





ترتیب
مجموعہ ۲ و ۳
ملک



مشرق و مغرب کے علوم و فنون کا بہترین مرجع

سکالنامہ

کلاسیک
ماہوار



۱۹۳۴

عینی

کاروان چابک سواران لاہور

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	صاحب مضمون	صفحہ
۱	سخنہائے گفتنی	مجید ملک	۱
۲	تصادیر	"نقاد"	۹
۳	گزارش احوال واقعی	مینجر	۳۵۰
۴	یوپی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں۔	"نیاز مند ان لاہور"	۱۲
علمی مضامین			
۵	اسلامی کوزہ گری	میرزا اوبردی	۱۷
۶	اردو	مولوی حمید الحق (مترجم سردار عبدالحجید)	۲۹
۷	میرزا قتیل اور شہنوی بدرنبیر	ڈاکٹر سیدھی الدین قادری ایم اے پی۔ ایچ۔ ڈی	۴۱
۸	فلم کاری کا آرٹ	آغا عبدالحجید بی۔ اے (آنرز)	۵۳
۹	نثری افسانوں کا ارتقا	عبد القادر سروری ایم۔ اے	۶۱
۱۰	اردو ڈرامہ کی مضامین	سید امتیاز علی تلج بی۔ اے	۶۵
۱۱	سعیار تاج	مولوی محمد عبد اللہ چغتائی	۱۲۵
۱۲	منتخب اشعار	عبد القادر مولینا سید سلیمان ندوی خلیفہ عبدالحکیم مولینا عبدالحجید	۲۳۳
۱۳	چغتائی کا آرٹ	(مولینا غلام رسول قمر)	۲۳۹
۱۴	پنجاب میں اردو کا ایک فراموش شدہ ورق	ڈاکٹر یحییٰ کزنز (مترجم مس شیدہ ذکار اللہ بی۔ اے)	۲۸۵
۱۵	مسلمانوں میں مصوری کا ارتقا	حافظ محمود شیرانی	۲۹۳
۱۶	جنتا ٹل بیلینی	محمد عبد اللہ چغتائی	۳۳۳
افسانے (طبع زاد)			
۱۷	گاڑی بان	سراج الدین (ناگیاں) بی۔ اے (لندن)	۴۵
۱۸	— "کہ عالم دوبارہ نیست"	سید امتیاز علی تلج بی۔ اے	۱۰۰
۱۹	آپ بیتیان	مجید ملک	۱۱۷

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۲۰	کامیاب ناکام	آغا عبد الحمید بی آسے آنرز	۱۵۳
۲۱	تاجدار	رحمن چغتائی	۲۱۷
۲۲	شکارے والی	ایم اسلم	۲۲۱
۲۳	محبت کا گیت	غلام عباس	۲۵۷

افسانے (نراجم)

۲۴	سیب کا درخت (گالزوردی)	پطرس (سید احمد شاہ بخاری بی۔ اے کینٹب)	۱۶۹
۲۵	بخاری (میتھا زکی ٹوسون)	فضل حسین	۲۵۱
۲۶	لومڑیوتا (بوس پلیٹاک)	غیر معروف جرنلسٹ	۲۶۹
۲۷	دیسلائی (چارلس لونی فلیپ)	شیخ قمر الدین بی آسے آیل آیل۔ بی	۲۷۷

مزاحیہ مضامین

۲۸	— "کارواں پیدا است"	رشید احمد صدیقی ایم۔ آسے	۶۵
۲۹	میر امرزا (انگارد)	آغا حیدر حسن	۷۸
۳۰	آسے۔ آسے۔ آسے	رکن الدولہ شمشیر جنگ نواب سجاد علی خاں (نواب آف کراٹل)	۱۲۲
۳۱	لاہور کا جغرافیہ	پطرس (سید احمد شاہ بخاری بی۔ اے کینٹب)	۱۶۵

ایک ایکٹ کے کھیل

۳۲	برفباری کی ایک رات	سید امتیاز علی تاج بی۔ آسے	۱۰۹
۳۳	پرانے دوست	مجید ملک	۱۳۷
۳۴	گورکھ دھندا	مجید ملک	۳۱۷

ادب لطیف

۳۵	نکات	مجید ملک	۲۵
۳۶	مشورہ	رحمن چغتائی	۵۱
۳۷	ہسپتال	سید امتیاز علی تاج بی۔ آسے	۱۰۸
۳۸	آخری وصیت	ماثر لنک	۱۲۲
۳۹	انسان کہ شیطان	فلک پیما	۱۵۷
۴۰	محبوبہ سے درخواست (آسکر وائیڈ)	عبد الحمید ساکت	۲۲۵
۴۱	مد و جزر	مجید ملک	۲۸۱
۴۲	حسن اور روان کی دنیا	مس مجاہد اسماعیل	۲۸۲
۴۳	وارث	رحمن چغتائی	۲۹۱

۴۴	شعر اقبال
۴۵	صبح بنارس
۴۶	احسن الکلام
۴۷	نر بڑا
۴۸	تحفہ درویش
۴۹	شاعر سے رات کی سرگوشیاں
۵۰	سوال
۵۱	فطرت اور انسان
۵۲	آغا نڈ
۵۳	زمزمہ بردازیاں
۵۴	نغمات حقیقت
۵۵	شعبہ صنعت
۵۶	روح نشاط
۵۷	فرمودہ پطرس
۵۸	آرزو
۵۹	تقدیر
۶۰	تغزلی
۶۱	عورت کی محبت
۶۲	کلام تپیش
۶۳	غزل وحشت
۶۴	جام باقی
۶۵	سرد و شبانہ
۶۶	جذبات ناقب
۶۷	کلام بنگانہ
۶۸	غزل رسا
۶۹	تاثرات
۷۰	گناہ کیست ؟ (منتخب اشعار)
۷۱	طرحی غزلیات

تبصرے

۷۲	انارکلی
۷۳	مجموعہ نغز
۷۴	ایرانی کتابی مصوری - تاریخ مستقلہ وغیرہ وغیرہ

۴۰	سر محمد اقبال
۵۲	عبد الرحمن بجنوری (مروج)
۷۶	مولانا احسن مارہروی
۸۱	مولانا سید سلیمان ندوی
۸۲	ترخ - ش - (مروجہ)
۱۱۶	خواجہ سعید احمد ذوقی بی - آئے علیگ
۱۲۲	مجید ملک
۱۳۵	ق - م - راشد وحیدی
۱۳۶	مجید ملک
۱۴۵	نواب فصاحت یار جنگ جلیل لکھنوی (بوساطت نظیر لکھنوی)
۱۶۱	ابوالاثر حنیف جالندھری
۱۶۲	میرزا محمد مادی عزیزی لکھنوی
۲۱۳	مولانا اصغر حسین اصغر گوندوی
۲۱۴	پطرس (سید احمد شاہ بخاری بی - آئے - کسٹب)
۲۱۵	منا - احسن - ایم - آئے
۲۱۶	مجید ملک
۲۳۰	عبد المجید جیرت
۲۳۱	میاں محمد دین تاثیر ایم - آئے
۲۳۲	شیخ عبد اللطیف پیش ایم - آئے - ایم - آو - ایل
۲۵۵	خان بہادر رضا علی وحشت
۲۵۶	ابوالعلا ناطق لکھنوی (بوساطت نظیر لکھنوی)
۲۷۵	فیض احمد فیض ایم آئے
۲۷۶	ابو محمد ثاقب کانپوری
۲۸۰	میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی
۳۳۲	محمد کبیر خاں رتسا جالندھری
۳۳۴	میاں محمد دین تاثیر ایم - آئے
۳۳۸	ق - م - ح -
	نواب سجاد علی خاں بہل - احسن مارہروی - خان بہادر رضا علی وحشت
	شیخ عبد اللطیف پیش

۳۳۷	مرزا محمد سعید ایم - آئے
۳۳۸	ڈاکٹر محمد اقبال ایم - آئے - پی ایچ ڈی (اورنٹل کالج لاہور)
۳۳۹	محمد عبداللہ چغتائی

فہرست تصاویر

علامہ اقبال کا شعر
علامہ اقبال کے اشعار

سوز و ساز

مربیان

قلندر

جاوی رقاصہ

راجہ جسونت

خلوت

نغمہ

راگنی

شب شیراز

مینا رتاج

سادن رت

محبوب

اسلامی کوزہ گری

اسلامی کوزہ گری

اندھا فقیر

ایرانی شہزادی

مالچہ (جدید سنگتراشی)

اسکندر (قدیم سنگتراشی)

بدھا (قدیم سنگتراشی)

ایک چینی (جدید سنگتراشی)

مغرور مان (جدید سنگتراشی)

شبیبہ مصور

جدید عمارت

بادۂ حافظ

دربار شاہجہان

تصویر نظیر اکبر آبادی

تصویر میر حسن دہلوی

سلطان محمد ثانی

سلطان محمد ثانی - سلطان محمد کا تمغہ - سلطان محمد کے تمغے کا خاکہ

سلطان محمد ثانی

قدیم ترک سپاہی

قدیم ترک عورت

مطالعہ

تراش

سجودے

سرکس

عمل رحمن چغتائی

عمل رحمن چغتائی

عمل رحمن چغتائی

اشتر پیگور

مغل تصویر

راجپوت تصویر

اثر اصغر

عمل عنایت اللہ

اثر اصغر

قدیم عمارت

عمل کچھو سوہیرائے (جاپانی)

ایس فیورن ڈی مسکوٹیا (ٹالینڈ)

عمل آنسو کمارٹ (جرمنی)

ہرات اسکول

ایلیٹ ہوز

ایلیٹ ایگلو -

دورا ٹورٹون (رومی)

ہرمین گیل

اثر ہزاد

فوتو کرافٹ

اثر بین جی

منزل تصویر

جنگل سلیم

جنگل سلیم

جنگل سلیم

جدید فوٹو گرافی

جدید فوٹو گرافی

جدید فوٹو گرافی

جدید فوٹو گرافی

چار رنگ

چھ رنگ

سہ رنگ

سہ رنگ

سہ رنگ

سہ رنگ

سہ رنگ

سہ رنگ

سہ رنگ

دو رنگ

دو رنگ

دو رنگ

دو رنگ

دو رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

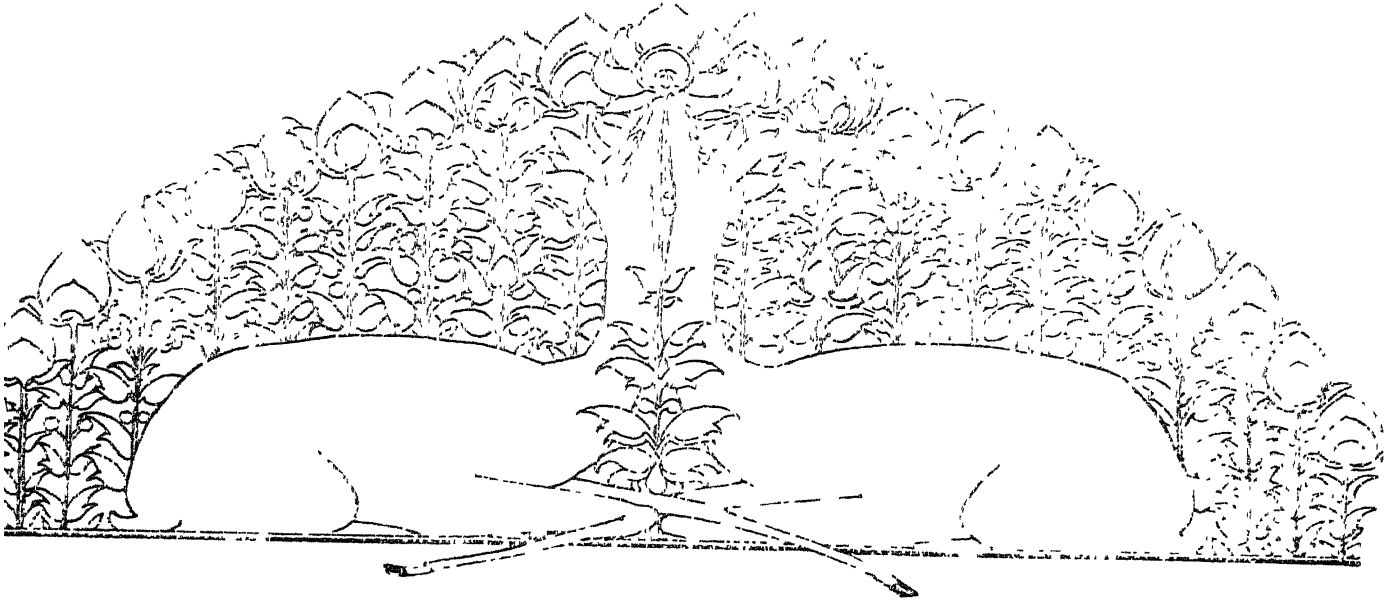
ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ

ایک رنگ



سخنہائے گفتنی

کاروان اپنی زندگی کی دوسری منزل میں قدم رکھتا ہے۔ کاروان کے اہلکار کے وقت جو تخیل پیش نظر تھا۔ اس سے انحراف نہ کرنا آسان نہ تھا لیکن عزم کے پکے ثابت قدم رہے۔ تعریف و توصیف سے ان کا سر نہ پھرا اور تنقید و تنقیص سے وہ آزرده نہ ہوئے۔ اس سال کا کاروان پبلک کے سامنے ہے جس کا جی چاہے اس کی تعریف کرے جس کا جی چاہے اسے بُرا کہے۔ کاروان کے کارکن توصیف و تعریف سے بے نیاز ہیں۔ اور بہر حال اپنا کام کرتے چلے جائینگے۔

x x

گذشتہ سال علامہ اقبال نے کاروان کے لئے ایک غزل عنایت فرمائی تھی اور اس سال صرف ایک شعر۔ لیکن اس عطیہ کو میں "حاصل گلچینی باغ حیات" سمجھتا ہوں۔ خاص طور پر اس لئے کہ میری درخواست کے جواب میں حضرت علامہ نے ارشاد فرمایا تھا۔ "تم غزل لے کر کیا کر و گے۔ میں تمہیں ایک ہی شعر دیتا ہوں۔ لیکن ایسا شعر جسے بیسویں اشعار سے بہتر جانتا ہوں"۔ میرا دل بلبوں اُچھلنے لگا اور میں نے قدرے سکوت کے بعد عرض کیا :-

"میں مژدہ گرجاں نشانم رواست"

یہ شعر قارئین کے سامنے ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اہل نظر اسے حرزِ جاں سمجھیں گے۔

x x

کاروان کے مضامین اور مضمون نگار انتخاب کے متعلق چند معروضات پیش کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ گذشتہ سال کاروان نے دعوے کیا تھا کہ "آئندہ سال موجودہ سال سے بھی بلند تر ہونگے" یہ وعدہ وفا کرنے کی ہم نے کوشش کی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ہم ان کوششوں میں کامیاب ہوئے ہیں۔ میرے دوست تاثیر اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے مجھے وہ مدونہ دیکھے جس کی میں امید لگا کر بیٹھا تھا۔ حقیقت۔ میرا غمزدہ اور غمخوار دوست سال بھر مصائب و آلام میں گرفتار رہا اور اب بھی گرفتار ہے۔ اس کے باوجود ہم حقیقت کی پانچ غزلیں اور ایک گیت شائع کر چکے ہیں اور یہ ایک ایسی کامیابی ہے کہ اس پر کاروان جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ "علیٰ مضامین میں جناب سید امتیاز علی تاج کا مضمون 'اردو ڈراما کی مفاہمتیں'۔ جناب محمود شیرانی کا مضمون 'یخاں میں اردو کا فراموش شدہ ورق' ڈاکٹر محی الدین صاحب زور کا مضمون میرزا قتیل۔ میر حسن اور فتویٰ بدر میر کے متعلق۔ میرزا ویردی کا 'اسلامی ظروف'۔ جناب سردری کا 'نثری افسانوں کا ارتقا' اور آغا عبدالحجید کا 'فلم سازی کا آرٹ' تمام معرکے کی چیزیں ہیں۔ جناب محمد عبداللہ چٹائی کے مضامین 'معمار تلج' 'جنگل بیلنی' اور اسلامی مصوری 'انتہائی محنت و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ پہلے دو کے لئے مواد مصنف نے فرانس انگلستان کی سیاحت کے دوران میں مہیا کیا تھا۔ تبسرا مضمون دائرہ معارف اسلامیہ کے جلسے میں پڑھا گیا تھا اور سنتا ہوں کہ مولانا سید سلیمان ندوی اور پروفیسر شیرانی جیسے بالکمال محقق اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے مزاحیہ مضامین کا حصہ گذشتہ سال سے بہت بہتر ہے۔ گذشتہ سال سے بہتری نہیں۔ میں سمجھتا ہوں تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔ جناب پطرس اور جناب رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین جس رسالے میں یکجا ہو جائیں اس رسالے کو اور کیا چاہئے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ہندوستان کی فضا میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک ہی رسالے میں پطرس اور رشید احمد صدیقی بہ یک وقت جلوہ گر ہوئے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس قرآن السعید پر میں جتنا بھی ناز کروں بجا ہے۔

"بر دست خویش بوسہ زند باخسان ما"

اس سال ہم دو انگلے (سیک) بھی شائع کر رہے ہیں۔ جناب آغا حیدر حسن کا "میرا مرزا" اور جناب نواب سجاد علی خاں نواب آف کرنال کا "اے۔ اے۔ اے۔" اردو زبان میں ادب کی اس صنف پر کم توجہ کی جاتی ہے۔ دونوں انگلے مزاحیہ انداز میں ہیں اور قابل داد ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ دیگر رسائل اور مضمون نگار بھی اس طرف توجہ کریں۔ فلک پچا کا "انسان کہ شیطان؟" اپنی رنگ کی واحد چیز ہے۔ نظم کا انتخاب۔ اس کا ترجمہ اور اس پر انتقاد۔ "نینوں کے لئے فلک پچا مستحق مبارک باد ہے۔"

کاروان کے افسانے دو حصوں میں منقسم ہیں۔ تراجم اور طبع زاد افسانے۔ تراجم میں سب سے پہلے میں جناب پطرس کے "سیب کا درخت" کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ (گالزور دی کا "دی اپیل ٹری" درحقیقت مختصر افسانہ نہیں "طویل مختصر افسانہ" ہے) بیشتر انگریز مصنفین کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں مقامی رنگ کوٹ کوٹ کئے بھر دیتے ہیں۔ یہ بات غالباً جان بول کی فطرت میں داخل ہے اور اسے دیگر اقوام سے تمیز کرتی ہے۔ روسی افسانہ نگار بھی مقامی رنگ پیش کرتا ہے۔ لیکن مقامی رنگ اس کے افسانوں کا جزو نہیں ہوتا۔ فرانسیسی افسانہ نگار بھی عام طور پر فرانسیسی مردوں اور عورتوں اور بازاروں اور گلیوں کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن اس کی تحریروں میں ایک "عالمگیریت" ہوتی ہے۔ نام بدل دو۔ تھوڑا بہت ماحول بدل دو تو۔ عام طور پر۔ روسی اور فرانسیسی افسانہ میرے اور تیرے اور اس کے اور اس کے اور اس ملک کے اور اس ملک کے حالات کے مطابق ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نوآموز افسانہ نگار نہایت آسانی سے روسی اور فرانسیسی افسانے اوپر نیچے کر کے جاہل ایڈیٹروں کے پاس بھیج دیتے ہیں اور یہ حضرات ان "طبع زاد" افسانوں کو لمبی لمبی تعریفیں لکھ کر شائع کرتے ہیں۔ انگریزی افسانے

— عام طور پر — اس محل جراحی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اور اسی لئے سفالوں کی دراز دستیوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ انگریزی افسانوں کی یہ خصوصیت مترجموں کے لئے بھی مشکلیں پیدا کر دیتی ہے۔ گالز وروی کے ”دی اپیل ٹری“ میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور اس خصوصیت کے اشکال سے جناب پطرس جس کمال سے عہدہ برآ ہوئے ہیں وہ جناب پطرس ہی کا حصہ ہے۔ میرا دعوئے ہے کہ ”دی اپیل ٹری“ کا اس سے بہتر ترجمہ ممکن نہیں — میں جانتا ہوں کہ یہ جملہ بعض حضرات کو آماؤ پکار کر لگیا۔ اور بعض حضرات کی آزدگی کا باعث ہوگا۔ لیکن خوف پیکار یا پاس مردوت مجھے اٹھائے حق پر آمادہ نہیں کر سکتا۔

ایک اور ترجمے کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں یعنی جناب عبدالحمید سالک کا اسکر وائلڈ کی ایک نظم کا ترجمہ جسے ”محبوبہ سے درخواست“ کے زیر عنوان شائع کر رہے ہیں۔ میں نے کاروان کے لئے مضمون کی درخواست کی تو سالک صاحب نے کہا۔ ”تم آج کل کسی روزانہ اخبار کے ایڈیٹر نہیں اسی لئے تمہیں مضمون نگاریاں سوجھ رہی ہیں۔ میں بدستور اس مصیبت میں گرفتار ہوں جسے عرف عام میں ایڈیٹری کہتے ہیں۔ اس لئے میرا دماغ خالص ادب کی طرف مائل نہیں ہو سکتا۔ لیکن خیر اگر کوئی انگریزی نظم یا کہانی بھیج دو تو ترجمہ کر دوں گا۔ میں نے دل میں سوچا سالک صاحب نے وعدہ تو کر ہی لیا ہے اب کوئی ایسا مشکل ترجمہ تجویز کروں کہ جھلا کے خود ہی کہ دیں۔“ بابا میں باز آیا میں طبعاً اد چیز ہی لکھ دوں گا۔ گھر کے میں نے کافی چھان بین کے بعد اسکر وائلڈ کی ایک نظم چنی۔ اور نشان لگا کر اُسے ”انقلاب“ کے دفتر میں بھیج دیا۔ اس یقین کے ساتھ بھیج دیا کہ اس کا کامیاب ترجمہ ناممکن ہے — دو گھنٹے کے بعد دفتر انقلاب کے چیر اسی نے کتاب میرے حوالہ کی۔ میں نے دل میں کہا۔ سالک صاحب نے ہار مان لٹی ہے اور بہت جلد مان لی ہے۔ لیکن جب میں نے کتاب کھولی تو ترجمہ اس کے اندر موجود تھا۔ اور ترجمہ بھی ایسا کہ میں عش عش کر اٹھا — یہ سطور گویا اعتراف شکست ہیں اور اس لئے لکھ رہا ہوں ”کہ سندر ہے اور بوقت ضرورت کام آئے“

طبعاً افسانوں میں سب سے پہلے جناب سید امتیاز علی تاج کا افسانہ ہے۔ آج سے تقریباً دو ماہ پہلے تاج صاحب نے مجھے یہ افسانہ سنایا اور کہا اس کا نام تجویز کرو۔ میں نے کہا ”الفاظ کی جادوگری“۔ متعجب ہو کر میرا منہ تنکے لگے۔ میں نے ہنس کے کہا یہ نام اس لئے ہے کہ اس افسانے میں آپ نے فراغ مصر کے محلات۔ آسیرس کے جشن۔ مے نوشوں کی مے نوشی۔ رقاصوں کے رقص کی وہ تصویر کھینچی ہے کہ سامع محسوس کرتا ہے کہ جسدا اس دنیا سے اس دنیا میں چلا گیا ہے اور نوجوان فرعون کی بدست عشرتوں میں شامل ہے۔ رقاصہ حبشی النسل ہے۔ اس کا رنگ کالا ہے۔ اس کے ہونٹ موٹے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس میں شباب کی وہ بدستی ہے کہ فرعون مصر تو خیر فرعون مصر تھا ہم اور آپ بھی ہوتے تو۔ لپک کے اسے گود میں اٹھا لیتے۔ اگر یہ الفاظ کی جادوگری نہیں تو اور کیا ہے — فنی اعتبار سے بھی جناب امتیاز کا یہ افسانہ بالکل نئی چیز ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں مسلمہ شاہکاروں سے قطعاً مختلف ہے۔ عام طور پر مختصر افسانہ نویس کامیابی کے لئے پلاٹ میں یا کردار میں ایک قسم کی ”حرکت“ پیدا کرتے ہیں۔ امتیاز صاحب کے افسانہ میں ”حرکت“ نام کو بھی نہیں تلاش سے بھی نہیں ملتی اور اس کے باوجود یہ افسانہ بے انتہا کامیاب ہے۔ چٹائی کا افسانہ بھی اپنے انداز کی واحد چیز ہے۔ چٹائی مصور ہے۔ جوش طبعیت دیکھئے کہ وہ الفاظ میں بھی تصویریں کھینچتا ہے۔ چٹائی کی تصویروں میں فنی کمال کے علاوہ شعریت اور تخیل کی وہ فراوانی ہوتی ہے۔ کہ ناظر متحیر ہو کے رہ جاتا ہے۔ تخیل اور شعریت کی یہ فراوانی اس کے افسانوں میں بھی عیاں ہے۔ بلکہ افسانوں میں تصاویر سے بھی زیادہ ہے۔ تصاویر میں چٹائی اپنی شعریت اور تخیل کو اپنے فنی کمال کے تابع کر دیتا ہے۔ اور دونوں کے مناسب امتزاج سے وہ چیز پیدا کرتا ہے کہ باید و شاید۔ لیکن چونکہ افسانہ نویس کے فن پر اسے وہ قابو حاصل نہیں جو خطوط اور رنگوں پر ہے۔ اس لئے بار بار وہ اپنے تخیل کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ اور شبہ ہوتا

ہے کہ تخیل چغتائی کا غلام نہیں بلکہ چغتائی تخیل کا غلام ہے۔

میرے ایک دوست کا ایک جرمن دوست جو چغتائی کا مداح ہے میرے مکان پر آیا کیونکہ اسے معلوم ہوا تھا کہ میرے پاس "چغتائی" کے چند شاہکار ہیں۔ تصویریں دیکھ کے وہ گھنٹوں سر دھننا رہا۔ رات ہو گئی۔ اور کھانا کھانے کے بعد جب ہم دھوئیں کے بادل اڑا رہے تھے میں نے اس سے کہا۔ تم مصوٰر چغتائی کو جانتے ہو لیکن ادیب چغتائی سے واقف نہیں۔ میں نہیں ادیب چغتائی سے بھی ملا سکتا ہوں۔ میں نے اسے چغتائی کے افسانے ترجمہ کر کے سنائے۔ کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے۔ بے انتہا متاثر ہوا اور اس نے مجھ سے کہا۔ اگر چغتائی مصوٰر کے بجائے ادب کی طرف اپنی تمام توجہ مبذول کرتا تو ادب کی دنیا میں وہی رتبہ حاصل کرتا جو اُسے آرٹ کی دنیا میں حاصل ہے۔

x x x x x x x x x x x x x x x x

کاروان میں ہم تین ایک ایکٹ کے کھیل شائع کر رہے ہیں۔ جناب امتیاز کا کھیل "برفاری کی ایک رات" معرکہ آرا چیز ہے۔ ان کے افسانے کا ماحول رومانی ہے۔ ان کا کھیل "ریلشک" ہے۔ لیکن اس "ریلزم" میں بھی کس قدر رومان ہے! ایک چھوٹی سی کٹیا۔ رات۔ اور برفاری کا لاگتنا ہی سلسلہ۔ ایک مرد۔ ایک عورت۔ اور بس۔ چھوٹے چھوٹے جملے بولتے ہیں۔ لیکن ہر لفظ نشتر ہے اور ہر جملہ تیر

"تیر دگر آمد و دل و دست بہم دوخت"

ادب کی اس صنف کی جانب بھی ہمارے ادیبوں کی توجہ کم ہے۔ افسوس ہے کہ جو کھیل ہر بانوں نے بھیجے معیار پر پورے نہ اترے۔ مجبوری ہو کر میں نے خود دو کھیل لکھے۔ برے بھلے جیسے ہیں قارئین کے سامنے ہیں۔

حصہ نظم کے لئے ہم نے بہت جدوجہد کی ہے۔ ترخ۔ ش۔ مرحومہ اور عبدالرحمن بجنوری کا غیر مطبوعہ کلام ہدیہ ناظرین ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی نظم "زبدا" پر ایک نادر چیز ہے اور مجھے یقین ہے کہ اہل نظر اسے سرمہ چشم سمجھ کر آنکھوں میں جگہ دینگے۔ فصاحت یا جنگ جلیل لکھنوی کی غزل۔ حضرت عزیز لکھنوی کی غزل۔ حضرت احسن مارہروی کی غزل۔ حضرت وحشت کی غزل۔ حضرت تسلی کی غزل۔ حضرت اصغر کی غزل۔ علامہ ابو العلا ناطق کی غزل۔ میرزا یاس کی غزل۔ حضرت ثاقب کی غزل۔ حضرت قیس عظیم آبادی کی غزل۔ حضرت رسا کی غزل۔ حضرت تاثیر کی غزل۔ نظموں میں حضرت راشد کی نظم۔ حضرت فیض کی نظم۔ حضرت تاثیر کی نظم۔ حضرت ذوقی کی نظم۔ حضرت ممتاز حسن احسن کی نظم۔ اس سے زیادہ کاروان کیا کر سکتا ہے۔ حضرت حفیظ نے جو جواہر ریزے کاروان کے لئے فراہم کئے ہیں ان کے متعلق میں کچھ نہیں کہوں گا کہ حضرت حفیظ کا یہی حکم ہے۔

x x x x x x x x x x x x x x x x

ایک دن میں علامہ اقبال کے در دولت پر حاضر تھا۔ آپ حسب معمول فلسفہ و حکمت کے موتی بکھیر رہے تھے اور میں خاموشی کے ساتھ ان موتیوں سے اپنا دامن تہی بھرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ موضوع گفتگو بار بار بدل رہا تھا۔ مولانا برکات احمد نے زبانِ مکان کی بحث پر کیا خام فرسائی کی ہے؟ افسوس ہے کہ گذشتہ ایک صدی میں مسلمانان ہند نے ادق فلسفیانہ مسائل پر جو کچھ لکھا ہے وہ عوام بلکہ خواص سے بھی پوشیدہ ہے۔ قرآن میں ایک سورہ دہر ہے اور ایک سورہ عصر۔ دہر اور عصر میں کیا فرق ہے؟ اور سورہ دہر کو سورہ عصر اور سورہ عصر کو سورہ دہر کیوں نہیں کہا گیا؟ اسلامی مساجد اور اسلامی مقابر کی ساخت میں فنی لحاظ سے کیا فرق ہے؟

اور کیوں ہے؟ قریب کی مسجد میں شکوہ۔ سربلندی اور نمکنت کیوں ہے۔ تاج میں حسن۔ نزاکت اور پاکیزگی کیوں ہے۔ زندگی اور آرٹ کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ عربی شاعری اور عجمی شاعری میں کیا فرق ہے؟ ایران نے عربی شاعری سے کیا کچھ اخذ کیا اور اس میں کیا اضافہ کیا؟ اردو شاعر نے ایرانی شاعری کا تتبع کیوں کیا۔ اور کس حد تک کیا۔ وہی اور لکھنؤ کی زندگی زبان پر اور طربیان پر کہاں تک اثر انداز ہوئی۔

میں نے پوچھا کیا آپ کے نزدیک آرٹ بجائے خود کوئی حیثیت نہیں رکھتا؟ قائم بالذات نہیں؟ فرمایا۔ نہیں۔ اردو شاعری ہندوستان کے دور انحطاط کی پیداوار ہے۔ اس لئے کمزور۔ غیر فطری اور حد درجے کی مصنوعی ہے۔ آرٹ اقوام عالم کی زندگی کا عکس ہے۔ کسی قوم کے آرٹ کو دیکھ کر اس قوم کی نفسیاتی کیفیتوں کا صحیح نقشہ کھینچا جاسکتا ہے۔ لیکن آرٹ زندگی کا منظر ہی نہیں۔ زندگی کا آلہ کار بھی ہے۔ اور سچا آرٹ وہ ہے جو اپنے کمال کو بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے وقف کر دے۔

میں نے عرض کیا ”فرحت“ محض ”فرحت“ بھی انسانی زندگی کا ایک لازمی جزو ہے۔ اگر کوئی شعر کسی کو ہنسائے۔ یا آمادہ گریہ کر دے۔ کیونکہ بسا اوقات گریہ میں بھی فرحت پنہاں ہوتی ہے۔ تو یقیناً وہ شعر کامیاب ہے۔ فرمایا بیشک لیکن اردو شعرا بھی اپنی قوم کے لئے فرحت مہیا کرتے ہیں اور پرانے عربی شعرا بھی کیا کرتے تھے! کتنا تفاوت ہے۔ عربی شاعری میں اور اردو شاعری میں وہی فرق ہے جو ایک سرفروش۔ جنگجو قوم میں اور عشرت زدہ قوم میں ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ میرے نزدیک اس زمانے کی عربی شاعری صحیح قسم کی شاعری تھی عرب کی زندگی کے عجوب عربی شاعری میں عیاں ہے۔ لیکن ان عجوب کی نوعیت اردو شاعری کے عجوب سے مختلف ہے۔ میرے نزدیک حقیقی آرٹ وہ ہے جو اپنی قوم کا نبض شناس ہو اور آرٹ کو قومی امراض کے دلیعہ کا ذریعہ بناوے۔ شاعر امر القیس کی طرح اشعار شہر ہونے کے باوجود قائد ہم الی التار ہو سکتا ہے۔ اور شاعر ہی اپنے حسن کلام کی وجہ سے اس لئے تک پہنچ سکتا ہے جس لئے پے پر لبید پہنچا۔ کہ خود سرور کوئین کو اس سے ملنے کا شوق تھا۔ علاوہ ازیں جسے تم ”کامیاب شعر“ کہتے ہو وہ اور چیز ہے اور معیار پر پورا اترنے والا شعر اور چیز ہے۔ وہ شاعری جو آرٹ کے حقیقی معیار پر پوری اترتی ہے۔ پیغمبری کا جزو ہے۔ وہ شاعری جو اس معیار پر پوری اترے یا نہ اترے لیکن فنی معیار پر پوری اترتی ہے ”کامیاب“ شاعری ہے۔

میں نے عرض کیا اردو کا کوئی شعر جسے آپ ”کامیاب“ سمجھتے ہوں یا جو آپ کو بہت پسند ہو فرمائیے۔

قدے وقف کے بعد فرمایا بہت کم اردو اشعار میرے ذہن میں ہیں۔ اور یوں بھی شاید دل پر گہرا اثر چھوڑنے والے اشعار اردو میں کم ہیں۔ تم شعر سناتے جاؤ۔ جو شعر پسند ہو گا کہ دوں گا۔ میں فکر میں غرق ہوا۔ لیکن ابھی کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ آپ نے پوچھا یہ کس کا شعر ہے:-

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عسریٰ نہیں تمام ہوتی ہے

میں نے عرض کیا غالباً داغ کا ہے۔ فرمایا غالباً داغ کا نہیں۔ لیکن اچھا شعر ہے۔ ہر لحاظ سے کامیاب۔ شاعر نے ایک نقطہ نظر کو چیدہ الفاظ میں اور مکمل طور پر بیان کر دیا ہے۔ یہ نقطہ نظر مشرق میں عام ہے۔ مختلف شعرا نے مختلف پیرایوں میں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ غالباً ان تمام اشعار میں سے یہ شعر بہترین ہے۔ لیکن قابل خوربات یہ ہے کہ یہ نقطہ نظر شاعر بلکہ جملہ قوم کی نفسیاتی کیفیت کا منظر ہے۔ شاعر وقت کے سیلاب کے سامنے اپنے آپ کو بے حقیقت تصور کرتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ دن اور رات کے ایاب و ذہاب پر اس کی شخصیت مطلقاً اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ وہ ”زمان“ کو محض دن اور رات کا تسلسل سمجھتا ہے۔ حصول مدعا۔ کارکردگی اور جدوجہد کا ذریعہ نہیں

سمجھتا۔ وہ وقت کے دھارے پر ایک تنکا ہے۔ جسے موجیں اُدھر اُدھر جھرجھراتی ہیں پٹک دیتی ہیں۔ وہ ان موجوں کے خلاف نبرد آزما نہیں کرتا۔ انہیں اپنی راہ پر نہیں لاتا۔ لانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ کوشش کرنے کی خواہش بھی نہیں رکھتا۔ ”صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے“ یہ احساس اس قوم یا اس قوم کے کسی فرد کا ہے جو سیل زمانہ کے سامنے اپنی بے بسی کا معترف ہے۔ معترف ہی نہیں۔ کامل طور پر آگاہ ہے۔ اس حد تک آگاہ ہے کہ اپنی بے بسی کو قانون قدرت کا جزو سمجھتا ہے۔ جدوجہد کرنے والی اقوام کی ”صبح“ ہوتی ”نہیں۔“ وہ گویا ”صبح“ کرتی ”ہیں اور شام“ کرتی ”ہیں۔“ وہ وقت کو دن اور رات اور جینے اور سال کے پیمانے سے نہیں ناپتیں۔ بلکہ سعی اور ”حصول“ کے پیمانے سے ناپتی ہیں۔ یہ سب کچھ ہے لیکن یہ شعر بہت اچھا ہے۔ کیونکہ جس خیال کو شاعر ادا کرنا چاہتا تھا اس خیال کو اس نے موثر طریقے سے ادا کر دیا ہے۔ ”سیل زمانہ کے سامنے انسانی بے بسی“ اس موضوع پر یہ بہت اچھا شعر ہے۔

میں نے عرض کیا آپ کے نزدیک کامیاب اشعار میں کیا خوبیاں ہوتی ہیں۔ مسکرا کے فرمایا بہت سی ہوتی ہوں گی لیکن جدت اور نئی خوبی یہ دو تو بہر حال ضروری ہیں۔ میں نے عرض کیا تو کوئی اور شعر فرمائیے جو آپ کو پسند ہو اور اس معیار پر پورا اترے۔ اٹھایا کیا تم شعر سناؤ۔

میں نے غالب کا یہ شعر پڑھا :-

مہرباں ہو کے بلا لومھے چاہو جس وقت میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر ابھی نہ سکوں
 فرمایا اچھا شعر ہے کوئی اور شعر سناؤ۔ میں نے غالب کا ایک اور شعر پڑھا :-

غالب نے اسے ترک کر دیا۔۔۔ میں نے یہ شعر پڑھا :-

نہ یوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

اور ورد کے یہ دو شعر :-

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ساتھیاں لگ رہا ہے چل جلاؤ

ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
جب تک بس چل سکے ساغر چلے

فرمایا دردِ اردو زبان کا واحد صوفی شاعر ہے۔ زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے۔ ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے، خوب شعر ہے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر زندگی کی بے پناہ کشاکش سے عاجز آ گیا ہے۔ تھک گیا ہے۔ لیکن نہیں۔ ابھی اس میں جان باقی ہے اور جب تک جان ہے وہ آمادہٴ پیکار ہے۔۔۔ نفسیاتی لحاظ سے یہ شعر ”صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے“ کا ضد ہے۔ دوسرا شعر ”ساقیاں لگ رہا ہے چل چلاؤ۔ جب تک بس چل سکے ساغر چلے“ اردو شعرا کے عام انداز میں ہے۔

میں نے عرض کیا کیا یہ ممکن نہیں کہ دوسرے شعریں بھی متاع سعی اور انہماک فی المشاغل کا درس دے رہا ہو۔ فرمایا ممکن ہے لیکن قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔

قدے توقف کے بعد میں نے فانی کے یہ اشعار سنا کئے :-

اور حقیقت کا یہ گیت :-

عرض کیا :-

میں نے اکبر کا یہ شعر پڑھا :-

فرمایا خوب ہے لیکن مجھے اکبر کا یہ شعر زیادہ پسند ہے :-

نادیدنی کی دید سے ہوتا ہے خون دل

نے باوجود اپنی لاتعداد مصروفیتوں کے فوراً جواب باصواب بھیجا۔

ہمدردی اور غور سے مطالعہ کیا جائے معترضین کی خدمت میں ہم خود بھی ایک بات۔ فقط ایک بات عرض کرنا چاہتے ہیں : —

پنجاب نے ایسے شاعر پیدا کئے ہیں جن کے اشعار اور نغلات آپ کی زندگی کا جزو بن کر رہ گئے ہیں۔ آپ کے متبحر عالم ان کے اشعار پڑھ کے سر دھنتے ہیں۔ اور آپ کے بازاروں اور گلیوں میں آوارہ پھرنے والے لڑکے، ان کے اشعار بے سری الاپوں میں گاتے ہیں اس کے باوجود جب آپ تنقید لکھتے بیٹھتے ہیں تو آپ کو سوائے ”غرضہ محشر“ پہ اعتراض کرنے کے اور کچھ نہیں سوجھتی۔ ہمارے ہاں مزید نگار ہیں جن کے مضامین کیمبرج کے پروفیسر ترجمہ کر کے سنتے ہیں اور مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ جاتے ہیں۔ جن کے مضامین آپ بھی پڑھتے ہیں تو ہنستے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ نہ ہنسیں۔ لیکن ہنسنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے باوجود جب تنقید لکھنے کا وقت آتا ہے۔ تو ”آپ“ خسرہ کی تذکیر و تائیت کی بحث چھیڑ کر اپنی فضیلت علمی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ڈرامہ نگار ہیں جنہوں نے اردو ڈرامہ میں اپنے سحر ف سے جان ڈال دی ہے۔ لیکن آپ کچھ فرماتے ہیں تو یہی کہ ”سیچھے“ کہوں لکھا۔ بیلچہ کیوں نہیں لکھا۔ کیا یہ مقام افسوس نہیں۔

فارئین یہ سن کر خوش ہونگے کہ اس سال کاروان کا ایک خاص ایڈیشن جو ایک سو پچھتر کاپیوں پر مشتمل ہے اور جس کی قیمت فی جلد بارہ روپے ہے۔ شائع کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ ایڈیشن فروخت کے لئے مارکیٹ میں نہیں آئیگا۔ پچیس کاپیہ اس معاویہ کاروان کے لئے علیحدہ کر لی جائیگی اور بدینہ ان کی خدمت میں پیش کی جائیگی۔ ایک سو پچاس کاپیوں کے لئے احباب کے ارے سے آرڈر موصول ہو چکے ہیں۔ اگر آئندہ سال آرڈر زیادہ تعداد میں موصول ہوتے تو اس ایڈیشن کی تعداد بڑھا دی جائیگی۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ کاروان کی اشاعت سے کافی پہلے دفتر کاروان میں آرڈر پہنچ جائیں۔ اس سال کی طرح آئندہ سال کا یہ خاص ایڈیشن بھی بہتر کاغذ پر بہتر طباعت سے اور مجلد شائع ہوگا۔ آئندہ سال کا کاروان انشاء اللہ اس سال سے بھی بہتر ہوگا۔ ابھی سے تیار ہوا شروع کر دی گئی ہیں اور امید ہے کہ دسمبر کے بجائے اکتوبر میں شائع ہوگا۔

۱۰ دسمبر ۱۹۳۳ء

اقبال

نؤیری نو اُس کی نو اُس کی نویری
خدا کو سچا کرے خدا کو سچا کرے



تصاویر از "نفتاد"

سوا کہ یہ ایک شاہکار ہے۔ اردو ادب اس سے پہلے ایسی کوئی تصنیف پیش نہیں کر سکا اور کچھ موجود نہیں۔

کاروان کی اشاعت کا ایک مقصد ان علوم و فنون شرقیہ کی ترویج ہے جو ہمارے اسلام کو خوب مقبول تھے۔ انھوں نے کہ مشرقی روایات جو ہندوستان اور ایشیا میں فنون کے وابستہ تھیں، مثلاً مٹ چکی ہیں۔ ان سٹے ہوئے علوم و فنون کو جدید علوم و فنون کے ساتھ پیش کرنا کاروان کا مقصد اولین ہے۔ اس کے علاوہ ایک ہم مقصد یہ بھی ہمارے پیش نظر ہے کہ ملک کے اہل نظر کو جو فن جیسی دولت سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ ایک ایسی فضا میں لا کر رکھ دیا جائے جس کے انکے ذوق تسلیم کو ایک قسم کی غذا مل سکے۔ دینائے ادب فن کا سب سے اہم کام جو مصوروں اور شاعروں کے پیش نظر رہا ہے اور رہیگا صرف اس قدر ہے کہ وہ انسان کی شیرازہ بندی میں محروم اور انسان میں بیداری پیدا کر کے اچھے اور بُرے کو تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیں۔ تصویر نگہ شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں کہ ورق کے ورق بھر دئے جائیں ان کا مقصد ادب اور فن کی ترقی کرنا ہے۔ جذبات کی ترجمانی کرنا صنائع اور شاعر کا کام ہے۔ انکو سمجھنا اور ان سے لطف اندوز ہونا صاحب نظر اور نقاد کا کام ہے۔

قدیم اور جدید مصوری کو فلک ادبی ذوق کے سامنے پیش کرنا ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ اسکی اہمیت کو مد نظر رکھ کر پچھلے سال ہم نے قدیم ہندوستانی اور ایرانی تصویروں کے علاوہ جدید اسکولوں کی تصویروں بھی شائع کی تھیں۔ انہیں خصوصیت سے چٹائی سکول کے مصوروں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان تصاویر کے علاوہ قدیم اور جدید سنگ تراشی۔ فوٹو گرافی۔ فن تعمیر اور کتابت کے نمونے بھی تھے۔ اس مرتبہ ہم پھر مختلف جدید مصوروں کی تصاویر قدیم ایرانی، مغربی اور جاپانی مصوروں کی تصاویر کے ساتھ ساتھ نئے نئے کتبے ہیں۔ اسمال کاروان میں کم و بیش عاشر تصاویر شائع ہو رہی ہیں۔ یہ تصویروں غازی پر کرنے کو یا تجارتی نقطہ نگاہ کے سامنے رکھ کر شائع نہیں کی گئیں۔ جملہ تصاویر میں ایک خصوصیت ایک انوکھا پن ہے۔ نو آمو یہ تصاویر دیکھ کر حیران نہ ہوں۔ انہیں غور سے دیکھیں۔ انہیں سمجھنے کی کوشش کریں۔ آہستہ آہستہ یہی تصویروں آرٹ کے متعلق ایک صحیح قسم کا معیار قائم کرنے میں ان کی مدد

رہو۔ خزانہ جیسا نقد جب مصوری پر کچھ لکھنے کے لئے قلم اٹھاتا ہے تو اس کا طبع نظر صرف اس قدر ہوتا ہے کہ تصاویر کے محاسن آسان سے آسان طریقے سے قارئین پر واضح کر دے۔ اور جو کچھ اس نے خود محسوس کیا ہے دوسروں تک جو ان کو توں پہنچائے۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ سمجھنے کہ اس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ جن گونا گوں کیفیات نے مصو کو ایک نیا جہان پیدا کرنے پر آمادہ کر دیا ہے۔ ان کیفیات کو الفاظ کی شکل میں تبدیل کر دے۔ مصو ہمیشہ اپنی شخصیت کے رنگوں اور خطوں میں ایک ایسی تخیل متحرک دینے کی قدر چاہتا ہے جو ناظر کے دل میں ہی جلتا پیدا کر دے۔ حکومت مصو خود محسوس کرتا ہے۔ تصویر کو اگر سمجھانے کی کوشش کی جائے تو اسے سمجھنے کی کوشش کھائے تو یہ کوشش بالکل اسی طرح کی ہے جیسے چاند تاروں یا بی بی نوع انسان کو سمجھنے کی کوشش۔ ہم چاند کا نام کن پتھر والی سے لے لیتے ہیں۔ پتھے تک چاند کو ذکر کرتے ہیں۔ مینٹو طرح کچھ بھی اور دوسری طرح پتھا ہوا آدمی بھی جب کوئی تصویر دیکھتا ہے تو جھٹک دیتا ہے کہ یہ تصویر ہے لیکن چاند تاروں اور انسان کی غرض و غایت اور حقیقت کے متعلق آج سے نہیں صدیوں سے بڑے شاعر فلسفہ دان اور سائنسدان تخیل ہیں۔ اسی طرح تصویروں کی ماہریت اور انکے کمال کے متعلق بڑے بڑے اہل الرائے سرنگوں ہیں۔ ایک مثال لیاور دو ڈونچی کی تصویر نو نائیزا ہے جن کو دنیا بھر کے نقادوں نے تنقیدیں لکھی ہیں صرف اس ایک تصویر پر کئی ایک بڑے کتابیں ہو چکی ہیں مگر جب مصنف یا نقاد اپنے احسانات و جذبات کو ختم کرنے پر آتا ہے تو یہ کہ خاموش ہو جاتا ہے کہ اسی کائنات اور تصویر کے اندر بہت سے جذباتوں کے توں محفوظ پائے ہیں جو مصو اور قدرت نے اپنی تخلیق میں مخفی رکھا ہے اور جنہیں کوئی بھی روشنی میں نہیں لاسکتا۔

ہماری موجودہ تہذیب میں مصوری کو داخل ہونے سے قہور ڈا ہی عرصہ گزرا ہے۔ ابھی تک بہتر پڑھے لکھے اور تصویروں کو سمجھنے کا دعویٰ کر نوالے اصفانے بھی بہت کم اور کچھ "تصویر پر دیکھی ہیں۔ قدیم مصو تو خیر پانے ہو چکے ہیں۔ ان میں جان سے اگر یہ پوچھا جائے کہ آپ کے نزدیک جدید مصو کون کون سے ہیں تو وہ جلدی جھانکنے لگیں گے اور ان سے کچھ نہ بن پڑیگا۔

اردو علم و ادب میں تصویروں پر جو تنقیدیں ہیں وہ کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔ تصویروں کو خیر علیحدہ رکھنے جو تنقیدیں اس وقت تک ادبی شاہکاروں پر کی جا چکی ہیں وہ بھی اس قابل نہیں کہ انکے تراجم مغرب کے سامنے پیش کئے جائیں۔ ہمارے ادب میں تنقید کے حصے میں ان الفاظ کے

معادن ہوئی۔ ہم گذشتہ سال کی طرح اس مرتبہ بھی جنابتی کی تین تصویریں شائع کر رہے ہیں 'سوز تمام' 'مراں' اور 'قلندر'۔ پچھلے سال ہم نے علامہ اقبال کا اردو کلام قدیم ایرانی طرز نگارش سے شائع کیا تھا۔ جس میں جمیل ترین تصویر سے بھی زیادہ قد و احترام سے دیکھی گئی تھی اور اسے قدردانانہ اقبال نے بے انتہا سراہا تھا اس مرتبہ پھر ہم علامہ موصوف کے اشعار سے ابتدا کرتے ہیں! انہیں شعروں کے متعلق 'سوز و ساز' کے نام کی تصویر ہے۔ یہ تصویر جنابتی کے موقم کا نتیجہ ہے۔ یہ تصویر مصور کے خیال اور وسعت نظر کو اور اس وقت کو جو اسے رنگوں پر رہے واضح کرتی ہے۔ شائقین کے اصرار پر جنابتی یہ تصویر متعدد بار دہرا چکے ہیں اور اس کی کاپیاں ہندوستان کے مختلف حصوں میں اپنی رونق کے پاس موجود ہیں ایک تصویر ہمارا جبر و ان کے پاس ہے ایک ہمارا ان کی کوچ بہار کے پاس ایک میجر سی ہر وادہ ور کے پاس اور ایک صاحب بٹال پور کے پاس۔ فنی اعتبار سے اس تصویر کی یہ آخری اور بہترین کوشش ہے جو کاروان میں شائع کی جا رہی ہے لیکن مصو اس پر بھی مطمئن نہیں یا شاید نہ ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ غالب کے ایڈیشن میں جنابتی کو وہ فی کمال نظر نہیں آتا جس کے اب وہ اپنے آپ کو اہل سمجھتے ہیں۔ یورپین باہرین فنی کی رائے ہے کہ غالب کا ایڈیشن جنابتی کی مصوری کا بہترین نمونہ ہے لیکن چٹائی خود دنیا سے بہت اگے نکل گیا ہے ہمارا خیال ہے کہ ہر ایک کامل مصو اور شاعر اپنے گذشتہ شاہکاروں اور کارناموں کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ ایک 'جنینس' کی طبیعت بھی اپنے گذشتہ کارناموں پر مطمئن نہیں ہوتی خواہ ان کی تکمیل میں کتنی ہی محنت اور کوشش کیوں نہ کی گئی ہو۔ افسوس ہے کہ چٹائی کے متعلق اس وقت تک جو کچھ مغربی زبانوں میں لکھا جا چکا ہے اسکا عشر عشر بھی ہماری ملکی زبان میں موجود نہیں اور جو موجود ہے اس میں ایک فقرہ بھی ایسا نہیں جس کو مغربی تنقید کے مقابلے میں پیش کیا جاسکے تاکہ وہ لوگ سمجھیں کہ ہم خود اپنے مصو کے متعلق کیا کچھ خیالات رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چٹائی سے اردو دان حضرات کو روشناس کرنے کے لئے مغربی نقادوں کا بہترین منت ہونا پڑتا ہے۔ ایک مغربی نقاد لکھتا ہے:-

"چٹائی ان مصوروں میں سے ہے جسکی تصویریں دیکھ کر روح میں ایک قسم کا ارتعاش پیدا ہوتا ہے وہ خود رومان کی دنیا میں رہتا ہے اور دیکھنے والو کو بھی اس دنیا میں لیجانا چاہتا ہے۔" نوامو حضرت چٹائی کی تصاویر دیکھتے وقت اس لئے کو پیش نظر رکھنا

کریں تو انہیں چٹائی کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

چٹائی کی دوسری تصویر 'مراں' پنجاب کی ایک دیہاتی لڑکی کی تصویر ہے اس تصویر کو دیکھ کر پنجاب کی فضا اور مقامی رنگ اور محسوس لڑکیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ جن لوگوں نے پنجاب کے دیہات دیکھے ہیں یا ان کی رومان بھری کہانیاں سنی ہیں وہ اس تصویر سے پوری پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ تیسری تصویر 'قلندر' ہے۔ مصوری کی دنیا میں خواہ وہ مغربی ہو یا مشرقی چٹائی کی یہ غیر فانی تخلیق ہمیشہ یادگار رہے گی۔ دور احیا کے مغربی مصوروں کو اور جدید مصوروں کو شبیہ سازی میں کمال حاصل ہے مگر یہ تصویر مشرقی مصو کی تخلیقی انداز کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

"جاوہی قاصد" ڈاکٹر ابد راناٹھ ٹیگور اور بنگال اسکول کی مصو کی بہترین نمونہ کہی جاسکتی ہے۔ جدید ہندوستانی مصو کی میں ٹیگور کی شخصیت کسی تعریف و توصیف کی محتاج نہیں۔ اجنٹا راجپوت نعل اور چائلی طرز مصو پر ٹیگور کو بہت قدرت حاصل ہے۔ بیشتر نقادان فن کا خیال ہے کہ ٹیگور پر چائلی مصو کا اثر ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس کے کام میں مثل روایا مصو کے سب سے زیادہ نمایاں ہیں مثال کے طور پر اسکی تصاویر اور نقاب ابو الحسن شاہجہاں۔ قدیم بانسری وغیرہ پیش کیا جاسکتی ہیں ٹیگور فنی اعتبار سے ایک قابل ترین مصو۔ ہندوستانی آرٹ کے اجا کیلئے ٹیگور نے برسوں کوشش کی ہے چنانچہ جس طرح چٹائی مصو کے کچے بنگال اسکول کا بانی ہے اسی طرح ٹیگور بنگال اسکول کا بانی ہے ٹیگور اسکول کی ابتدائی تصاویر ہندوستانی آرٹ کا بہترین نمونہ کہی جاسکتی ہیں۔ لیکن یہ بات قابل افسوس ہے کہ اب قدیم دلیا اور فنی خوبیاں جیٹگو نے برسوں کی محنت کے بعد پیدا کی تھیں آہستہ آہستہ مفقود ہوتی جا رہی ہیں۔

گذشتہ سال ہم نے پنجاب اسکول کے دو مصو یعنی اصغر اور میاں محمد حسین کی تصاویر شائع کی تھیں اس سال ہم پنجاب اسکول کے ایک اور قابل مصو میاں غلامی کی ایک تصویر "راگنی" شائع کر رہے ہیں۔ میاں غلامی اللہ پنجاب اسکول اولین دور کے مصو ہیں جس میں وہ تمام فنی خوبیاں پنجاب اسکول کا طرہ امتیاز ہیں یعنی خطوط کی مینا ہم آہنگی۔ رنگوں کی دلکش امتزاج اور طرز ادایہ سب کچھ اس تصویر میں موجود ہے۔

"شب شیراز" اور "نغمہ" اصغر کے فن کا نمونہ ہیں۔ اصغر کو پنجاب اسکول کے مصو میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کی تصویریں ہندوستان کے دوسرے حصوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی

کے

متاثر ہو کر عجیب و غریب شاہکار پیش کئے تھے۔

”شیشہ مصور“ بہزاد کا کہنا ہے ایرانی مصوروں میں عجیبیت بہزاد کو حاصل ہے۔ وہ بہت کم مصوروں کو نصیب کی چیز کو یاد ہوگا کہ گذشتہ سال ہم نے بہزاد کی دو تصویر شائع کی تھیں۔

ایرانی شہزادیؑ ایرانی معنوی میں بہت اسکول مختلف بادشاہوں کے عہد میں قائم ہوئے۔ بعض اسکول آج تک شہور ہیں۔ ہر ات اسکول ایرانی معنوی میں اس شہرت رکھتے ہیں۔ ایرانی شہزادیؑ اسی ہر ات اسکول کا کارنامہ ہے۔

یورپ میں فن تعمیر میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ غامبی خوبصورتی اور بناوٹ میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی گئی ہے۔ ”جدید عمارت“ انگلستان کے ایک ہنراری مکان کے مالکان نے مصحف کا فوٹو ہے۔

”بیتنا راج“ یوں تو تلخ محل تعمیر کی دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ لیکن اس نے جس جہت کا فوٹو شائع کیا ہے۔ غریب چیز ہے۔ یہ فوٹو خاص طور پر کاروان کے لئے لیا گیا ہے۔

”اندھے فقیر“ اس تصویر کا مضمون کارٹن جرمین مصو ہے۔ یہ تصویر جبر مغربی مصوری میں بالکل نئی چیز ہے۔ اس کا کمال محنت اور کوشش سے محسوس کیا جاسکتا ہے، اندھے فقیر کی تصویر جبر مغربی میں بہت بڑا درجہ رکھتی ہے۔

جدید فوٹو گرافی کے نوئے اساتذہ تعلق تھے جنہوں نے کہا کہ قابیقین اندازہ لگائیں کہ یورپ میں فنی اعتبار سے فوٹو گرافی کہاں تک تصدیق کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ خطاطہ "رائش" اور "سکس" تینوں خوب طلب ہو گئیں۔

گذشتہ سال ہم نے سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کی تصویر خلیفہ استنبول سے حاصل کی تھی۔ اس سال اس تصویر کی ایک اور تصویر سلطان محمد کی شایع کر دی ہے۔ اس تصویر کے لئے جو برٹش موزیم کے مسٹر ہاسل گرے اور عزیز بے مستم بحان خاں نے ثناء و تحفہ استنبول کے

شکر گزار ہیں۔ اسکے ساتھ دو تصویریں اور ادبی سلطان محمد کی شائستگی کی جاری ہیں۔ ایک تصویر بے بیش گیمیری لٹون کی بلکت ہے۔ اور دوسری گزشتہ سال کی تصویر کا چھوٹا ٹکس ہے اسکے ساتھ عثمانی ملٹی کے دو اکرار بھی شائع کئے جا رہے ہیں۔ یہ سب تصویریں جیش ملیتی

والے مضمون سے تعلق رکھتی ہیں۔
 ”میر حسن کی تصویر“ شادی پر ریزہ ریزہ تھی موصوفے نے لکھی ہے اصل کتاب ۱۲ x ۴ انچ
 پر ۶۹ تصاویر سے مزین ہے۔ ۱۹۵۸ء تک اس کا استعمال جو کتاب پر مبنی ہے اس کی رو سے یہ نسخہ معاصر
 ہے۔

چشمیت کہتا ہے۔ یہ نادر و ناکار محطوطیہ میں الدولہ ناظم الملک صاحب کوئی کون سے بھجانا کی رائے
 رہ چکا ہے۔ آج کل آغا خیز حسن پورہ نظام کالج کی ملکیت ہے۔
 تصویر نظیر اکبر آبادی بھی ایک قلمی نسخہ کلمات نظیر سے لی گئی ہے۔ اس نسخہ میں قریب قریب

جانی ہیں۔ اس نوجوان مصور نے پنجاب سکول کے لئے بہت کام کیا ہے۔ ہندوستانی مصوری میں چابی روایات کے ساتھ رنگ آمیزی اور فضائیں دلکشی زیبائش اور شہوت بھرا کرنے کے لئے صغہ کو بدطو لے حاصل ہے۔

سولہویں اور تیسویں صدی میں مغل مصوروں کی شبیہ سازی پر چونکہ بہت حد تک متاثر تھے، اس کا بہترین نمونہ راجہ جونت سنگھ کی تصویر ہے۔ اس شبیہ میں مصور کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ یہ تصویر مسٹر شوگر دیلی کے تصور خانے سے لی گئی ہے۔

کی ایک شاخ ہے بہت سے راجپوت مصوروں نے کوشاں راہا کی تصاویر بنائے ہیں انکا مال دھکا ہے۔ ان مصوروں کو خضما اور جڑ بات کی تصویر کھینچنے میں کمال

حاصل تھا۔ اس اسکول نے بہت سے مصور پیدا کئے تھے۔ ملا رام اور گوہر سہائے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ تصویر ملا رام کی بنائی ہوئی ہے۔

”دربار شاہجہان“ مغل مصوری کے انتہائی عروج کا زمانہ عہد شاہجہانی تھا۔

یہ تصور اس زمیں عہد کی ہے۔ چلتے اسلانت کے بیشتر کارناموں کی طرح یہ نادر و نایاب تصور بھی یورپ (بوڈین لائبریری آفسورڈ) میں ہے۔ مہتمم لائبریری کی اجازت سے شائع کی جا رہی ہے۔

جاپانی مصوروں کو رنگ آمیزی اور فضا میں کیسٹیت پیدا کرنے میں خصوصیت حاصل ہے۔ "سلاون رت" چمکیو ہرن ایک جدید جاپانی مصور کی تصویر ہے۔ یہ بھی رنگ آمیزی اور فضا میں کیسٹیت پیدا کرنے میں مگر جاپانی مصوروں سے کہیں بہتر ہے۔ فیصلہ

ٹوکیو دارالحکومت جاپان کی نمائش سے جناب خجندی کے ایک جاپانی معتمد دوست کی وساطت سے حاصل کی گئی ہے۔

اسی تمام تصاویر اسلامی کو ذہن گری والے مضمون سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ مضمون میرزا یزدانی سے بڑی محنت اور کاوش سے لکھا ہے۔ اردو علم ادب میں بالکل نئی اور اچھی نئی چیز ہے۔ کلاویان کو اس بات پر فخر حاصل ہے کہ وہ اردو علم ادب میں نئے نئے موضوعات پر لکھ رہے ہیں۔

پرمنا میں لکھو اور ادنیٰ شاعری کر کے میں کوٹاں ہے۔ اسلامی طورہ کوئی سے یہ عام ہے۔
 برش کو نیم کی ملکیت ہیں۔ تمام حجاب خانہ کی اجازت سے شائع کئے جا رہے ہیں۔
 ”مجسمہ اسلیم“ یہ اطالوی مہو مائیکل ایلکلیو کی تخلیق ہے۔ مائیکل دورا جیلا کا 10

مصلوب ہے جسے مصلوبی اور سنگتراشی پر کیا اس قدر حاصل کی اس سے مصوری اور سنگتراشی کے بیناں نے نوں چھوڑے ہیں ۔

قدیم صفا پیدا کرنے میں بہت بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔
 دورِ انور میں ایک فوجانہ سنگتِ اش روسی لڑکی ہے۔ جدید سنگتِ اش
 میں اپنا تہائی نہیں رکھتی۔ "ایک چینی کا محبت" اسی کا بنایا ہوا ہے۔ حال میں
 امر نے اپنے تبار کردہ مجسموں کی نمائندہ، انڈیا میں لڑکی ہے۔ جہاں اسے بہت بڑی

یو۔پی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں

از نیاز مندانِ لاہور

جتنی فرہنگیں اور جتنے فرہنگ طرازیں۔ یہ سب کتابیں اور یہ سب جامع مانند پیاز ہیں۔ تو بتو اور لباس در لباس وہم در وہم اور قیاس در قیاس۔ پیاز کے پھلنے جس قدر اتارنے جاو گے۔ پھلکوں کا ڈھیر لگ جائیگا۔ مغز نہ پاؤ گے۔ (غالب)

”کاروان کا یہ دوسرا نمبر دنیا کے سامنے ہے۔ یہ رسالہ پنجاب کے چند نوجوانوں کی محنت کا نتیجہ ہے جنہوں نے پچھلے سال جناب چغتائی اور جناب تاثیر کے زیر قیادت اور اس سال جناب چغتائی اور جناب مجید ملک کے زیر ہدایت اس بات کی کوشش کی ہے۔ کہ حسب استطاعت ان فنون لطیفہ کے ذریعے سے جن کا ظہور سطح قرطاس پر ممکن یا سہل ہے۔ ہندوستان کے موجودہ اہل فن کے مزاج سے تعلیم یافتہ حضرات کو روشناس کرایا جائے۔ اس میں کسی صوبے کی قید نہیں۔ اور فرست مضامین سے ظاہر ہوگا۔ کہ اس مبارک در یوزہ گری کے لئے ہندوستان کے سب صوبوں کے سامنے ہاتھ پھیلا لیا گیا ہے۔ اگر آپ کو اپنے بعض دلپسند نام اس فہرست میں نظر نہ آئیں۔ تو اس کو سائل کے استغنا پر نہیں۔ اس کی نامرادی پر محمول کیجئے۔

ادب و انشائے نمونے پیش کرنے کے لئے زبان اردو کو منتخب کیا گیا ہے۔ نہ اس لئے کہ اور کوئی زبان درخور اعتنا نہیں۔ نہ اس لئے کہ پنجاب میں صرف یہی ایک زبان بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ پنجاب کے نوجوانوں کا وہ طبقہ جسے کاروان سے وابستگی کا فخر حاصل ہے۔ اپنی تعلیم۔ اپنی تہذیب۔ اپنی تربیت اور اپنے جذبات عقیدت و الفت کی وجہ سے اردو ہی کو اپنے لئے بہترین ذریعہ اظہار سمجھتا ہے۔ بمصرین سے پوشیدہ نہیں۔ کہ اس وقت ہندوستان میں اردو کے تین مرکز ہیں۔ یو۔پی۔ حیدرآباد (دکن) اور لاہور۔ لیکن اہل پیش بھی یہ بات گاہے گاہے بھول جاتے ہیں۔ کہ یوپی میں یہ زبان خود رو ہے۔ حیدرآباد میں یہ زبان ایک والی ملک کے سایہ عاطفت میں پل رہی ہے۔ اور صرف پنجاب ہی ایک ایسا علاقہ ہے۔ جہاں اس کی نشو و نما محض خون عشاق کی مرہون منت ہے۔ جس جگہ یہ زبان خود رو ہے وہاں خود بین بھی ہے۔ جہاں اتالیق شاہی سے تعلیم پا رہی ہے۔ وہاں عوام سے کچھ کچھ کے رہتی ہے۔ لیکن پنجاب میں اس زبان کی حالت ایک ہونہار تنومند نوجوان کی ہے جس کا خون گرم ہے اور جس کے اعضا میں لچک ہے۔ جو چھلکے مارتا جاتا ہے۔ اور اس بات کی پروا نہیں کرتا۔ کہ اس کا ہر قدم پگڈنڈی پر پڑتا ہے یا نہیں۔ اسے سمت کا اتنا ہی شعور ہے۔ جتنا کسی اور قدرتی نمونہ کو ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ سوائے گرمی حیات کے اور کسی بیرونی قوت کا احساں نہیں۔ لیکن قوت نامیہ خود وہی رستہ ڈھونڈتی ہے۔ جو بظاہر مستقیم کھلی روشنی اور تازہ ہوا کی طرف جاتا ہے۔

یہ کہنا کہ پنجاب نے یوپی سے کسب فیض نہیں کیا۔ یا یہ کہ پنجاب یوپی کی روایات سے یکقلم مقلد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ کذب اور مبالغہ ہوگا۔ یوپی کے اساتذہ قدیم میں سے کون سا ایسا ہے۔ جسے پنجاب نے ایک بار سو بار ہزار بار نہیں پڑھا۔ وہ کون سا ایسا دیوان ہے

جس کی ورق گردانی نہیں کی۔ وہ کونسا ایسا شاہکا رہے۔ جسے حرز جان بکا کر نہیں رکھا۔ لیکن یوپی کے چشمے خشک ہو چکے۔ پیاس بجھانے کے لئے اب وہاں جانا بیسود ہے۔ اب پنجاب کی رہبری بجز اس کی اپنی قوت نامیہ کے کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ یوپی میں ادب اردو ایک سسکتا ہوا سانپ ہے۔ جو کبھی کبھی ایک نجف سی پھنکارا مارتا ہے۔ اور بس۔ اب یوپی صرف اعتراض کر سکتا ہے۔ رہنمائی نہیں کر سکتا۔ اور نہیں جانتا۔ کہ اس کا چڑچڑاپن۔ اس کا مربیانہ انداز۔ اس کی طفلانہ تنقید یہ سب انحطاط کی نشانیاں ہیں۔ ہم جانتے ہیں۔ کہ یوں ایک خود بین ہستی کو اس کے انحطاط کی خبر سنانا بیرحمی ہے۔ لیکن یہ بیرحمی ایک نشر زن کی بیرحمی ہے۔ اس میں معمول کی دلداری کا خیال کرنا فضول ہے۔

اس انحطاط کے ثبوت میں کوئی سی ایسی تنقید اٹھا کے دیکھ لیجئے۔ جو کسی یوپی کے مرتب کئے ہوئے رسلے میں چھپی ہو۔ اگر وہ تنقید ڈرامے پر ہے۔ تو ڈرامے کے اصولوں سے کچھ بحث نہیں۔ مناظر کی ترتیب سے کچھ واسطہ نہیں۔ سیٹج کی موزونیت سے کچھ تعلق نہیں۔ اگر نظم پر ہے تو شاعر کی نفسیات درخور اعتنا نہیں۔ اس کی جدت زیر غور نہیں۔ اس کی ذہنی کشمکش پر نظر نہیں۔ اگر افسانہ ہے۔ تو توازن کا ذکر نہیں۔ فصاحت کا احساس نہیں مطلب کا شعور نہیں۔ اگر ترجمہ ہے تو فقروں کی ترکیب پر توجہ نہیں۔ اصل سے مقابلے کا حوصلہ نہیں۔ اجتہاد کو پرکھنے کی استعداد نہیں۔ صرف زبان کے اعتراضات پر زور ہے۔ اس محاورے پر اُس لفظ پر۔ اس حرف پر اُس نقطے پر نظریں گڑی ہوئی ہیں۔ نگاہ میں یہ وسعت نہیں اور طبیعت میں یہ بلندی نہیں۔ کہ کسی اور چیز کو جانچ سکیں۔ یا اصل مدعا کے متعلق پھوٹے منہ سے دو لفظ بھی کہنے کی توفیق پیدا کر سکیں۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ کاروان اردو کئی منزلیں طے کر گیا۔ لیکن حضرات یوپی ہنوز "یک" اور "ملک" کے پھیر میں ہیں۔ وہ زبان اردو کو اشوک کا ایک کتبہ سمجھے ہیں۔ جو دہلی یا لکھنؤ میں نصب ہے۔ اور جس کا متبع ان پر بھی ضروری ہے۔ جو جمادات کی منزل سے آگے نکل چکے ہوں۔

گذشتہ سال کے کاروان پر کئی رسائل نے زبان کے اعتراض کئے تھے۔ لیکن ہم لوگ اس قسم کے اعتراضات سننے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم یوپی کے حضرات کو اس مسئلے سے محروم نہیں کرنا چاہتے۔ اس انحطاط کے زلزلے میں اب یوپی کے پاس صرف یہی ایک کھلونا رہ گیا ہے گو چڑچڑے پن کا یہ عالم ہے۔ کہ خود اس سے کھیل نہیں سکتے اور کسی اور کو کھیلنے نہیں دیتے۔ بے ہنر نقادوں کا ہنر اب یہی رہ گیا ہے۔ کہ جہاں بچا کا کوئی مضمون چھپے اس کے ہر چھوٹے سے چھوٹے فقرے کو ہر بڑی سے بڑی فرہنگ کے ساتھ پرکھیں۔ اہل قلم کی ہر قوت کو محض تذکیر و تائید کے معیار سے ناپیں اور اس کے بعد ایک "فہرست اغلاط" مرتب کر کے فن تنقید کی گور پرلات مار دیں مطالب یا فن یا حسن بیان کی طنز و طعنے مارے صرف لکھیوں سے دیکھ لیں۔ اور اگر باوجود اپنی نااہلی کے مرحوب ہوئے بغیر چارہ نہ ہو۔ تو اپنی بیچارگی کو "اچھا ہے" یا "خوب" جیسے بے معنی فقروں سے ڈھانپ کر اپنی کم مانگی کو فہرست اغلاط کی طوالت سے پورا کرنے کی کوشش کریں۔ یا اگر کسی ریلوے بک سٹال سے کسی انگریز لال جھکڑ کی کوئی ارزان کتاب مبادیات انشا کے متعلق دستیاب ہو جائے۔ تو اس کے فرسودہ خیالات کے پھوسڑوں سے اپنی تھوڑی ستر پوشی کر کے یہ سمجھ بیٹھیں کہ اب ہم علم و فن کی تمام آرائشوں سے مزین ہیں۔ اور کیا مشرق اور کیا مغرب دنیا بھر کا ادب ہمارے ہی گوشہ حشم سے کیسیا بننے کو ہماری دہلیز پر پڑا ہوا ہے۔

اگر یوپی کے سب رسالے اسی جہل سے مرکب ہوتے۔ تو اس مضمون کا لکھنا محض بیسود تھا۔ لیکن ان میں سے چند رسالے ایسے بھی ہیں جن کی ہر اشاعت کے ساتھ نہایت خوشگوار توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ اور جنہیں پنجاب کا ہر وہ ادب آشنا جسے اہل نظر کی تلاش رہتی ہے بہت شوق سے پڑھتا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ ایسے رسالوں کے مرتب کرنے والے بھی باوجود اپنے علم اپنے ذوق اور اپنی متانتِ طبع کے

یوپی کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمارا دوسرے سخن اس وقت ان کی طرف ہے۔ اور ان میں سے دور سارے خاص طور پر ایسے ہیں جن سے مخاطب ہونا خود ہمارے لئے فخر کا باعث ہے۔ ہماری مراد ”علی گڑھ میگزین“ اور ”جامعہ“ سے ہے۔

علی گڑھ کا خطہ مردم خیز خطہ ہے۔ اور اس کی زمین کا ہر ذرہ قابل احترام ہے۔ ہندوستان میں جہاں بھی کوئی ایسا شخص ہے جو تنہا جدید کے ساتھ ٹکرائے سے پریشان نہیں ہوتا۔ لیکن پھر بھی اردو زبان کو اپنے لئے روح پرور تصور کرتا ہے۔ وہ علی گڑھ کے نام کو سہم غم اور علی گڑھ کے مطبوعات کو ترقی کا پرچم سمجھتا ہے۔ لیکن علی گڑھ میگزین بھی جب کا روانہ پر تنقید لکھنے بیٹھا تو اس نے اس تنقید کا تقریباً نصف حصہ ”زبان کی لغزشوں“ کی نذر کر دیا۔ اسانوں پر پانچ سطروں کا ایک پیرا گراف لکھا۔ اور وہ بھی ایسا جس میں علم کم اور منانیت پوش بچپن زیادہ پایا جاتا ہے۔ تضاد کے متعلق صرف اتنا لکھ دیا۔ کہ ”سب کی سب دلکش اور دلاویز ہیں“۔ یہ الفاظ نہایت محفوظ ہیں لیکن نہایت کہ ان کے شگافوں میں سے تنقید نگار کا کورا پن نظر نہ آئے۔ البتہ یہ بڑے وثوق سے کہہ دیا۔ کہ ”معراج“ مٹوٹ ہے مگر نہیں۔ اس کا جواب دراصل تو یہ ہے۔ کہ بہت اچھا صاحب معراج مٹوٹ ہی سہی۔ لیکن اس کی وجہ سے آپ کو صرف اتنی ہی زحمت اٹھانی پڑیگی۔ کہ جہاں ”معراج“ تھا۔ وہاں منسل سے ”تھا“ کی بجائے ”تھی“ کہ لیجئے۔ قصہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مضمون کو پڑھئے۔ اگر لطف آئے تو کئے اچھا ہے ورنہ اس پر خاک ڈالئے رفعتیہ انداز اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بقول آپ کے ہم ”اس قسم کے اعتراضات سے آزرہ ہوتے ہیں“۔ ہمیں آزرہ کرنے سے کیا حاصل۔ اس غلطی کو اگر آپ نظر انداز کر دیتے۔ تو نہ صرف آپ کی تنقید کا معیار ہی بلند رہتا۔ بلکہ ہماری ذلی عقیدت بھی متزلزل نہ ہونے پاتی۔ نسخ نے کیا خوب کہا ہے :-

کسی دل تک رسائی ہو سکے تو عرش ہے یہ بھی
عزیز و گرنہیں معراج ممکن عرش اعظم کا

شعر معمولی ہے لیکن جذبہ نہایت صحیح ہے۔ اور عجیب نہیں کہ آپ اس سے متاثر ہوں۔
محولہ بالا تنقید خود ایڈیٹر صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ تازہ ترین اشاعت میں انہوں نے ”آغاز داستان“ کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے۔ اس کے تقریباً ہر صفحے پر اس سے بدتر لغزشیں موجود ہیں۔ فرماتے ہیں :-

”سالنامہ کی خصوصیات اس کی دلچسپیاں و دلفریبیاں ہم سے نہ کہلو ایئے“ (عطف کا یہ غلط استعمال خاص علی گڑھ میگزین کا حصہ ہے۔ اور خصوصیات کہلوانا“ تو ایسا محاورہ ہے کہ کیا کہنے۔)

”چھوٹے ہوؤں سے ملنا“ (پنجاب اس مطلب کو یوں ادا کرتا۔ تو آپ ہی مربیانہ تبسم سے فرماتے۔ کہ یہاں ”بچھڑے ہوؤں“ چاہیئے)
”سب سے زیادہ موجب مسرت خبر کابل یونیورسٹی کا قیام ہے۔“ (جناب اہل زبان صاحب۔ کابل یونیورسٹی ابھی قائم نہیں ہوئی۔ جب قائم ہو جائیگی۔ تو جو آپ کا دل چاہے لکھ لیجیگا۔ فہ الحال تو جس خبر سے آپ کو مسرت ہوئی ہے۔ وہ قیام کی تجویز ہے)
”پہلے سے جو مضامین کی آخری تاریخ مقرر کی جاتی ہے۔۔۔۔“ (مضمون کی تاریخ نہیں ہوتی۔ مضمون بھیجنے یا پہنچنے کی تاریخ ہوتی ہے)

”تمام ضروری خبریں اور اہم اجتماعوں کے متعلق پچھلے نمبروں میں لکھا جا چکا ہے“ (اس ایک فقرے میں صرف و نحو اور بیان کی اتنی غلطیاں ہیں۔ کہ ان میں سے دو ایک تو خود ہی آپ کو سو بھنی چاہئیں)

معلوم ہوتا ہے۔ آپ ہماری اصلاح میں اس قدر وقت ضائع کر دیتے ہیں۔ کہ خود کچھ سیکھنے سکھانے کی فرصت ہی نہیں ملتی لیکن پنجاب کا ایک رسالہ بھی ایسا نہیں۔ جو آپ پر نکتہ چینی کرنے کو اپنے لئے باعث فخر و ناز سمجھے۔ ہم مہینے کے مہینے خود یوپی کے رسالوں میں سے زبان۔ صرف و نحو اور انشا کی غلطیوں کی ایک طویل فہرست اہل بصیرت کی عبرت کے لئے مرتب کر سکتے ہیں۔ لیکن اب تک ہم نے یہ پیشہ اختیار نہیں کیا۔ اور سچ پوچھئے تو ہمیں اس کی فرصت بھی نہیں۔ یہ مسئلہ آپ ہی کو مبارک ہو۔ ہم آپ کی خوبیوں پر نظر رکھتے ہیں۔ کیونکہ ہم نوشت و خواند کو وجہ مسرت اور ذریعہ اتحاد سمجھتے ہیں۔ آپ ہمارے نقائص کر دیتے رہتے ہیں۔ آپ نے زبان کو اپنے لئے مردقسمہ بنا لیا ہے۔ جو نحیف ہے۔ مگر جس نے آپ کا ٹینٹو ادا بار رکھا ہے۔

”جامعہ“ کی حالت اس سے بھی زیادہ قابل افسوس ہے۔ کیونکہ ”جامعہ“ کے حلقے میں بعض ایسی شاندار مہینیاں بھی شامل ہیں جن کی توجہ کو جذب کرنا بھی باعث سعادت ہے۔ ان کا جوش عمل اور ان کا تحریر علمی ہم بیچ میرزوں کی تعریف و توصیف سے بالاتر ہے۔ پھر کیا یہ حیرت کا مقام نہیں۔ کہ یہ زبان کا جنون ان کی سلامت طبع کو بھی ملوث کر رہا ہے۔ اور وہ بھی تنقیص کے نشے سے بخود ہو کر تفکر و تعقن سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اس زبان درازی کا حوصلہ ہمیں صرف اس لئے ہوا۔ کہ ”جامعہ“ نے فہرست اغلاط میں ”منزل گاہ“ جیسے لفظ کو بھی شامل کر لیا۔ اور کہ دیا۔ کہ ”یہ ترکیب صحیح نہیں۔ غالباً قافیہ کی مجبوری تھی۔“ یہی وہ ادعا اور تیقن ہے۔ جس کی ایک موٹی ٹیسی تہ یوپی کے اکثر دماغوں پر چھی ہوئی ہے۔ اے کاش کہ فاضل تنقید نگار صاحب اپنے لمحے میں تھوڑا سا منکسر اندر مگر مخلصانہ تامل پیدا کر لیتے۔ اے کاش اب بھی کبھی کبھار وہ اپنا انداز طالب علمانہ بنا لیا کریں۔ اور خشوع و خضوع کے ساتھ یہ شعر گایا کریں۔

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست

ایں قدر ہست کہ بانگ جر سے مے آید

لیکن اسے پڑھ کر بھی وہ شاید یہی کہیں گے۔ کہ ”ترکیب صحیح نہیں۔ غالباً قافیہ کی مجبوری تھی۔“

”جامعہ“ کے جس نمبر میں کاروان پر تنقید چھپی ہے۔ اسی نمبر میں زبان کی کئی دلچسپ غلطیاں موجود ہیں جنہیں ہم یہاں نقل کرنا سوئے ادب سمجھتے ہیں۔ لیکن ارباب ”جامعہ“ کا اشارہ پاتے ہی ہم ان کی خدمت میں پیش کرنے کو تیار ہیں۔

”جامعہ“ کی تنقید کا انداز ضرورت سے زیادہ پیغمبرانہ ہے۔ اور ”عمل پییم“ اور ”قومی سیرت“ اور ”اصلاح مد نظر ہے“ اور ”ہمیں خوشی ہے“ اور ”ہمیں امید ہے“ اور اسی قسم کی آیات سے خالق ”الْبُشُورَةِ مِنْ مِّثْلِهَا“ پر عمل کرنے کی کوشش بہت نمایاں ہے لیکن چونکہ یہ انداز جامعہ کا مستقل انداز ہے اور اس کے اغراض و مقاصد میں شامل ہے۔ اس لئے ہمیں اس پر اعتراض کرنے کا حق غالباً حاصل نہیں۔ تاہم اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ نقد و نظر کے اعتبار سے اس تنقید کا وزن مخصوص ”بہت کم ہے اور پڑھنے والے کو اس سے حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ بجز اس احساس کے کہ تنقید نگار اپنے سینے میں دل درمندر رکھتے ہیں۔ اور یہ احساس لایب و دونوں جہان میں امت مرحومہ کے لئے بھلائی کا موجب ہو گا۔

”پنجابی محاورے“ خاص طور پر قابل بحث ہیں۔ علی گڑھ میگزین ”اور جامعہ“ دونوں نے ان کا ذکر کیا ہے۔ اور کنایتہ بالکل بجا فرمایا ہے کہ یہ محاورے ٹھٹھ پنجاب کی پیداوار ہیں۔ یہاں تک تو ہمیں ان سے پورا اتفاق ہے۔ مثلاً پنجاب کے لوگ ”مجھے جانا ہے“ کی بجائے ”میں نے جانا ہے“ اور ”میری سمجھ میں نہ آتا تھا“ کی بجائے ”مجھے سمجھ نہ آتا تھا“ بولتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں مقتدر رسالے اس بات

کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کہ جب پنجاب نے اردو کو اپنا لیا ہے۔ تو اس قسم کے تصرفات لائق ہیں۔ اور جوں جوں پنجاب میں اردو ترقی کرے گی۔ ایسے تصرفات کی تعداد بھائے کم ہونے کے اور بڑھیں گی۔ اس کے ثبوت اور جواز دونوں کے لئے کسی زبان کی تاریخ ارتقا کا مطالعہ کیجئے۔ اس کے بعد اگر آپ ذرا بلند نظری سے کام لیں۔ تو آپ پر روشن ہو جائیگا۔ کہ اگر اردو کو پنجاب میں نشوونما نصیب ہونی ہے۔ تو ان تصرفات کے بغیر چارہ نہیں۔ بلکہ انہی کی بدولت پنجاب میں اردو کی جڑیں مضبوط ہوں گی۔ اور وہ ایک اکتسابی زبان کے درجے سے ایک فطری زبان کے لئے تک جا پہنچے گی۔ وہ وقت آن پہنچا ہے۔ جبکہ آپ اردو لغت کی کتابوں میں لکھنؤ۔ اور دہلی کے محاوروں کے پہلو بہ پہلو پنجاب کے محاورے بھی شامل کر لیں۔ چہ جائیکہ آپ ان کو اغلاط قرار دیں۔ پنجاب کے تعلیمیافتہ نوجوانوں کی تو اب یہ حالت ہو چکی ہے۔ کہ جہاں کوئی محاورہ باز ”مجھے جانا ہے“ کہتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگ اُسے ملامت کرتے ہیں۔ کہ یہ کیا چٹر پٹائیوں کی زبان بول رہے ہو۔ اپنا پنجابی ڈھکوں کی طرح بانٹیں کرو۔ ریختی مت بولو! کاروان کی اس اشاعت میں جناب تاثیر کی نظم کا پہلا مصرعہ ہے

تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لئے

ان سے کہا گیا۔ کہ ”تو نے... کرنی ہے“ کی بجائے ”تجھ کو الفت مجھ سے کرنی ہے“ رکھ دیجئے۔ انہوں نے فرمایا۔ ہرگز نہیں۔ ”تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے“ میں ترغیم زیادہ ہے۔ میں مصدر کے ساتھ ”نے“ استعمال کرتا بھی ہوں اور نہیں بھی کرتا۔ مصرعے یا جملے کے ترغیم کے مطابق۔ جہاں پنجابی محاورہ مجھے مفید مطلب نظر آتا ہے۔ وہاں میں بحیثیت پنجابی اردو خوان کے لئے استعمال کرنا اپنا حق سمجھتا ہوں۔ یوپی کے حضرات اس حق سے محروم ہیں۔ وہ مجبور ہوں تو ہوں میں مجبور نہیں۔“

”علی گڑھ میگزین“ اور ”جامعہ“ دونوں بہترین ہندوستانی تہذیب کے علمبردار اور آئینہ دار ہیں جس فضا میں یہ رسلے تربیت پاتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی بہترین علمی فضا ہے۔ اور ان کے مدیر و معاون حضرات اہل پنجاب کے نزدیک بوجہ محبوب و مقتدر ہیں۔ ہم میں سے اکثر ایسے ہیں جن کو ان حضرات سے ذاتی تعارف کا فخر حاصل ہے۔ اور خدا گواہ ہے۔ کہ ان کا حسن اخلاق اور ان کی بالغ نظری ہمارے نزدیک مسلم اور ان کی صحبت کی یاد (ہر چند کہ وہ صحبت بہت مختصر تھی) بالیدگی روح کا موجب ہے۔ لیکن جہاں ہماری عقیدت کا یہ عالم ہے۔ وہاں توقعات بھی کچھ کم نہیں۔ ہم یہ توقع رکھتے ہیں۔ کہ یہ دور سالے ہندوستان بھر میں تنقید کی رہنمائی کریں گے۔ ادب و انشا کے معاملے میں ایسے معیار قائم کریں گے۔ جو کم از کم نصف صدی تک اہل قلم کے لئے مشعل ہدایت کا کام دیں۔ صوبی جاتی اور بلدیاتی حدود سے باہر قدم رکھ کر کل ہندوستان میں اردو کے مستقبل پر غور کریں گے اور اپنے رویے سے ایسے ایسے اصولوں کی نگہبانی کریں گے جن کی تائید ہمیشہ فرہنگ آصفیہ سے نہ ہو سکیگی۔ بلکہ جن کی بدولت خود فرہنگ آصفیہ رفتہ رفتہ بیکار ہو کر رہ جائیگی۔ تاکہ دنیا پر یہ ثابت ہو جائے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے جو بڑھ چکی اور پھیل رہی ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں پنجاب اس زبان کو اپنے خون سے سینچنے کے لئے تیار ہے۔ اس لئے ظلم ہے اگر اس سے بار بار یہی کہا جائے۔ کہ تمہارا خون رذیل ہے۔ اور اس کے مقابلے میں بار بار ان مردہ ہڈیوں کو سراہا جائے جو مدت ہوئی بے مغز ہو چکیں۔ ہم آپ سے رہنمائی کی توقع رکھتے ہیں۔ رہنمائی کو آپ کی شان کے شایاں نہیں سمجھتے۔ ہم یہ توقع رکھتے ہیں۔ کہ آپ ہم نیاز مندوں کو شرف باریابی بخش کر ہماری عقیدت اور اپنی دریاواری سے بزم اردو کی زمینت کو بڑھائیں گے۔ نہ یہ کہ قلعہ معلے کے کھنڈروں پر نت نئے تالے ڈالتے چلے جائیں گے۔

”نیازمندان لاہور“

آخر شب دید کے قابل تھی سبل کی تڑپ

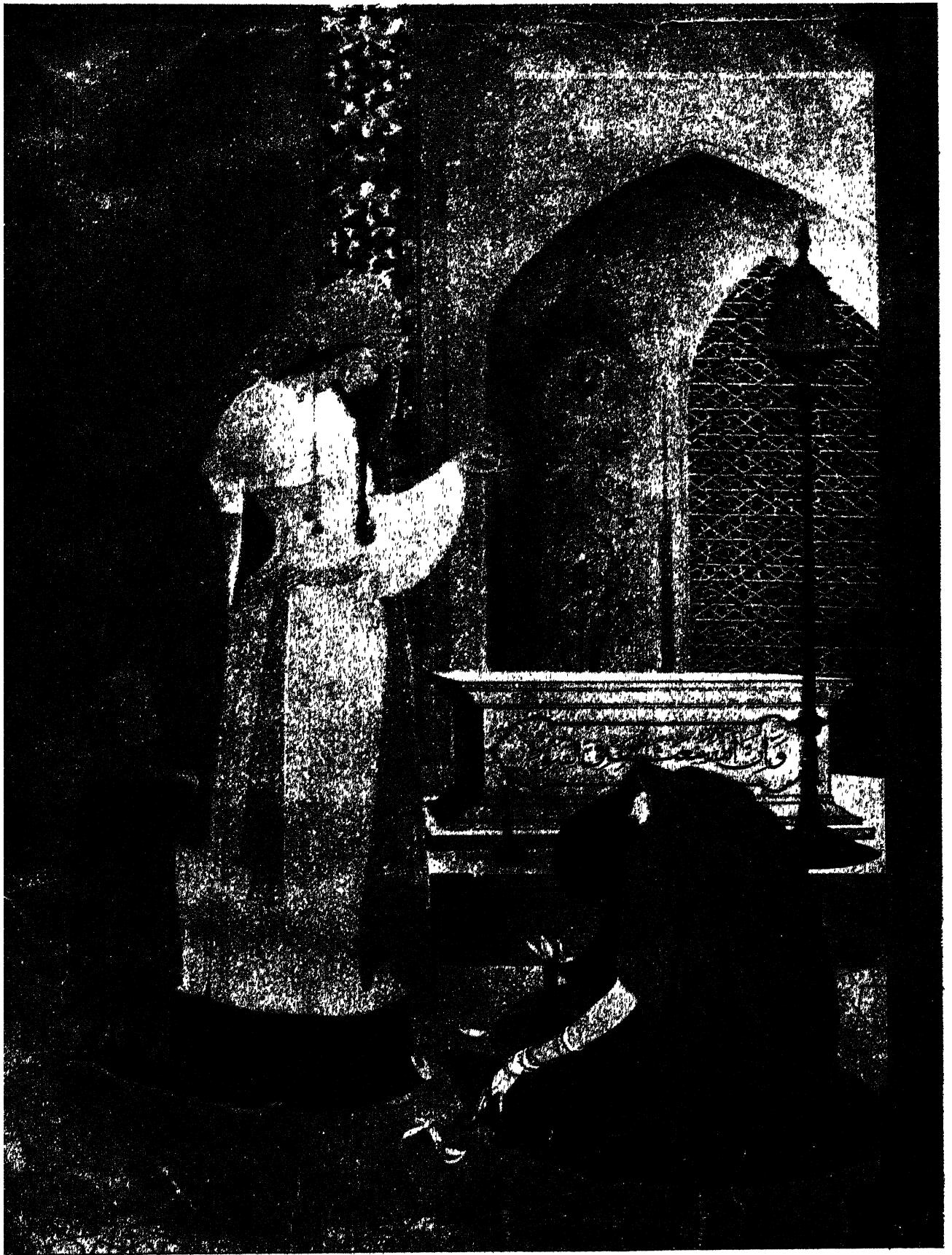
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصود ہر رُپوانہ تھا

اب کوئی سودائی سوزِ تمام آیا تو کیا

اقبال





میرزا ویردی

اسلامی کونہ گری

نام ان کے مختلف حالات اور مختلف استعمالات کے مطابق ملینگے اور یہ بات مسلمانوں کی اعلیٰ ثقافت پر دال ہے۔ مثلاً لفظ کاس اس وقت استعمال ہوتا ہے جب پیالہ پینے کی شے یا شراب سے پر ہو ورنہ زجاجہ ہے۔ اسی طرح جب خوان میں کھانا ہو تو 'ماندہ' ہے ورنہ خوان ہے اور کوز (لوٹا) اس وقت ہے جب اس کے ساتھ ٹونٹی (عروہ) ہو ورنہ کوٹ ہے۔ دیگر زبانوں میں یہ جامعیت نہیں ہے۔

اسلام نے اول اول مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں پرورش پائی جان مسلمانوں کا ابتدائی زمانہ خلفائے راشدین کی حکومت میں گذرا۔ اس وقت اسلام کو صرف اتنی ہی ضرورت تھی کہ اسلام من حیث المذہب اپنی ہستی قائم رکھ سکے۔ لیکن جب خلفائے بنو امیہ و عباسیہ نے عراق و عجم کے مختلف شہروں کو اسلامی "حضارت" سے آراستہ و پیراستہ کیا تو آہستہ آہستہ ترقی تمدن کی وجہ سے ساز و سامان زندگی کے تنوع میں بھی اضافہ ہو گیا اور یہ امر قدرتاں جدید اختراع و ایجاد کا باعث ہوا۔ جہاں جہاں مسلمان آباد ہوئے انہوں نے خالص اسلامی "حضارت" کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ یہ درست ہے کہ ابتدا میں مسلمان مقامی غیر اسلامی طرز فن سے بیش و کم متاثر ہوئے تھے مگر انجام کار انہوں نے ہمیشہ اپنا مخصوص انداز فن

دیگر فنون اسلامیہ کی طرح اسلامی کوزہ گری کے متعلق بھی ہماری تاریخ خاموش ہے۔ حالانکہ ظروف کی ظاہری شکل و شبہت ان کے مختلف اسما اور ان کے مختلف استعمالات سے کسی ملک کے تمدن ہی کا پتہ نہیں ملتا۔ بلکہ ان کے باشندوں کی روزانہ زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ فن کوزہ گری کا تعلق "مٹی" یا "گل" یا "خاک" سے ہے اور حقیقت یہ ہے کہ "مٹی" سے دیگر آثارِ عتیقہ کے اکتشاف میں بھی بہت مدد ملتی ہے۔ بہت سی قویں صفحہ ہستی سے مٹ چکی ہیں اور ان کے مقبوضات کے نشان تک بھی مٹ چکے ہیں لیکن ماہرینِ ارضیات نے اپنی دریافتوں سے وقتاً فوقتاً جو اطلاعات ہم پہنچائی ہیں ان سے ان ممالک کی صحیح تاریخ کے بارے میں وہ مدد ملی ہے۔ جو تیز کتب سے باہر تھی۔ اور جس کی بدولت ان اقوام کے فنون پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ عراق و عجم اور دیگر اسلامی ممالک سے ایسے آثار برآمد ہوئے ہیں جن سے ہمارے علم میں بہت اضافہ ہوا ہے اور بعض تو اس قدر اہم ہیں کہ ان سے اسلامی ثقافت (کلچر) جہاں ہوتی ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ تہذیب یافتہ اقوام کا کوئی گھر ظروف اور دیگر سامان سے مستغنی نہیں ہوتا۔ ہر قوم کے ہاں ظروف کے اسما بھی ہوتے ہیں۔ مگر اس بارے میں وہ جامعیت کسی زبان کو حاصل نہیں ہے جو عربی و فارسی کو حاصل ہے۔ ان زبانوں میں برتنوں کے کئی

اختیار کیا۔

سامرہ

سامرہ عراق میں بغداد اور تکریت کے مابین فرات کے اوپر کوئی ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ خلیفہ معتصم نے ۸۳۸ء میں سامرہ کو اپنا پایہ تخت قرار دیا۔ اور یہاں محلات۔ حمام مساجد وغیرہ تعمیر کیں جن کی خوبصورتی اور شان و شوکت کو مد نظر رکھ کر خلیفہ معتصم نے اس کے قدیم نام سامرہ کو ”سمر من رای“ میں تبدیل کر دیا یعنی ”جس نے دیکھا خوش ہوا“۔ یہ مقام آخر کار مسلمانوں کی ثقافت کا بہت بڑا مرکز بنا۔ ان محلات و آثار کے کھنڈراب تک ملتے ہیں افسوس ہے کہ یہ شان و شوکت بہت تھوڑا عرصہ قائم رہی کیونکہ خلفائے عباسیہ پھر بغداد میں واپس آگئے سامرہ سے حال ہی میں بہت سے قدیم ظروف برآمد ہوئے ہیں جو فنی اعتبار سے بھی سامرہ کے ساتھ مختص ہیں۔ سامرہ کے قرب میں ان برتنوں کے پکانے کی قدیم بھٹیاں بھی ملی ہیں۔ ان برتنوں کو غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شکل و شباہت پردھات کے برتنوں کا اثر ہے۔ برٹش میوزیم میں ان کے بہت سے نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان نمونوں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مختلف اقسام کے ظروف پر مختلف مصروفوں کے لئے مختلف اقسام کے خاص خاص چمکدار رنگ کئے جاتے تھے۔ لیکن یہاں کے ظروف میں شگرف کا رنگ جو نعل کی جھلک مارتا ہے عام ہے۔ سنہری۔ بھورا اور ہلکا سبز رنگ بھی نظر آتا ہے۔ بعض اوقات محض ایک ہی رنگ میں تمام برتن مکمل نظر آتا ہے اور بعض اوقات ظروف پر کتبات کو فنی رسم الخط میں ملتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ سامرہ کے ظروف پر چینی اثر ہے جو غالباً ان چینی تاجروں کے باعث ہوا جو عراق و عجم میں قدیم زمانہ سے مقیم تھے (یا قوت جموی نے بغداد کے ذکر

قدیم کوزہ گری کے متعلق عرض ہے کہ یہ زیادہ تر پارہتی اور ساسانی روایات کوزہ گری کا تسلسل تھی مصقول بھی اور غیر مصقول بھی۔ ساسانی فن کے نایاب نمونے امریکہ و یورپ کے عجائب خانوں میں موجود ہیں جو طہران سے دستیاب ہوئے تھے۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ تیسری صدی عیسوی سے متعلق ہیں۔ مصقول ظروف قدیم زمانے میں بھی مصر و عراق میں ملتے تھے کیونکہ جستی آمیرش کے چمکدار رنگ ان ہی ملکوں میں بنائے جاتے تھے۔ رنگوں میں سبز اور نیلا رنگ بہت استعمال ہوتے تھے۔ اور یہ رنگ خصوصیت سے مشرق قریب سے تعلق رکھتے ہیں۔ مسٹر بلر کا خیال ہے کہ مصقول برتنوں کی صنعت کی ابتدا روم و مصر نے کی۔ مگر ڈاکٹر سائے (جرمنی) کا نظریہ ہے کہ عراق نے کی۔ ڈاکٹر سارے کا نظریہ زیادہ قابل قبول معلوم ہوتا ہے۔ بعض ظروف پر سنہری رنگ و روغن معہ بیل بوٹوں کے نظر آتا ہے اور بعض تو کامل طور پر سونے کے ملمع سے منقوش ہوتے ہیں۔ یہ ملمع قدرے بعد کی ایجاد ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ سنہری صقل القلی۔ جست۔ فولاد اور سرمہ کی ملاوٹ سے تیار کیا جاتا تھا۔ عام طور پر سنہری زمین پر سبزی یا نیلے رنگ کے بیل بوٹے چڑھائے جاتے تھے۔ ان ظروف کے لئے جو مٹی استعمال کی جاتی تھی بہت باریک اور زردی بالکل سرخ رنگ کی ہوتی تھی۔ ان ظروف کے نمونے فسطاط (مصر) ایران اور سامرہ میں بھی ملتے ہیں۔

ان ابتدائی امور کو مد نظر رکھ کر ممالک اسلامیہ میں فن کوزہ گری کے ارتقا کی تاریخی حیثیت بیان کرنا ہمارا مقصود ہے

میں چینی تاجروں کی آمد اور موجودگی کا ذکر کیا ہے) بایں ہمہ سامرہ کے ظروف میں امتیازی اسلامی شان تھی۔ اور ان ظروف کی وجہ سے سامرہ بہت مشہور ہوا۔ افسوس ہے کہ آخر سامرہ کی شان و شوکت مرور ایام سے جاتی رہی اور لوگوں نے اس کو بجائے ”سُحْرَمَنْ رَاى“ کے ”سَاعَ مَنْ رَاى“ کہنا شروع کیا یعنی جس نے دیکھا غلگین ہوا ۛ

برہناباد

یہ وہی برہناباد ہے جسے بعض نے بہمناباد لکھا ہے۔ سندھ کے شمال میں پچاس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اسی مقام کا نام بعد میں مسلمانوں کی آمد سے منصورہ ہوا اور اب اسی مقام کو یا اس کے قریب کسی مقام کو بھکتر کہتے ہیں۔ سندھ سے لے کر گجرات تک کا علاقہ قریباً ہمیشہ ایرانیوں اور عربوں سے آباد رہا کیونکہ یہ وہ مقام ہے جہاں یہ لوگ بری اور بحری دونوں راستوں سے ہندوستان میں آئے۔ سندھ کا علاقہ خصوصیت سے ایرانیوں کی منزل گاہ بنا۔ چنانچہ بہمن بن اردشیر کے نام پر یہ بہمناباد بھی کہلایا۔ خلیج فارس کے راستے سے اور وسط ایشیا کے راستے سے عراقی و عجمی تمدن سے بھی متاثر ہوا۔ مہنجر ڈارو (سندھی۔ میرمقا) اٹک وادی میں جو انکشافات ہوئے ہیں وہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ یہ مقام صدیوں سے آباد تھا۔ اور بری اور بحری راستوں سے دوسرے ممالک کے تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ میرا خیال ہے کہ بہمناباد اور مہنجر ڈارو دراصل ایک ہی مقام ہے۔ ایرانیوں اور عربوں نے اسے آباد کیا۔ لیکن سندھ میں ایک بہت ہیست ناک زلزلہ آیا۔ اور یہ مقام ویران ہو گیا۔ صدیوں ویران رہنے کی وجہ سے تہذیب کے آثار بالکل محو ہو گئے۔ اور کھنڈر ریت اور مٹی میں دب گئے اب یہاں سے بیشمار ظروف برآمد ہوئے ہیں جن کے متعلق یہ آ

ہے کہ زیادہ تر سامرہ اور فسطاط کی طرز کے ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم ہی سے سندھ پر عراقی ثقافت کا اثر تھا۔ بعض ظروف سخن۔ بعض بھورے۔ بعض سیاہی مائل ہیں۔ ان برتنوں میں بعض ایسے برتن بھی برآمد ہوئے ہیں جو آجکل کے مصری اور عراقی برتنوں سے مشابہت رکھتے ہیں مثلاً بعض کوزوں میں پانی وغیرہ انڈیلنے کے لئے ٹونٹی کا ہونا اسلامی اثر کا نتیجہ ہے آج بھی تمام اسلامی دنیا میں ٹونٹی والے لوٹے کا رواج ہے۔ ہندو لوگ اس کے استعمال سے گریز کرتے ہیں (غالباً اس وجہ سے کہ) ان کو کبھی ٹونٹی دار لوٹے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ یورپ کے عجائب خانوں میں ایسے بیشمار برتن موجود ہیں۔ بعض پر کوئی یادگیر رسم الخط میں کتبات بھی ملتے ہیں۔ فنی اعتبار سے دیکھیں تو ہم ان برتنوں میں چینی اثر بھی دیکھتے ہیں جو غالباً کمر قد کے راستے سے یہاں پہنچا ہوگا ۛ

اگرچہ اس ضمن میں برہناباد کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔ تاہم یہ یقینی بات ہے کہ ابتدائے اسلام میں یہ شہر آباد تھا۔ اس کا ذکر فتوح البلدان میں بھی ملتا ہے۔ سنہ ۲۷ھ میں منصورہ (بہمناباد) کا بادشاہ عبداللہ تھا جس کے زمانے میں ایک عراقی نے کشمیر کے راجہ مہروگ بن رائق کے حکم سے قرآن کریم کا ترجمہ ہندی زبان میں کیا تھا (عجائب الہند بزرگ بن شہر یار ص ۳۰۰ پر) اس مقام سے اسلامی ثقافت کے اثرات ہند کے دیگر مقامات پر بھی پہنچے یعنی گجرات کا کھٹیا واڑ۔ سورت اور دکن تک گئے ۛ

مصر

مصر کے جنوب میں فسطاط واقع ہے جسے عمرو بن العاصؓ نے مصر کی فتح کے بعد آباد کیا جو دراصل قدیم مصر کا سب سے زیادہ آباد شہر تھا اور یہیں سے ابتدا میں حضارت اسلامی کو فروغ

بہت بڑا کوزہ ہے جس پر صاف لکھا ہے ”عل یوسف دمشق“ اسی طرح ایک اور ظرف پر جو دکتور یا موزیم میں ہے لکھا ہے ”موید المنصور سلطان مصر“ دمشق کی ایک شمع پر لکھا ہے ”مصور مصطفیٰ حمادی الاولیٰ ۹۵۶ھ۔ ان پر بیشتر نیلے رنگ کا روغن ہے۔ یہ چیزیں کافی تعداد میں رتہ۔ دمشق۔ بعلبک وغیرہ سے برآمد ہوئی ہیں۔ بعض برتنوں پر صاف ”الشامی“ ”یمنی“ ”ہرمزی“ ”انورزی“ ”غزل“ ”سوز“ وغیرہ الفاظ لکھے ملتے ہیں۔ جن کی مختصر تعبیر یہ ہو سکتی ہے کہ یا تو یہ بنانے والوں کے نام ہیں یا یہ ظرف ان شہروں کی طرف منسوب ہیں جہاں یہ کام ہوتا ہے۔ شام، بعلبک، حمزہ شلم، دمشق، رصافہ وغیرہ میں جو کثافتات ہوئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان شہروں میں فن کوزہ گری نے ایک خاص طرز اختیار کر لی تھی جس طرز نے ترک کوزہ گری پر بہت اثر کیا +

ری

ری وہ مقام ہے جسے امام المفسرین فخر الدین رازی کا شہر ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اس کے قدیم کھنڈر طران کے قریب ملتے ہیں۔ یہ شہر اسلام کی ابتدائی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا تھا اسلامی ثقافت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ لیکن افسوس کہ ۱۲۲۰ء کی تاتاری یورش نے ویران کر دیا۔ یہ شہر آج تک محقق مستشرقین کی آماجگاہ ہے۔ یہ لوگ یہاں سے مفید مطلب معلومات حاصل کر کے تاریخچی الجھنوں کو سلجھاتے ہیں +

ری کے ظروف کی ساخت سامرہ، سوس وغیرہ کے ظروف کی ساخت سے ملتی ہے لیکن وسط ایشیائی اور فغوری برتنوں کا اثر بھی ان سے عیاں ہے۔ یہاں کے ظروف دیگر ممالک سے مختلف شکل کے ہیں۔ عام طور پر زیادہ کشادہ ہیں۔ طشتوں

ہوئے۔ ۱۶۱۵ء میں یہاں آگ لگی جس سے قریب قریب تمام شہر تباہ ہو گیا اور از سر نو تعمیر کیا گیا۔ لیکن سلاطین مملوک نے پھر ۱۶۲۲ء میں تاخت و تاراج کیا۔ اس کے باقیات کو قاہرہ کھنا چاہئے۔ یہاں بہت سے پہاڑ اور ٹیلے ہیں جن میں سے ایسے آثار برآمد ہوئے ہیں جو بہت دلچسپ اطلاعات کے مخزن ہیں ایک برتن پر نصر الشہاب الدین احمد سلطان مملوک ۱۳۲۲ء کا نام ملتا ہے جو برٹش میوزیم میں ہے۔

قبطی لوگ مصر کے قدیم باشندوں کی حیثیت سے ظہور اسلام کے وقت بھی ماہرین فن کوزہ گری تھے۔ افسوس ہے کہ اس وقت کے کوئی اعلیٰ نمونہ نہیں ملتے۔ بہر حال مسلمانوں کے زمانے میں اس فن کو چار چاند لگ گئے جس کا ثبوت اس وقت کے نمونوں سے ملتا ہے۔ مصر میں اس فن کی ترقی عراق و عجم کے کاریگروں کی مرہون منت تھی۔ اگرچہ طرز کے اعتبار سے یہاں کے برتن زیادہ تر سامرہ کے برتنوں سے مشابہ ہیں خلفائے فاطمین کے زمانے کے مشہور سیاح ناصر خسرو علوی نے بھی ایسے ظروف کی مثالیں پیش کی ہیں۔ علی بے ہجرت نے مصر کے عجائبات کے خزائن سے متعلق ایک گائیڈ کے طور پر کتاب لکھی ہے جس میں کم و بیش ہر دور کے ظروف کو بیان کیا ہے۔ اور فاطمین کے دور کے ظروف کو بالخصوص بیان کیا ہے +

برٹش میوزیم لندن میں ایک طباق ہے جس پر بننے والے کا نام تک لکھا ہے اور جس پر نیلے، سبز اور زرد چمک دار رنگوں سے پیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ مصر کے دیگر مقاموں کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً قم۔ شیم۔ قیوم۔ اعظمی وغیرہ کے۔ مصر کے متاخر زمانے کے ظروف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اثر ہسپانیہ۔ الجیریا اور گرد و نواح کے دیگر اسلامی ممالک کے فن کوزہ گری پر ہوا۔ اور یہی اسلامی اثر ہسپانیہ سے تمام یورپ تک پہنچا۔ یورپ کے ایک مجموعہ میں ایک

رقہ

رقہ بھی سامرہ کی طرح اہم ہے یاد رہے کہ اس نام کے چار مقام ملتے ہیں۔ لیکن یہاں اس رقبہ سے مراد ہے جو فرات پر حلب کے مشرق میں ایک سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ اسے سکندر اعظم نے آباد کیا تھا۔ مسلمانوں نے اس پر ۳۳ھ میں قبضہ کیا۔ خلیفہ ہارون الرشید نے یہاں اپنے لئے ایک محل بنوایا تھا۔ یا قوت حموی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محل اس کے زمانے میں مست آباد ہو چکا تھا۔ اگرچہ ابوالفدا کے زمانے میں اس کے کھنڈروں جو تھے۔ رقبہ سے کئی نمونے برتنوں کے ٹکڑوں کی صورت میں ملے ہیں اور بعض سالم طشت بھی جو یورپ کے مجامیع میں دیکھے جاسکتے ہیں عین معائنے کے بعد یہ رائے قائم ہوتی ہے کہ یہ نمونے ۱۳۱۶ھ سے قبل کے ہیں۔

رقہ کے ظروف میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کی مٹی میں ریت زیادہ ہے۔ اس امر کا فیصلہ مشکل ہے کہ آیا یہ ریت قدرتی طور پر مٹی میں موجود تھی یا کاریگر خود ملا تے تھے۔ ان برتنوں پر ہلکا سا سبز روغن نظر آتا ہے اور چمک معمول سے زیادہ ہے۔ یہاں سے بعض بہت قدیم نمونے بھی برآمد ہو چکے ہیں۔ لیکن اسلامی ظروف کا نشان امتیاز یہ ہے کہ ان پر عموماً طائوسی نیل کی تہ ہے اور سیاہی مائل روغن ہے۔ برٹش میوزیم میں ایک طشت ہے جو کسی زمانہ میں پیٹرک کے گرجا سینٹ سیلیسیا کی دیوار میں لگا ہوا تھا۔ یہ امر رقبہ کی تاریخ ظروف گری کو کسی حد تک الجھاتا ہے۔ رقبہ اور ملک شام کے ظروف میں فرق کم ہے۔ ان ظروف کا بیشتر مجموعہ دمشق کے عجائب گھر میں ہے۔ یہ ظروف کسی حد تک مقام رسافہ سے بھی تعلق رکھتے ہیں جو دراصل بانیطینی شہر ہے۔

کے پیندرے بہت خوبصورت ہیں۔ سنگاروانوں پر کلفیاں ہیں۔ اور ابھرے ہوئے نقش و نگار۔ ان برتنوں کا رنگ نیلگوں سبز ہے۔ یہاں کے برتن اتنی شہرت رکھتے ہیں کہ ہوشیار سوداگر "ری کے برتن" کہ کر تجارت کرتے ہیں۔ اس طرح سے ان کو مبالغہ زیادہ ملتا ہے۔ ری کے کھنڈروں میں سے قدیم بھٹیاں بھی نکل چکی ہیں اخیر زمانے کے ظروف پر مصوری و نقاشی کے وہ نمونے بھی نظر آتے ہیں جو کتابی تصاویر سے بالکل مشابہ ہیں حقیقت یہ ہے کہ انہیں مصورین نے ان ظروف پر مصوری کی ہے جنہوں نے قرطاس کتاب پر تصاویر بنائی ہیں۔ چنانچہ برٹش میوزیم میں ایک طشت ہے جس پر بہرام گور کو مصروف شکار دکھایا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصورین نے اول اس تصویر کو برتنوں پر بنایا اور بعد میں کاغذ پر تصویر کو منتقل کیا۔ غار ہائے اجنٹا کی اول غار میں چھت پر خسرو شیریں کی تصویر ہے۔ وہی تصویر ایک پلیٹ پر بھی نظر آتی ہے جس کے کئی نمونے کلکتہ کے انڈین میوزیم میں ہیں بعض برتنوں پر علم ہندسہ کی نہایت عمدہ گریں بنی ہوئی ہیں جو مسلمانوں کی فنی خصوصیات کا پتہ دیتی ہیں۔ رنگوں میں سے سفید۔ سرخ۔ زرد اور سبز رنگ عام نظر آتے ہیں۔ ساتویں صدی ہجری کے ایرانی ظروف میں خصوصیت سے اعلیٰ معیار فن نظر آتا ہے کیونکہ ان میں نزاکت حد سے زیادہ ہے۔ ان کی گردنیں گاؤدم ہیں۔ نقاشی کا طریقہ بھی نیا ہے۔ جو اول زمانہ سے مختلف اور چینی ظروف سے مشابہ ہے۔ فریڈرک میوزیم برلن میں چند اسلامی ظروف پر "۶۰۶ھ" و "۶۱۲ھ" منقوش ہیں۔ کلیکس مجموعہ پر "۶۳۳ھ" و "۶۴۸ھ" و "۶۵۵ھ" اور "۶۶۵ھ" خوبصورت اور سچا پربل بوٹوں سے مزین ہیں۔ بہت سے نمونے ایک مقام کبشہ کے ہیں جو کوہ قاف میں ایک پہاڑی مقام ہے مگر بعض ماہرین کی رائے ہے کہ یہ نمونے داغستان کے ہیں اور نویں صدی ہجری کے ظروف کا تسلسل ہیں۔

سمرقند

جو آج تک موجود ہیں۔ ان پر جانوروں کی تصاویر بھی ہیں۔ اور آدمیوں کی بھی۔ ان ظروف پر بھی چینی انر نمایاں ہے۔ کیلیکس مجموعہ میں ایک نمونہ ہے جس پر ۱۲۴۵ء کی تاریخ ہے۔ دیگر نمونے ۱۲۲۷ء و ۱۲۳۷ء کے ہیں۔ سلطان آباد کے ظروف کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ساخت گرد و نواح کے شہروں مثلاً ہمدان قم۔ مشهد۔ کاشان وغیرہ کے ظروف سے بالکل مختلف ہے محققین متفق ہیں کہ ایران کے علم و ادب میں کاشان۔ حمص۔ کوفہ۔ بصرہ بغداد۔ سراف۔ کرمان۔ اصفہان۔ شیراز۔ طوس۔ نیشاپور وغیرہ کی صنعت کو زہ گری کا بہت سا حصہ ہے۔ ہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ سلطان آباد کا بنا ہوا ایک بہت بڑا مشکا جس پر آدمیوں کی تصاویر ہیں اور جو ۱۲۸۵ء کی ساخت ہے امریکہ کے میٹروپولیٹن میوزیم میں ہے۔

ترکی ظروف

مصقول ظروف مشرق قریب میں ساتویں سے دسویں صدی ہجری تک استعمال ہوتے رہے۔ ترکی صقل کے بہترین نمونے قونیہ کے مدرسے کے دیواری نقوش ہیں۔ آٹھویں صدی ہجری کے نمونے بروسہ اور نصائح میں ملتے ہیں جو زیادہ تر رنگین ہیں اور نیلگوں۔ ہرمزی۔ سفید۔ سیاہ اور زرد رنگ کے امتزاج کا نتیجہ ہیں۔ ان پر خط طغرا میں کتبات بھی ہیں۔ اشکال علم ہندسہ اور دیگر نقش و نگار بھی۔ نقش و نگار رسمی قسم کے ہیں۔ یعنی مناظر قدرت کی نقل نہیں اور یہ امر شبہ پیدا کرتا ہے کہ یہاں کافن ہرات کی صنعت سے اثر پذیر ہوا۔ قسطنطنیہ کے بعض محلات و عمارات میں اسی قسم کا کام فروشوں پر نظر آتا ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ بعض دیواری نقوش ایرانی کاریگر دس کے اسماء سے مزین ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایرانی کاریگر دس کی محنت کا نتیجہ

سمرقند میں آج بھی ساسانیوں کے عہد کے ظروف مل جاتے ہیں۔ ان ظروف کے نمونے زیادہ تر روس میں اور کچھ لندن کے وکٹوریہ البرٹ میوزیم میں ہیں۔ ان ظروف میں عموماً سرخ زمین پر سفید یا سفیدی خطوط منقوش ہوتے ہیں اور عربی و فارسی کتبات بھی جو بیل بوٹوں اور دیگر نقوش کے ساتھ خوب میل کھاتے ہیں۔ ڈیزائن میں اہم مرکز دوائر کثرت سے نظر آتے ہیں۔ سمرقند کے بعض ظروف برہمنا آباد کے برتنوں سے مشابہ ہیں۔ ہسپانی سفیر کلیو گیو جوتیمور کے زمانہ میں سمرقند آیا تھا بیان کرتا ہے کہ تیمور دمشق سے بہت سے کاریگر ریشم کا کام کرنے والے اور بہت سے صنایع برتن بنانے والے اپنے ہمراہ لایا تھا۔ چنانچہ تیمور کے زمانہ میں ان فنون کو بیشمار فروغ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے مناظر زمانہ کے برتنوں میں بعض خصوصیات عراقی ظروف کی سی ہیں۔

سلطان آباد

یہاں اعلیٰ اور مختلف اقسام و طرز کے ظروف بنتے تھے۔ گریہ مقام کسی حد تک ایک محمہ ہے کیونکہ ایران میں سلطان آباد بہت سے ہیں۔ وہ سلطان آباد جہاں اس فن نے کمال حاصل کیا تم اور ہمدان کے مابین واقع تھا۔ جغرافیہ اسلام میں سلطان آباد کا وجود ۱۲۷۷ء سے قبل نہ تھا۔

برٹش میوزیم میں سلطان آباد کا ایک برتن موجود ہے۔ سلطان آباد کو اسلامی کوزہ گری کے سلسلے میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ تاہم فن کے اعتبار سے سلطان آباد کے ظروف ری اور سامرہ کے ظروف سے مختلف ہیں۔ یہاں صراحیوں اور بٹے طشت بنتے تھے

ہیں۔ بات یہ ہے کہ سلطان سلیم اول نے ۱۵۱۷ء میں تبریز کو فتح کیا اور کئی صنایع اپنے ہمراہ قسطنطنیہ لے گیا۔

دسویں صدی ہجری سے قبل مشرقِ قریب میں کوزہ گری کا چرچا کم نظر آتا ہے۔ ترکی ظروف میں نقش و نگار پر اور آرائشی طرزِ کتابت پر زور ہے۔ شمع دان خدا جانے کیوں اتنا مقبول ہے کہ ترکوں کے ہاں بیسیوں انواع کے شمع دان ملتے ہیں۔ شاید شمع دان بنانے میں ترکوں نے خاص مہارت اور شہرت حاصل کر لی تھی۔ ان شمع دانوں پر کئی قسم کے آرائشی خطوط اور کتبات ہیں۔ ایک ترک شمع دان جو ۹۵۹ھ کی ساخت ہے آجکل برٹش میوزیم میں ہے۔ غالباً مقامِ قطیعہ میں بنایا گیا تھا۔ ترکی ظروف کی طرزِ ساخت ایک حد تک ایرانی یا شامی طرز سے مشابہ ہے۔ چینی اثر بھی ہے مگر ان ظروف پر جو بیل بوٹے ہیں خالصاً عربی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ترکی کا فن کوزہ گری دمشق کے فن کا مرہونِ منت ہے۔ ترک دمشق سے بہت سے آثار ۱۵۱۷ء میں فتحِ قسطنطنیہ کے موقع پر لے گئے تھے۔ اور اگرچہ بروسہ جہاں ترکی علوم و فنون نے بہت ترقی حاصل کی۔ کاریگروں کا شہر تھا۔ تاہم قسطنطنیہ کے دارالخلافہ بننے کے بعد وہ پہلی سی بات نہ رہی۔

مقامِ نضاع میں بھی ایک بہت بڑا کارخانہ مصقول اینٹوں اور ظروف کا تھا۔ سلطان مراد ثالث نے ۱۵۸۹ء میں اپنے کسی اہلکار کو نضاع میں لکھا: "تم جلد کاشانی اینٹیں (LUSTRED TILES) ارسال کرو تاکہ ان کو قسطنطنیہ کے نئے ایوان میں استعمال کیا جاوے۔" مورخ سعد الدین کا بیان ہے کہ "نضاع کی مٹی اس قدر چمکنی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ شاید اس قدر کہ دینا کافی ہو کہ چین کے اور یہاں کے برتنوں میں فرق کم ہے بلکہ تمیز کرنا دشوار ہے قسطنطنیہ میں بھی ظروف ساز موجود تھے۔ مورخ چلبی کے بیان کے مطابق ۱۶۹۸ء میں ظروف سازوں کی دکانیں میٹھار تھیں۔ احمد خاں (۱۶۹۳-۱۷۰۶ء) کے زمانہ میں کل نین سو تھیں۔ آہستہ آہستہ

نیست و نابود ہو گئیں۔ اگرچہ ان کا وجود بارہویں صدی ہجری تک رہا۔ ترکی ظروف ایک لحاظ سے دنیا کے ظروف سے نرالے تھے۔ ان کی لمبی لمبی گردنیں ہوتی تھیں اور سنہری پیٹ اور ان پر حواشی۔ علاوہ ازیں ان میں ایک خاص قسم کی نزاکت بھی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ کوزہ گری کی تاریخ میں ان برتنوں سے ایک نئی طرز کا اضافہ ہوا۔ اور ترکی ظروف کو سب سے زیادہ خوبات متمیز کرتی ہے وہ ان کے حواشی ہیں۔ مقامِ ازبیک کے ظروف جو خالص ترکی الاصل ہیں من حیث الفن الگ طرز رکھتے ہیں۔ ترکی ظروف پر بعض اوقات جہازوں یا کشتیوں کی تصاویر بھی ملتی ہیں جس سے دو نتیجے نکل سکتے ہیں ایک تو یہ کہ ایسے ظروف محض جہازوں میں استعمال کئے جاتے تھے اور دوسرا یہ کہ اس زمانے میں ترکوں کو جہاز رانی کا بہت شوق تھا۔

اندلس

اندلس میں مسلمانوں کی ابتدا اموی خاندان سے ہوئی جو اپنے ہمراہ خالص اسلامی تہذیب کے اثرات لائے۔ اس زمانے کے بعض پرانے ظروف کھر دے اور بھدے سے ملتے ہیں۔ ان ظروف کا گوشتہ قوم کے آثار سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ جب مسلمانوں کا اندلس پر غلبہ ہوا تو عہدِ محمدی ظروف (فنی اعتبار سے) بننے شروع ہوئے۔ اندلسی عربوں نے اس فن کو مصر اور شام کے کاریگروں سے سیکھا تھا۔ معری اندلسی ظروف کا ذکر جابجا کرتا ہے۔ مرسیئہ المیریا میں ملاکا کے عہدِ مقل شدہ ظروف کا ذکر ہے۔ ملاکا غرناطہ میں واقع تھا جو اخیر زمانہ تک عربوں کے قبضے میں رہا۔ ابن العریبی المعری بیان کرتا ہے کہ یہاں جو ظروف تیار ہوتے تھے ویسے ظروف دنیا بھر میں کہیں نہ تھے۔ ابن بطوطہ وابن

برٹش میوزیم کے ایک طشت پر لکھا ہے۔ "نقاش کمینہ زارعی ۱۰۲۵ھ
 عمل محمود و محاریر مذی" اس پر ایسے مناظر کی تصاویر ہیں جن میں
 درخت۔ پودے۔ راج ہنس۔ ہرن وغیرہ ہیں۔ ان مناظر سے
 چینی اثر کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح اور کئی نمونے صراحیوں۔ آفتابوں
 اور طشتوں کے نظر آتے ہیں جو ظاہر طور پر تو چینی اثر سے بیگانہ ہیں
 لیکن اگر انہیں نگاہ غائر سے دیکھا جائے۔ خاص طور پر پیل بوٹوں
 کو۔ تو ان میں چینی رجحانات پائے جاتے ہیں۔ برٹش میوزیم میں ایک
 سنہری ایرانی طشت ہے جس پر کنول وغیرہ چینی طرز میں منقوش
 ہیں۔ اس طشت کے کنارے پر تاریخ ۱۱۰۹ھ لکھی ہے۔
 ایک اور طشت پر "ملکیت احمد عمل محمد علی ۱۲۳۲ھ لکھا ہے
 برٹش میوزیم میں علاوہ ان طشتوں کے بیشمار ٹکڑے ایسے
 برتنوں کے بھی ہیں جو بیجا پور سے دستیاب ہوئے۔
 اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کی ایک تحریر سے بھی
 یہ پتہ چلتا ہے کہ بیجا پور میں عہد برتن بنتے تھے۔ غرضیکہ بیشتر
 ممالک اسلامی میں یہ فن اعلیٰ معیار پر تھا۔ اگرچہ اس کا ذکر
 تاریخ میں نہیں ملتا۔ جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ لوگوں کی طبائع ایسے
 فنون کے ذکر کی طرف کم راغب تھیں۔ شمالی ہند میں ملتان۔
 جالندھر۔ سرہند وغیرہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ملتان تو
 آج تک مشہور ہے۔ اور یہاں کام بھی خوب ہوتا ہے۔ دعا
 میں جو ظروف بنتے ہیں وہ دیکھنے میں اعلیٰ نہیں مگر نقاشی کے
 اعتبار سے بہت عمدہ ہیں۔ ان پر سبز۔ زرد۔ نیلگوں شکرانی
 نارنجی اور جامنی رنگ ہیں۔ زیادہ تر ترکی ظروف سے مشابہ ہیں
 ان کے بہترین نمونے لندن کے البرٹ میوزیم میں دیکھے جاسکتے
 ہیں۔ برٹش میوزیم میں ایک برتن ہے جس پر تاریخ ۱۱۰۲ھ
 مکتوب ہے اور چند ظروف بعد کے بھی ہیں۔ برتنوں کا رنگ
 عموماً سیاہ ہے۔

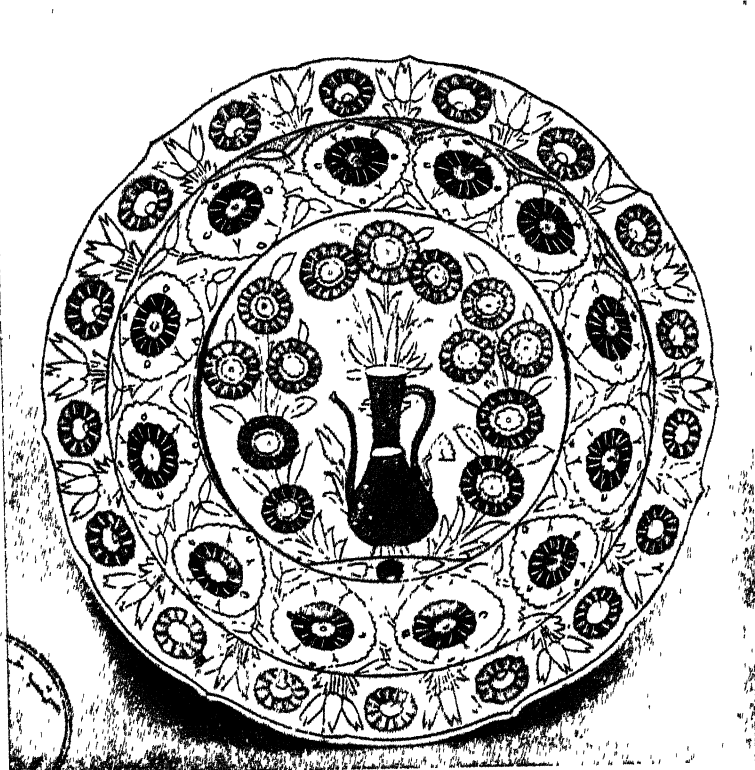
میرزا ویردی

خطیب غرناطہ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ قصر غرناطہ میں دو برتن
 ہیں جن میں سے ایک کا نام "طشت الحمرا" تھا۔ اس پر
 عربی کتبات بھی تھے۔ غرناطہ کے ظروف سینٹ پیٹرز برگ۔ پرمو
 (صلیبیہ) اور شک ہولم میں موجود ہیں۔ یوسف ثالث کے عہد کے
 ظروف بھی عجائب خانوں میں ملتے ہیں محققین کا بیان ہے کہ جب
 ازبیل اور فرڈیننڈ نے ملاکا پر قبضہ کیا تو یہ فن بالکل مٹ گیا۔

متاخر زمانے کے ایرانی ظروف

زمانہ بزل چکا تھا سلسلہ محل و نقل میں ترقی ہو چکی تھی اور
 لوگوں کی معیشت میں انقلاب ہو چکا تھا۔ متاخر زمانہ میں شامان
 ایران کا سامان تعیش دیگر ممالک سے آتا تھا۔ چنانچہ یہاں بچائے
 اس کے کہ فن کو زہری کو فروغ ہونا کسی حد تک تنزل ہوا۔
 چینی ظروف براہ راست چین سے منگائے جاتے تھے۔ اس
 کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ طبلع میں تنوخ کا مادہ زیادہ ہو گیا تھا اور
 ویسے سیاسی اعتبار سے بھی مختلف ممالک کے درمیان تعلقات
 دوستانہ تھے۔ بہر حال ایران میں بھی نئی طرز کے ظروف اور سازو
 سامان اختراع کئے گئے۔ اور ان کے نقش و نگار میں بھی جدتیں
 پیدا کی گئیں۔ سلطان حسین بایقرا کے زمانہ میں نقاش حاجی محمد اسی
 امر کے لئے مامور تھا کہ برتنوں وغیرہ پر ردغن اور نقش و نگار کیا
 کرے۔ حاجی محمد میر علی شیر نوائی کے کتبخانہ کا مہتمم بھی تھا جس پر
 میں لکھا ہے کہ "ردغن تصویر و تذهیب ہمارت تمام داشت و چند
 گاہ ہمت بر بختن چینی نفقوری کماشت بعد از تجربہ بسیار و از کتاب
 مشقت بیشمار جسم ظروف و ادائی کہ میساخت با چینی بغایت پیشہ
 گشت اما رنگ و صفائش چنانچہ می یابد" مصوری میں اس کے
 برعکس ایک خالص ایرانی طرز پیدا ہو چکی تھی جو ہر قسم کے بیرونی
 اثر سے برتر تھی۔ یہی زمانہ بہزاد کا زمانہ تھا۔





مجید ملک

نکات

آرٹ کے متعلق چند اشائے

۱۔ بت (یعنی آرٹسٹ خاک کو الوہیت بخش دیتا ہے)

۲۔ تصویر (یعنی محض فنی کمال کافی نہیں ہوتا)

۳۔ حسن (یعنی آرٹسٹ کی نگاہ میں حسن کا معیار وہ نہیں جو عوام

کی نگاہ میں ہے)

بت

بت شکن نے کہا میں اس مٹی کے بت کو توڑ دوں گا۔
 پجاری کے دل پر چوٹ لگی۔ اس نے کہا اے بت شکن یہ مٹی کا بت نہیں یہ خدا ہے۔
 بت شکن کا چہرہ غصے سے تمٹما اٹھا۔ اس نے کہا یہ بت ہے۔ یہ خاک ہے۔ اور میں اسے خاک میں ملا دوں گا۔
 پجاری نے رو کر کہا میں جانتا ہوں کہ تیری آہنی تلوار کی ایک ضرب سے یہ خاک ہو جائیگا بلکہ خاک سے بھی بدتر لیکن اے بت شکن اس وقت یہ خدا ہے۔

اور جب یہ خاک میں مل کر خاک ہو جائیگا۔ میں اس خدا کو یاد کرتا رہوں گا اور اس کے تصور میں اپنی زندگی گزار دوں گا۔
 اور میری طرح اور سینکڑوں بھی جنکو قدرت نے چشم بصیرت دی ہے۔
 اور ہمارے دل اس کی یاد سے۔ اس کے تصور سے سکون اور اطمینان حاصل کرتے رہیں گے۔ ہم نیک کام کرتے رہیں گے۔ ہم غریبوں پر رحم کھاتے رہیں گے۔ ہم ظالموں سے لڑتے رہیں گے۔ ہم مظلوموں کی مدد کرتے رہیں گے۔
 اور اے بت شکن کیا جو کچھ ہم کرتے ہیں۔ اور جو کچھ ہم کرتے رہیں گے برا ہے۔
 بت شکن نے کہا تم بے جان پتھر کی پرستش کرتے ہو۔
 پجاری نے کہا اے بت شکن ہمارا خدا پتھر نہیں۔ اگر ہمارے دل پر غیظ و غضب قبضہ کر لیں تو یہ ہمیں علم اور نرمی کی تلقین کرتا ہے۔ اگر حق اور باطل برسر پیکار ہوں تو یہ ہمیں حق کی حمایت پر اکساتا ہے۔ اگر گناہ کی چمک سے ہماری آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ اگر ہوس ہمیں راہ راست سے منحرف کر دے تو یہ ہمیں نجات کا راستہ بتاتا ہے۔ اے بت شکن تو ان آنکھوں کو دیکھ۔ اس پیشانی کو دیکھ۔ ابروؤں کے اس خم کو دیکھ۔ ان ہونٹوں کو دیکھ۔ دیکھ۔ سن اس وقت بھی یہ ہونٹ تجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں۔
 لیکن بت شکن نے اپنی فولادی تلوار کی ایک ضرب سے بت کو پاش پاش کر دیا۔
 پجاری روتا ہوا اٹھا۔ اس نے ریزوں کو اٹھا کے مندر کے صحن سے باہر پھینک دیا اور کہا ہائے وہ محنت خاک میں مل گئی جس نے خاک کو حقیقی خدا بنا دیا تھا۔

تصویر

کہتے ہیں ایک مصور نے ایک عورت کی تصویر کھینچی۔ اور جب وہ تصویر کھینچ چکا تو اس نے اپنے دوستوں کو بلایا اور کہا۔ دیکھو میں نے ایک عورت کی تصویر کھینچی ہے۔

اور جب دوستوں نے تصویر کو دیکھا تو کہا

اس کے بال بادلوں والی رات کی طرح کالے ہیں۔

اور اس کی آنکھوں میں شہاب ثاقب کی چمک ہے۔

اور اس کے ہونٹ شفق کی طرح رنگین ہیں۔

مصور ان کی باتیں سنتا رہا۔ اور اس نے کہا ہاں اس کے بالوں میں رات کی سیاہی ہے۔ اور آنکھوں میں تارے کی چمک اور ہونٹوں میں شفق کی رنگینی۔ لیکن اس میں جان نہیں۔

یہ تصویر ناکام ہے

اور مصور نے ایک اور تصویر کھینچی

اس نے اپنا سینہ چیر کر دل میں سے خون نکالا۔ اور اس خون سے تصویر بنائی۔

اور جب یہ تصویر تیار ہوئی تو اس کے بالوں میں بادلوں والی رات کی سیاہی تھی۔

اور آنکھوں میں شہاب ثاقب کا نور

اور ہونٹوں میں شفق کی سرخی

اور سینے میں عقاب کے پروں کا تناؤ

اور کمر میں چھتے کی کمر کی لچک

اور اعضا میں تیرتیری کی سبک اندامی

مصور نے اپنے دوستوں کو بلایا اور کہا اس تصویر کو دیکھو۔

اور دوست آئے اور تصویر کو دیکھتے رہے۔

انھوں نے بالوں اور آنکھوں اور ہونٹوں کے متعلق کچھ نہ کہا۔

لیکن تصویر کے سامنے ان کے سر جھک گئے اور جھکے رہے۔

حسن

حسین عورت نے کہا :-

اے مصور تو اپنی تصویروں کا ذکر کرتا ہے تو تیری آواز میں لرزش سی پیدا ہو جاتی ہے۔ تو ان کے خدو خال۔ ان کی رنگت اور ان کے تناسب پر کئی کئی پہر غور کرتا رہتا ہے۔ اور میں نے سنا ہے کہ بارہا تو راتوں کی تاریکی میں تصویروں کو یاد کر کے سیلاب کی طرح ترپتا ہے۔

اے مصور کیا تجھے ان تصویروں سے محبت ہے۔ ان تصویروں سے جن میں جان نہیں۔ جو اگر تو ان کو مس کرے تو برف کی طرح سرد اور پتھر کی طرح سخت ہوتی ہیں۔ جو تیری باتوں کا جواب نہیں دے سکتیں۔ جن کی آنکھیں لطف دیدار سے محروم ہیں۔ ہونٹ لطفِ ملاست سے اور دہن لطفِ اظہار سے۔ جن میں حرارت نہیں۔ خون نہیں۔ جو تجھ کو چھو بھی نہیں سکتیں۔

اے مصور تو ان تصویروں کی پرستش کرتا ہے۔ لیکن یہ پرستش کے لائق نہیں۔ تو میری پرستش کر۔ میں تیری پرستش کے لائق ہوں۔
مصور نے جواب دیا۔ میری تصویروں میں جان نہیں حسن ہے۔ تجھ میں جان ہے۔ لیکن جن میں اور میں حسن کی پرستش کرتا ہوں۔
حسین عورت نے اپنے سر کو بلند کیا اور کہا۔

اے مصور میرے حسن کی دور دور دھوم ہے۔ اس نواح کے نوجوان میری خاطر سمندر کا سینہ چیر کر موتی لاتے ہیں۔ اور گھنے جنگلوں میں شیروں سے لڑتے ہیں۔ ادھیڑ عمر کے آدمی اپنے خوبصورت اہلن گھوڑوں پر سوار ہو کر مجھے دیکھنے آتے ہیں اور میرے سامنے اپنے کارناموں کی داستانیں دہراتے ہیں۔ بوڑھے میرے پاس پوشیدہ پیغامات بھیجتے ہیں اور میرے قدموں پر سونے اور چاندی کے انبار لگانے کے وعدے کرتے ہیں۔ اے مصور۔ تو کیسے کہتا ہے کہ میں حسین نہیں۔

مصور نے کہا تو حسین نہیں۔ اور وہ جو تیری خاطر سمندروں سے موتی لاتے ہیں اور جنگلوں میں شیروں سے لڑتے ہیں۔ اور وہ جو اہلن گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں اور تجھے اپنی بہادری کی داستانیں سناتے ہیں۔ اور وہ جو تیرے پاس پوشیدہ پیغام بھیجتے ہیں اور تیرے قدموں پر سونے اور چاندی کے انبار لگاتے ہیں۔ وہ تجھ سے۔ تیرے حسن سے محبت نہیں کرتے بلکہ اپنے آپ سے محبت کرتے ہیں۔
وہ اپنی جوانی۔ اور اپنی عنقریب گزر جانے والی جوانی۔ اور اپنی گزری ہوئی جوانی سے محبت کرتے ہیں۔

وہ تیری پرستش نہیں کرتے بلکہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ تو ان کی پرستش کرے۔
اور تو حسین نہیں۔ کیونکہ اگر تو حسین ہوتی تو یہ لوگ اسی طرح تیری پرستش کرتے جس طرح میں تصویروں کی پرستش کرتا ہوں۔

مجید ملک

مولوی عبدالحق

اُردو

نے قرآن کی زبان کا استعمال کیا ہے۔ درحقیقت اس کی کتاب میں فارسی و عربی کے کافی الفاظ نظر آتے ہیں +

اردو ترکی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی امراد سلاطین کی فرودگاہ یا پڑاؤ ہیں اور چونکہ ترک اہل ایران اور ہندوستانی سب اکٹھے شاہی کمپو میں رہا کرتے تھے اس لئے ان کی مخلوط زبان 'زبان اہل اردو' (چھاؤنی کے لوگوں کی زبان) کہلانے لگی۔ کچھ عرصہ کے بعد زبان کا نام ہی "اردو" ہو گیا۔ مسلمان فاتحین کی زبان فارسی تھی۔ جسے شاہی زبان ہونے کا فخر حاصل تھا۔ لیکن عام لوگوں کی زبان ہندی ہی رہی جو پراکرت سے سنسکرت کے ذریعہ بنی تھی۔ عوام کی اس زبان پر فارسی کا عمل دخل ہونے لگا۔ اور اس طرح اردو معرض وجود میں آئی۔ سہرا جرج گریسن اپنی کتاب "پیمائش لسانی ہندوستان" میں اردو کو صرف مغربی ہندی کی شاخ بتاتے ہیں ان کا یہ نظریہ فارسی کے اس نمایاں اثر کو جو اردو زبان پر پڑا ہے نظر انداز کر دیتا ہے۔ اردو نے صرف الفاظ ہی فارسی سے مستعار نہیں لئے بلکہ تمام اقسام نظم عروض مضامین اسلوب بیان خیال بندی تلیجات گرامر خصوصیات بندش وغیرہ سب کچھ فارسی ہی سے مستعار لی ہیں حتیٰ کہ اردو نثر بھی فارسی کے رنگ میں ڈھلی ہوئی ہے اس کو نہ صرف ہندی کی شاخ کہا جاسکتا ہے اور نہ صرف فارسی کی بلکہ مخلوط خصوصیات کی ایک علیحدہ زبان ہے +

پہلا فارسی شاعر جس نے ہندی الفاظ کا استعمال کیا

اردو ایک ہندوستانی زبان ہے جو مختلف اسباب و وجوہ کی بنا پر ہندوستان کی مشترکہ زبان کہلانے کی سستی ہے۔ یہ ایک مخلوط زبان ہے۔ جس کی تعمیر و تشکیل کے واسطے تنہا ہندی آریائی یا فارسی زبانیں اپنا اپنا دعویٰ پیش نہیں کر سکتیں بلکہ اس کی لغوی اور نحوی نشوونما دونوں زبانوں کے تمدنی اور لسانی ذخیرے سے حاصل کی گئی ہے اور ہندو اور مسلم تہذیبوں کے شکم کی ایک نہ مٹنے والی یادگار ہے +

شمال مغرب سے مسلمان فاتحین کی آمد پر اس کی داغ بیل ہندوستان میں رکھی گئی۔ سلطان محمود غزنوی اور اس کے فرزند مسعود کے عہد حکومت میں تنگ ناخ اور دیگر ہندو دربار غریبن میں ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ محمود کے وقت میں ہندو فوج بھی وہاں رہتی تھی۔ جس کا سپہ سالار سونیدراراؤ تھا۔ غزنوی خاندان کے آخری تاجداروں نے غزنی چھوڑ کر پنجاب میں اقامت اختیار کر لی تھی اور اپنی سلطنت کے اختتام تک وہیں قیام پذیر رہے ان امور کا لازمی نتیجہ ہندو اور مسلمانوں کا باہمی میل جول تھا۔ مسعود کی سلطنت کے کئی عہدین و رؤسا جنہیں ترکوں کے حملے نے بے خانان بنا دیا تھا۔ لاہور میں آکر پناہ گزین ہوئے اس روزمرہ کے ارتباط نے اس زبان پر جو دونوں مختلف اقوام میں قدر مشترک بن گئی تھی گہرا اثر کیا۔ چنانچہ ہم راجہ پرتھوی راج کے درباری شاعر چند بردائی کے شاہکار "پرتھی راج راسو" میں اس بات کے نمایاں اثرات پاتے ہیں۔ وہ خود کہتا ہے کہ اس

امیر خسرو (۶۵۳ھ - ۷۲۵ھ = ۱۲۵۵ء - ۱۳۲۵ء) تھا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے اور مختلف تذکروں میں بھی لکھا ہے کہ امیر خسرو نے اپنا بہت سا کلام ہندی میں رقم کیا لیکن بد قسمتی سے اب وہ مفقود ہے۔ اگرچہ بعض ریختے اب بھی مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ جن میں ایک مصرعہ ہندی کا اور ایک فارسی کا ہے اور کئی منظوم و نسخے اسی مخلوط زبان میں پائے جاتے ہیں۔

امیر خسرو کے کافی عرصہ بعد تک یہی طریقہ رائج رہا کہ ایک مصرعہ فارسی اور ایک ہندی میں لکھا جائے۔ اور اسی وجہ سے اس قسم کی نظم کا نام ”ریختہ“ قرار پایا۔ ”کثیر المعانی لفظ“ ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں نئی چیز کو موزون کرنا۔ جب امیر خسرو کو ہندی اور فارسی مقفے مصرعے بنانے میں کامیابی حاصل ہوئی تو ریختہ کے معنی موسیقی کی اصطلاح کے لئے جانے لگے۔ اس اصطلاح سے موسیقی میں یہ مقصد قرار پایا کہ جو فارسی خیال ہندوی کے مطابق ہو اور جس میں دونوں زبانوں کے سرود ایک تال اور ایک راگ میں بندھے ہوں۔ اس کو ”ریختہ“ کہا جائے کچھ عرصہ بعد ریختہ نے موسیقی سے نکل کر عمومیت حاصل کر لی اور اس کا اطلاق ایسے کلام منظوم پر ہونے لگا جس میں دو زبانوں کا اتحاد ہو۔ اس سے تھوڑا عرصہ بعد نظم کی ہر صنف اسی نام سے پکاری جانے لگی۔ اور بالآخر زبان کا نام بھی ریختہ پڑ گیا۔ چنانچہ لفظ ”ریختہ“ اردو زبان کے مختلف النوع ہونے کا مزید ثبوت ہے۔

کافی عرصہ تک یہ زبان ہندی یا ہندوی کے نام سے موسوم رہی اس کے بعد ریختہ نام پڑا۔ اور آخر کار اس کا نام اردو ہو گیا اس نام نے غیر معمولی ہر دلغیزی حاصل کی۔ اور آج تک یہ زبان اسی نام سے پکاری جاتی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دنوں میں اردو کو ”ہندوستانی“ کہا جاتا تھا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ

ہندوستان کی دیگر زبانوں میں سے صرف یہی مشترک زبان کہلانے کی مستحق ہے۔

اگرچہ اردو زبان نے دوبارہ گنگ و جمن یا زیادہ صحیح کہا جائے تو دلی اور اس کے قرب و جوار میں جنم لیا لیکن علمی و ادبی قالب اس نے سرزمینِ دکن میں اختیار کیا۔ وہ اشخاص جنہوں نے اس کا سب سے پہلے استعمال کیا صوفیائے کرام تھے جو صحیح معنوں میں اس کے مرئی و سرپرست کہلا سکتے ہیں جس طرح گوتم بدھ نے سنسکرت کی بجائے پالی زبان اختیار کی تھی تاکہ وہ اپنا الہامی پیغام عام لوگوں تک پہنچا سکے اسی طرح ان صوفیوں نے بھی یہ محسوس کیا کہ عوام تک رسائی حاصل کرنے کے لئے انہیں کی زبان کو آراکار بنایا جائے لہذا انہوں نے فارسی و عربی کو چھوڑ کر اردو زبان اختیار کی۔ جب یہ بزرگ اپنی تعلیم کی اشاعت کے دوران میں دکن کے مختلف حصوں مثلاً دولت آباد، گلبرگ، احمد آباد، بیجاپور، پٹن (گجرات) وغیرہ پہنچے تو انھوں نے مذہبی تلقین کا کام اسی زبان میں شروع کیا جس کو اپنے ساتھ دلی سے لائے تھے۔ چنانچہ ان میں سے بعض نے (مثال کے طور پر پرستید محمد بندہ نواز جو دکن میں ۱۳۹۸ھ = ۱۸۰۰ء میں آئے اور جن کا مرزا گلبرگہ میں ہے) رسالے، اشعار اور دیگر کتب اسی زبان میں تصنیف کیں۔ ان کے نقش قدم پر چل کر ان کے شاگردوں اور مریدوں نے متعدد کتابیں لکھیں اور اس زبان کو ہر دلغیزی بنانے کے لئے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ انھوں نے عربی و فارسی الفاظ کثرت سے استعمال کر کے فارسی رسم الخط کو اختیار کیا۔ اس بات نے اسے ہندی زبان سے علیحدہ کر دیا بندہ نواز کے علاوہ جن کی کتاب معراج العاشقین شائع ہو چکی ہے دیگر صوفیائے کرام نے بھی اردو زبان کو اپنے خیالات نظم و نثر میں ادا کرنے کے لئے استعمال کیا۔ میران جی المتخلص شمس العشاق (متوفی ۹۰۲ھ) جو بیجاپور کے بزرگان کرام میں سے تھے اور

بندہ نواز کے پیرو تھے۔ ان کا بیٹا اور جانشین شاہ برہان جہانم
(متوفی ۹۹۰ھ) اور ان کا بیٹا امین الدین غلام (متوفی ۱۰۷۶ھ)
دکنی اردو میں بڑے پایہ کے نظم و نثر نگار تھے۔ اسی طرح گجرات میں
بھی اس نئی زبان کو قبولیت حاصل کرنے کا فخر صوفیائے کرام کے
ذریعہ ہوا جن میں صوفی شاہ علی محمد جیو (متوفی ۹۷۳ھ) سب
سے پیش پیش ہیں۔ وہ بڑے پایہ کے شاعر تھے ان کے کلام کا مجموعہ
”جواہر الاسرار“ کے نام سے موسوم ہے۔ دیگر صوفی شعرا میں سے
مصنف شنوی ”خوب ترنگ“ (محررہ ۹۸۶ھ = ۱۵۸۷ء)
اور امین مصنف ”یوسف زلیخا“ (تالیف ۱۱۰۹ھ = ۱۶۷۹ء)
قابل ذکر ہیں۔ یہ سب گجرات کے رہنے والے تھے۔
دکن میں اردو زبان کے تین بڑے مرکز تھے (۱) گولکنڈہ
شاہان قطب شاہی کا دارالخلافہ (۲) بیجا پور شاہان عادل شاہی
کا پایہ تخت (۳) احمد آباد (گجرات)۔ اور یہ بات خالی از
دلچسپی نہیں کہ تینوں جگہ کی مروجہ زبان میں تھوڑا بہت مقامی
فرق ضرور پایا جاتا ہے۔
قطب شاہی خاندان کے تمام فرمانروا علوم و فنون کے بڑے
سرپرست تھے سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۹۹ء - ۱۶۰۰ء
= ۱۵۸۰ء - ۱۶۱۱ء) جس کا مجموعہ کلیات بہت ضخیم ہے بڑا
عالی دماغ شاعر تھا۔ اس کے دو جانشین سلطان محمد قطب شاہ
(۱۶۲۰ء - ۱۶۳۵ء = ۱۶۱۱ء - ۱۶۲۶ء) اور سلطان
عبد اللہ قطب شاہ (۱۶۳۵ء - ۱۶۸۳ء = ۱۶۲۶ء -
۱۶۷۲ء) نیز ابوالحسن تانا شاہ (۱۶۸۳ء - ۱۱۱۸ھ =
۱۶۷۲ء - ۱۶۸۷ء) اس خاندان کے آخری فرمانروا سب
کے سب نہایت بلند پایہ شاعر تھے اور اکثر زبان اردو میں شعر
کہا کرتے تھے۔ اس زمانہ کے دیگر قابل ذکر شعرا مندرجہ ذیل
ہیں:-
۱۔ وجہی۔ اس نے محمد قلی قطب شاہ کی داستانِ عشق اپنی

شنوی موسومہ ”بہ قطب و مشتری“ میں نظم کی یہ ۱۰۱۸ھ
میں لکھی گئی۔
۲۔ شہاب الدین قریشی مصنف ”بھوک بال“
۳۔ شیخ احمد شریف مصنف شنوی ”علم الادویہ“
۴۔ غواصی مصنف سیف الملوک و بدیع الجمال (۱۰۳۵ھ)
دوطولی نامہ (۱۰۴۹ھ)۔
۵۔ ابن نشاطی مصنف پھول بن (۱۰۷۶ھ)۔
۶۔ رضی یاقطبی مترجم تحفۃ النصاب (پند کا تحفہ)
۷۔ طبعی مصنف بہرام و گل اندام
۸۔ والہ مصنف طالب و موہنی
۹۔ مظفر مصنف ظفر نامہ عشق
(آخری چار شعرا عبد اللہ قطب شاہ کے زمانے میں ہوئے ہیں)
۱۰۔ فیض مصنف رضوان شاہ و روح افزا۔
۱۱۔ شاہی و { یہ دونوں مرثیہ گو تھے
۱۲۔ مرزا
۱۳۔ جید رآباد کا فوری و دیگر شعرا تانا شاہ کے عہد حکومت
میں ہوئے۔
عادل شاہی فرمانروا بھی علوم و فنون کے قدردان و سرپرست
تھے۔ محمد عادل شاہ (۱۰۳۵ھ - ۱۰۶۷ھ = ۱۶۲۶ء - ۱۶۵۶ء)
کے عہد حکومت میں چار بڑے شاعر تھے:-
۱۔ حسن شوقی مصنف فتح نامہ نظام شاہ (ثانی کوٹا کی لڑائی
کا بیان و میزبانی عادل شاہ)۔
۲۔ مقیمی (مرزا مقیم خان) مصنف فتح نامہ یکھیری (جس میں
عادل شاہ کی فتح کا ذکر ہے) و عشقیہ نظم میاں و چند بھان
(بدن ؟)
۳۔ رستمی (کمال خان) ایک ضخیم شنوی خاوند نامہ کا مصنف
جس میں خلیفہ چارم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی لڑائیوں کا حال

دج ہے (تالیف ۱۰۵۹ھ)

۴۔ ملک خوشنود مصنف "جنت سنگار" (بہرام کی کہانی

تالیف ۱۰۵۵ھ) ۛ

۱۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ - ۱۰۳۵ھ = ۱۵۸۰ء

— ۱۶۲۶ء) جسے فن موسیقی میں یدِ طولیٰ حاصل تھا اور نوں کا جو ہندی گانوں کی کتاب تھی مصنف ہونے کی وجہ سے "جگت گرد" کہلاتا تھا۔ اس پادشاہ نے دکنی اردو کو فارسی کے یکائے درباری زبان قرار دیا ۛ

علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ - ۱۰۸۳ھ = ۱۶۵۶ء - ۱۶۷۳ء)

اردو میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ اس کے عہد سلطنت میں دکنی اردو نگاروں میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں :-

۱۔ ملا نصرتی - گلشن عشق و علی نامہ کا مشہور و معروف مصنف

۲۔ ایاضی (محمد امین) مصنف نجات نامہ (۱۰۷۶ھ)

و شامل نامہ ۛ

۳۔ سید بلاقی مصنف معراج نامہ (۱۰۶۵ھ)

سکندر عادل شاہ کے عہد حکومت میں شعرا ذیل دیکھنے میں

آتے ہیں :-

۱۔ شاہ امین الدین علار (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے)

۲۔ عبدالمومن بیجا پور کا مصنف عشق نامہ (جن میں سید محمد

جو پوری بانی فرقہ ہمدویہ کا ذکر ہے) ۛ

۳۔ ہاشمی مصنف یوسف زلیخا جو اپنے زمانے کا مشہور ترین

اور سب سے بڑا شاعر ہے۔ مادر زاد اندھا تھا اور غالباً

اسی نے سب سے پہلے ریختی کی بنیاد رکھی جس کو رنگین

کے ہاتھوں فروغ ملا (اس کا ذکر آگے آئیگا) ۛ

گوگی کا قاضی محمود بھری مصنف "من گن" (۱۱۱۲ھ = ۱۷۰۰ء)

و جدی مصنف "پنچی باچا" (شیخ عطار کی منطق الطائر کا مترجم) اسی قبل کے کئی اور شعرا بھی بارہویں صدی ہجری میں ہوئے یہ

وہ زمانہ تھا جب اورنگ زیب نے دکن فتح کر لیا تھا۔ نشر میں سب

سے پہلے جو کتب زبان اردو میں لکھی گئیں وہ دکنی روزمرہ میں

تھیں۔ صوفیائے کرام کے اقوال کے علاوہ (جیسے شاہ راجو) -

سید قتال - سید محمد بندہ نواز - شاہ امین الدین علار (چند سالے

تصوف پر بھی لکھے گئے۔ جواب تک موجود ہیں۔ لیکن ادبی لحاظ

سے انہیں کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ اس کے علاوہ ادبیات

و دینیات میں دیگر معرکہ الآرا تصانیف ہیں مثلاً "شرح تمہید"

جو حیدر آباد کے سید میران (متوفی ۱۰۷۴ھ = ۱۶۶۳ء) نے

قاضی عین القضاة (متوفی ۱۱۳۳ھ = ۱۷۲۷ء) کی فارسی

کتاب "تمہیدات" سے دکنی اردو میں ترجمہ کی ۛ

دجی جس کا اوپر ذکر آچکا ہے علاوہ شاعر ہونے کے ایک

نشر کی کتاب الموسوم بہ "سب ریس" یا "حسن و دل" (جس میں

عشق و حسن کی معرکہ آرائی دلج ہے) کا بھی مصنف ہے۔ اس

کتاب کی عبارت ادبی شان رکھتی ہے اس سے پیشتر سب تصانیف

مذہبی رنگ یا تصوف میں ہیں۔ اس کا پیرایہ بیان تمثیلی ہے۔

تمام کتاب مقفی عبارت میں ہے اور ۱۱۳۵ھ مطابق ۱۷۲۳ء میں

تصنیف کی گئی۔ اس عہد کی نشر کی دوسری کتاب ترجمہ شامل الاقیاف

(۱۰۸۰ھ = ۱۶۷۰ء) ہے جس کا ترجمہ میران یعقوب نے

رکن عماد الدین جو برہان الدین (متوفی ۱۷۳۲ھ = ۱۶۳۲ء)

دولت آباد کے مرید تھے کی فارسی کتاب سے کیا۔ اسی عہد میں اور

بھی بہت سی کتب تصنیف ہوئیں ۛ

اس ابتدائی زبان میں جس طرح کہ فارسی و عربی الفاظ ہندی

زبان میں ہندی زبان میں خواہ مخواہ شامل ہو گئے تھے اسی طرح

سے مصنفین نے ہندو مسلمان دونوں کے قصص و روایات کو

بھی اپنا موضوع بنایا۔ چنانچہ کئی منظوم کہانیاں فارسی سے ترجمہ

کی گئیں اور کئی کہانیاں سنسکرت اور ہندی کی مقبول عام روایتوں

سے اخذ ہوئیں مثلاً "نل دمن" یا نصرتی کی مشہور و معروف مثنوی

”گلشن عشق“ (مدالیتی اور منوہر کی عشقیہ داستان) یا ”کامردیکلا“ کی داستان۔ صوفیائے کرام کی کتب میں تینوں زبانوں فارسی، عربی، ہندی کے الفاظ کثرت سے دیکھنے میں آتے ہیں۔ شاعرانے بھی تینوں زبانوں سے تشبیہات اور استعارے لے کر اپنے کلام میں استعمال کئے ہیں۔

لیکن اردو زبان کی بنیاد صحیح طور پر اس وقت پڑی جب فارسی رسم الخط اور فارسی یا عربی علم عروض اختیار کئے گئے۔ ملک محمد عباسی کی ”پداوت“ (۹۷۳ھ = ۱۵۶۰ء) میں اگرچہ عربی اور فارسی کے الفاظ معدودے چند ہیں تاہم رسم الخط فارسی ہی اختیار کیا گیا ہے۔ نیز نظموں کی کثیر تعداد فارسی بحر میں ہے محمد عباسی نے خالص ہندی کو فارسی رسم الخط میں تحریر کر کے اس وقت کی ہندو مسلم تہذیب کی آمیزش کا ٹھیک ٹھیک نقشہ کھینچا ہے۔ بعد کے مصنفین اس سے بھی دو قدم آگے بڑھے انہوں نے اپنی نظم و نثر میں ہندی، عربی، فارسی ہر سہ السنہ کے الفاظ باہم استعمال کرنے شروع کئے اور اس طرح اس رشتہ کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ فارسی عروض اختیار کرنے کی وجہ سے اس نئی زبان کی بنیاد اور بھی مستحکم ہو گئی اور اس کا سبب فارسی تہذیب و تمدن کا اثر تھا جو اس وقت سب پر مستولی تھا۔ غیر ملکی عروض اختیار کرنے سے گویا غیر ملکی موسیقی بھی اثر انداز ہونے لگی چنانچہ ان بحر و نغمات کی امداد سے اردو زبان کے خصائص اور اخلاقی طرز کلام میں ایک نئی شان پیدا ہو گئی۔

جدید اردو شاعری کی ابتدا محمد شاہ (۱۱۳۱ھ — ۱۱۶۱ھ = ۱۷۱۹ء — ۱۷۶۸ء) کے عہد حکومت میں ہوئی۔ دلی دکنی (۱۰۹۹ھ — ۱۱۵۹ھ = ۱۶۸۸ء — ۱۷۴۷ء) نے بھی دلی کے اساتذہ سے بہت کچھ حاصل کیا اور انہیں کے تاثرات سے متاثر ہوا۔ اس کے کلام میں تخیل کی بلندی و تنگی پائی جاتی ہے اور اس کی یہ دلی کوشش ہوتی ہے کہ شستہ

الفاظ و محاورات استعمال کئے جائیں اس کے اشعار میں ہندی اور فارسی عنصر ملحوظ لفت و نفس مضمون مساوی تناسب رکھتا ہے اس کا مہمصر سراج بھی اچھا شاعر ہے اور اس سے زیادہ صاف زبان استعمال کرتا ہے۔

اردو شاعری کا ارتقائی زمانہ میر تقی (۱۱۳۷ھ — ۱۲۲۵ھ = ۱۷۲۳ء — ۱۷۹۷ء) سے شروع ہوتا ہے۔ تیر کی شاعری ان کی زندگی کا آئینہ ہے۔ وہ ایک ایسے صالح دیوبند کے صاحبزادہ تھے جس نے جماعت سے تمام تعلقات منقطع کر کے دنیا سے انزوا اختیار کر لیا تھا۔ لہذا ان کی ابتدائی عمر کا وہ زمانہ جس میں اثر پذیری کی خاصیت بہت زیادہ ہوتی ہے درویشوں کی صحبت میں گزرا۔ گیارہ برس کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا۔ اس پر انہوں نے اپنے وطن آگرہ سے دلی کی جانب ہجرت کی تاکہ کوئی ذریعہ معاش حاصل کریں۔ اس وقت شایان منخلیہ کی سلطنت کی بنیادیں متزلزل ہو چکی تھیں۔ مرہٹوں اور جاٹوں کی لوٹ مار اور احمد شاہ درانی کے پے در پے حملوں نے اس کے لیے سب سے وقار کو بھی خاک میں ملا دیا تھا۔ ان باتوں سے ان کے آئینہ دل پر ٹھیس لگی۔ ان کی شاعری میں فطرت و حزن یاس کا محرک ہی امر ہے۔ ان کے اشعار میں ترنم اور طرب بیان میں دل آویزی، سادگی اور صلاوت پائی جاتی ہے۔ یہ ایسی خوبیاں ہیں جو دیگر شعرا میں بہت کم ملتی ہیں۔ تیر کی غزلیات و مثنویات اردو ادب میں بہترین خیال کی جاتی ہیں اور ان کی برتری اردو کے قریباً تمام شعرا نے تسلیم کی ہے۔ وہ خلیق اور خود دار تھے مگر ان کی خود داری و تمکنت بد دعا کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ وہ بید مضابط و با اصول زندگی بسر کرتے تھے۔ شاہ عالم (۱۱۵۹ء — ۱۸۰۶ء) کے عہد حکومت میں جب شاعری کا بازار سرد پڑ گیا اور کوئی معاون و سرپرست نہ رہا تو بیشتر شعرا نے لکھنؤ کا رخ کیا جو اس وقت ایک ذی شان سلطنت کا پایہ تخت تھا

تیر بھی نواب آصف الدولہ کے مدعو کرنے پر لکھنؤ چلے گئے اور اپنی وفات ۱۷۹۹ء تک وہیں رہے +

سودا (۱۱۲۵ھ - ۱۱۹۵ھ = ۱۷۱۳ء - ۱۷۸۱ء)
تیر کے ہم عصر شاعر تھے لیکن تیر کے مقابلہ میں ان کا رتبہ بہت کم ہے وہ نہایت مغلوب الغضب انسان تھے اور اپنے متعلق کسی قسم کی تنقید برداشت نہ کر سکتے تھے جس سے ذرا ناخوش ہوتے جو دس کا طومار باندھ دیتے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ خواجہ میر درد (۱۱۳۳ھ - ۱۱۹۹ھ = ۱۷۲۱ء - ۱۷۸۴ء) کا شمسہ و پاکیزہ کلام اس زمانے کے صوفیانہ خیالات کا آئینہ دار ہے حقیقت شناس میر حسن (متوفی ۱۲۰۱ھ = ۱۷۸۶ء) جو میر درد کے پیرو تھے اپنے اشعار میں اس زمانے کے معاشرتی و اخلاقی حالات کا نقشہ کھینچتے ہیں ان کی شہرہ آفاق شہر سحر البیان "جس میں وہ قدرتی مناظر و انسانی جذبات کی تصویر بطریق احسن کھینچتے ہیں سب شہریوں میں بہترین سمجھی جاتی ہے اور مقبول خاص و عام ہے +

اب رنگین و آتش (متوفی ۱۲۳۳ھ = ۱۸۱۷ء) کا دور آتا ہے۔ سودا، تیر، و میر حسن کی طرح یہ دونوں بزرگ بھی لکھنؤ ہجرت کر گئے تھے جو اس وقت کی شائستگی، عیاشی، عشرتی مجالس اور یہودیوں کا مرکز تھا اور یہ خصوصیت اس عہد کی شاعری میں نمایاں ہے۔ رنگین عام طور پر ریختی کے موجد خیال کئے جاتے ہیں ریختی اصناف سخن میں سے ایک صنف ہے جس میں ہر بات عورتوں کے متعلق اور عورتوں ہی کی زبان و محاورات میں لکھی جاتی ہے وہ ہندی الفاظ استعمال کرنے کے سجد شائق ہیں لیکن ان کا معیار بہت پست ہے ان کے اشعار عاشقانہ اور خوش خیالات سے مملو ہیں۔ اس کے خلاف انشاء کے کلام میں ہوا پرستی کے بجائے خوش طبعی کا عنصر غالب ہے مگر بد قسمتی سے وہ ایسے زوال کے وقت پیدا ہوئے جب فخر و حریت کے بجائے غلامانہ ذہنیت اور

نکبت کا دور دورہ تھا وہ زندگی کو دل لگی سمجھتے ہیں ان کے اشعار میں رنگ آمیزی بہت زیادہ ہے لیکن احساسات و حسیات کا فقدان ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ وہ موجد اصطلاحات ہیں اگرچہ ان اصطلاحات نے زبان اردو میں رخنہ اندازی بھی کی مگر اپنی جدت اور ندرت کی وجہ سے اپنا جواب آپ ہیں چنانچہ ان کا علم ادب پر مبرا اور اچھا دونوں طرح کا اثر ہوا اور ان کی کتاب "دریا کے لطافت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ انہیں زبان پر پوری پوری قدرت تھی +

نظیر (متوفی ۱۸۳۰ء) اردو ادب میں یکہ دو واحد حیثیت کا مالک ہے۔ عام طور پر بنظر تحقیر دیکھا جاتا ہے اور کئی تذکرہ نگاروں نے اسے شاعر ماننے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ لیکن وہ ایک خالص ہندوستانی شاعر ہے۔ اگرچہ سوتیلی روش اس کے کلام پر حاوی ہے تاہم وہ اپنی قدرتی نقاشی میں نظیر ہے اس کی وہ نظمیں بہترین ہیں جن میں وہ اپنے وطن کے راگ الاپتا ہے یا ان عام مضامین پر خامہ فرسائی کرتا ہے جو بوڑھوں بچوں اور غریب و امیر سب کے لئے یکساں طور پر خوش آئند ہیں ہندوستان کے قدرتی مناظر کی طرح اس کا تخیل بھی بہت سرسبز و شاداب ہے۔ اس کی متعدد نظمیں جانوروں اور پرندوں کے متعلق ہیں (مثلاً ریچھ کا بچہ، گھری کا بچہ وغیرہ) وہ کنایت اس وقت کے معاشرتی رسم و رواج پر تنقیدی نگاہ ڈالتا ہے۔ اس نے اپنی بعض نظموں میں فحش و انبساط کے ان مناظر کا جو ہندوستانی تہواروں کے موقعوں پر دیکھے جاتے ہیں مرقع کھینچا ہے۔ موسموں کی جو صحیح تصویر تار سی ہے اس کا طرز تحریر اکثر بے ربط ہے اور اشعار نقائص و عیوب سے بھرپور ہیں۔ نہ ہی اسے لفظوں کے انتخاب کا صحیح احساس ہے تاہم وہ عوام کا شاعر ہے اور اپنے اور اپنی تیز بیانی کے درمیان کسی چیز کو حائل نہیں دیکھنا چاہتا +

ذوق (متوفی ۱۲۷۲ھ = ۱۸۵۵ء) ان قدیم فارسی شعرا کے مقلد ہیں جنہوں نے ادبی لفاظی کو فن لطیف میں تبدیل کر دیا۔ ان کے قصائد جو زیادہ تر مغلیہ خاندان کے آخری تاجداروں کی طرح و ثنا میں رقم کئے گئے ہیں اردو ادب میں اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں ان کی غزلیں اتنی بلند پایہ نہیں کیونکہ ان کی طبیعت کو تغزل سے زیادہ مناسبت نہ تھی۔

اُس وقت اردو شاعری ایک خاص حالت پر قائم تھی اس دور کی شاعری زیادہ تر تقلیدی، سوقیانہ اور جذبات سے خالی ہے اور شعرا بار بار انہیں مستعل و فرسودہ خیالات و مضامین کا اعادہ کرتے ہیں جن کو متقدمین ہزار بار استعمال کر چکے ہیں حتیٰ کہ الفاظ تک وہی ہیں۔ ایسے وقت میں غالب آسمان ادب پر ایک درخشندہ ستارے کی مانند جلوہ گر ہوتے ہیں۔

غالب (۱۲۱۲ھ - ۱۲۸۶ھ = ۱۷۸۷ء - ۱۸۶۹ء) ایک جنگجو خاندان کے رکن تھے اور ایک ترکوں کا جوشیلا خون جو ان کی رگوں میں موجزن تھا ان کی نظم میں بھی دوڑتا نظر آتا ہے طالب علمی کے زمانے سے شعر و شاعری کی طرف رغبت کی۔ لیکن ان کے کلام کی اصلی خوبیاں اور محاسن غور شدہ ۱۸۵۶ء کے بعد ظاہر ہوئے۔ یہ بغاوت و دو متضاد و متباہن طاقتوں کے مجادلہ کا مظہر یا نتیجہ تھی اور اُن چیزوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی جو فنا نہ ہونے والی تھیں۔ غالب مغلیہ سلطنت اور اس کے آئین کی مکمل تباہی سے بچھڑتا ہوا تھا اور اسی تاثر نے ان کی شاعری پر دلگدازی اور رقت کا وہ رنگ چڑھا دیا جو اس میں جدت و طلاق پیدا کرتا ہے۔ دنیا کی دیگر نامی گرامی ہستیوں کی طرح یہ بھی اپنے زمانے سے بہت پہلے عالم وجود میں آگئے اور اسی وجہ سے معاصرین میں ان کی کوئی عملی قدر نہیں ہوئی۔ وہ اردو شاعری کی موجودہ تحریک کے پیشرو تھے۔ اردو ادب کی ظہور میں ایک مثال بھی ایسی موجود نہیں جو

غالب سے بلحاظ جدت، بلحاظ بلندی تخیل گونے سبقت لے جاسکے۔ غالب سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے فلسفیانہ خیالات کی اردو شاعری میں ترویج کی۔ اسی وجہ سے ان کے اشعار فلسفہ، تصوف اور رقت و اثر کا دلکش اجتماع پیش کرتے ہیں۔ ان کا طرز بیان تزئینی و پر معنی ہے اور کالوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ نقص یہ ہے کہ محاورات زیادہ تر فارسی کے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے بیشتر اشعار سلیس اور سادہ ہیں۔

فارسی مراثنیٰ میں حضرت امام حسینؑ کی شہادت پر سب سے زیادہ مشہور مرثیہ "ہفت بند" محترم کاشی کا ہے۔ اردو کے مرثیہ گو بھی اسی کو نمونہ بنائے ہوئے تھے۔ لیکن اس صنف میں انیس (۱۸۰۲ء - ۱۸۷۷ء) و دبیر (۱۸۰۳ء - ۱۸۷۷ء) نے بحد ترقی کی ہے۔ ان کی نظموں کی ادبی فضیلت و مذہبی جوش نے ان کا مرتبہ اردو ادب میں بہت بلند کر دیا ہے۔ انیس لڑائیوں کے مناظر کا نقشہ ایسی حست سے کھینچتے ہیں اور کر بلا کے شہد کا ایسا چہرہ اتارتے ہیں کہ تمام واقعات آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔ اشعار ضعیف اور شاندار ہیں اور بعض جگہ اس قدر سادہ ہیں کہ روزمرہ میں استعمال کئے جاسکتے ہیں لیکن حزن و یاس کا پردہ تمام نظموں پر پڑا ہوا ہے۔ بجائے اس کے کہ امامؑ کے بہادرانہ کاموں کو جوشیلے رزمیہ کلام میں بیان کریں انیس و دبیر ان کی تکلیف و مصائب اور ان کی شہادت پر سحر توں کی طرح ماتم کرتے ہیں حضرت امام حسینؑ کے لئے ان مرثیوں میں وہ خاص صفات نہیں بیان ہوئیں جو اُن شہدائے پائی جاتی ہیں جنہوں نے حق کی خاطر جان دی۔ لیکن ان نقائص کے باوجود انیس کو شاعری کے فن اور زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔

لکھنؤ کے تنزل کا زمانہ اردو ادبیات کی تاریخ میں ایک غیر اہم اور رد عمل کا دور ہے شعرا کے مضامین و اسلوب بیان میں کوئی جدت نہیں پائی جاتی اور ان کے اشعار حشو و زوائد و دور از کار تشبیہات سے پر ہیں۔ آتش اور ناسخ دونوں اپنے فن میں باکمال ہیں لیکن وہ اس قابل نہیں کہ اردو کے بڑے شعرا کی صف میں انہیں جگہ دی جائے۔ ان کے پیروں اور شاگردوں کے شعرا کمالات و ذومعنی کلام اور صنعت ایہام تک محدود ہیں۔ دیاندر نسیم (۱۸۱۱ء — ۱۸۴۳ء) کی شنوی جو انہیں ایام میں لکھی گئی سب سے زیادہ یادگار ہے۔ اس کا شمار بہترین نظموں میں کیا جاتا ہے اگر اس میں تشبیہات و پرشکوہ الفاظ کا کثرت سے استعمال عجیب کی حد تک نہ پہنچ جاتا۔ شوق کی متعدد تشنویاں لفظی مرتعوں اور اس وقت کی سوسائٹی کے آزادانہ اور بیہودہ رسم و رواج کا نمونہ ہیں اور ان کے لکھنے میں شاعر نے اپنے خیالات و اجد علی شاہ لکھنؤ کے آخری فرمانروا کے رنگیلے دربار سے لئے ہیں لیکن اگر نظر تعمق سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نے ہزل کو بھی اپنے آرٹ کے ساتھ ملا دیا ہے۔ آخر میں اس کی شنویوں کے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے کہ شاعر نے اپنے فن کو چھوڑ دیا اور ابتذال پر قربان کر دیا ہے۔

داع (۱۸۳۱ء — ۱۹۰۵ء) و امیر (۱۸۲۸ء — ۱۹۰۰ء) کے بعد اردو شاعری کی وہ بنیادیں جو میر تقی نے رکھی تھیں جدا جدا ہو گئیں۔ ان دونوں کی شاعری میں نمایاں طور پر اخطا ط کے اثرات پائے جاتے ہیں دونوں اسی گیر کے فقیر ہیں جس میں عموماً بے معنی لیکن بعض وقت خوبصورت ایہامی و تجنیسی الفاظ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ داع کو طرز بیان پر پوری قدرت حاصل ہے اور انہوں نے اردو میں روزمرہ محاورہ اور دیگر خوش آہنگ الفاظ کو نظم میں کھپا کر اردو زبان میں وسعت پیدا کر دی ہے۔

تنزل کے اس عہد میں جب شاعری محض تقلیدی رہ گئی تھی مغرب کا اثر ملک کی ذہنی زندگی میں سرایت کرنے لگا۔ اہل فرنگ نے ہندوستانی دماغوں کے لئے خیالات کی ایک نئی دنیا پیدا کر دی پرانی روایات میں تبدیلی ہوئی۔ موجودہ سائنس نے مادیات (Objective Arts) کے ذریعہ سے باطنی انانیت (Self-egoism) کو جگہ دی۔ عربی، فارسی کے شان و شوکت و لے الفاظ اور مقفے زبان کے بجائے سادہ اور نیچرل طرز بیان اختیار کیا گیا۔ غرضیکہ اردو علم و ادب میں نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا۔

محمد حسین آزاد اس عہد کی خوبیوں کا بے نظیر مجسمہ ہیں وہ پہلے شاعر ہیں جو مغربی علم و ادب کے چشمے سے اچھی طرح سیراب ہوئے مسیح نثر اور لسانیات (علم السنہ) کے زبردست ماہر تھے لیکن بحیثیت شاعر زیادہ مشہور نہیں۔ حالی پانی پت میں ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۴ء میں انتقال کر گئے۔ ان کا بچپن اور جوانی دلی میں بسر ہوئے جبکہ مغلیہ سلطنت دائمی نیند سو جانے والی تھی اور معاشرتی و سیاسی تغیرات روز کا معمول تھے حالی نے مغلیہ سلطنت کے سورج کو غروب ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ سوان باتوں نے ان کی حساس طبیعت پر گہرا اثر کیا اگرچہ وہ ادبی لحاظ سے غالب و شیفہ کے شاگرد تھے لیکن ذہنی طور پر وہ صحیح معنوں میں عرب قبل از اسلام کے نامور شعرا کے پیرو تھے۔

ان کی ابتدائی نظمیں اسی پرانی تقلید میں تھیں لیکن رفتہ رفتہ زمانے کے انقلاب نے ان پر اپنا اثر ڈالا۔ اور ان کی توجہ دیگر کی طرف مبذول کر آئی۔ انہوں نے اپنے ارد گرد کی سوسائٹی کا مطالعہ بنظر تعمق شروع کیا۔ علی گڑھ کی تحریک ان کے ناصحانہ اشعار کی محرک ہوئی۔ سر سید احمد خان کی کوششوں سے ہندوستان میں نئی تہذیب کا دور دورہ شروع ہوا اور ہندوستانی مسلمانوں کی

تنقید و تنقیص کے لئے استعمال کیا کیونکہ انہیں ان کو تاہ نظر ہندوستانیوں سے جو یورپ کی کورانہ تقلید کر رہے تھے سخت نفرت تھی۔ ان کا طرز بیان شمسہ، پاکیزہ، اور زندہ دلی کی تصویر ہے اور انہوں نے اپنی وسیع علمیت کی بنا پر صنایع و بدائع کا التزام بھی کیا ہے۔ لیکن بتیقن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ آئندہ نسلوں میں بھی قبولیت حاصل کر سکیں گے یا نہیں اگرچہ وہ بلند پایہ شاعر نہیں ہیں تاہم ان کا سرمایہ متقدمین کا شرمندہ احسان نہیں ہے۔

جدید اردو شاعری میں تین شخصیتیں نہایت اہم اور معروف ہیں۔ غالب۔ حالی۔ اقبال۔ غالب کا بلند بخیل اور فلسفیانہ خیالات پرانی شاعری ہی کے تاثرات ہیں۔ لیکن ان کے کلام کی گہرائیوں میں فطرت پرہیز ہے۔ حالی سب سے پہلا شخص ہے جس نے قدیمی شان و شوکت کے کھنڈیروں پر کھڑے ہو کر آنسو بہائے لیکن اب بھی ان کے دل میں اس زبردست خواہش کی آگ بھڑک رہی ہے کہ ان مترنزل عمارات کو پھرنے سے سرے سے تعمیری صورت میں لایا جائے۔ اقبال میں نہ غالب کی سی بلند پروازی ہے اور نہ حالی کی سی رقت۔ لیکن ان میں حوصلہ، جوش، اور قوتِ تعمیر بدرجہ اتم موجود ہے۔ اگرچہ یہ مغربیت کے شیدائی نہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے مغربی تخیل سے اقتساب کیا ہے اس لئے ان کا شاعرانہ نظریہ اور بھی بلند ہو گیا ہے۔ ابتدا میں ان کی شاعری کا رنگ حب الوطنی پر مبنی تھا۔ لیکن بعد میں ان کے خیالات بہرہ بین اسلامک (PAN - ISLAMIC) رنگ غالب آ گیا۔ مسلمانوں کو ان کا پیغام یہ ہے کہ اپنے مذہب پر جم کر اپنے اصولوں کو متحد کریں اور گزشتہ زمانے کے اسلام کے شیدائیوں جیسے خصائص پیدا کریں۔ وہ اس زمانے کا خواب دیکھتے ہیں جب اسلام ایک دن نہ صرف ایشیا، بلکہ تمام دنیا

دماغی و معاشرتی زندگی میں ایک نئی لہر دوڑنے لگی۔ حالی موجودہ دور کی اس نئی تحریک کے پہلے شاعر تھے۔ انہوں نے اپنے ”مسدس“ میں صرف مردہ تاریخ کو ہی از سر نو زندہ نہیں کیا بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے قومی جذبات کا بھی پوری طرح خاکہ کھینچا ہے اگرچہ ان کی شاعری میں یاس ہندی کا عنصر غالب ہے لیکن حق کے لئے ان کی جوش بھری تمنائیں میناب ہیں اور اس عمارت کو دوبارہ تعمیر کرنے کی آرزو مند ہیں۔ ایک بڑے شاعر ہونے کے علاوہ حالی ہندوستانیوں کے لئے انگریزی ادب کے ترجمان بھی ہیں لیکن وہ صحیح معنوں میں حقیقت شناس ہیں اور مغربی خیالات کی ہستی ہوئی تیز رو میں ان کے قدم بالکل نہیں ڈگمگاتے۔ حالی سے قبل کا لٹریچر ایک خاص جماعت کے خیالات کا آئینہ دار تھا مگر انہوں نے اس کا دروازہ عوام الناس کے لئے کھول دیا۔ اور اپنے جذبات کا اظہار ایسی زبان میں کیا جو ان کے اس مقصد کی تکمیل کے لئے لازمی اور ضروری تھا۔ اس اقدام سے جیسا کہ عیاں تھا مخالفانہ تنقیدوں کا طوفان اٹھ آیا۔ لیکن ضروریاتِ زمانہ نے ان کے مخالفوں کے خلاف انہیں سچا ثابت کر دیا۔ ان کی زبان بے عیب ہے اور وہ ہندی الفاظ کا اپنے اشعار میں نہایت خوبصورتی و صفائی سے استعمال کرتے ہیں۔

نئے خیالات کے اس بے پناہ سیلاب کے سامنے جو پرلے رسم و رواج کو ہبا کر لے جا رہا تھا۔ اکبر حسین (۱۸۷۶ء - ۱۹۲۱ء) نے اپنی آواز کو مشرقی تہذیب کی حمایت میں بلند کیا۔ یورپ اور اس کی یہودہ رسوم کے مداحوں کو اپنے طعنوں کا ہدف بنایا۔ ہاشاک کہ علی گڑھ کی موجودہ تحریک بھی ان سے اپنا دامن نہ بچا سکی۔ انہوں نے اسلام اور اسلامی تہذیب کو خطرات سے گھرے ہوئے اور مغربی مادیات کی بے پناہ لہروں میں بہتے ہوئے دیکھا اور اس لئے اپنی شاعری کا نصب العین ہی قرار دیا کہ اپنے ہموطنوں کو اس مصیبت اور آفت سے بچایا جائے۔ ان خیالات کو انہوں نے

کے لئے موجب نجات بن جائے۔ اب انہوں نے اپنی تمام دماغی قابلیت اردو ادبیات کے بجائے فارسی ادبیات کی طرف مبذول کر لی ہے کیونکہ ان کے خیال میں ان کی ملکی زبان اردو کی بہ نسبت فارسی زبان ان کا یہ عالم گیر پیام تمام دنیا میں پہنچانے کے لئے زیادہ مفید اور کارآمد ہو سکتی ہے۔

اردو نثر کی ابتدا کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اس زبان کی ابتدائی تصنیف و تالیف بھی دکن ہی سے شروع ہوئی لیکن اس وقت کی مصنفات کا نفس مضمون زیادہ تر مذہب و قصوت ہی تھا اور سوائے ”سب رس“ (۱۰۷۵ھ = ۱۶۳۵ء) کے جو مسیح و مفتی عیار میں لکھی ہوئی ہے کوئی بھی ادبی اہمیت نہیں رکھتی۔ شمالی ہندوستان میں غدر کے بعد تک تصنیفات کا سلسلہ فارسی ہی میں رہا اور عموماً خط و کتابت بھی اسی زبان میں کی جاتی تھی۔ دلی کے شاہ رفیع الدین (۱۱۶۳ھ — ۱۲۳۳ھ = ۱۷۵۰ء — ۱۸۱۸ء) و عبدالقادر (۱۱۵۷ھ — ۱۲۳۰ھ = ۱۷۷۸ء — ۱۸۱۵ء)

وہ لوں نے قرآن شریف کا اردو ترجمہ کیا۔ لیکن ان کے تراجم بالکل لفظ بلفظ تھے۔ موجودہ نثر کی بنیاد فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں رکھی گئی جس کا سنگ بنیاد لارڈ ولزلی نے سنہ ۱۸۰۰ء میں رکھا تھا۔ جو زبانیں وہاں پڑھائی جاتی تھیں ان میں سے فارسی اور ہندوستانی یا اردو پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ ڈاکٹر جان گلکراٹسٹ جو کالج کے مہتمم تھے اور اردو زبان میں بڑی دلچسپی لیتے تھے صحیح طور پر اردو کے مرقی و سرپرست کہلانے کے مستحق ہیں وہ کئی ہندوستانی کتابوں کے مؤلف بھی تھے۔ اسی زمانے میں میرامن مؤلف ”باغ و بہار“ یا قصہ چار درویش“ (۱۸۰۱ء — ۱۸۰۲ء) اور میر شیر علی افیس مؤلف ”آرائش محفل“ (۱۸۰۵ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ بالا دونوں کتابیں زبان و خوبی بیان کے لحاظ سے قابل ستائش ہیں۔ خاص طور پر ”باغ و بہار“ ادبیات اردو میں ہمیشہ کے لئے موجب فخر و مباہات رہیگی ان تراجم و تالیفات کا

جو فورٹ ولیم کالج کے زیر سایہ لکھی جا رہی تھیں ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اردو کے مصنفین میں سادہ و صاف زبان کے استعمال کا شوق پیدا ہو گیا۔ پرانی مسیح و مفتی اعجازتیں اور فارسی و عربی کے ثقیل الفاظ کا رواج کم ہونے لگا۔ لیکن ان میں سے زیادہ کتابیں کمائیوں اور افسانوں کے متعلق تھیں اور یہ کام سرسید احمد خاں (۱۸۱۳ء — ۱۸۹۸ء) کو سرانجام دینا تھا کہ وہ متین اور علمی مضامین فصیح و سادہ زبان میں لکھ کر آئندہ نسلوں کے لئے مشعل راہ بنیں ان کے رسالہ ”تہذیب الاحسن“ نے اردو زبان میں انقلاب برپا کر دیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مشہور شاروہی ہیں جو یا تو براہ راست سرسید احمد خاں کے زیر اثر ہے یا دلی کالج سے متعلق تھے جہاں مضامین اردو زبان میں پڑھا۔ گئے جاتے تھے اور دیگر زبانوں سے اردو میں تراجم بھی کئے جاتے تھے۔ اس موقع پر غائب کے خطوط بھی نظر انداز نہیں کئے جاسکتے۔ جو ”اردوئے معلیٰ“ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

عہد حاضر کے مشہور نثر مند رجہ ذیل ہیں :-

محمد حسین آزاد۔ ان کی تحریر شستہ و پاکیزہ ہے اگرچہ ان کی کتابیں تصنع سے نہیں بچ سکیں لیکن اپنے اندر سادگی و رنگینی کا ایک خاص پہلو لئے ہوئے ہیں ان کی کتاب ”آب حیات“ جو شعر کی سوانح عمری ہے اردو ادبیات میں ہمیشہ زندہ رہیگی۔
خواجہ الطاف حسین حالی۔ نظم و نثر دونوں میں کیتلے فن تھے ان کا طرز تحریر متین اور زور دار ہونے کے علاوہ فصیح ہے وہ اردو ادبیات میں تنقید اور سوانح نگاری کے موجد ہیں۔ ان کی تصانیف حیات سعدی، یادگار غالب اور مقدمہ شعر و شاعری اردو علم و ادب میں شاندار اضافہ ہیں اور ان کی کتاب ”حیات جاوید“ (سرسید احمد کی سوانح عمری) اردو نثر کی چوٹی کی کتابوں میں ہے۔
نذیر احمد (۱۸۳۱ء — ۱۹۱۲ء) بڑے عالی پایہ مصنف اور

مقرر تھے۔ انہیں زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ وہ عربی و فارسی محاورات و الفاظ کا استعمال کثرت سے کرتے تھے لیکن باوجود اس کے ان کی زوردار زبان پڑھنے والوں کے دلوں میں تیر و نشتر کا کام کرتی ہے۔ ان کے ناول مثال کے طور پر 'مرآة العروس'، 'توبة النصوح'، 'فسانہ بنتلا' اردو کے قدردانوں میں ہمیشہ بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جائینگے۔ قرآن شریف کا جو ترجمہ انہوں نے اردو زبان میں کیا ہے وہ بلا شک و شبہ دیگر تمام تراجم سے بہتر و برتر ہے۔

شبلی (۱۸۵۷ء — ۱۹۱۴ء) علی گڑھ میں پروفیسر تھے۔ تاریخ کا ذوق صحیح معنوں میں انہوں نے ہی اردو دان طبقہ میں پیدا کیا۔ مجملہ ہاداران اسلام کے سوانح لکھنے کے انہوں نے کئی کتب مذہب اسلام کے متعلق لکھیں وہ ایک مشہور ادبی نقاد تھے۔

ناول نگاری اردو ادبیات میں رتن نامتھ سرتشار (۱۸۷۷ء — ۱۹۰۲ء) سے شروع ہوئی۔ ہے اُن کی شہرہ آفاق کتاب 'فسانہ آزاد' اگرچہ صحیح طور پر ناول نہیں کہی جاسکتی لیکن اس میں لکھنؤ کی سوسائٹی کا نقشہ نہایت خوش اسلوبی سے کھینچا گیا ہے۔

عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰ء — ۱۹۲۶ء) کے ناول زیادہ تر تاریخی ہیں۔ لیکن کردار نگاری کے لحاظ سے کمزور ہیں۔ درحقیقت نذیر احمد کے چند ناولوں کے سوا اردو زبان میں کوئی بھی لمبہ پایہ ناول نہیں لکھا گیا۔ شرر کے ناولوں نے اگرچہ ادبی ذوق پیدا کر دیا لیکن اس سے زیادہ انھوں نے کوئی خدمت انجام نہیں دی۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد پر ڈراما کو بھی ترقی دینے کا شوق پیدا ہوا۔ اور پہلے پہل پارسی لوگوں نے اسے قبولیت عامہ کا جام پہنایا چنانچہ کئی معمولی ڈرامے اور ڈرامہ نویس پیدا ہو گئے۔ لیکن اس وقت تک ایک ڈراما بھی ایسا نہیں لکھا گیا جو خاص طور پر قابل ذکر ہو۔ اگرچہ شروع میں انگریزی زبان کے اثر نے ہندوستانی نوجوانوں کو اپنی زبان اردو سے برگشتہ کر دیا جس کا سبب موجودہ طرز تعلیم تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ جب ان کے ادبی ذوق میں بچگی و متانت آگئی انہوں نے اپنی مادری زبان کی طرف جوش اور سرگرمی سے رجوع کیا۔ اور سائنس و آرٹ پر یورپ کی زبانوں سے تراجم کر کے اپنی زبان میں وسعت پیدا کر دی۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو اور نگ آباد کن و عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن معہ دار ترجمہ اردو زبان کی ترقی کے لئے پیش پیش نظر آتی ہیں۔ غرضیکہ لوگوں میں اپنی زبان کے لئے احساس پیدا ہو گیا ہے اور وہ اس کی ترقی میں کوشاں نظر آتے ہیں اور گزشتہ چند سالوں میں بہت سے رسائل اردو کی ترقی کے لئے جاری ہو گئے ہیں جن میں سے متعدد اس زبان کی خدمت بطریق احسن سرانجام دے رہے ہیں۔

ترجمہ: سردار عبدالحکیم

بجنوری

صبحِ بنارس

جوگی کی صدا

یہ نتھری نتھری آنکھیں یہ لنبی لنبی پلکیں
یہ تیکھی تیکھی چتون یہ سندر سندر درشن

مایہ ہے سب مایہ ہے

یہ گوڑے گوڑے گال یہ کالے کالے بال
یہ پیاری پیاری گردن یہ ابھرا ابھرا جو بن

مایہ ہے سب مایہ ہے

کل جھوٹا ہے سنسار اک سچا سرجن ہمار

عبدالرحمن بجنوری (۲۶)

سید محی الدین قادری زور بدرمنیر اور مرزا قاتل

میر حسن (۱۱۴۰ تا ۱۲۰۱) کی فنوی سحرالبیان (مصنف ۱۱۹۹ھ) جو فنوی ”بے نظیر و بدرمنیر“ کے نام سے مشہور ہے، اردو زبان کی بہترین فنوی سمجھی جاتی ہے۔ زبان کی لطافتوں اور اسلوب کی علاوتوں کے علاوہ موضوع کی دلکشی اور رجال قصہ کے گوناگوں کردار اس کو اردو کا ایک واقعی بے نظیر شہ کار ثابت کرتے ہیں۔

اس فنوی کو جو غیر معمولی وقعت اور مقبولیت حاصل ہوئی اس کا اندازہ صرف اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس کے مصنف کے دوسرے کارناموں کو گمن لگ گیا، اور بہت کم لوگ واقف ہیں کہ میر حسن اپنے عصر کے بہترین قصیدہ گو تھے، اور مرزا رفیع کے انتقال کے بعد لکھنؤ میں ان کی فکر کا کوئی شاعر موجود نہ تھا۔ انہوں نے نہ صرف اعلیٰ پائے کے قصیدے لکھے، بلکہ سحرالبیان کے علاوہ آٹھ اور فنویاں بھی لکھیں، مگر ان سبھوں کو ”بے نظیر و بدرمنیر“ کی تابناکیوں نے ماند کر دیا۔ انہوں نے غزلوں کا ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا جس میں چار ہزار سے زیادہ شعر موجود ہیں، اور جو اپنی بعض خصوصیتوں میں۔ خاص کر ادبندی کے لحاظ سے نہایت دلچسپ ہے۔ ان کے علاوہ میں ترکیب بند اور ڈیڑھ سورتیاں لکھیں جو اپنے موضوعوں اور شکلوں کی گونا گونی کے باعث قابل ذکر ہیں۔

لیکن میر حسن کا یہ تمام کلام اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے مخطوطے بھی نہایت کم یاب ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری گذشتہ نسلیں اور خود میر حسن کے معاصرین بھی ”سحرالبیان“ کی سحر طرازیوں میں اس قدر محو ہو گئے کہ ان کے دوسرے کلام کے مطالعہ کا خیال بھی نہیں کیا۔ میر حسن نے جس زمانے میں یہ فنوی لکھی وہ لکھنؤ کا عہد زریں تھا، اور اطراف ہندوستان کے اکثر صاحبان فضل و کمال وہاں موجود تھے۔ شعر و شاعری کا ذوق رکھنے والوں میں سودا، میر، سوز، قتیل، فضا، مصحفی، انشا، جرات اور رنگین وہ ارباب کمال تھے جنہوں نے لکھنؤ میں اردو ادب اور شعر و شاعری کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔ ہمارے قیام یورپ کے زمانہ میں اردو زبان اور ادب کے ارتقائی مدارج اور تحریکات پر تحقیق و تفتیش کے سلسلہ میں برٹش میوزیم میں ایک ایسی قیمتی کتاب ہماری نظر سے گذری جس میں اس عہد کی علمی و ادبی مشغولیتیں بھی ضمناً قلمبند کر دی گئی ہیں، اور چونکہ ضمناً ہی اسی لئے بہت دلچسپ ہیں، اور ان کی صداقت اور غیر جانبداری پر کم شبہ ہو سکتا ہے۔

۱۔ یہ تفصیل برٹش میوزیم کے ”کیبات میر حسن“ کے مخطوط کے مطالعہ سے حاصل کی گئی ہے۔

اس مخطوط کا نام "تنبیہ الجاہلین" ہے، جس کو سدا سکھ نیاز دہلوی نے ۱۲۳۴ھ میں تکمیل کو پہنچایا۔ وہ غالباً ۱۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے مرزا نجات خاں کے زمانے میں آگرہ کے قریب پرگنہ باڑی کے سرشتہ دار تھے۔ اختتام ملازمت پر آگرہ میں چند روز قیام کیا اور پھر دہلی چلے گئے۔ چونکہ سیر و سیاحت کا شوق تھا ۶۵ برس کی عمر میں الہ آباد کے ارادے سے دہلی سے نکلے۔ لکھنؤ میں بھی کئی سال تک قیام رہا۔ چنانچہ اس قیام کے تاثرات میں یہ کتاب "تنبیہ الجاہلین" لکھی گئی۔ اس وقت ان کی عمر قریب ۷۵ سال کی تھی اور پانچ سال سے وہ اس کی ترتیب میں مصروف تھے۔

اس کتاب کے علاوہ سدا سکھ دہلوی نے ایک اور کتاب "مختب التواریخ" بھی مرتب کی تھی جس میں غزنیوں کے عہد سے اکبر ثانی تک کے تاریخی حالات درج تھے۔ سرسہری الیٹ نے ان کی اولاد سے الہ آباد میں یہ کتاب حاصل کی تھی چنانچہ اس کے متعلق اپنی "تاریخ ہند" کی آٹھویں جلد میں چھ صفحات وقف کئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سدا سکھ کا اصل منشا یہ تھا کہ بہادر شاہ اول سے اپنے زمانے تک کے حالات تفصیل سے لکھیں چنانچہ اس میں عہد شاہ عالم کی نسبت خاص کراہم مواد درج تھا۔

سرسہری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سدا سکھ آخر عمر میں انگریزی حکومت کے تحت چٹار میں ملازم بھی تھے۔ انہوں نے دس سال کے عرصہ میں قریب ایک سو پچیس ہزار اردو و فارسی اور بھاکا شعر لکھے اور پانچ ہزار صفحات کی نثر بھی لکھی۔ چنانچہ ان کاموں کے بعد "مختب التواریخ" شروع کی تھی جس کی تکمیل کے بعد انہوں نے الہ آباد ہی میں وفات پائی۔ ان کا خاندان وہیں سکونت پذیر ہو گیا۔

"تنبیہ الجاہلین" کو سدا سکھ دہلوی نے آٹھ مقالوں میں تقسیم کیا ہے جن کی تفصیل دیکھی سے خالی نہیں :-

مقالہ اول میں ہندوستان کے مختلف مذاہب کا ذکر

مقالہ دوم میں شرح اقوام براہمنہ و راجپوتیہ وغیرہ

مقالہ سوم میں دوازدہ سالہ قحط و طہارت اور دیوکرم وغیرہ

مقالہ چہارم میں تنبیہ فرقہ وغیرہ

مقالہ پنجم میں ذکر روایات غریب دیدہ و شنیدہ

مقالہ ششم میں درجن ہائے عجیب و حالات حیوانات بری و بحری

مقالہ ہفتم میں احوال زمان ماضی

مقالہ ہشتم میں در بعض علوم کہ فارسیاں ازاں اطلاع ندارند

اس کتاب کا تحقیقی مطالعہ اس عہد کے ہندو رسم و رواج اور عام تمدن سے متعلق متعدد حالات پر روشنی ڈال سکتا ہے۔ ہر مقالہ

معلومات سے پر ہے۔ افسوس ہے کہ نقل کرنے والے کا خط خراب ہے، اور الفاظ خلط ملط کر دئے ہیں۔ اکثر مقالوں میں مصنف کی ذیلی ترتیب بنا بہت علمی تھی، لیکن کاتب نے بہت سے حصے چھوڑ دئے ہیں اور جا بجا ذیلی عنوانات کے تحت لکھا ہے کہ "تشریح ان نگاشتن ضرور نیست"۔ مقالہ ہفتم پورا چھوڑ دیا گیا ہے۔ مقالہ ششم کا بھی ابتدائی تہائی حصہ غائب ہے۔ البتہ اس کا آخری حصہ موجود ہے جس میں اردو شاعروں کے متعلق بھی نہایت اہم معلومات درج ہیں۔

سدا سکھ دہلوی نے دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہوں کے اردو اور فارسی شاعروں سے ملاقاتیں کی تھیں، اور ان سے فیض صحبت حاصل کیا تھا

ہیں۔ ان کا تذکرہ شعرائے فارسی، اصل میں قاتل ہی کے مواد اور کادشوں پر مبنی ہے جیسا کہ انہوں نے دیباچہ میں لکھا ہے :-
 ”مرزا محمد حسن قاتل تخلص کہ مفصل احوال ایشان در حدود انصاف سمت تحریر خواہد پذیرفت، در ایامیکہ مجلس مشاعرہ بہ غیر غزل زمینت انعقاد داشت
 از سیاحت لشکر نواب ذوالفقار الدولہ بہادر بشا ہجمن آباد گذر افگندہ زمرہ غزل فارسی بگوش اس مزاج دان سخن رسانیدہ باعث شعر فارسی
 خواندن در مجلس ریختہ گویاں گردید اکثر دران روز ماہم ہم طرح بودیم و از یکدیگر گوئے سبقت می ربودیم۔
 و چون مرزا کے مذکور خلی سیاحت کہ وہ در مجلس وضع و شریف رسیدہ، نظم و نثر از اشعار و احوال معاصرین جستہ جستہ بر بیاض خاطر خود
 منقوش داشت۔ روزے آں ہمہ رطب و یابس را بنظر قبول من نہ میانمود۔ ضون تالیف تذکرہ معاصرین بگو شتم دیدہ آسای چند از آہنا
 بقلم تحریر من در آورد۔ و مسودہ احوال بعضی را بر بیاض مختصرے بدست من نویسانیدہ۔“

غرض قاتل کی نسبت ان کے معاصرین کی تحریروں سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک شریف اور با اخلاص اہل علم اور ادیب تھے۔ اور
 ہر ایک کی خاموش مدد کیا کرتے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ میر حسن کی شنوی نگاری میں بھی مدد کی ہو اور ”سحر البیان“ میں اصلاحیں دی ہوں جن کا
 ذکر انشاء اور مقحفی کی طرح میر حسن نے اپنی کتاب میں نہیں کیا۔ اور یہ بھی ضروری نہ تھا کیونکہ نظم میں نثر کی کتابوں کی طرح دیباچہ یا مقدمہ وغیرہ
 میں اس قسم کے امور کے ذکر کا عام طور پر رواج نہ تھا۔ البتہ کتاب کے آخر میں انہوں نے مرزا قاتل کی تعریف کی ہے، اور یہ ضرور لکھا ہے کہ انہوں
 نے ان سے شنوی سنی اور اس کی تاریخ لکھی۔ میر حسن لکھتے ہیں :-

میر حسن ایک مشفق ہیں مرزا قاتل	جو ہیں شاہراہ سخن کی دلیل
سنی شنوی جب یہ مجھ سے تمام	دیا اس کی تاریخ کو انتظام
زبس شعر کہتے ہیں وہ فارسی	ہر اک شعر ان کا ہے جوں آری
انہوں نے شتابی اٹھا کر مسلم	یہ تاریخ کی فارسی میں رستم
”بتغیث تاریخ این مشنوی	کہ گفتش حسن شاعر دہلوی
زدم غوطہ در بحر فکر رسا	کہ آرم بکف گوہر مدعا
بگو شتم ز ہاتھ رسید این ندا	برا پس مشنوی باد ہر دل صدا

کیا تعجب ہے کہ سدا سکھ نیاز دہلوی کا مندرجہ بالا بیان کہ مرزا قاتل نے میر حسن کی شنوی میں بہت اصلاح دی ہے، میر حسن کے
 مصرع ”کہ ہے شاہراہ سخن کی دلیل“ کی تفسیر ہو!!

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور



ناگامیان

گاڑی بان

جب گاڑی بان لایا گیا تھا شاید یوں نے ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ مختلف قسم کی آوازوں کے درمیان کبھی کبھی ایک ایسی آواز سنائی دے جاتی تھی جیسے کوئی چیخ رہا ہو۔

گاڑی بان تفکرات میں کھویا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کے قدم بھاری بھاری معلوم دیتے تھے۔ یہ مختصر سا راستہ اس کے لئے ایک دشوار گزار منزل سے کم نہ تھا۔

وہ حاکم عدالت کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ لوگوں کی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سب کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن کسی کو پہچان نہ سکتا تھا۔ آخر ایک قانون دان نے اس کی طرف سے ایک درخواست پڑھی جس میں اس کے بچوں اور بیوی کی طرف سے آنسو بہائے گئے تھے۔

عدالت نے پوچھا۔ ”کیا تم مجرم ہو؟“

قیدی نے نگاہ اٹھا کر سامنے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں امید کی دھیمی دھیمی روشنی چمک رہی تھی۔ اس نے جرات سے کہا۔ ”جی نہیں۔ میں مجرم نہیں۔ میں ایک سیدھا سادا گاڑی بان ہوں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا باپ اور ایک ذمہ دار انسان۔ قدرت کی جانب سے مجھ پر بہت سے فرائض عائد ہیں۔“

پھر اس نے اپنے ہم پیشہ لوگوں کو دیکھا جو ہمدردی سے اس کے جوابات پر کان لگائے ہوئے تھے۔ اس نے ان کے چہروں سے استقلال حاصل کرتے ہوئے کہا:-

”میں ایک گاڑی بان ہوں۔ گاڑی بان میرا آبائی پیشہ ہے۔ میرا باپ بھی گاڑی بان تھا۔ بڑا دیانتدار۔ ابھی تک عزت سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں نہ سزا پائی نہ کبھی جرم کیا۔ لوگ کہتے ہیں وہ ایک صحیح قسم کا گاڑی بان صرف گاڑی بان تھا۔“

”جی ہاں گھوڑا گاڑی میرا ہے لیکن میرے سر پر کچھ قرضہ بھی ہے۔ کچھ دن ہوئے میں نے اپنی لڑکی کی شادی کی ہے۔“

”میرا داماد؟ وہ ایک بڑھئی کا لڑکا ہے۔ خود بھی بڑھئی کا کام کرتا ہے۔ میں مطمئن ہوں۔ وہ بڑا خلیق ہے۔ چھوٹے بڑے سب کی عزت کرتا ہے۔“

— ”جی ہاں جو کچھ بیان کرونگا حلیفہ بیان کرونگا“

— ”میں اس پیشہ کو پسند کرتا ہوں یا نہیں یہ میری موجودہ حالت سے پوچھئے۔“

— ”جی نہیں میری زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں یہاں اس رسوائی سے لایا گیا ہوں۔“

— ”یہ غلط ہے کہ میں سزا یافتہ ہوں نہ میرا باپ سزا یافتہ تھا۔ نہ میں کبھی گواہی دینے یہاں آیا ہوں۔“

— ”نشہ؟ جی نہیں۔ ہاں جو ضرور کھیلتا ہوں لیکن وہ بھی سال میں ایک بار۔ اس کا نتیجہ اچھا ہوا یا برا یہ میں ہمیشہ قیمت پر چھوڑ دیتا ہوں۔“

— ”قول یہ فعل کا پابند ہوں۔ جو کچھ کہوں اس پر پورا اترنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

— ”یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جو کچھ بیان کرونگا حرف بھرت درست ہوگا۔“

’شام ہو چکی تھی میں روزی کی فکر میں کھڑا آٹنے جانے والوں کا منہ تک رہا تھا۔ میرے ہاں اولاد کی کثرت ہے۔ میں روزی کمانے میں کچھ غیر معمولی طور پر لالچی واقع ہوا ہوں۔ جب اڈے میں کھڑا ہوتا ہوں۔ یہی خیال کرتا ہوں کہ جو آتا ہے مجھے ڈھونڈتا آتا ہے۔‘
’تمہاری بچی پھیل رہی تھی۔ میں نے اپنے پیچھے ایک آواز سنی۔ آواز میں ایک دستار سا تھا۔ میں نے پیچینی سے پلٹ کر دیکھا۔ مجھے یقین بھتا کہ میری روزی کبھی آ رہی ہے۔ سردی کی شدت سے فضا میں دھند اور غبار تھا۔ سواری سر سے پاؤں تک ایک بڑا بسادہ اوڑھے میرے پیچھے کھڑی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ‘آپ کہاں جاینگے؟‘

— ”جوار کے قریب۔“

میں جوار کا نام سن کر کانپ اٹھا لیکن سواری بیٹھ چکی تھی اور میں گھوڑا چلانے پر مجبور ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے دل سے کہا۔ جوار بہت دور ہے۔ بہت ہی دور۔ دریا کے پار گھنے درختوں میں۔ جنگلوں کے درمیان جہاں انتقام کھلم کھلا کھیلتا ہے۔
میرے بچے۔ میری دنیا۔ میرے خرائٹس۔ سب میری یاد سے ایک آوارہ لہر کی طبع بل کھا کر گزر گئے۔ میں بالکل خاموش تھا۔ اتنا بھی خیال نہ کر سکا کہ یہ کام اس سنان اور بھیا تک رات میں میرے لئے کس قدر مشکل ہوگا۔ جوار جن کا نام سن کر دن کے وقت بھی ڈی خوف کھانے لگتا ہے پاؤں لڑکھڑانے لگتے ہیں مجھے دبا جانا تھا۔ آخر اس وقت وہاں کیا ہوگا۔ جہاں سانپ زہر لگاتے ہیں اور حبیب درندے اپنی خوفناک آوازوں کے ساتھ دباڑتے ہیں۔

میں گھوڑا ہانکے جا رہا تھا۔ میں نے کہیں دور کچھ روشنی دیکھی جیسے چراغ ٹٹا رہا ہو۔ پھر کھنڈروں کے نشان۔ ایک گنبد۔ کچھ شکستہ دیواریں یہ سب مجھے یکے بعد دیگرے نظر آئے اور میرے خوف و ہراس کو ایذا دہانے میں مددگار ہوئے۔ اس ضمن میں جو خیالات میرے ذہن میں آئے میں انہیں محض وہم سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر میں نے جرات سے منہ پھیر کر سواری کو دیکھا سواری نہایت مطمئن۔ متین صورت بنائے میری پیٹھ سے پیٹھ لگائے بیٹھی تھی۔ میں گاڑی کے ہچکولوں کے باوجود اپنی جگہ پر بیٹھا تھا مختلف قسم کے خیال سرعت سے میرے ذہن میں رنگ رنگ کی تصویروں بن کر آ رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں کمزور ہوتا جا رہا ہوں۔ میں اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ سب کچھ وہم ہے۔ تم گاڑی بیان ہو۔ یہ تمہارا آبائی پیشہ ہے۔

تمہاری اور تمہارے بچوں کی روزی کا وسیلہ۔ اندھیرا ہے تو کیا؟ دور جانا ہے تو کیا؟ یہ مزدوری ہے۔ گاڑی بان کا کام سواری کو اس کے مقام تک پہنچانا ہے۔ اگر تم اپنا کام دیانت داری سے انجام دو گے تو تمہارا حق تمہیں مل جائیگا۔

میرے دل نے اس قسم کے بہت سے دلائل پیش کئے۔ مگر وہم جو میرا نقاب کر رہا تھا سحر سے کم نہ تھا۔ سواری کی وحشت خیز خاموشی بھیہناک خواب کی طرح میرا نگلا دبا رہی تھی۔ میں مضطرب تھا۔ حلق سے آواز تک نہ نکلتی تھی۔ گویا قوت گویائی کھو چکا تھا۔..... بعض اوقات کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ گھوڑا گٹھڑی۔ سواری سب کا بوجھ مجھ پر ہے اور میں ان کے نیچے روند جا رہا ہوں۔ گھوڑا ڈگر پر برابر بغیر کسی سچپنی کے چلا جا رہا تھا۔ اس تمام عرصے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ نہ میں نے سواری کو مخاطب کیا نہ سواری نے مجھ سے کوئی سوال کیا۔ جس کا میں جواب دیتا۔

ہم دریا کے پل پر سے گذر رہے تھے۔ گاڑی کے پیہوں کی آواز بلند اور کچھ نا آشنا سی معلوم ہو رہی تھی۔ آخر کار سواری کو مخاطب کرنے کی غرض سے میں نے دیدہ دانستہ گھوڑے کو غلط راہ پر ڈال دیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ سواری اس پر معترض ہوگی اور میں فوراً جلدی جلدی تین چار سوال کر دوں گا جس طرح بھی بن پڑا اپنے دوسو سو کو اطمینان سے بدل لوں گا۔ اس وقت میرے لئے بہترین موقع ہو گا کہ میں اس کا اور اس کے ارادوں کا غور و خوض سے مطالعہ کروں۔ اور جوار جانے کی غرض و غایت کو سمجھ لوں۔ میں نے بار بار اس کی طرف دیکھا لیکن اس کی خاموشی میں کوئی فرق نہ آیا۔ دریا کا پل چھوڑتے ہی اس نئے راستے پر پہنچ کے مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ کوئی غار ہے جس کے اندر ہم اندھا دھند چلے جا رہے ہیں۔ اگر یہ راہ ایک غار ہی ہے تو یقیناً اس کا کہیں اختتام بھی ہو گا۔ وہاں موت کے قہقہے فضا میں چکر کاٹ رہے ہوں گے۔ اور ان دہشتناک ہنگاموں میں زندگی ناممکن ہوگی۔

کبھی یہ خیال آتا کہ ہم کھڑے ہیں۔ دریا کا پانی ہمارے پاؤں کے نیچے پھیل گیا ہے۔ کبھی یہ تصور ہوتا کہ گھوڑا گاڑی میرے ہاتھ سے پھوٹ کر بہت دور نکل گئی ہے اور میں بغیر کچھ سوچے سمجھے بھاگا جا رہا ہوں۔ اس تصور کو تکمیل دینے کی خاطر میں نے چاہا کہ گھوڑا گاڑی چھوڑ کر دیوانوں کی طرح بھاگ نکلوں۔ میری بیوی کن حسرتوں کے ساتھ میری راہ تک رہی ہوگی۔ کسن بچوں کی یاد۔ ان کی باتیں پھر روزی کا خیال اور یہ خوف کہ اگر میں ایسا کروں گا تو سواری کا خوفناک پنجم میری گردن پر ہو گا۔ میں گھٹ کر مر جاؤں گا۔ میرے بچوں کی دنیا اندھیر ہو جائیگی!۔۔۔۔۔ میں ان دوسو سوں اور اچھنوں میں سے گذر رہا تھا مجھے ایسا احساس ہوا کہ کوئی آدمی سکیاں لے رہا ہے۔ کیا یہ میری سواری کی آواز ہے؟ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ لیکن سواری گنگوں کی طرح خاموش۔ بہروں کی طرح بے پروا اور اندھوں کی طرح بی حرکت تھی۔ گندمند درختوں کے خوفناک سائے دور دکھائی دیتے تھے۔ گھوڑا ذرا بھی تھکا ہوا معلوم نہ ہوتا تھا نہایت وفادار۔ بڑا طاقتور۔ میری روزی کا ذریعہ محنت و مزدوری کا سہارا سب کچھ وہی تھا۔ وہ اپنی رفتار چلا جا رہا تھا۔ میری منزل میرے وہم و گمان سے دور خدا جانے ہم کہاں کہاں سے گذر رہے تھے۔ ہر طرف پریشانی ہی پریشانی تھی۔ کوئی اس مصیبت میں پرسان نہ تھا۔ سواری کی مستقل خاموشی نے میرے خوف پر قبضہ کر رکھا تھا۔ کرتا تو کیا کرتا!۔۔۔۔۔

سردی کی وجہ سے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ باگ تھلنے کی بھی طاقت نہ رہی تھی۔ ہاتھ ٹھنڈے مارے سن ہو چکے تھے۔ اس مایوسی کی حالت میں ہم ایک ایسی جگہ پر پہنچے جہاں سے دور استے الگ الگ نکلتے تھے۔ یہاں ایک نڈرا انسان نہایت مضبوط اور توانا ملا۔ وہ آگے بڑھا اور میرا گھوڑا اختتام کر بولا۔ ”ادھر کوئی راستہ نہیں۔ گھوڑے کا رخ بدلو۔“ میں فقط اس کے پاؤں دیکھ

سکتا تھا۔ بڑے بھڑے اور بھاری بھاری کھیتی باڑی کرنے والوں کے سے معلوم ہوتے تھے۔ غالباً کوئی کاشتکار تھا۔ اس کی صورت سے وحشت ٹپکتی تھی۔ اس کی آواز نہایت کڑخت تھی۔ میری یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اس نے ٹھکانہ طور پر کہا تم کون ہو؟ وہ پیچھے کون ہے؟ کہاں سے آئے ہو؟ کہاں جاؤ گے؟ میں سچیں و حرکت بیٹھا زبان میں قوت گویائی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں وہ بولا "یہ وہ جگہ ہے جہاں شہری لوگ برسوں دیکھنے میں نہیں آتے۔ تم اس تاریک اور سرد رات میں اندھا و ہند کدھر جا رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "ہم جواری کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ پیچھے میری سواری ہے اور میں خود ایک غریب گاڑی بان ہوں۔" وہ کچھ جواب دئے بغیر لپک کر گاڑی پر پیچھے سواری کے ساتھ جا بیٹھا اور ترش آواز میں بولا۔ "گاڑی کا رخ بدلو جو اس طرف نہیں۔" گاڑی کا رخ بدلنے میں شاید کچھ تاخیر ہوئی ہوگی کہ وہ اپنی جگہ سے چونک کر اٹھا اور گاڑی سے کود پڑا اس نے گھوڑے کو لگام سے پکڑ کر اس کا رخ دوسری طرف بدل دیا۔ اور خود گھوڑے کے ساتھ ساتھ قدم قدم چلنے لگا۔ جب گھوڑا رفتار بیکڑ چکا اور راہ پر ہولیا تو پیچھے بیٹھنے کے بجائے میرے ساتھ آ بیٹھا مضبوط اور نڈر انسان خوف زدہ معلوم ہوتا تھا مجھ میں قدرے قوت آگئی تھی۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ "یہ ضرور کوئی مزدور ہے۔" میں بھی مزدور ہوں یہ میری مدد کریگا۔ اور وہ راز جو خوف اور دہشت بن گیا ہے۔ دیکھتے دیکھتے اس کا انکشاف ہو جائیگا۔ لیکن میرا یہ خیال بہت جلد غلط ثابت ہوا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے بھی زیادہ خوف زدہ ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا جسم سرد ہوتا جا رہا تھا۔ غالباً وہ کانپ رہا تھا۔ اب صرف گھوڑے کے قدموں اور اس کے ہانپنے کی آواز آرہی تھی۔ کون تھا جو رہبری کرتا۔ ہم تینوں یقیناً علیحدہ علیحدہ اپنے انجام پر غور کر رہے تھے۔

وہ راستہ جو میں نے انتہائی پریشانی سے کاٹا تھا پھر دوبارہ جوں توں کر کے نصف سے زیادہ ختم ہو چکا تھا۔ کسان نے میرے بازو پر زور سے ایک چٹکی لی۔ قریب تھا کہ میری چیخ نکل جائے۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے رحم پر چھوڑ دیا۔ اس نے پوچھا یہ پیچھے کون ہے؟ میں نے کہا میں نہیں جانتا۔ وہ بولا خاموش میں سب کچھ جانتا ہوں۔ کبھی کبھی وہ بے سبب مجھ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کرتا۔ کبھی میرے ساتھ لگ جاتا۔ کبھی ادھر دیکھنا کبھی ادھر دیکھنا کبھی میرا منہ تنکے لگتا۔ اب گھوڑے کی باگ اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ گھوڑے کو جلدی جلدی چلا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بڑے بڑے تھے۔ بالوں کی بناوٹ عجیب قسم کی تھی۔ چہرہ عجیب۔ ممدلی و جاہت اور صحت کے سبب چمک رہا تھا۔ بے فکری اور تازہ ہوا میں پلا ہوا جسم پتھر کے مانند نظر آتا تھا۔ لیکن سواری کی دہشت سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اس پر سحر کر دیا ہے۔ وہ اپنی پریشانی کو ہر امکانی کوشش سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہم آہستہ آہستہ دوبارہ پل کے قریب پہنچ گئے۔ درختوں کے ڈراؤنے اور گھنے جھنڈ ختم ہو چکے تھے۔ میں دعا مانگ رہا تھا کہ سلامتی سے پل پر پہنچ جاؤں۔ گھوڑا گھائی ٹپ پر اس طرح چڑھ رہا تھا جیسے موت اس کا تعاقب کر رہی ہو۔ وہ جگہ پھر آگئی تھی جہاں سے میں نے دیدہ دانستہ اپنے لئے غلط راستہ اختیار کیا تھا۔ میں نے سواری کو دیکھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ "جیسے کوئی رو رہا ہو۔" بیکایک ایک جھٹکا لگا۔ غالباً پہیے کے نیچے کوئی پتھر آ گیا تھا۔ قریب تھا کہ ہم سب گر جاتے۔ سواری نے گردن اٹھائی۔ میں نے بڑی جرأت کے ساتھ کاشتکار سے کہا۔ "یہاں سے جو اڑ

کتنی دور ہوگا۔ کیونکہ ہمیں جوار جانا ہے۔ میری آواز کسی قدر بلند تھی۔ اس میں ایک قسم کی تندہی اور حوصلہ پایا جاتا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ موت سے زیادہ میرے لئے یہاں کچھ نہیں۔ کاشتکار میری آواز سے چونک اٹھا۔ میں نے سواری کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس میں ایک بے بسی اور بیکسی نظر آتی تھی۔ اس کی حالت نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ میں نے اس کی آنکھیں دیکھیں۔ ان میں ایک چمک تھی اور وہ خوبصورت تھیں۔

پل کے قریب ایک پرانا بڑھکا درخت تھا۔ جس کے نیچے سے کچھ آوازیں آرہی تھیں۔ غالباً مسافر تھے۔ رات وہیں ٹھہرے ہوئے کاشتکار کے الفاظ مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ ”جوار بہت دور ہے۔ وہاں قتل و خون کی خوفناک وارداتیں ہو رہی ہیں۔ تم وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ سرکاری ملازموں نے اس کے گرد و نواح میں ڈیرے ڈال دیے ہیں۔ وہاں سے نہ کوئی آسکتا ہے اور نہ جاسکتا ہے۔“ یہ کہ کر وہ گاڑی سے کود گیا تھا۔ اور سواری کو بڑے غور سے دیکھتا ہوا بغیر کچھ کہے درختوں کی آڑ میں گم ہو گیا تھا۔

اب تمام ماحول بدل چکا تھا۔ میں نے ہوشیاری سے گھوڑے کو جلدی جلدی چلانا شروع کیا۔ اس کا رخ شہر کی جانب تھا۔ سواری ابھی تک اپنے خیال میں سونگون تھی۔ مجھے اب اس سے ہمدردی سی پیدا ہو گئی تھی۔ ”ہم پل پھوڑ کر بہت دور نکل آئے تھے۔ وہ یقیناً رو رہی تھی۔ شاید اس کی کسی بڑی آرزو کو ٹھیس لگی تھی۔ لیکن میرے دماغ میں ایک ہی خیال چکر کاٹ رہا تھا کہ راستہ ختم ہو جائے اور میں گھوڑا گاڑی لیکر گھر کی راہ لوں میرا بدن تکان سے چور چور ہو چکا تھا۔ رات قریب الاقترام تھی۔ شہر کے آثار کچھ کچھ نظر آنے لگے تھے۔ میری حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ یکایک مجھے معلوم ہوا کہ کسی نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ میرے تمام جسم میں ایک لہری دوڑ گئی۔ خاموش فضا میں ایک چیخ گونجی۔ اس ہراس کے عالم میں میں نے کاشتکار سے مدد چاہی۔ لیکن وہ جا چکا تھا۔ اس کا گرم گرم جسم اور پھولا ہوا سانس اب کچھ بھی باقی نہ تھا۔“

— گاڑی چلتے چلتے خود بخود رک گئی۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور میں زمین پر گر پڑا۔ گھوڑے نے اپنا منہ ہمدردی سے مجھ پر رکھ دیا۔ یہ کچھ یاد نہیں کہ میں کب تک جیس و حرکت پڑا رہا۔ جب ہوش آیا تو اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے دیکھا زمین پر کچھ چاندی کے سکے گرے پڑے تھے اور ایک سایہ جیسے چاند بادلوں اور درختوں کے پیچھے سے گزر رہا ہو سڑک کی دوسری جانب جا رہا تھا۔

یہ واقعہ اس جگہ پیش آیا تھا جہاں ایک شکستہ گنبد اور چند قدیم دیواریں اپنے بنائے والوں کی یاد میں کھڑی آنسو بہا رہی ہیں۔ کوئی آواز کوئی آہٹ سنائی نہ دیتی تھی۔ میں گھوڑا گاڑی سنبھال گھر کی طرف روانہ ہوا۔ مکان اور ڈر کے ماسے بالکل ماطاقت ہو چکا تھا۔ گھوڑے کی رہی سہی طاقت سے آخر میں گھر تک پہنچ گیا۔ بچے بے خبر سو رہے تھے۔ دروازے میں میری بیوی بیٹھی اونگھ رہی تھی معلوم ہوتا تھا کہ تمام رات اس نے میری راہ دیکھتے دیکھتے کاٹ دی ہے میں مصیبت میں گرفتار مرنے سے بدتر دل میں ہمت نہ پاؤں میں سکت چار پائی تک پہنچ کر چت لیٹ گیا۔ کون بتا سکتا ہے مجھے خود معلوم نہیں کہ اس کے بعد کیا پیش آیا تھا۔ صرف اس قدر یاد ہے کہ دن چڑھ چکا تھا۔ میری بیوی نے مجھے شانوں سے پکڑ کر اٹھایا اور گاڑی کے پاس لاکر کھڑا کر دیا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ گاڑی خون سے لت پت ہو رہی ہے اور سپاہی میرے ارد گرد کھڑے ہیں۔ رات کے تمام واقعات میری آنکھوں کے سامنے تھے بعد دیگرے گزر رہے تھے۔ میں خاموش

بیس و حرکت کھڑا گاڑی کو تک رہا تھا۔ خون آلودہ گاڑی میرے سامنے کھڑی تھی۔
 لوگ جوق در جوق آ رہے تھے۔ ہجوم کافی سے زیادہ جمع ہو گیا تھا۔ یہ واقعات جو میں نے بیان کرنے کی کوشش کی ہے کسی کی سمجھ
 میں نہ آتے تھے
 ایک نے کہا۔ ”یہ گاڑی بان کا کام ہے۔“
 دوسرا بولا۔ ”یہ جوار کیونکر پہنچا؟“ اس نے جاگیردار کو کس طرح قتل کیا۔ اس نے کس کی مدد سے کامیابی حاصل کی؟“
 کہتے ہیں تو ماہر کی مشہور رقاصہ، جاگیردار کی داشتہ، کل شام تک شہر کے بازاروں میں موجود تھی۔

ناگامیاں

بدنامی

مری قسمت میں لکھا تھا کہ تو بدنام ہو جائے
 تری شہرت قاتل خنجر الزام ہو جائے
 قیامت ہے کہ تجھ پر انگلیاں اٹھیں حریفوں کی
 ترانہ سادہ دل وقفِ غم ایام ہو جائے
 مری جاں چل کہیں ایسی جگہ چل کر رہیں دونوں
 جہاں حیرت گلوگیر صدائے عام ہو جائے
 افق کے پاس وہ آگ گلستاں ہے اسکے دامن میں
 ہمارا رنج و غم غرق مئے کلف نام ہو جائے

مجید ملک

رحمن چغتائی مشقون

نوجوان بادشاہ نے تخت پر جلوہ فرما ہوتے ہی کہا — ”میں سکہ بدل دوں گا“
کامل سکوت گردنیں لہروں کی طرح بل کھا کر جھک گئیں
بادشاہ نے سلسلہ کلام جاری رکھا — ”مجھے قوانین میں تبدیلیاں کرنی ہیں۔“
ایک سانس تک سنائی نہ دیتا تھا۔

بادشاہ نے کہا حکومت طاقت۔ سب بادشاہت کے نشانات ہیں۔
مجمع میں ایک حرکت سی ہوئی جیسے کوئی لہر ابھرے اور کھو جائے۔
بادشاہ بولا۔ موتی۔ زمرہ۔ الماس مجھے اپنے تلخ کے لئے پیش بہا جو اہر درکار ہیں۔
آواز آئی اے بادشاہ بادشاہوں کی ایسی ہی خواہشیں ہوتی ہیں۔
بادشاہ نے شانوں کو جھٹکا اور کہا بادشاہ کی نظریں مستقبل کی نظریں ہیں۔

اے بادشاہ پہلے بادشاہوں کا بھی یہی خیال تھا۔
بادشاہ کی پیشانی پر بل آگئے اس نے کہا ”جہانذاری بغیر قتل و خون کے ممکن نہیں“ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔

اے بادشاہ پہلے بادشاہوں کا بھی یہی قول تھا
بادشاہ نے جھجھکا کر کہا۔ ”میں ماؤں سے بچے چھین لوں گا“
اے بادشاہ پہلے بادشاہوں کا بھی یہی عمل تھا۔
دقار اور تمکنت کے احساس سے بادشاہ نے سر اور بلند کر دیا۔

آخر مجھے کیا کرنا ہے؟

دربار میں ایک سر جھک گیا
اے بادشاہ مجھے یہی کرنا ہے۔

رحمن چغتائی

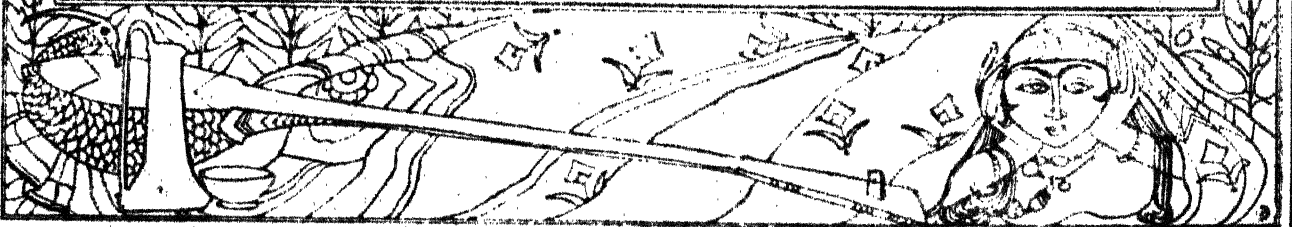
احسن مارہروی

احسن الکلام

زباں سے جو کلمہ آسمان نکلتا ہے فریب خوردہ دہم و گمان نکلتا ہے
چشمِ تر سے سرنشک رواں نکلتا ہے کہ آبرو لئے اک رازداں نکلتا ہے
یہی ہے وقتِ مدِ جذبِ دل تیرے صدقے وہ میری خاک سے مہکٹاں نکلتا ہے
سلگ ہی ہے تیغِ غم سے آگِ سینے میں نفسِ نہیں یہ اسی کا دھواں نکلتا ہے
وہ کوئے حسنِ جہاں کوئی جانہ سکتا تھا وہاں سے روزِ ابا اکا رواں نکلتا ہے
وہ خارِ غم جو ہے پیوستِ قلبِ عاشق میں بغیر اُن کے نکالے کہاں نکلتا ہے
نکل سکا کسی قوت سے جو نہ الفتیں وہ کامِ تجھ سے دل ناتواں نکلتا ہے

کئے پہاں میں نے شہیدِ احسن اتنے وقتِ حرام
کہ ہر قدمِ پچھد کا نشان نکلتا ہے

احسن مارہروی



آغا جہد اجمید فلم کاری کا آرٹ

سے بحث کی گئی ہے جو ہندوستان میں دکھائی جا چکی ہیں۔ یہاں فن اور فنا پا "کافرق واضح کر دینا شاید غیر ضروری نہ ہوگا۔ جہاں تک سینما کا تعلق ہے۔ فنا پا "سے فن کی ایسی نمائش مراد ہے جو بے موقع ہو اور جس سے موضوع پر مزید روشنی پڑنے کے بجائے صرف یہی ظاہر ہو کہ ڈائریکٹر نے محض اپنی کارویگری دکھلانے کے لئے ایجنج کی لی ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہوگا کیمرے کی حرکت اور اس کا غیر معمولی زاویوں سے زندگی کو دیکھنا ایک بہت کارآمد چیز ہے لیکن ایسے مفید اور خالص فنی طریقوں کے بجا استعمال کا نتیجہ ہمیشہ فنا پا ہی ہوتا ہے۔

آجکل جس کثرت سے اردو میں سینما کے متعلق اخبار اور رسالے شائع ہو رہے ہیں (گو وہ ایکٹرسوں کی تصاویر چھاپنے اور ان کے عشاق اور تنخواہوں کی فہرستیں دینے ہی پر اکتفا کرتے ہیں) اور جس شوق سے ادبی رسائل بھی ستارگان فلم کی تصاویر سے اپنے اوراق مزین کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس فن کی مبادیات اور فلم کی بناوٹ سے عوام واقف ہو گئے۔ اس بازاری اور محض اعداد و شمار بتانے والے ادب کے علاوہ چند ایک قابل قدر مضامین بھی لکھے گئے ہیں جن میں پروفیسر بخاری کا "فلم کا وسیلہ اظہار" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

فلم تصاویر کے ایک ایسے سلسلے کا نام ہے جن کو یکے بعد دیگرے دکھانے سے حرکت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ تصاویر

اس مختصر سے مضمون میں فلمی موضوع (جس پر کہانی کا دار و مدار ہوتا ہے) کی ڈھال، ماحول کی تخلیق اور کیمرے کی حرکت اور مختلف زوایاں نگاہ سے کچھ بحث کی جائے گی اور اس سلسلہ میں فن اور فنا پا "میں تمیز کرنے کی کوشش کی جائیگی۔

نفس مضمون پر کچھ کہنے سے پہلے قارئین کی توجہ دو ایک باتوں کی طرف مبذول کرانا شاید غیر ضروری نہ ہوگا۔ ہندوستان میں صنعت فلم کاری کی جو حالت ہے۔ وہ آپ سے پوشیدہ نہیں۔ اس کے متعلق تفصیل سے کچھ لکھنا فضول معلوم ہوتا ہے۔ چند ایک اہم باتوں کا ذکر نفس مضمون میں کیا جائیگا سینما پر لکھنے میں سب سے بڑی دقت یہ پیش آتی ہے کہ وہ فلمیں جن کے متعلق دنیا کے تمام بڑے بڑے نقاد متفق ہیں کہ وہ اس صنعت کی بہترین منظر ہیں۔ ہندوستان میں نہیں دکھائی جاتیں۔ میرا مطلب روسی فلموں سے ہے علاوہ انہیں چند ایک بہترین امریکن فلمیں بھی پنجاب میں نہیں دکھائی گئیں۔ ہندوستانی ناظر فلموں میں اب تک صرف ایک فلم "پورن بھگت" ایسی ہے جس کو درمیانہ درجہ کی کامیابی حاصل ہوئی ہے (میرا مطلب مالی کامیابی سے نہیں بلکہ صناعانہ کامیابی سے ہے) خاموش فلموں کی حالت اس سے بھی زیادہ قابل رحم تھی۔ کسی نقاد کا ایک ایسی صنعت کی بہترین تخلیق سے بے بہرہ ہونا جس پر وہ تنقید کرنا چاہتا ہے ایک حد تک مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ تاہم یہ ایک ایسی محجوری ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ اس مضمون میں حتی الوسع انہیں فلموں

نہ ہو اور جس میں حرکت اور اس کا اتار چڑھاؤ اس کا
تھم جانایا روک دیا جانایا حرکات کا باہمی تصادم نہ دکھایا
جائے۔ تمام صوری فنون میں یہ انبیاز فلم ہی کو حاصل
ہے کہ مسلسل حرکت اور روانی کو اس کا اصل موضوع
قرار دیا جاسکتا ہے“ (پروفیسر بخاری)

مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ ”فلم میں تو کوئی ایسی چیز دکھائی
ہی نہیں جاتی جس میں واضح طور پر حرکت نظر نہ آئے۔“ کیونکہ حرکت
سے مراد صرف معمول (جس کی تصویر لی گئی ہے) کی حرکت ہی
سے نہیں بلکہ محسوسات کی اس حرکت سے بھی ہے جو بیجان اشیاء
کی تصاویر کی مناسب ترتیب سے پیدا ہوتی ہے۔ عمل اور حرکت
کو زیادہ واضح کرنے کے لئے کیمرے کو بھی حرکت دی جاتی ہے۔
وہ ایکٹر کے ساتھ چلتا ہے گھوڑوں کے ساتھ دوڑتا ہے۔ ہوائی
جہازوں کے ساتھ اڑتا اور کشتیوں کے ساتھ تیرتا ہے بلکہ ضرورت
کے وقت پانی میں غوطہ بھی لگا جاتا ہے اور سمندر کی ان گہرائیوں
تک پہنچ جاتا ہے جہاں انسان کی آنکھ کام نہیں کر سکتی۔ محسوسات
کی حرکت کے لئے کیمرہ ”دیکھتا ہے۔ سنتا ہے چھوتا ہے سونگھتا
ہے چکھتا ہے گویا وہ انسانوں کی طرح جو اس منظر رکھتا ہے
اور فلم کار کو بڑی آسانی یہ ہے کہ کیمرہ کی وسیع طاقت اور قوت آ
سہارا لینے کو موجود ہے“ اسی طرح مختلف زوایائے نگاہ سے تصویر
لینے کا مطلب بھی عمل کو زیادہ واضح کرنا یا کسی نفسیاتی کیفیت کے
اظہار سے محسوسات کو بیجان میں لانا ہوتا ہے۔ لیکن جہاں کیمرے
کی حرکت اور غیر معمولی زوایائے نگاہ بلا ضرورت استعمال کئے جائیں
وہاں فلم پر برا اثر ہوتا ہے اور نتیجہ فنا پا۔ فرض کیجئے دو آدمی
سیڑھیوں کے نیچے کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک
سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کر دیتا ہے اور دوسرا نیچے کھڑا رہتا
ہے۔ اب اگر سیڑھیوں پر چڑھنے والے کی تصویر نیچے سے لی جائے
تو وہ اس آدمی کا زاویہ نگاہ ظاہر کرے گی جو نیچے کھڑا ہے۔ اسی

مقرر کیمرے سے لی جاتی ہیں اور مصنوعی روشنی سے پردے پر
دکھائی جاتی ہیں۔ ہر ایک تصویر کے بعد پردے پر ایک لمحے کے لئے
تاریکی چھا جاتی ہے۔ لیکن چونکہ ایک سیکنڈ میں بین سے لے کر تین
تک تصویریں دکھائی جاتی ہیں تماشائی تاریکی کے وقفوں کو محسوس
نہیں کرتا اور وہ اشیاء جن کی تصاویر بنائی گئی ہیں حرکت کرتی ہوئی
دکھائی دیتی ہیں۔ فلم کا ایک ٹکڑا جس کی ایک ہی وقت میں تصویر
لی گئی ہو ”شات“ یا فلمیہ راہ کہلاتا ہے۔ جب کیمرہ دوبارہ حرکت
کرتا ہے تو دوسرا شات شروع ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں
میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ”شات جب ترتیب اور تسلسل کے ساتھ
دکھائے جائیں تو انہیں فلم کہا جاتا ہے“ یہ یاد رہے کہ کسی فلم
کی کامیابی کا انحصار زیادہ تر ”ترتیب اور تسلسل“ پر ہے
تصویر لیتے وقت شاٹوں میں وہ ترتیب نہیں ہوتی جو فلم دکھاتے
وقت ہوتی ہے۔ اس لئے فلم بن چکنے کے بعد اس کو کاٹ کر
پھر جوڑا جاتا ہے اور

”فلم کی قطع و برید اور از سر نو شیرازہ بندی جسے تدوین
یا ایڈٹنگ کہتے ہیں فلسفہ سازی کا اہم مرحلہ ہے اور بعض
ڈائریکٹر خصوصاً روسی ماہرین تو دو حقیقت فن اسی کو
سمجھتے ہیں“ (پروفیسر بخاری)

چونکہ فلم ایک صوری فن ہے اس لئے موضوع خواہ مرنے ہو
خواہ غیر مرنے اس کو تصاویر ہی میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ لہذا کامیاب
ڈائریکٹر وہی ہے جو ایک غیر مرنے والے موضوع کے لئے بھی ایسی تصاویر
منتخب کرتا ہے جن سے تماشائی پر ان کا مفہوم بغیر کسی وقت کے
عیاں ہو جاتا ہے۔ فلم میں چونکہ ہمیشہ ڈرامی عنصر ہوتا ہے اسلئے
حرکت اور عمل اس کے جزو لا ینفک ہیں۔

”عمل ڈرامے کی جان ہے اور فلم میں بھی اسے یہی حیثیت
حاصل ہے۔ کیونکہ فلم میں تو کوئی ایسی چیز دکھائی ہی نہیں
جاتی جس کی ظاہری حالت اس کی تمام کیفیات کی ترجمان

دے رہا ہے کہ وہ جنگ سے دست بردار ہو چکے ہیں تصویر گر جے سے لی گئی ہے۔ سلسلے پادری کھڑا ہے اور سامعین کی صرف تلواریں نظر آتی ہیں۔ جن کے دستے چمک رہے ہیں۔ کیمرا حرکت کرنا شروع کرتا ہے اور تلواریں کو خوب واضح کرتا ہوا پادری تک جا پہنچتا، اس منظر میں ڈائریکٹر نے بہت طنز سے کام لیا ہے اور اس جھوٹ اور دغا کو ظاہر کیا ہے جس کے مرتکب وہ لوگ ہیں جو صلح کے وقت بھی ہتھیار لگائے ہوئے ہیں۔

اس سے اگلا سین اس جلوس کا ہے جو اس خوشی میں نکالا گیا ہے۔ تصویر ایک ایسے آدمی کی ٹانگوں میں سے لی گئی ہے جس کی ایک ٹانگ لڑائی میں کٹ چکی ہے۔ اس سے خوب نظا ہر توتا ہے کہ اس کی دماغی کیفیت کیا ہوگی جسے خوشی کے اس اظہار سے وہ وقت یاد آتا ہے جب اس کی ٹانگ کٹ گئی تھی۔ جلوس — جس میں کئی باجے بچ رہے ہیں اور لوگ رہ رہ کر نعرے لگا رہے ہیں — ایک ہسپتال کے قریب سے گزرتا ہے جس کے ایک نوٹس بورڈ کو کیمرا خوب واضح کرتا ہے۔ اس پر لکھا ہے ”خاموش“! پھر ہسپتال کے مریض دکھائے گئے ہیں جو اس شور سے ڈر کر چیخنے لگتے ہیں۔ اس سارے منظر میں ہجوم کی سنگدلی اور بے پروائی پر طنز ہے۔

اس شور و غوغا سے مقابلے کے لئے وہ فرانسیسی فوج ان دکھایا جاتا ہے جس کو گر جاکے ٹن ٹن باجوں کی آواز اور لوگوں کے نعرے اس وقت کی یاد دلاتے ہیں جب وہ — اپنی دانستہیں — قتل کا مرتکب ہوا تھا۔ الفاظ میں صوری تاثرات کا بیان بہت مشکل ہے اگر ان تمام مناظر میں کیمرا کی حرکت اور مختلف زوایاں نگاہ تفصیل سے بیان کئے جائیں تو کئی صفحات صرف ہو جائیں اور پھر بھی شاید وہ تاثرات بیان نہ ہو سکیں جو فلم دیکھنے سے ہوتے ہیں۔ اس فلم میں ایک ایسی احدیت اور روانی ہے اور اس کے شاٹ ایک دوسرے میں اس طرح ڈھلتے چلے جاتے

طرح اگر نیچے کھڑے ہوئے آدمی کی تصویر اوپر سے لی جائے تو وہ سیرٹھیوں پر چڑھنے والے کا زاویہ نگاہ ظاہر کریگی۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ایک سیرٹھیوں پر چڑھتے ہوئے آدمی کی تصویر ایک غیر معمولی زاویہ نگاہ سے اس لئے لی جائے کہ اس کی نفسیاتی کیفیت ظاہر ہو۔ ”سان لوئی لے کاپل“ میں ایک لڑکا سیرٹھیوں پر چڑھتا ہوا دکھایا گیا ہے جو خوشی کا ارادہ رکھتا ہے۔ تصویر لیتے وقت کیمرا چھت سے لٹکایا گیا ہے۔ لڑکا اپنے کندھوں کو سیمٹے ہوئے، اپنے بازوؤں کو لٹکائے ہوئے گھسیٹ گھسیٹ کر قدم بڑھا رہا ہے۔ اوپر سے تصویر لینے سے اس کا سر سینے میں دھنسا ہوا اور اس کا ارادہ خوفناک معلوم ہوتا ہے۔ جہاں ان دونوں میں سے کوئی بات بھی نہ ہو یعنی نہ تو کسی کردار کا زاویہ نگاہ دکھانا ہو اور نہ کوئی نفسیاتی کیفیت ہی ظاہر کرنی ہو وہاں ایک شخص کا سیرٹھیوں پر چڑھتے وقت غیر معمولی زاویہ نگاہ سے دکھایا جانا بے معنی ہو جاتا ہے اور ناظرین کی توجہ خواہ مخواہ کیمرا کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔

کردار کی نفسیاتی تحلیل کیلئے غیر معمولی زوایاں نگاہ کے استعمال کی ایک بہت اچھی مثال امریکن ڈائریکٹر لوئس کی ”دی بین آئی ریکلڈ“ ہے۔ ایک حماس فرانسیسی فوجان جو کسی تھیبیٹ میں اٹلن بجانے پر ملازم ہے جنگ عظیم میں سپاہی بن جاتا ہے اور دوران جنگ میں ایک فوجان جرمن سپاہی کو سنگین سے مار دیتا ہے۔ اس کی حماس طبیعت اس کی ضمیر کو ملامت پر مجبور کرتی ہے اور وہ خود کو ایک قاتل خیال کرتا ہے۔ چنانچہ وہ جرمن فوجان کے والدین سے ملنے اور ان سے معافی مانگنے کا ارادہ کرتا ہے فلم اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب جنگ عظیم کے اختتام پر صلح کی خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ پہلا سین ایک گر جے کا ہے جس میں پادری اس مبارک وقت کے لئے خدا کا شکریہ اور آئندہ کے لئے دعا کر رہا ہے۔ وہ تمام حاضرین کو اس پر مبارکباد

ہیں۔ کہ ہمیں کہیں بھی ان کی عنقریبی کا احساس نہیں ہوتا۔
 اس کے برعکس مثال ہمیں مائل سٹون کی فلم "بارش" میں ملے گی۔ جس میں ان چیزوں کا غلط استعمال کیا گیا ہے۔
 اس فلم کی کہانی "ٹائیس" کی کہانی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ ایک پادری ایک فاحشہ عورت کو نیکی کی طرف راغب کرتا ہے اور جب وہ گناہ کی زندگی سے توبہ کر لیتی ہے تو پادری خود اپنا زہر اس کے آغوش میں ڈبو دیتا ہے۔ اس فلم میں دو باتوں کا دکھانا خاص طور پر مشکل تھا۔ ایک تو ان کیفیات کا اظہار تھا جن کے زیر اثر لڑکی فواحشات سے متنفر ہونا قبول کر لیتی ہے اور دوسرے ان کا جو پادری کو زہر سے بہکا کر گناہ سے پیوستہ کر دیتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ ان تمام نفسیاتی کیفیات کو صورتی ذرائع سے ظاہر کرنا ہے۔ یہاں نہ تو الفاظ (مکالمہ) سے کام چل سکتا ہے اور نہ ایکٹروں کے چہرے بگاڑنے سے۔ مائل سٹون کو ان دونوں موقعوں پر ناکامی ہوئی ہے۔ لیکن یہ ایک شاندار ناکامی ہے اور کئی معمولی کامیابیوں سے بہتر ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ فلم میں بحیثیت مجموعی کوئی اصدیت اور تسلسل نہ تھا۔ تمام مناظر علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتے تھے اور ہر منظر کے اختتام پر یہی احساس ہوتا تھا کہ فلم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگی اس لیے جن مناظر میں لڑکی اور پادری کی جذباتی جنگ دکھائی گئی ہے ان کی باقی مناظر نے مدد نہیں کی اور ان میں وہ اثر پیدا نہیں ہوا جس کے پیدا ہو سکے کا بہت امکان تھا۔

مثال کے طور پر وہ سین لیا جاتا ہے جس میں لڑکی گناہ سے توبہ کرتی ہے۔ پادری میٹرھیوں کے اوپر کھڑا ہے اور اس کی تصویر نیچے سے لی گئی ہے۔ لڑکی نیچے کھڑی ہے اور اس کی تصویر اوپر سے لی گئی ہے (یہ عام ڈائریکٹر بھی جانتے ہیں کہ جس چیز کی عظمت دکھانی ہو اس کی تصویر اوپر سے لی جاتی ہے) لڑکی پادری کے وعظ سے تنگ آگئی ہے اور اُسے برا بھلا کہنا

شروع کرتی ہے۔ اس کی آواز بلند اور تیز ہے۔ پادری اسے خاموش کرنا چاہتا ہے لیکن لڑکی کی آواز بلند ہوتی جاتی ہے۔ وہ دھیمی آواز میں دعا مانگنا شروع کرتا ہے۔ لڑکی پر دعا کا اثر ہوتا ہے اور اس کی آواز دھیمی ہوتی جاتی ہے ساتھ ساتھ پادری کی آواز بلند ہوتی جاتی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد لڑکی خاموش ہو جاتی ہے اور پادری بلند آواز میں دعا پڑھنا رہتا ہے پھر لڑکی بھی آہستہ آہستہ دعا مانگنا شروع کر دیتی ہے۔ آخر میں دونوں بلند آواز میں دعا مانگتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں کاہم پر وہ نفسیاتی اثر نہیں ہوتا جو ڈائریکٹر دکھانا چاہتا تھا۔ آوازوں کے گھٹنے بڑھنے اور کمرے کے مختلف زوایائے نگاہ کا آپ ایک "گراف" بنا سکتے ہیں۔ اس سین میں فنا پا ہی فنا پا نظر آتا ہے۔ "بارش" میں جگہ جگہ کمرے کی ایسی حرکت دکھائی گئی ہے جو نہ ضرور بے ضرورت ہے بلکہ ہماری توجہ دوسری طرف مبذول کراتی ہے۔ علاوہ انہیں بارش کا کوئی اثر کردار پر معلوم نہیں ہوتا حالانکہ ڈائریکٹر کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ متواتر بارش ایک تنہا چیتے والی اور خوفناک چیز ہے۔ مائل سٹون اپنی فلم "آل کو اسٹ آن دی ڈیسٹرن فرنٹ" (مغربی محاذ پر سکوت) میں بہت کامیاب رہا ہے کیونکہ اس میں چند ایک ایسے ہییب جنگی منظر پیش کئے تھے جن سے بلا واسطہ ہمارے دلوں میں ہمدردی نفرت اور رحم کے جذبات کو موجزن کرنا تھا۔ اس کا موضوع مرنے والا اور وہ ایک "خاص" مصوری فلم تھا۔ "بارش" میں کردار کی نفسیاتی تحلیل لازم تھی اور مائل سٹون میں اس کی اہلیت نہیں۔

فلم بنانے سے پیشتر ڈائریکٹر کے دماغ میں فلم کا بحیثیت مکمل ایک نقشہ ہونا چاہئے۔ دوسرے الفاظ میں کمرے میں بننے سے پہلے اس کے دماغ میں فلم مکمل ہو جانی چاہئے۔ دنیا کے مشہور ڈائریکٹر آئی سن سٹائن نے تو یہاں تک کہ دیا ہے

کہ فلمکار کے لئے ضروری ہے کہ وہ فلم بنانے سے پہلے فیصلہ کر لے کہ اپنے سے اپنے ایکٹر کے کوٹ کے بٹن کس طرح کے ہونگے یعنی اس کو تمام جزئیات پر حاوی ہونا چاہئے۔ ہماری ہندوستانی فلموں میں یہی نقص ہے کہ فلمکار فلم بنانے سے پہلے کچھ نہیں سوچتا۔ اس کے مناظر میں کوئی ربط کوئی تسلسل اور کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ کہانی کا کوئی نشو و ارتقا نظر نہیں آتا۔ مناظر ایک دوسرے میں ڈھلتے نہیں۔ ہر ایک سین کو دھکیل کر پرے پر لایا جاتا ہے۔

پربھارت فلم کمپنی کی ”جنتی نشانی“ اور ”مایا مچھندر“ کو ملحجے۔ ان کو عام فلموں سے بڑھ کر کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اول الذکر ایک سیدھی سادی کہانی ہے۔ لیکن اس میں بھی تسلسل نام کو نہیں۔ شروع ہی میں کہانی کے خاتمے کا پتہ چل جاتا ہے اس لئے لازم تھا کہ پیرایہ بیان ہی کو دلچسپ بنایا جاتا لیکن یہ بھی نہ ہو سکا۔ فوٹو گرافی عام ہندوستانی فلموں کے مقابلے میں اچھی ہے۔ لیکن سیاہ نہ ہونے کی وجہ سے تصویر بے جان نظر آتی ہے ”مایا مچھندر“ میں بہت حد تک ممکن تھا کہ گرو اور چیلے کی باہمی کشمکش ایک عظیم الشان چیز بن جاتی اور دنیا کی ہوس اور نیکی کی یہ جنگ فلم کو اعلیٰ درجہ کا بنا دیتی لیکن سوائے گرو اور چیلے کی کرامات اور شعبدہ بازیوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ڈائریکٹر غیر ضروری چیزوں میں اپنے اصلی مقصد کو کھو گیا ہے چند ایک سین بذات خود بہت اچھے ہیں لیکن ساری فلم میں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔

ہندوستانی فلمکار جزئیات کے قریبی شاٹ یعنی ”کلوز اپ“ سے بہت کم کام لیتے ہیں۔ حالانکہ اس سے مغربی فلمکاروں نے حیرت انگیز کام لیا ہے۔

”کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ شروع میں سینما کو ٹھیسٹر پر صرف اس لئے ترجیح دی جاتی تھی کہ وہ ’کل‘ دکھا سکتا ہے اور سیٹج

صرف جزئیات کو۔ اب ہم پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا ہے کہ سینما اصلیت میں ٹھیسٹر پر اس لئے فوقیت لے گیا ہے کہ وہ جزئیات کو دکھا سکتا ہے۔ حالانکہ ٹھیسٹر کی سیٹج اس سے عاجز ہے اس کو ’کل‘ دکھانا پڑتا ہے۔ درحقیقت سینما ایک ایسی صنعت ہے جس میں صرف خاص خاص جزئیات چن لی جاتی ہیں اور اس انتخاب سے باقی ان جزئیات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو اس لئے چھوڑ دی جاتی ہیں کہ تخیل خود ان کو پیدا کرے۔ اسی لئے ایک اعلیٰ پایہ کی فلم ہمارے دماغ کے لئے بہترین قسم کی خوداک مہیا کرتی ہے۔“ (مس کاکس ہیڈ)

وہ اس شاندار محل کا صرف خاکہ پیش کرتی ہے جو ہمارے تخیل کو خود تعمیر کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے فلم میں کوئی ایسی چیز نہیں دکھائی چاہئے جس کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ اور کسی منظر کا تصور کر سکے۔ غیر ضروری حصہ پیش کرنا نہ صرف بیکار ہوتا ہے بلکہ حاضرین کی توجہ کو دوسری طرف مبذول کر دیتا ہے۔ ”سان لوئی لے کاپل“ میں ایک لڑکا دکھایا گیا ہے جو ایک رقصہ پر عاشق ہے اور ہر رات اس کا رقص دیکھنے جاتا ہے۔ رقص شروع ہونے سے پہلے لڑکے کو دکھایا گیا ہے اس کے ساتھ اور کئی آدمی بیٹھے ہیں اور وہ ان میں دلچسپی لے رہا ہے۔ لیکن جب رقص شروع ہو جاتا ہے تو لڑکے کا صرف چہرہ ہی دکھایا جاتا ہے باقی تمام پردہ سیاہ، اس سے اس کا انہماک، اس کی پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے بے پروائی اور اس کے بیجاں آفرین جذبات خوب نمایاں ہو جاتے ہیں۔

ہندوستانی فلموں میں ”پورن بھگت“ ہی ایک ایسی فلم ہے جس میں یہ دونو باتیں دکھائی دیتی ہیں۔ یعنی فلم کو بحیثیت کل سوچا گیا ہے اور جزئیات کو نمایاں کر کے پیرایہ بیان کو دلچسپ

بنایا گیا ہے۔ اندھے فقیر کا ہر اہم واقعے کے اختتام پر گنا یا یونانی ڈرامہ میں کورس کے گانے کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ یسکن "پورن بھگت" کی کامیابی کا راز شاید موسیقی کا شاندار اور صحیح استعمال ہے۔ "عالم آرا" کی طرح شہزادے کی سالگرہ پر بہاگ نہیں لگایا جاتا۔ کردار کی جذباتی حالت جو الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی موسیقی سے بیان کی ہے۔ ہندوستانی آلات موسیقی کو انگریزی آکٹو کی طرز پر بجا کر ان میں ہم آہنگی پیدا کی گئی ہے۔ اگرچہ "پورن بھگت" میں کئی نقائص اور فرد گزشتیں ہیں۔ تاہم فلم کو دیکھ کر یہ تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا بنانے والا کوئی ذی شعور اور با سمجھ انسان ہے دیو کی بوس واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ عام ہندوستانی فلم دیکھ کر تو یہ خیال ہوتا ہے کہ کوئی پریشان دماغ آدمی کمائی سارا ہے اور ایک نہایت ہی بھدا مصوّر اس کو "باتصویر" بنا رہا ہے۔

ہندوستانی فلموں میں ترتیب کا کچھ خیال نہیں ہوتا۔ اس بات کو نہیں سوچا جاتا کہ فلاں سین اگر فلاں کے بعد آئے تو زیادہ مؤثر ہو گا یا پہلے آئے تو۔ جہاں تک ترتیب کا تعلق ہے فلم کار کو دو باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ ایک تو شاٹوں کی ترتیب اور دوسرے شاٹ لیتے وقت فلمی مواد کی ترتیب۔ فرض کیجئے ہمارے سامنے ذیل کے تین شاٹ ہیں۔ ایک آدمی کا غمگین چہرہ دکھایا گیا ہے۔ پھر ایک لڑکی کی تصویر اور پھر اسی آدمی کا متبسم چہرہ۔ اگر ان تینوں شاٹوں کو اسی ترتیب سے جوڑ دیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ایک غمگین آدمی لڑکی کی تصویر دیکھ کر خوش ہو گیا ہے۔ لیکن اگر پہلے شاٹ کو تیسرے سے بدل دیا جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ شخص لڑکی کی تصویر دیکھ کر غمگین ہو گیا ہے۔

فلمی مواد کی بھی ایک زمانی سمت ہوئی چاہئے۔ اس کا شروع اور اخیر بدلتے وقت اس کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ اگر پانی میں ایک کنکر بھینکا جائے تو اس سے دائرے بنے شروع ہو جاتے ہیں جو پھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اب اگر اسی شاٹ کو الٹا کر دیا جائے

تو دائرے کم اور آخر ایک نقطہ پر ختم ہوتے ہوئے دکھائی دینگے دائروں کو پھیلتے ہوئے دیکھ کر طبیعت میں وسعت اور کشادگی اور کسی قدر خوشی کا احساس ہو گا۔ دوسری حالت میں طبیعت پر بوجھ معلوم ہو گا اور اس طرح کی کیفیت ہو گی جو دم گھٹنے سے ہوتی ہے اسی طرح ایک مکان کے گرنے سے جو اثر ہو گا وہ اس سے مختلف ہو گا جو مکان کے تعمیر ہونے سے ہوتا ہے۔ ہندوستانی تو کیا بعض مغربی ڈائریکٹر بھی اس بات سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں ماحول کی پیدائش کے لئے اکثر اوقات ڈائریکٹر کو ایسے مناظر لانے پڑتے ہیں جن کا موضوع سے صرف بالواسطہ تعلق ہوتا ہے اس وقت یہ احتیاط لازم ہے کہ ایسے مناظر دوسرے مناظر میں اس طرح ڈھلتے جائیں کہ ان کی اجنبیت یا علیحدگی کا احساس نہ ہو چ جائیکہ "حاتم طائی" کی طرح موضوع سے تعلق رکھنے والے مناظر کو بھی اس بے ربطی سے پیش کیا جائے کہ فلم کا ہر ٹکڑا الگ الگ معلوم ہو۔ ماحول کی پیدائش سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ خاص خاص سین زیادہ مؤثر ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک المناک افسانہ دکھانا مقصود ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ جگہ جگہ غم کی طرف اشارہ کیا جائے تاکہ اخیر میں دیکھنے والوں پر بہت اثر ہو۔

ہندوستانی کامیڈی کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ ماحول کی پیدائش سے بے پروائی ہے۔ ہنسائے کے لئے ضروری ہے کہ سامعین ایک طرف سے ہمدردی رکھتے ہوں۔ کیونکہ اگر کوئی شخص ہمیں رلانے کی کوشش میں ناکام ہے تو اس پر رحم آتا ہے لیکن اگر کوئی شخص ہنسائے کی کوشش میں ناکام رہے تو اس پر غصہ آتا ہے۔ کامیڈی میں ضروری ہے کہ شروع شروع میں مذاق کا رنگ پیدا کیا جائے۔ اس کے بعد اگر کوئی بھونڈی چیز بھی آجائے تو ناگوار نہیں گزرتی۔ ہمارے ہاں شروع ہی میں کوئی ایسا مذاق کیا جاتا ہے جس پر ایک طرف سے نفرت ہو جاتی ہے اور پھر باقی وقت میں غصہ آتا رہتا ہے۔

ہے ہیں۔ جو روشنی میں گزرتے وقت بہت چمکتے ہیں۔ اس منظر میں دونوں کی رومانی محبت دکھانی منظور ہے۔ اس نئے باغ غیر معمولی طور پر خوبصورت نظر آتا ہے۔ جب نوجوان سے لڑکی چہن جاتی ہے تو ہر چیز اپنا اصلی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ محبت میں ہر معمولی سے معمولی چیز بھی رومانی نظر آتی ہے۔

ان مثالوں سے واضح ہو گیا ہوگا کہ کسی ایسے خوبصورت منظر کا انتخاب جو موضوع سے تعلق نہ رکھتا ہو اور کیرے کی بلا ضرورت حرکت کا نتیجہ ہو۔ اکثر فلم کے لئے خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ یہ چیزیں فلم کی کامیابی کے لئے ضروری نہیں ہیں۔ چارلی چپلن کی آخری فلم ”سٹی لائٹس“ میں نہ تو کیرے کا زاویہ نگاہ ہی غیر معمولی ہے اور نہ اس کی حرکت ہی کچھ زیادہ نمایاں ہے لیکن پھر بھی فلم بہت کامیاب ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کمزور مشق چپلن اپنے فن سے خوب واقف ہے۔ فنی اعتبار سے فلم میں کہیں بھی تصنع نظر نہیں آتا یا دوسرے الفاظ میں چپلن نے فن کو موضوع پر سبقت نہیں دی اور فن کا کمال بھی یہی ہے کہ فن نظر نہ آئے۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہے نوجوان لیجے کہ ڈائریکٹر نے فن سے نہیں بلکہ فنا پا سے کام لیا ہے۔

ایک ناول نویس کی طرح ایک ڈائریکٹر بھی زندگی پر تنقید کرتا ہے۔ وہ اکثر بلا ارادہ ایسے مناظر منتخب کرتا ہے۔ جس سے اس کی طبیعت کے میلان کا پتہ چلتا ہے۔ لوہش کی ہر فلم میں ہتھوڑی بہت کلبیت نظر آتی ہے جو کامیڈی میں زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ شاید کلبیت اس کے فلسفہ زندگی کا اہم جزو نہ ہو، تاہم یہ توصاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کی طبیعت میں اس کا ایک گرا رنگ موجود ہے۔ جن ڈائریکٹروں کا کوئی خاص نقطہ نظر ہوتا ہے وہ اکثر اس کی تکرار کرتے ہیں۔ مثلاً جوزف فان سٹرن برگ میں ایک مصنوعی قسم کی رومان آلود جذبات پرستی ہے جس کی تکرار ”مراکو“ ڈس آنڈ“، ”شنگھائی ایکسپرس“ اور دوسری فلموں میں ہوتی ہے

ہماری کامیڈی کی ناکامی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم مغرب کی نقل کرتے ہیں۔ ہماری فلموں میں اسی قسم کے مذاق ہوتے ہیں جو ہم مغربی فلموں میں دیکھتے ہیں۔ بہت کم ہم اپنی طرافت کو کام میں نہ لائینگے ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔

جیسا کہ میں پہلے کہ چکا ہوں مناظر کا انتخاب اور اس بات کی دریافت کہ وہ کس زاویہ سے دکھائے جائینگے بہت اہم باتیں ہیں ”فلم کے سامنے ساری کائنات اور زمانہ کا لائن ہی سلسلہ

پڑا ہے۔ اسے اختیار ہے کہ زمانہ و مکان کے دامن میں جتنے رنگا رنگ جلوے ہیں ان میں جسے چاہے منتخب کرے۔... البتہ انتخاب بہت اہم کام ہے۔“ (پرفیسر خری)

زیادہ افسوس کا مقام یہی ہے کہ ہمارے فلمکاروں کی نظر انتخاب بہت کمزور ہے۔ کوئی منظر بذات خود کتنا ہی دلکش کیوں نہ ہو اگر اس کا اصلی موضوع سے کچھ تعلق نہیں تو بیکار ہے۔ ”جلتی نشانی“ میں اونٹوں کی ایک قطار کھجوروں کے درختوں کے پاس سے گزرتی ہوئی دکھائی گئی ہے اور سورج غروب ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ منظر بذات خود بہت خوبصورت ہے لیکن اس کا فلم سے کچھ تعلق نہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسری فلم سے کاٹ کر اس میں جوڑ دیا گیا ہے۔ ایک انگریزی فلم ”ٹیل می ٹو نائٹ“ میں اٹلی کے دلکش پہاڑوں، جھیلوں اور وادیوں کے مناظر بڑی افراط سے دکھائے گئے ہیں لیکن کہانی میں ایک ایسی رومانیت اور قدرتی مناظر کا ایک ایسا عنصر پایا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ فلم کا ایک حصہ بن گیا ہے ایک امریکن فلم ”کیمز“ میں ایک خوبصورت منظر کو بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے۔ ایک نوجوان کسی بوڑھے ڈوک کی داشتہ پر عاشق ہو جاتا ہے اور اس کے ہمراہ چند دن کے لئے کسی اور جگہ چلا جاتا ہے۔ وہاں ایک باغ کا سین ہے جس میں بہت خوبصورت درخت اور پھول آگے ہیں۔ مدہم روشنی درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر آرہی ہے۔ ننھی ننھی تیریاں اور بھونرے اڑ

نہیں۔ آج تک کسی نے ان کو مناسب طریقے پر استعمال نہیں کیا۔ ہمارے ہاں جو کہانیوں اور روایتوں کا ایک ذخیرہ پڑا ہے اس کو کسی نے چھیڑا تک نہیں۔ لیکن میں یابوسی کا قائل نہیں بہت ممکن ہے کہ اب اس وقت کوئی ایسی فلم ہندوستان میں بن رہی ہو جو ان سب شکایات کو بیکار بنائے۔

آغا عبدالحمید

ہندوستانی فلموں میں ابھی ایسی باتوں کی توقع پیش از وقت ہے۔ ابھی تو یہی غنیمت ہے کہ کوئی سیدھی اور سلجھی ہوئی فلم نظر آجائے جس میں جگہ جگہ بھول نہ پڑتی ہو۔ ہندوستانی فلموں کا مستقبل بڑا شاندار ہو سکتا ہے۔ ہمارے ہاں بلند سے بلند پہاڑ دلکش منظر، جھیلیں، ریگستان اور خوبصورت عمارات کی کوئی کمی

نگار خانہ چین

رفیق

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی گل و بلبل کی عشق بازیاں ختم ہو گئیں۔ بھونرے اپنے محبوب پھولوں سے اگتا کر جدا ہو گئے۔

رات کا پچھلا پہر آپہنچا۔ تاروں کی محفل برخواست ہونے لگی۔ اے لو۔ وہ ایک ایک کر کے سب کے سب آسمان سے رخصت ہو گئے۔

لیکن میں اور چنگ کی پہاڑی ہم ایک دوسرے کی رفاقت سے کبھی سیر نہیں ہوتے۔ چاہے ہم کتنا ہی عرصہ اکٹھے رہیں۔

غلام عباس



عبدالقادرسروری

نثری افسانوں کا ارتقا

فورٹ ولیم کالج کے قیام تک

نظمیں، خصوصاً قصہ و انظمیں، زبانوں کی اولین یادگار ہوتی ہیں۔ اسی طرح کی نظموں میں قوموں کے جذبہ قصہ گوئی کا اظہار سب سے پہلے ہوتا ہے۔ اور انہی کے ذریعے قصہ خوانی اور قصہ سننے کا ذوق افراد قوم میں سرایت کر جاتا ہے۔ لیکن قومی ذہن جب کافی طور پر نشوونما پا چکے ہیں اور مربوط اور مسلسل خیالات کے اظہار پر انہیں قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ تو نظم کی بندشیں ان کو اپنے راستے میں حائل معلوم ہونے لگتی ہیں۔ عموماً اسی وقت سے نثر میں اظہار خیال کی کوششیں شروع ہوتی ہیں۔ پہلے پہل تو سیدھی سادی زبان میں خیالات ظاہر کئے جاتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے قومی احساس شعریہ کو ترقی ہوتی جاتی ہے نثر میں بھی حسن پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

نظم کی طرح نثر میں بھی، سب سے پہلی قابل گفتنی چیز جو قوموں کو نظر آتی ہے۔ وہ اپنے اسلاف کے کارنامے ہیں۔ جو رفتہ رفتہ مبالغہ آمیز (یعنی افسانوں اور داستانوں کی) شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے۔ کہ زبان کے نشوونما کی ابتدائی حالت میں چند شائستہ زبانیں اور ان کا ادب اس کے ارد گرد موجود ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ترقی یافتہ زبانوں سے وہ فطرتاً متاثر ہوتی ہے۔ انشا پر دازوں کے لئے بنے بنائے سانچے مہیا مل جاتے ہیں۔ ان سے وہ صرف فراخ دلی کے ساتھ استفادہ کرتے ہیں۔ بلکہ بعض وقت انہیں زبانوں کی ادبی صورتوں پر، یہ اپنے ادب کی بنیادیں قائم کر لیتے ہیں۔

بعینہ یہ حال اردو زبان کا ہے۔ اس کے تشکیلی دور میں، فارسی زبان کا وسیع اور متنوع ادب، اس کے اطراف پر موجود تھا۔ اس لئے ابتدائی زمانے کے انشا پر دازوں نے فطرتاً اس سے استفادہ کیا۔ شاعری میں فارسی شاعری صنفوں کے ساتھ، فارسی تلیحات اور فارسی اسالیب بھی بعینہ یا کچھ تغیر کے ساتھ اردو میں منتقل ہو گئے۔ فارسی کے انشائیہ ذخیرے سے بھی اردو ادیبوں نے کافی فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ ابتدائی دور میں فارسی قصوں اور داستانوں کی طرز کے بہت سے قصے اردو زبان میں لکھے گئے۔ منظر اردو قصوں پر پہلے پہل کچھ اثر ہندوستانی زبانوں کا رہا۔ لیکن نثری قصہ نگاری کی ابتدا براہ راست فارسی کے اثر کے تحت ہوئی چنانچہ اولین ادبی قصہ سہرس "یا قصہ حسن و دل" فارسی ہی کے ایک مقبول قصہ کا آزاد ترجمہ ہے۔

”سبرس“ کا مصنف وجہی ابراہیم قطب شاہ (۹۵۷-۹۸۸) والی گوکنڈہ کے دربار کا مشہور شاعر تھا۔ اس نے ”قطب مشرعی“ کے نام سے ایک مشہور قصہ بھی لکھا ہے۔ جو کوئی ادب کا بیش بہا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ ”سبرس“ (۱۰۴۵ء) کی تصنیف کا زمانہ حقیقت منظم قصوں کا دور ہے۔ دنیا کی زبانوں کے نثری قصے عموماً بعد کی پیداوار ہوتے ہیں۔ لیکن اردو میں نثری قصے بھی، منظوم قصوں کے عہد ہی سے لکھے جانے لگے تھے۔ چنانچہ وجہی، نثری اور منظوم قصوں کا سب سے پہلا مصنف ہے۔ جس طرح اس کی تصنیف ”قطب مشرعی“ کو منظوم قصوں میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ اسی طرح نثری قصے کا بھی وہ موجود ہے۔

”سبرس“ یا ”قصہ حسن و دل“ فارسی زبان میں بھی ایک سے زیادہ مرتبہ لکھا جا چکا تھا۔ اس کی اسی مقبولیت نے وجہی کو ترجمہ کرنے پر ابھارا۔ لیکن ترجمہ اصل کا لفظ بلفظ پابند نہیں ہے۔ وجہی نے اس میں حسب ضرورت تصرفات بھی کئے ہیں۔

”سبرس“ کا اصل مقصد معرفت اور تصوف کے بعض مسائل کی توضیح ہے۔ لیکن یہ چیز قصے کی دلچسپی پر کسی حالت میں بھی اثر انداز نہیں ہوتی۔ پورا قصہ ایک تخیل کے پیرایہ میں لکھا گیا ہے۔ اشخاص قصہ کے نام بھی ایک معنی رکھتے ہیں۔ دل اس کا ہیرو اور حسن اس قصے کی ہیروئن ہے۔ حسن کی تلاش میں دل کو جو ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں۔ اسی سے قصے کا پلاٹ پیدا ہوتا ہے۔ یہ عشقیہ مہماتی قصہ ہے۔ اور بہت ہی نفاست اور خوبی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس کی دلچسپی، بعد کے اکثر قصوں سے بہت زیادہ، اور اس کی نفاذ گو نصب العینی اور روحانی سہی، لیکن بہت ہی مؤثر ہے۔ یہ اتفاقی بات ہے۔ کہ اردو کا یہ اولین قصہ مرصع اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی اس میں ایک سادگی اور ایک لطف ہے جو بعد کے مرصع قصوں میں بہت کم نظر آتا ہے۔ اگر زبان کی قدامت کا لحاظ نہ ہو۔ تو یہ قصہ اب بھی فرصت کے اوقات کا بہترین مطالعہ ثابت ہوگا۔

فارسی قصے لکھان اولین اردو مصنفین کے پیش نظر نہ ہوتے۔ تو اس دور تشکیل میں ”سبرس“ جیسے سبب اور نفیس قصے کا لکھا جانا ممکن تھا۔ یہ اردو ادب کی خوش نصیبی تھی۔ طرح اندازی کے لئے فارسی ادب کے ایسے نفیس نمونے اسے مل گئے۔ قصہ نگاری کے اس خاص انداز کی ابتدا جو وجہی سے ہوئی۔ وہ اردو افسانہ نگاری کے قدیم دور کے اختتام تک برابر قائم رہی۔ چنانچہ کوئی ادب کے زمین عہد سے لے کر زوال کھٹو تک کے طویل عرصہ میں جتنے قصے اردو میں لکھے گئے۔ وہ تقریباً تمام کے تمام اسی طرز کے ہیں۔ صرف چند قصے ایسے ملتے ہیں، جن میں مرصع اسلوب کا لحاظ کم کیا گیا ہے۔ اس میں مصنف قصہ کے طبعی رجحانات کو بھی بہت دخل ہے۔ ”سبرس“ کے بعد کئی قصے لکھے گئے ہوں گے۔ لیکن ان میں سے اب بہت کم دستیاب ہوتے ہیں۔ دوسرا قصہ جو ملتا ہے۔ وہ دکنی سلطنتوں کے زوال کے قریب کا ہے۔ یہ قصہ ”توتا کمانی“ کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ سنہ تصنیف ۱۱۴۲ء ہے۔ یہ ”سبرس“ کے قریب ایک سو سال بعد لکھا گیا۔ اور فارسی ہی کے ایک مقبول قصے کا ترجمہ ہے۔ اصل قصہ ”طوطی نامہ“ سنسکرت کے قصے ”شکاسپتی“ سے ماخوذ تھا۔ سب سے پہلے ملا ضیاء بخشی نے اس کی باواں حکایتوں کا ترجمہ طوطی نامہ“ کے نام سے فارسی میں کیا تھا۔ گیارہویں صدی ہجری میں ملا محمد قادری نے ضیاء بخشی کے ”طوطی نامہ“ سے بتیس قصوں کو سلیس فارسی زبان میں لکھا۔ اردو کا اولین ”طوطی نامہ“ ملا محمد ہی کے منتخب قصوں کا ترجمہ ہے۔

”سبرس“ کے مقابلہ میں ”توتا کمانی“ کا اسلوب بہت سادہ اور سلیس ہے۔ اس کا سبب خود ملا محمد کا قصہ معلوم ہوتا ہے۔ جو سادہ زبان میں لکھا گیا تھا۔ ورنہ وجہی کے مرصع قصے کے پیش نظر ہوتے ہوئے ”توتا کمانی“ کا ایسے سادہ اسلوب میں لکھا جانا تعجب سے خالی نہ

ہوتا۔ بہر حال اردو کے سلیس قصوں میں "توتا کمانی" سب سے پہلا قصہ ہے۔ بعد میں فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کے انشا پرداز 'سید عید بخش حیدری' نے اپنا مشہور کارنامہ "توتا کمانی" لکھتے ہوئے، اسی کو پیش نظر رکھا۔ دکنی "توتا کمانی" اور حیدری کی "توتا کمانی" میں اسالیب بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔

سنسکرت میں لقمان کی حقایقوں کی طرز کے قصوں کو بہت عروج ہوا تھا۔ سنسکرت کے یہ تمثیلی قصے زیادہ بسیط اور زیادہ نفیس ہیں ہندوستان کے صنایع ایسے قصے معاشرتی اور اخلاقی مقصد سے لکھتے تھے۔ لیکن یہ اس حسن کے ساتھ مرتب کئے جاتے تھے۔ کہ اصل مقصد قصے کی دلچسپی میں کسی طرح بھی حارج نہیں ہوتا تھا۔ "انوار سیلی" اس کا ثبوت ہے۔ "توتا کمانی" بھی "انوار سیلی" کی فکر کا قصہ ہے لیکن اس ماخوذ ترجمے میں وہ وسیع تنوع نہیں ہے، جو "انوار سیلی" کے قصوں میں موجود ہے۔ پھر بھی "توتا کمانی" "سب سے زیادہ مقبول قصہ ثابت ہوا۔ اور اردو میں یہ نہ صرف ایک سے زیادہ مرتبہ دہرایا گیا۔ بلکہ بعض ایسی بھی قصوں پر بھی اس کا اثر پڑا۔

دکنی ادب کے زریں دور میں یہی دو قابل ذکر قصے پیدا ہوئے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ دکنی سلطنتوں کے زوال کے بعد بھی منظوم قصے یہاں عرصے تک لکھے جاتے رہے۔ لیکن نثری قصے بہت کم دستیاب ہوتے ہیں۔

بیجا پور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کی تباہی کے بعد دہلی میں اردو ادب کو فروغ نصیب ہوا لیکن دہلی میں زیادہ تر شعر و سخن کے چرچے رہے۔ اور شعری اصناف ہی کو یہاں ترقی ہوئی۔ نثری ادب کی طرف دہلی کے انشا پردازوں نے توجہ ہی نہیں کی۔ ابتدائی زمانہ ایسے شعرا کی کاوشوں پر مشتمل ہے۔ جو فارسی زبان کے شاعر تھے۔ اور تفریح طبع کے لئے اردو میں بھی شعر کہ لیا کرتے تھے۔ ایسے زمانہ میں نثر کی طرف توجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن تعجب تو یہ ہے۔ کہ دہلی کی شاعری کے زریں عہد یعنی میر اور سودا کے زمانے میں بھی نثر میں کچھ نہیں لکھا گیا۔ ٹھیٹ اردو شعرا بھی جب کوئی چیز نثر میں لکھنی ہوتی، فارسی میں لکھتے۔ میر تقی میر کا تذکرہ فارسی ہی میں لکھا گیا۔ دہلی کے اس زریں عہد میں صرف ایک نثری کارنامہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اور وہ اتفاق سے قصہ ہی ہے مشہور ہے۔ کہ سودا نے میر کی مشہور "شعلہ عشق" کو نثر میں لکھا تھا۔ لیکن اب یہ نثر لاتہ ہے۔ اس کو چھوڑ کر جعفر زلی کی چند عبارتوں اور فضلی کی "وہ مجلس" (ترجمہ "رومۃ الشہدا") کے علاوہ دہلی کی تباہی سے پہلے شاید ہی کوئی نثری چیز یہاں لکھی گئی ہو۔

دہلی کی تباہی کے بعد یہاں کے ارباب سخن جب لکھنؤ پہنچے۔ تو لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ دہلی کے ترانہ سنجوں سے وہ ایسے مسحور ہوئے۔ کہ عرصہ تک شعر و سخن کی دلچسپیوں میں غرق رہے۔ اسی کو انہوں نے ترقی دی۔ اور اسی میں جڑیں پیدا کیں۔ کئی منظوم قصے لکھے جن میں سے ایک اردو منظوم قصہ گوئی کا معراج کمال ہے۔ لیکن نثر میں فورٹ ولیم کالج کے قیام یا لکھنؤ کے تنزل سے پہلے بہت کم لکھا گیا۔

نواب شجاع الدولہ (۱۷۵۳ء - ۱۷۷۵ء) کے عہد حکومت میں شمالی ہند کا سب سے پہلا نثری قصہ وجود میں آیا۔ یہ عطاحین خاں تحسین اٹاوی کا قصہ "نور طرز مرصع" ہے۔ جو "شعلہ" کے قریب لکھا گیا۔ تحسین انگریزوں کی ملازمت میں رہ چکے تھے۔ لیکن پھر بھی ان کی طبیعت مرصع نگاری کی طرف مائل تھی۔ چنانچہ اپنے زمانہ میں یہ مرصع رقم کے لقب سے مشہور تھے۔ تحسین کا قصہ فارسی کے "چار و یث" کا ترجمہ ہے۔ جس کو میرامن دہلوی کے قلم نے لازوال بنا دیا ہے۔ میرامن کا اسلوب جس قدر سادہ ہے۔ تحسین کا اسلوب اسی قدر مرصع اور بچیدہ۔ تحسین کے قصے کو اب دلچسپی کی خاطر کوئی نہیں پڑھتا۔ بلکہ یہ ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

لکھنؤ کے مشہور شاعر انشاء اللہ خاں انشاء ایک داستان کے بھی مصنف ہیں۔ جو اب چھپ چکی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ یہ ٹھیک اردو زبان میں لکھی گئی تھی۔ فارسی یا عربی الفاظ کے اخراج کا اس میں التزام کیا گیا ہے۔ لکھنؤ کے زوال سے پہلے پہلے ایک اور اہم قصبہ بھی یہاں لکھا گیا۔ یہ قصبہ ”فسانہ عجائب“ ہے۔ اور اس کے مصنف رجب علی بیگ سرور ہیں۔ قدیم ادبی دور کے ختم سے پہلے کا یہی ایک قصبہ ہے۔ جو فورٹ کالج سے باہر اور اس کالج کی کارگزاری کے زمانہ میں لکھا گیا۔

رجب علی بیگ سرور لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اسی سماج اور اسی ماحول میں ان کا ادبی کردار بنا جس میں آتش، ناتج، دبیر اور نسیم جیسے صنائع و ماغوں کی پرورش ہوئی۔ سرور قدیم مرصع اسلوب کے سب سے آخری مستند استاد سمجھے جاتے ہیں۔ سرور شاعر بھی تھے۔ لیکن ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ ان کے قصبے ہیں۔ انہوں نے کل چار قصبے لکھے تھے: ”شکوہ محبت“، ”شبتان سرور“، ”مشرعشق“ اور ”فسانہ عجائب“۔ ”شبتان سرور“ الف لیلہ کے چند قصوں کا ترجمہ ہے۔ جو سرور نے اپنے خاص انداز میں نہایت خوبی سے کیا ہے۔ باقی قصبے ان کی اپنی فکر کے نتائج ہیں۔ لیکن ان سب میں ”فسانہ عجائب“ کئی حیثیتوں سے اہم ہے۔ یہ قصبہ اسلوب کی نزاکت، روزمرہ اور محاورہ کے لطف، اور سب سے زیادہ عشقیہ مہمت کی دلچسپیوں کے باعث ہمیشہ زندہ رہے گا۔

”فسانہ عجائب“ کے خاکے (پلاٹ) میں واقعات بہت گتھے ہوئے ہیں۔ اور مہمت کی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ نرمیہ اور حیرت زا واقعات کے اختلاط کا یہ عجیب و غریب مجموعہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قصہ فوق الفطرت یا فوق العادت واقعات سے پر ہے۔ اس کے کردار انفرادی امتیازات سے عاری اور انسانی جذبات اور احساسات سے بیگانہ ہیں۔ نصب العینیت اور رد مائیت کا اردو میں یہ قابل ذکر کارنامہ ہے۔ جس کو اسلوب کی ندرت نے، ہمارے ادب کے لئے ناقابل فراموش بنا دیا ہے۔

سرور کا قصبہ بہت زیادہ طولانی بھی نہیں۔ کہ اس کے پڑھنے کے خیال ہی سے انسان گھبرا جائے۔ یہی اسباب ہیں۔ کہ سرور کا قصبہ زندہ رہا۔ حالانکہ اس سے زیادہ محنت اور تخیل کی سعی مسلسل کے عجیب و غریب نمونے جیسے ”طلسم ہوش ربا“ اور ”بوستان خیال“ وغیرہ ایک عجائب روزگار تخلیق انسانی کی طرح صرف دیکھنے کے لئے رہ گئے ہیں۔ انہیں انتقال کلمے کی جرأت بہت کم لوگ کرتے ہیں۔ ”فسانہ عجائب“ پر قدیم قصبہ نگاری کا عمدہ ختم ہو جاتا ہے۔

عبد القادر سروری

”ہر کجا کہ رسیدیم کاروان پیدا است“

رشید احمد صدیقی

”کاروان پیدا است“

ہونا کوئی سیاسی صیں دم کئے ہوئے ہے۔ چلنے والی ہوتی تو معلوم ہوتا
جاپان میں زلزلہ آ رہا ہے ’چلتی تو پھر‘

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پہلے رکاب میں
ڈاکٹر بٹ صاحب نمودار ہوئے، ایک نعرہ لگایا، کہاں ہے رشید
’نوکے‘ انہیں سب بھاگ کر گھر میں آئے باوجود اس کے کہ میں
اپنے مکان کے اس کمرہ میں تھا جہاں اندر صحن کی آواز بھی مشکل پہنچ
سکتی تھی اس خلفشار نے مجھے بھی سراپیمہ کر دیا، باہر نکلا تو آواز
آئی اے مجید کا خط آیا ہے تم نے کاروان کے لئے مضمون لکھا
یا نہیں۔ پہلے تو میں نے ذہن میں اس امر کا جائزہ لیا کہ مکان میں کوئی
شخص بیمار تو نہیں ہے۔ جب اس طرف سے اطمینان ہوا تو کسی قدر
دلیر ہو کر بولا، کیسا مضمون؟ ڈاکٹر صاحب بولے ناک میں دم
ہے۔ تم نے کاروان کے لئے مجید سے مضمون لکھنے کا وعدہ کیا ہوا
تھا۔ اس کا خط آیا ہے کہ مضمون لے کر بھیج دیا جائے۔ میں نے کہا
جناب لکھنے یا نہ لکھنے کا وعدہ تو میں نے ان سے کیا تھا، آپ مجھ پر
کیسے مسلط ہو گئے۔ بولے سلام علیکم، گاڑی پر لرزہ طاری ہوا، محلہ
والوں کے کان کھڑے ہوئے، انجن نے زقند بھری اور سوار دسواکی
دونوں غائب!

برق تھی، صرصر تھی یا ہمتا زلزلہ

کہتے ہیں ایک بار تین بزرگ ہمسفر ہوئے، ایک نائی، ایک گنجا،
ایک فلسفی۔ رات کا وقت ہوا اور طے یہ پایا کہ ہر شخص باری باری سوتے
جائے۔ ترتیب یہ قرار پائی کہ سب سے پہلے نائی پڑے اس کے بعد
فلسفی اور اس کے بعد گنجا۔ چنانچہ موخر الذکر دونوں بزرگ سو رہے
اور نائی پڑ دیتا رہا۔ کچھ دیر تک تو نائی جاگتا رہا۔ لیکن آخر طبیعت
اکٹائی تو اس نے سوچا کہ کوئی شغل کرنا چاہیے ورنہ وقت کٹنا دیکھ
ہو جائیگا چنانچہ اس نے کسوت کھول کر اسٹرہ نکالا اور بیٹھے بیٹھے
فلاسفہ کا سر مونڈ دیا۔ وقت معینہ ختم ہونے پر اس نے فلسفی کو جگا
دیا اور خود سو رہا۔ فلسفی نے جمائی لے کر اتفاقاً سر پر ہاتھ پھیرا تو
چونک پڑا اور متحیر ہو کر بولا۔ ”باری تو میری تھی اس کمجنت نائی نے
مجھے کو کیوں جگا دیا!“

مجید صاحب اور مجھ میں بالمشافہ یہ طے ہوا تھا کہ ہوسکا تو کاروان
کے لئے مضمون لکھ دوں گا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ مجید صاحب کو یہ یقین کہ
میں مضمون لکھ دوں گا۔ اور مجھے یہ تقویت کہ آخر اپنے اختیار کی بات ہے
چنانچہ مجید صاحب نے یاد دہانی کے لئے تار بھی بھیجے لیکن میں دنیا کی
بے ثباتی پر ہنستا رہا۔

ایک روز دووانے پر ایک موٹر آ کر رکی۔ میں نے ہر قسم کی موٹر دیکھی
ہے لیکن یہ موٹر اپنی سچ دھج اور شور و شغب میں نرالی تھی۔ کی رہتی تو معلوم

معلوم ہے انفلوئنزا متعدی ہوتا ہے۔ میں نے کہا جناب من انفلوئنزا کا متعدی ہونا مسلم لیکن آپ کا بد اخلاق یا بد جو اس ہونا کہاں تک روا ہے۔ آپ ڈاکٹروں نے مرض کو اور مولویوں نے مذہب کو ہوا بنا رکھا ہے۔ مرض میں مبتلا ہو کر جاں بحق ہونا اتنا بڑا سانحہ عظیم نہیں جتنا کہ مریض سے بھاگنا بزدلی اور شقاوت ہے۔ کہنے لگے لفظی اور لسانی کسی اور وقت کے لئے ملتوی کرو یہ تو بتاؤ مضمون بھی لکھایا نہیں۔ اس کے لئے میں تیار ہو کر آیا تھا 'بولا عنقریب ختم ہونے والا ہے' لیکن بھیجی کی بیماری کو کیا کر دوں 'فرمایا اچھی ہو جاؤ گی مضمون تیار کر لو' میں نے کہا لیکن مشکل یہ ہے کہ مضمون لکھنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا آپ کا نسخہ لکھ ڈالنا 'کہنے لگے تو پھر تم نے لکھنے کا وعدہ کیوں کیا ہوا تھا۔ میں نے عرض کیا 'ڈاکٹر صاحب حد کر لینا تو بس ایسا ہی ہے جیسے آپ نے کہا سلام علیکم میں نے کہا وعلیکم السلام۔ ایک اضطرابی فعل کا جواب دوسرے اضطرابی فعل سے دے دیا گیا۔ اس کے ایفا پر آپ کا اصرار کرنا یقیناً "حق آسانش میں خلل اندازی" ہے۔ فرمایا۔ اچھا رخصت سلام علیکم

تعطیلوں میں بارش، اور چوروں کی یورش ہوئی اس پر لطف یہ کہ مکان کے ایک حصہ کی توسیع ہو رہی تھی۔ بارش اور سلسلہ تعمیر نے "کاشانہ کا کیا یہ رنگ"

کہ ہو گئے مے دیوار دور درو دیوار

بچی ٹائیفائیڈ میں مبتلا، دن بھر تو ڈاکٹروں اور دوا خانوں کی سیر رہتی، رات بھر تیمار داری کا سلسلہ جاری رہتا۔ میں نے ایک بار تنگ آ کر کہا تیمار داری سے تو بہتر ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو جانا ہے۔ بیوی نے کہا خاموش ہو جاؤ، اللہ کی مصلحت میں چون و چرا کی گنجائش نہیں۔ میں نے کہا چون و چرا کون کرتا ہے۔ رات بھر بیمار بچی کو گود میں لے کر ٹھلانا میں ایسے فقرے نکل ہی جاتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم مذہب کے معاملہ

ٹائیفائیڈ نے درد فرمایا گھر میں بچی بیمار ہوئی۔ خیال آیا ڈاکٹر صاحب کے ہاں چلوں، ساتھ ہی ساتھ مضمون کا خیال آیا جس کا کوسوں پتہ نہ تھا، معاً جھوٹ بولنے کی تحریک ہوئی، ایک مصرعہ بھی ذہن میں آگیا اور ایسا رواں اور شگفتہ کہ دیکھتے دیکھتے پوری نظم مرتب ہو گئی۔

ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ یہ کوٹھی میرس روڈ پر ابھی حال ہی میں تیار ہوئی ہے، نہایت وسیع، نہایت خوش قطع، سامنے گھاس کا کشادہ میدان، آمدورفت کا راستہ بھی نہایت سہرا، ہموار اور کشادہ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انفلوئنزا میں مبتلا دیکھتے ہی ٹلنے خوب آئے کوٹھی کا نام تجویز کر دوں، میں نے کہا یہ آپ نے روکار پر لکھا رکھا ہے، فرمایا حمید بٹ اور محمود بٹ میں نے کہا یہ کوٹھی کا نام ہے یا خاندان کا شجرہ نسب، کہنے لگے ہرج ہی کیا ہے میں نے کہا ایسا نام بھی کیا جس کو نہ ثواب سے لگاؤ نہ آرت سے تعلق، ثواب کی خاطر رکھتے تو کراما کاتبین میں کیا قباحتی اور آرت مد نظر تھا تو یا جوج ماجوج رکھتے۔ لکھا کہ بولے، ناک میں دم ہے، آخر تمہیں کچھ بتاؤ، لیکن میں منزل و زلزل کا قائل نہیں، میں نے کہا پھر ظاہر ہے بٹ کہ وہ نام رکھئے، ہندوستانی حکومت اور اردو رسم الخط بدلتے بدلتے بتکدہ رہ جائیگا!

فرمایا کہو کہاں چلے، میں نے کہا بچی ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہے۔ کہنے لگے حال سناؤ، میں نے حال کہنا شروع کیا اور ڈاکٹر صاحب نے نسخہ لکھنا، میں نے ابھی بھر بھی متیقن نہیں کی تھی ڈاکٹر صاحب نے پوری نظم تیار کر دی۔ اتنے میں طائیہ بی وڈی آئیں اور فرمایا باجی نے کہا ہے آپ نے کاروان کے لئے مضمون نہیں لکھا۔ میں نے کہا باجی سے کہ دیجئے کہ اس پھیر میں نہ پڑیں اڈیٹر اور مضمون نگار کے معاملات سے ان کو کوئی تعلق نہ ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب نے دونوں کو ملکا را کہ کمرے سے نکل جاؤ۔ طائیہ بی تو بیچاری گھبرا کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ میں نے کہا جناب والا، آپ کا یہ حکم بحیثیت مالک مکان کے ہے یا بحیثیت ڈاکٹر کے، فرمایا بحیثیت ڈاکٹر کے۔ تم کو

میں بھی مجھ سے مشتبہ ہو جاؤ مصلحت کی فائل تو مجھ سے زیادہ تم ہو نہیں سکتیں۔ دیکھتی نہیں چوروں کی وجہ سے تمام لوگ کس درجہ پریشان اور سراسیمہ ہیں۔ ہم تم کس قدر بیگمہ ہیں۔ بچی چوروں سے نجات کا باعث ہو گئی ورنہ مکان ٹوٹا ہوا ہے چور گھس آتے تو بھڑکی تمہاری بے پردگی تو ہوتی ہی تمہاری کفایت شکاری اور میری زیربائی دونوں مال مسروقہ بن جاتیں۔ بیوی نے کہا اچھا چپ رہو رات کے وقت چور ڈاکو کا ذکر نہیں کرتے لیکن آخر برسات میں مکان پھیرنے کو کس نے کہا تھا میں نے کہا 'کما کس نے تھا' مصیبت کہیں کہہ آتی ہے۔ ضرورت اور اتفاق کس کے بس سے ہیں۔ نہیں بناؤ ہماری تمہاری شادی کو کس نے کہا تھا کہ عین طوفان کی حالت میں ہو اور رخصتی طوفان فوج اور کشتی فوج میں ہو۔ بیوی نے جھلا کر کہا کہاں کی بات کہاں پہنچا دی تم تو مجھے ہمیشہ سے دباں جان ہی سمجھتے ہے۔ میں نے کہا بڑی مشکل ہے میں نے چوروں کا تذکرہ کیا تو تم نے کمالات کے وقت اس کا ذکر نہ کرو میں نے سوچا 'نیت شب بکھر' شادی کا قصہ پھیروں اس پر تم چرخ پا ہو گئیں۔ تمہیں بناؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے

لتنے میں بچی نے ایک چیخ ماری اور میں پھر دلی چلنے لگا۔ اور موسیقی کی وہ دھن شروع کر دی جو موسیقی کی ایجاد سے بہت پہلے وہ دن ہو چکی تھی۔ اب بارش کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہوا چلنے لگی، شب کی تاریکی و خاموشی میں ایک طرح کا نم آلود سکر پیدا ہوا جس نے رفتہ رفتہ دماغ، اعضا اور عضلات میں سرایت کرنا شروع کیا۔ اس وقت میں زندگی کا حاصل یا زندگی کی تمام زبونی و درآمدگی کا معاوضہ اس آرام کی نیند سے تعبیر کر رہا تھا جو مجھے اپنے اس صاف ستھرے بستر پر میسر آسکتی تھی جس پر میں نے اکثر نہایت بیقراری اور مایوسی کی راہیں گزاری تھیں۔ زندگی کے بعض لمحات بھی کس درجہ عجیب ہوتے ہیں جب انسان بے اختیار یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ ان سے عمدہ برابا لطف اندوز ہونے کے لئے اپنی قیمتی ترین متاع بھی قربان کجائکتی

ہے!

مریض بچی کو میں نے چارپائی پر آہستہ سے سلا دیا۔ خیال آیا کہ بیوی کو جگا کر خود سو رہوں۔ اتنے میں چوکیدار کی چیخ سنائی دی بجائے محلہ کے چوکیدار کی آواز ایسی ہوتی ہے گویا چور دیکھ کر مائے خوف کے اس کی چیخ نکل گئی ہے۔ بیوی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ بستر سے یہ معلوم ہونا تھا گویا میں نے ہی چیخ ماری ہے فرمایا دیکھتے نہیں بچگی بجا رہے میں نے کہا اس میں دیکھنے کی کون سی بات ہے۔ میں تو اس کے علاوہ یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ آپ آرام فرما رہی ہیں چوکیدار چیخ رہا ہے بارش ہو رہی ہے اور میں الو کی طرح بیٹھا ہوں فرمایا تو اس میں میرا کیا قصور ہے کہ آپ کس طرح بیٹھے ہوئے ہیں اچھا اب جا کر سو رہے تھوڑی دیر میں صبح ہو جائیگی، آپ کو ڈاکٹر بٹ صاحب کے پاس جانا ہے۔ اور ہاں اس دن آئینہ بھی کتنی تھیں کہ آپ نے کوئی مضمون لکھنے کا وعدہ کیا تھا جسے آپ نے پورا نہیں کیا۔ اب میرے تھل کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا میں نے جھجھکا کر کہا وعدہ تو میں نے کیا تھا آپ کیوں سر پر سوار ہو گئیں۔ بچی میں آیا لکھ لگا جی میں نہ آیا نہ لکھ لگا۔ نیکیخت بولیں اچھا شور نہ مچائیے اتنا بھی نو لحاظ ہونا چاہیے کہ ڈاکٹر بٹ صاحب ہم لوگوں پر کتنا کرم کرتے ہیں ان کی ایک ذرا سی فرمائش تو پوری نہیں ہوتی سارا گھر سر پراٹھ لئے پھرتے ہیں۔ خدا جانے لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ مضمون کے لئے آپ کی خوشامد کیا کرتے ہیں۔ آپ کا مضمون میری سمجھ میں تو کبھی آیا نہیں۔ میں نے کہا جس دن میرا مضمون آپ کی سمجھ میں آگیا اسی دن میں خود کشتی بھی کر لوں گا۔ فرمایا خود کشتی کے اس سے بہتر مواقع بھی پیش آیا کئے ہیں لیکن آپ نے اپنا ارادہ ملتوی رکھا۔ اب اس وعدہ فراموشی کے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اس لئے نہیں کہ اس سے رنج و شر مقصود تھا بلکہ کوئی جواب ہی نہ سوچا جا کر چارپائی پر دراز ہو گیا۔ خواب دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی موٹر پر کاروان

کا انبار ہے، موٹر بے تحاشا اور بدحواس چلا آ رہا ہے کھڑکھڑکھڑکھڑ
دھڑ دھڑ، دھڑ دھڑ، تر تر، تر تر، چرچر، چرچر اور...
..... ارارار دھڑام، میرے اوپر سے گزر گیا، آنکھ
کھل گئی تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب بھی کو دیکھنے آئے ہیں اور
دروازہ پر کھڑے نعرے لگا رہے ہیں!

ڈاکٹر خان بیمار ہوئے، ایک آدھ دن ملاقات نہیں ہوئی میں نے خیال
کیا الموترہ سے بیوی بچے نہیں آئے ہیں ممکن ہے کسی فکر میں ہوں
بالآخر معلوم ہوا کہ بیمار ہیں کوئی کتنا ہے بلیریا ہے کوئی کتنا
ہے ٹائیفائیڈ ہے۔ چنانچہ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ واقعی بیمار ہیں
اور ان کے طالب علم تیمارداری میں مصروف ہیں۔ میں نے پوچھا
کیسا مزاج ہے تو اس قدر آہستہ جواب دیا گویا الموترہ سے آواز
آ رہی ہے بخار ہے، میں نے کہا اللہ رحم کرے لیکن یہ بتا شے
کی طرح بیٹھے کیوں جا رہے ہیں۔ بخار ہے تو ہوا کرے، سراسیمہ
ہونے کی کون سی بات ہے۔ ذرا اور خفیف آواز میں بولے،
ٹائیفائیڈ ہوا تو؟ میں نے کہا میں اپنے سارے قرضے ابھی
معاف کئے دیتا ہوں۔ اس پر تو خان صاحب چوکنے ہوئے،
آواز میں کراہا پن پیدا ہوا، بولے، کیسا قرض، ارے تم میرے
مقروض ہو یا میں تمہارا میں نے کہا بھائی کسی کا قرض ہو یہ موقع
تو صرف معاف کر دینے کا ہے، بولے غچہ دیتے ہو، میں نے کہا
خاموش ہو جائیے، بیماری میں رد و قدح نہیں کرتے۔

خون کا معائنہ کیا گیا، اصغر صاحب نے فرمایا،
ٹائیفائیڈ تو ہے نہیں، بلیریا البتہ ہے، میں نے کہا
آپ مریضوں کے نہیں بلکہ طالب علموں کے ڈاکٹر ہیں
آپ کی رائے لینے کے کوئی معنی نہیں اور دینا
اس سے زیادہ مہل، فرمایا، آپ الحق میں ٹیڑھ چارٹ

دیکھو تو معلوم ہو، کرافٹ کا موجودہ نشیب و فراز کبھی ٹائیفائیڈ کا
نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا ٹائیفائیڈ اور بلیریا دونوں ہوں تو کیا
ہو، فرمایا ممکن ہے میں نے کہا آپ کے فیصلہ کا یہی حال ہے
تو تھوڑی سی ہومیوپیتھک پڑھ ڈالئے، کتنے لگے خوب یاد دلایا،
ٹائیفائیڈ میں ہومیوپیتھک علاج بڑا کارگر ہوتا ہے اگر یہ متیقن
ہو جائے تو یقیناً ہومیوپیتھک علاج کرنا چاہئے، میں نے عرض کیا
کہ جب تک مرض یا علاج متیقن نہ ہو اور آپ کی رائے ہو تو میں
زعفران سے آیت شفا لکھ کر پلانے کا انتظام کروں۔ ڈاکٹر صاحب
بولے مذاق کی کون سی بات ہے، کیا معلوم زعفران کی یہ مقدار
بجائے خود ہومیوپیتھک خوراک ہوتی ہو۔ میں نے کہا۔ آپ تو
بحیثیت ایک سائنسدان کے زعفران کے معتقد ہو گئے۔ ڈاکٹر
خان صاحب آیت شفا کے قائل ہیں، ڈاکٹر خان نے منعص ہو کر
کہا کہ تم دونوں یہاں سے دفع ہو تو میری جان بچ جائے اور مجھ
پر بڑا احسان ہو اگر آپ لوگ میرے پاس باری باری آیا کریں۔

بخار قائم رہا، انار، سنگترہ کا عرق، آتش جو، سہل سب کچھ
دیا گیا، ایک پیش نہ گئی۔ ایک دن حسب معمول میں اور اصغر صاحب
مریض کو دیکھنے گئے تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے کہ کوئی شخص
مریض کے پاس نہ جائے۔ حال دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دوا
اور غذا دونوں سے پزار ہیں اور برابر پیچ و تاب کھاتے رہتے
ہیں۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ہم سب دخل درنا معقولاً
دیتے۔ چنانچہ مریض کے پاس پہنچے پوچھا آخر دوا کیوں نہیں دیتے
فرمایا کوئی چیز استعمال نہیں کرونگا۔ معدہ میں کوئی چیز نہیں
گھڑتی۔ بخار کا وہی عالم ہے۔ میں نے کہا دوا
تو ہر حال میں پینی پڑے گی۔ آپ کو جو تکلیف یا شکایت
ہے اس کا دافعہ صرف دوا سے ممکن ہے۔
اصغر صاحب اور مجھ کو دیکھتے تندرستی میں بھی دوا ترک
نہیں کرتے، اصغر صاحب نے چمک کر فرمایا، جھوٹے ہو،

کہ بخار نہیں رہا تو مرض بھی نہیں رہا اس لئے آپ کو خوش ہونا چاہئے
آپ کے مسرور اور مطمئن ہونے سے بیوی بچے تیمار دار سب خوش ہونگے
مرشد کا قول آپ کو نہیں یاد رہا کہ خوش رہنا اکاسما سے زیادہ مفید
اور مقوی ہے ڈاکٹر خان مسکرائے بولے اچھا ہو جاؤں تو تمہاری خبر
لوں۔

میں نے کہا آپ نے کچھ اور بھی سنا خان صاحب جرمنی جانے
والے ہیں اور اصغر صاحب حج کرنے والے ہیں۔ اصغر صاحب
بولے، آپ احمق ہیں، خان صاحب حج کو جا رہے ہیں اور میرا
ارادہ جرمنی جانے کا ہے۔ میں نے کہا یہ تو آپ لوگ ایک بار
کر چکے ہیں لیکن اس کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ میری رائے یہ ہے
کہ اب آپ حج کرنے جائیں اور خان صاحب جرمنی ہو آئیں۔ اس طوطے
پر ہندوستان مذہب اور آرٹ یا مولوی اور عورت کی کشاکش سے
آزاد ہو جائیگا۔ ڈاکٹر خان بولے اور جناب خود کیوں نہیں ہوتے
میں نے کہا میں اور آپ دونوں وجود معطل ہیں، میں شیردانی پاجامہ
پر بیٹ لگاتا ہوں اور آپ کوٹ پتلوں میں مرزا رات پر جاتے ہیں۔
ایک ساحل سے بے نیاز دوسرا کشتی سے محروم! ڈاکٹر خان اس طوطے
پر شگفتہ ہوئے گویا وہ اپنی بیماری بھول آئے تھے۔

ہم لوگ باہر نکلے، اور ابھی آخری زمین سے اثر ہی رہے
تھے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی بھونچال پر سوار آدھکے اور دور
ہی سے لٹکارتے لوگ مریض کے پاس کیسے پہنچے۔ میں نے کہا کیوں
نہ پہنچتے۔ ڈاکٹر صاحب نے بگڑ کر فرمایا، میں نے ہدایت کر دی
تھی کہ کوئی شخص مریض کے پاس نہ جائے میں نے کہا ہم لوگ شخص
کب ہیں، ہم تو علاج ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ناک میں دم
ہے اور کیوں جی مضمون لکھا۔ اب میری باری تھی، میں نے کہا ناک
میں دم ہے، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا اچھا رخصت سلام علیکم۔
ہم لوگ ٹانگے پر بیٹھ کر واپس ہوئے۔

تم ہی تندرستی میں دوا پیٹتے ہو گے۔ ڈاکٹر خان نے کہا باتیں مت کرو
میں کچھ نہ کر دینگا۔ میں نے کہا اسے خوب سمجھ لیجئے آپ کی ایک پیش
جائیگی۔ آپ تو بچوں اور جاہلوں کی سی بات کرتے ہیں، آپ کے عزیز
شاگرد آپ کی صفتی اور جیسی خدمت کرتے ہیں اس کو دیکھ کر اصغر صاحب
کو رشک ہے، کہتے تھے اتنی اور ایسی خدمت میری ہو تو میں بیمار
ہونے کے لئے تیار ہوں، اصغر صاحب نے کہا تم دنیا بھر کے
جھوٹے پٹائے ہو، میں نے کب کہا کہ میں بیمار ہونے کے لئے تیار
ہوں۔ ڈاکٹر خان کچھ مسکراتے پر آمادہ ہوئے تو میں نے کہا دوا پی
لیجئے، فرمایا بکو مت، میں نے کہا آپ کے اس جواب سے تو مجھے
اندیشہ ہوتا ہے کہ آپ کا مسکرانے پر آمادہ ہونا محض منافقت تھی،
خیر آپ کچھ ہی کیوں نہ کریں دوا تو پینی ہی پڑیگی، بولے معاف کیجئے
اور تشریف لے جائیے۔ میں نے کہا مجھے نہایت تعجب ہے آپ
کی تندرستی میں مجھے کبھی یہ خطرہ نہیں گذرا کہ آپ اس درجہ بے تکے
اور صندی ہیں، میں تو آپ کو ان لوگوں میں سمجھتا تھا جو دوستوں کی تائید
قلوب کے لئے دنیا کی بڑی سی بڑی حماقت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں،
فرمایا لا بھائی جان ہی لینے پر آمادہ ہے تو سب کچھ کرونگا، سوڈا اور
دودھ دیا گیا اس کے بعد دوا پلائی گئی اور ہم سب مکان واپس
آئے۔

الموڑہ سے چوی بچے آئے، بخار اور تیار دار کم ہونے لگے
ایک دن ہم سب شام کو ڈاکٹر خان کے ہاں پہنچے تو لوگوں نے اندر
جانے سے منع کیا کہ کچھ اضمحلال زیادہ ہے۔ میں نے کہا آج ہی تو
ہمارے ہی موجودگی زیادہ ضروری ہے۔ پردہ کرایا گیا۔ ہم لوگ اندر پہنچے
تو واقعی ڈاکٹر صاحب نڈھال پائے گئے، نہایت نحیف آواز سے
بولے، طبیعت بہت درماندہ ہے، حرکت کرنے میں بھی تکلف ہوتا
ہے۔ میں نے کہا یہ علامت اچھی ہے بخار اور نشہ دونوں کی کیا
خاصیت ہے، اترتے ہیں تو اضمحلال بڑھتا ہے، کہنے لگے کہ اس
مت کرو، میں نے کہا جناب مذاق ختم کیجئے۔ جب آپ کو معلوم ہو گیا

راستہ میں اصغر صاحب نے فرمایا اور کیوں جی آٹھ دس دن سے مانگے پر یہاں آتے جلتے ہیں، کرایہ کون دیا کرتا ہے۔ میں نے کہا مانگے والے سے پوچھئے، بگڑ کر فرمایا مانگے والے سے کیوں پوچھا جائے۔ تم جو مفت خوری کرتے ہو، میں نے کہا اور کبھی آپ کو یہ بھی خیال آیا ہے میں تعظیماً برابر آگے بیٹھتا ہوں۔ دنیا جانتی ہے جو شخص مانگے پر آگے بیٹھتا ہے اس کا کرایہ معاف ہوتا ہے۔

اصغر صاحب نے فرمایا یہ سب صحیح لیکن آخر آپ خود کیوں نہیں مانگتے کرتے۔ میں نے کہا سوال سینیر اور جونیئر کا ہے۔ میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ سفر سواری میں ایک شخص کو سردار بنایا جاتا ہے بقیہ جتنے لوگ ہوتے ہیں وہ اس کی متابعت کرتے ہیں۔ سینیر اور جونیئر میں فرق یہ ہے کہ میں (جونیر) آپ (سینیر) کی معیت میں ہوں تو پھر میرا خوشگوار فرض ہوگا کہ میں مانگہ کرٹ لائوں، اسباب بار کر اؤں، کرایہ چکاؤں، دوکان پر جائیں تو آپ مانگے ہی پر بیٹھے رہیں، میں کپڑے موزے، جوتے جوڑے، پھل پھلہری لالا کر آپ کو دکھاؤں، کوئی فقیر آجائے تو مار بھگاؤں یا آپ کے پیسے میں سے خیرات دے دوں۔ مجھے کوئی چیز پسند آجائے تو آپ خرید دیں۔ کہیں بحث مباحثہ کی تو آجائے تو قبل اس کے کہ آپ غلط اردو بولنے پر مجبور ہوں میں غلط انگریزی بولنے لگوں۔ برج کی صحبت ہو اور ہم آپ ایک طرف ہوں تو اگر آپ ایک نوٹر مپ کہیں تو میں دو نوٹر مپ کہوں۔ دشمن آپ کو ڈبل کرے تو میں "ری ڈبل" کر دوں۔ آپ غلطی کریں تو مجھے برا بھلا کہ لیں مجھے بحیثیت جونیئر کے کوئی حق نہ ہوگا کہ اپنے سینیر کے خلاف کوئی لفظ منہ سے نکالوں۔

اصغر صاحب نے فرمایا، شکریہ، لیکن آپ خود کیوں نہ سینیر بنیں۔ میں نے کہا سینیر بننا آسان نہیں ہے۔ اس کے لئے صورتِ شکل، وضع قطع، رکھ رکھاؤ ضروری ہے، مجھے اکثر میٹنگ وغیرہ میں شریک ہونے کے لئے باہر جانا پڑتا ہے۔ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لیتا ہوں لیکن بعض اوقات ایسی دشواریاں پیش آئی ہیں اور

ایسی رسوائی ہوئی کہ اکثر جی میں آیا ہے کہ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر تھرڈ کلاس میں بیٹھ جاؤں۔ اول تو قلی پوچھتا ہے کہ صاحب انٹر کلاس میں اسباب رکھوں؟ اس کے بعد ہر بڑے اسٹیشن پر ٹکٹ کلکٹر آتا ہے۔ خواجہ والے وہی بڑے پیش کرتے ہیں اور پانی والا تالوٹا اور بالٹی دکھاتا ہے!

ایک بار ایک صاحب بہادر بھی ہم سفر تھے، کیا ٹکٹ میں داخل ہوا ہی تھا کہ نہایت 'ولندیزی' لہجہ میں فرمایا یہ تو فرسٹ کلاس ہے۔ میں نے ان کی اطلاع سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تو بولے یہ سکند کلاس نہیں ہے۔ میں اب بھی خاموش رہا، ارشاد ہوا انٹر کلاس آگے ہے، میں نے کہا گاڑی چھوٹنے والی ہے فرمایا تو تھرڈ میں بیٹھ جاؤ۔ میں نے عرض کیا سفر لمبا ہے اس میں بڑی تکلیف ہوتی ہے، فرمایا یہ فرسٹ کلاس ہے مقدمہ چلایا جائیگا۔ میں نے کہا شکریہ لیکن ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ اب تک ہم دونوں صحیح انگریزی بول رہے تھے اس لئے کسی قسم کی ناہمواری نہیں پیدا ہوئی۔ صاحب نے سگڑٹ سلگا کر کچھ اور فرمایا جس کو میں نہیں سمجھا۔ میں نے ڈبیا میں سے ایک پان نکال کر منہ میں رکھا اور عرض کیا مگر ارشاد ہو، فرمایا ہم بولا، تم دوسری گاڑی میں جانا مانگتا، میں نے عرض کیا، ہم سمجھا، 'بٹ' یہی جگہ بیٹھنا مانگتا، صاحب کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ ادھر خاکسار نے بھی خلاف معمول اپنے چہرہ پر کچھ اتنا رنج پائے جتنا نے انگریزی میں فرمایا تم کہاں جا رہے ہو، میں نے بھی انگریزی میں کہا اور تم کہاں جا رہے ہو۔ فرمایا جہنم کو میں نے کہا مجھے ذہن سفر سمجھتے لیکن میرا ٹکٹ واپسی کا ہے۔ صاحب بہادر منہ پر ہاتھ رکھنے لگے جب منزل ایک ہے تو درجہ سفر کے ایک ہونے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ بولے کیا کام کرتے ہو میں نے کہا جاہلوں کو مہذب بنانا ہوں، صاحب کسی قدمہ کر جیں ہو کر بولے یعنی؟ میں نے کہا یونیورسٹی میں معلم ہوں۔

کرتا، پردہ کا حامی ہوں بال میں رقص کرتا ہوں، غریب پر آنچ آئے تو گورنمنٹ کا ساتھ دیتا ہوں اپنے اوپر آفت آئے تو جہاد کی تلقین کرتا ہوں۔ رہی مسخرگی اس کا الزام یوں غلط ہے کہ یہ بچے خود کوئی مرض نہیں ہے بلکہ علامت مرض ہے۔ آپ دربارداری کا مطالبہ نہ کریں میں مسخرگی سے دست بردار ہو جاؤں۔ آئینہ میں شکل دیکھنے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ جو نیر کی شکل ہی ایسی ہوتی ہے مرشد کا مقولہ نہیں سنا ہے، فرماتے تھے دنیا میں رہنے کے صرف دو مقصد ہیں نشاط یا نجات یعنی قلو بطرا یا سقراط۔ فرمایا جناب کا مسک کیا ہے میں نے کہا وہی، خود کشی یا شہادت، کہنے لگے شکل تو سقراط ہی کی پائی ہے میں نے عرض کیا اس وقت یونیورسٹی کو قلو بطرا سے زیادہ سقراط ہی کی ضرورت ہے۔ ایک طرف سے صدا آئی،

”اور کاروان کو ایک مضمون کی“

ایک صاحب نے مجید صاحب کا تار لاکر دیا کہ ابھی ابھی گھر پر آیا تھا۔

اب پانی سر سے گزر چکا تھا، ارادہ کر کے بیٹھا کہ مضمون لکھوں گا، خیال آیا کہ کمرہ میلا ہے، تمام چیزیں بے ترتیب ہیں، ان کی صفائی کروں تو پھر اطمینان سے لکھوں۔ چنانچہ کمرہ صاف کیا گیا۔ سب چیزیں سرینے سے رکھی گئیں، قلم اٹھایا تو معلوم ہوا سیاہی نہیں، فوراً ایک ڈپو پہنچا کہ سیاہی کی شیشی خریدوں، وہاں معلوم ہوا ایک ڈپو کی چھت ٹپک رہی ہے، فلاں کتاب نہیں آئی، پارک کی بلیٹیں وی۔ پی آئی ہیں، روپے کا انتظام کیجئے۔ ایک خریدار منیجر سے لکھجے ہوئے ہیں۔ منشی اور دفتری کی جھک جھک ہو رہی ہے۔ کتابوں اور کاپیوں کا آرڈر بھیجنا ہے، اسٹیشنری کی قیمت نہیں لگائی گئی ہے۔ تین گھنٹے اس کے نذر ہوئے۔ شام ہو گئی، مکان واپس آیا تو معلوم ہوا کہ داخلہ کے پہلے میں لڑکے مولدین

صاحب بہادر نے لپک کر نہایت گرجوشتی سے ہاتھ ملایا معذرت چاہی اور اپنے طالب علمی کے قصے سناتے رہے۔ ایک اسٹیشن پر صاحب بہادر اتر پڑے۔ ٹکٹ باؤ نے آکر مجھ سے ٹکٹ مانگا۔ میں نے نکال کر دکھا دیا۔ لیکن اس کو کچھ اطمینان نہیں ہوا۔ اس نے صاحب بہادر کی طرف اس طور پر دیکھا گویا وہ چاہتا تھا کہ موصوفہ احتیاطاً اپنا ٹکٹ دیکھ لیں۔ صاحب بہادر نے میری طرف دیکھ کر پوچھا کیا معاملہ ہے میں نے کہا میرے دوست کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں میں نے آپ کا ٹکٹ تو نہیں نکال لیا۔

میں نے اصغر صاحب سے عرض کیا کہ ان حالات کو دیکھتے ہوئے خدارا انصاف فرمائیے مجھ میں سینیر بننے کی کہاں تک صلاحیت ہے دوسری طرف اپنے آپ کو ملاحظہ فرمائیے۔ آپ اور وائس چانسلر صاحب بہادر سے زیادہ یونیورسٹی میں نہ کوئی خوش لباس ہے اور نہ جامہ زیب۔ آپ کا پانڈان میری بیوی کے سنگار دان سے زیادہ خوبصورت ہے، ابلا پانی پیتے ہیں، ٹیکے لگوانے ہیں، کبھی زندہ نہیں رہنے دیتے قاعدہ سے بچ کھلتے ہیں خواہ قاعدہ کے سبب سے جیتے ہوئے گیم کے بجائے دو چار ہاتھ ڈاؤن ہی کیوں نہ ہو جائیں سالن میں مرج نہیں کھاتے، چائے میں دودھ نہیں ڈالتے، برفیڑی معاف نہیں کرتے، قرض کا تقاضا نہیں کرتے، دن میں ایک بار خط بناتے ہیں اور دو بار غسل کرتے ہیں، نہ کبھی کلاس چھوڑتے ہیں اور نہ ٹرین۔ میں تو فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لوں تو کسی کو یقین نہ آئے آپ بے ٹکٹ بھی سفر کریں تو کسی کو قریب آنے کی ہمت نہ پڑے۔ آپ سے ہاتھ ملانے کے لوگ متمنی اور منتظر میرا سلام لینے سے مستغنی اور میزبان۔ آپ ہی انصاف کیجئے ایسی حالت میں کون سینیر بننے کا مستحق اور سزاوار ہے۔

فرمایا آپ ہیں احمق، مسخرہ بننے کی کوشش فرماتے ہیں، ذرا آئینہ میں شکل تو ملاحظہ فرمائیے، میں نے کہا آپ کے یہ خیالات قطعاً غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ میں احمق نہیں اس لئے کہ چندہ دیتا ہوں خیرات نہیں

اُٹے ہوئے ہیں۔ ٹھنڈا کلاس پاس ہوئے ہیں، گھر سے ایک پیسہ کی امداد نہیں ہو سکتی۔ فیس معاف ہونی چاہئے، قرض حسنہ دلو ایسے آفتاب ہال میں جگہ مل جائے۔ سیکنڈ ہینڈ کتابوں کا بندوبست کیجئے۔ فرنیچر گھر سے دیجئے۔ صبح حبیب صاحب سے ملائیے، وائس چانسلر صاحب کے ہاں لے چلئے۔ قوم کی غفلت، مسلمان بچوں کی تنہائی پر ان کے ساتھ ماتم کرتا رہا اور حاضر کھانا کھانا رہا۔

۹ بجے رات کو زنا خانہ میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ دو ایک صاحب بیمار ہیں۔ ایک صاحب کھانا کھانے سے انکار کرتے ہیں دوسرے صاحب اس قدر کھا رہے ہیں کہ ان کی صحت خطرہ میں ہے اور ماں عنقریب ایسا سلوک کرنے والی ہے جس سے ان کے اعضا و جوارح خطرہ میں ہیں۔ ان کے قضیے فیصل کر کے بیٹھا تھا کہ اب کلاس پڑھانے کے لئے کچھ پڑھ لوں۔ کچھ دیر تک مراقبہ میں رہا کہ ایک طرف سے سسکنے کی آواز آئی جو رفتہ رفتہ بلند ہوتی گئی۔ پوچھا کیا ہے آواز آئی پانی پیونگا جب تک پانی مہیا کیا جائے، ایک دوسرے بزرگ نے ایک نالہ سر کیا، ان کی خدمت میں حاضر ہوا، فرمایا ہم بھی پانی پیئیں گے۔ ان کے حکم کی بھی تعمیل کی گئی۔ واپس آکر پھر کتابیں اٹھائیں۔ اقبال سے رجوع کیا گیا، کل کا سبق ہے ارتقا، نظم نکالی گئی

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

چراغ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

بات تو ٹھیک ہے لیکن آج کل کے مسلمان نوجوان اسے سمجھنے کے کس طور پر؟ ”چراغ مصطفوی“ پر ایمان نہیں ”شرارِ بولہبی“ کے قائل نہیں، اچھا مسئلہ خیر و شر سے بحث کی جائیگی لیکن خیر و شر کو سمجھ سکتے تو ”چراغ مصطفوی“ اور ”شرارِ بولہبی“ کے سمجھنے میں کون چیز حائل تھی۔ اچھا یہ بھی نہ سہی، سرمایہ دار اور مزدور کی مثال سے سمجھانے کی کوشش کرونگا، چلو آگے بڑھو،

حیات متعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی

اس شعر کا سمجھانا ذرا دشوار ہے، ایسی حیات جس نے ”مشکل کشی“ اور ”جفا طلبی“ سے ترکیب پائی ہو ان نوجوانوں کی سمجھ میں کیسے آئیگی جو حیات کا مفہوم یہ سمجھتے ہوں کہ ان کی کفالت کے ذمہ دار ان کے والدین یا مسلم یونیورسٹی ہو اور ہندوستان کی آزادی کے ذمہ دار ہندو، تکلیف ہو تو چھیننے لگیں راحت ہو تو کسی اور کی چیخ سنائی نہ دے اچھا ان کو مثال دے کر سمجھایا جائیگا۔ مسلمانوں کی تاریخ تو ان کے نزدیک افسانہ کسن ہے، ممکن ہے موجودہ ترکوں کی مثال ان کی سمجھ میں آجائے لیکن اگر کوئی ”شمشیر بے نیام“ یہ بول اٹھا کہ موجودہ ترک مسلمان کب ہیں تو کیا جواب ہوگا۔ کچھ ہرج نہیں، حکومت ترکیہ جدیدہ اور حکومت ترکیہ اسلامیہ کے مظاہر شخصی بھی دو ہیں، مصطفیٰ اکمال اور رؤف بے لیکن اسلامی حکومت ممکن ہے ہندی مسلمانوں کی سمجھ میں نہ آئے کیونکہ اس چیز کو جاسمہا اور بڑاٹو کا مینہ وزارت دونوں برا سمجھتے ہیں اس لئے اخلاق اور عقل دونوں اعتبار سے یہ قابل احترام ہے۔ بہر حال اس پر مفصل بحث کرنی ضروری ہے۔ ہاں یہ بھی دیکھ لینا چاہئے اگر بعد کے اشعار مشکل ہوئے تو پھر محفوظ طریقہ کار، فریقین کے لئے یہی ہوگا کہ ساغر اور شراب کے قصہ کو اور پھیلا کر بیان کیا جائے، گھنٹہ ختم ہو جائیگا اور جان بچ جائیگی۔

اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے راز تپ و تاب ملتِ عربی
مناں کہ دانہ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

اچھا تو اس بحث ہی کو کیوں اٹھایا جائے، ”مشکل کشی“ اور ”جفا طلبی“ کا فلسفہ موجودہ جرمن قوم کی مثال سے سمجھا جائیگا

چلے ساری وقت حل ہو گئی۔ ان مسلمان نوجوانوں کی سمجھ میں اس وقت تک کوئی چیز نہ آسے گی جب تک آپ اسلامی ادب یا تاریخ کی مثالیں پیش کرتے رہیں گے، ہاں آپ کسی غیر اسلامی چیز کو اٹھائیں اور یہ آپ کے معتقد اور ہمہنوا بن جائیں گے، لیکن اس وقت اس کا موقع نہیں ہے کہ قوم کا ماتم کیا جائے۔ کسی نہ کسی طرح سبق پر نظر ڈال لینی ہے۔

سکوت شام سے تا نغمہ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغان نیم شبی

خدا کا شکر ہے اس شعر کے سمجھنے میں زیادہ وقت نہ ہوگی۔ اول تو یہ بحث مشکل کشی اور جفا طلبی کے سلسلہ میں آچکی ہوگی لیکن اگر کچھ کسر رہ گئی تو پھر ان کو وہ زمانہ یاد دلاؤں گا جب امتحان قریب ہوتا ہے اور کورس کورا! شام کو بیٹھ کر پڑھنا شروع کرتے ہیں، نیند آتی ہے تو اٹھ کر ٹہلنے لگتے ہیں، پھر پڑھتے ہیں، نیند کا غلبہ ہوتا ہے تو چائے کی تیاری میں ہر قسم کی زحمت اٹھاتے ہیں، پھر پڑھنا شروع ہوتی ہے، زور کی نیند آتی ہے۔ تھوڑا سا کورس باقی رہ جاتا ہے، اب بغیر دودھ اور شکر کے چائے پی جاتی ہے اور آخری جملہ ہوتا ہے، کورس ختم ہو جاتا ہے اور پاس کے درخت پر پرندوں کا پہلا نغمہ شروع ہوتا ہے۔ افق مشرق سے آفتاب ابھرنا ہے، یا غامیاں بااگر دوں سے جین جبریل!

کشا کشم دگر بات تراش و خروش ز خاک تیرہ دروں تا بہ شیشہ چلی
مقام بست و شکست فاش و سو کوئید میان قطرہ نینان و آتش عنبی
یہ دو فون اشعار "گوں" کے ہیں، اس عہد کے نوجوان "ساغر اور شراب" کا مفہوم ہم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ وقت اس وقت پڑتی ہے جب ساغر و شراب کو تصوف یا تصوف کو ان کے قالب میں ڈھالنا پڑتا ہے اس کے علاوہ ایک سہولت یہ بھی ہے کہ آج کل فن تعلیم یا فن تعلیمی کا سب سے بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ مفہوم سمجھ میں آئے یا نہ آئے موضوع کو دھپ بنا دیا جائے اور ساغر اور شراب وہ چیزیں ہیں جو "لچسپ" بھی ہیں

اور لہذا بھی! کشا کشم پیہم پر بحث ہو چکی ہے، ملت عربی کو پیش کرنے کا موقع دیکھا جائیگا۔ آخری شعر فارسی کا ہے۔ موجودہ دور میں اردو ہی کون سمجھتا ہے کہ یہ فارسی کا شعر پیش کر دیا گیا ستاؤنی ٹکند آفتاب ہی زند کی بلندی اور بلاغت سے ان لوگوں کو کیسے آشنا کیا جائیگا جن میں سے ایک صاحب مغاں کو فضاں پڑھتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ خیر اللہ مالک ہے، اگر سمجھا نہ سکا تو اردو کا ایک شعر پڑھ کر بھاگ کھڑا ہوں گا

انگور میں تھی یہ سے پانی کی چربونیں جس دن سے کچھ گئی ہے، تلواریں گئی ہیں دوسری کلاس میں غالب پر درس دینا ہے۔ رات زیادہ آئی ہے مگر کوئی مقرر نہیں ہے، خدا کرے سبق آسان ہو، غالب کا دیوان کھولا گیا، سبق ہے

موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
لیکن اب الفاظ اور سطروں کے بجائے کچھ اور پیش نظر ہے۔ مفہوم کے بجائے نیند چلی آتی ہے۔ پہلا مصرعہ امر مسلم لیکن دوسرا قطعاً خلاف واقعہ ہے۔ کتاب ہاتھ سے چھوٹ گئی، ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

دوسرے دن علی الصباح مضمون لکھنے بیٹھا تو معلوم ہوا کہ سیاہی کی شیشی خریدنا بھول گیا، پنسل ڈھونڈ کر نکالی، مضمون کا عنوان کیا ہو، کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر طے کیا کہ عنوان نہ سہی، مضمون کی فکر کرو، لیکن مضمون کا بھی پتہ نہیں، اچھا عنوان پر پھر زور لگاؤ، مثلاً ہندو مسلم اتحاد، برطانیہ کا اخلاص اور ہندوستان کا افلاس، پرائیڈل ایجوکیشنل کانفرنس، سٹی سکول علی گڑھ، انجمن اقوام عالم اور ہم، اچھوت اور ہم، ہٹلر اور ہم، ہم اور ہم، کاروان اور ہم

ہندو مسلم اتحاد، پر لکھنا آسان ہے، مثلاً محرم، گاؤں کشی، تناب آبادی اور بربادی، ریاست متحدہ اسلامیہ، پورن راج، مخلوط انتخاب، مخلوط ازدواج، اردوئے معلیٰ، ناگرنی پر چارنی سبھا، لاٹھی چارج، شفیع داؤدی، پنڈت مالوی، لیکن اس ماگھ میلہ کی طرف متوجہ کون

بزرگوں نے کہا ہے کہ ایسوں کا نام بھی نہیں لینا چاہئے ورنہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ادھر نام لیا ادھر وہ آدھکے اس لئے بہتر یہی ہے کہ اس کو بھی نظر انداز کیا جائے۔

ہم اور ہم قافیہ کے اعتبار سے خوب ہے عنقریب ہر ایک سنسی گورنر کا درود ہوگا، ایسی حالت میں اس قسم کا تذکرہ مناسب نہیں ہے محفوظ طریقہ کاریہ ہوگا کہ اس عنوان کو خواجہ حسن نظامی صاحب کے پاس بھیج دیا جائے۔ پچھلی بار کسی ایسے ہی موقع پر موصوف نے پیاری ڈکار تصنیف فرمائی تھی جو اردو طرافت نگاری میں اب تک یادگار ہے۔ ممکن ہے اس دفعہ بھی کچھ ہو جائے۔

اب رہا کاروان اور ہم چنانچہ
چل مے خامہ بسم اللہ

رشید احمد صدیقی

ہوگا، برطانوی اخلاص اور ہندوستانی افلاس۔" بھی اچھا مضمون ہے لیکن اسی قسم کی چیزوں سے میرٹھ کا مقدمہ سازش بھی مرتب ہو جایا کرتا ہے اس لئے اس سے بھی اجتناب لازم ہے، فائدہ کیا جو جیل خانہ گئے گورنمنٹ کو زیر بار ہونا پڑا۔ پراونشل ایجوکیشنل کانفرنس سٹی سکول علی گڑھ، بھی اچھی چیز ہے لیکن اس کا صدر ہونا اس پر مضمون لکھنے سے زیادہ موزوں ہے اور آسان بھی اس لئے اس کو ناکش اسپان علی گڑھ کے موقع پر دیکھا جائیگا۔ انجمن اقوام عالم اور ہم خاصا عنوان ہے لیکن اقبال نے ایک شعر میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ ہم سے ایک جلد میں بھی نہ لکھا جائیگا،

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دے چند بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند
"اچھوت اور ہم" البتہ ایک چیز ہے، کیا کہنے، کس قدر حسب حال ہے، کیسا بولتا ہوا مصرع ہے، مصرعہ نہیں فقرہ سہی فقرہ نہیں واقعہ سہی! "ہٹلر اور ہم" بھی خوب ہے، لیکن ہر ہٹلر کو ہم اپنی یونیورسٹی کے نقطہ نظر سے کچھ بہت اچھا نہیں سمجھتے اور

یہ سکیوں کے مزاروں شامیہا ہوا
لگا کے آگ مجھے کارواں رواں ہوا

خدا دراز کرے عمر چرخ نیلی کی
نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحراہوں

آتش

سید سلیمان ندوی نربدا

ہندوستان کی دوندیاں نربدا اور تپتی ایسی ہیں جو بحر عرب میں جا کر گرتی ہیں، یا یوں کہئے کہ یہ دو شہر گیس ہیں جنکے ذریعہ سے ہندوستان کا آبی خون بحر عرب کے جسم میں داخل ہوتا ہے۔

قدیم زمانہ میں عرب کے سواہل سے جو ہارات ہندوستان آتے تھے، وہ بھر ہندو بحر عرب سے ہو کر اسی دریائے نربدا میں داخل ہو جاتے تھے، اور اس دیا کے اندر چند میل چل کر اس بندر گاہ میں داخل ہو جاتے تھے، جس کا نام انھوں نے 'بروص' رکھا تھا، اور جس کو ہم ہندی بھروچ کہتے ہیں، ہشام بن عبد الملک کے زمانہ میں عربوں نے اس بندر گاہ پر قبضہ کیا تھا۔

۸ جولائی ۹۳۳ء کو بڑودہ سے مجھے بھروچ جانا پڑا، اور اس یادگار زمانہ شہر کی زیارت کی عزت حاصل کی، اور یہاں کی قدیم یادگارین چنانچہ پانچویں صدی ہجری کی بنائیں، دیکھ کر اپنی حقیقت کی آنکھیں روشن کیں، اسی سلسلہ میں شام کو دریائے نربدا کے ساحل پر چڑھ ہوا۔ اس شخص فضا منظر کو دیکھ کر روح نے وجد کیا، اور تاریخ کا گذشتہ بیان ایک جیتی جاگتی زندہ تصویر بن کر سامنے آگیا، اور شاعرانہ ہونے کے باوجود کچھ موزون نغمے میرے خاموش ساز دل سے ادا ہو گئے۔

سلیمان



نظم

نربدا اے نربدا اے جادہ بھر عرب
گرچہ تو ہندی ہے لیکن زادہ بھر عرب
ہاں گذشتہ کارواں کا نشان آہ
ہند میں اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہے
جانتا ہے تو مری تاریخ کا پوشیدہ راز
تیسے دروازہ پہ پھٹا تھا مرا پہلا جہاز
ہند میں اسلام کے انجام کا آغاز تو
چار صدیوں تک رہا اسلام کا بسا تو
رشتہ ہند و عرب تجھ سے ہوا تھا اتنا
تیرے سالن سبجا ترا تھا عرب کا کاروان
آج کس کو یاد ہے وہ داستان باپان
اس تن آبی میں تیرا خون ڈرنا ہے کام
تیرا ہر قطرہ حیات نو کا اک تازہ پیام
تو ہے دریائی پری یا شاہِ عالم ہے تو
اس سمندر کے گلے میں شہرِ گلا عظم ہے تو

اے بھروج! اے خاتمِ انگشتِ رودِ نربدا
عہدِ ماضی کی تری عت ہے باقی سدا
تو تیرے چشم زائر آج تیری خاک ہے
تیرا سالن دگا رستِ لولاک ہے



آغا حیدر حسن میرا مرزا

مرزا اچھی صورتوں کا دیوانہ سدا سے تھا۔ اور اب تو یہ دیوانگی حد سے بڑھ گئی تھی۔ اچھی آواز۔ اچھی خوشبو۔ اچھے لباس پر مرزا جان دیتا۔ جن دنوں اس حسن پرستی کا دورہ نہ دروں پر ہوتا۔ دل بتانے کی طرح بیٹھتا۔ روح سلب ہوئی جاتی۔ پنڈلیاں کٹی جاتیں۔ پیروں میں اینٹھیاں ہوتیں۔ جتنا عشق کا زور ہوتا اتنے ہی پاؤں بے سکت ہو جاتے۔ کبھی ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پالا ہو کے رہ جاتے۔ اور کبھی چہرہ بھبک اٹھتا۔ ہتھیلیوں میں سے بھاپ اور تلووں میں سے آگ نکلتی۔ جی کی دھڑکن بڑھ جاتی۔ صندل میں کپڑے نر کر کے دل پر رکھتا۔ گرم سم ہوا پڑا رہتا۔ دوست اجاب آتے۔ پکڑ جکڑ کر لے جاتے۔ مرزا کی کمزوریوں سے سب واقف تھے۔ مرزا کو صورت مردوں کی اور گانا ناچنا عورتوں کا پسند تھا۔ صورت مردوں کی جب ہی پسند آتی۔ جب اس میں نزاکت اور حسن ہو۔ دو مہینے سے مرزا نے کھانا ترک کر دیا تھا۔ کیونکہ مرزا کو زیادہ کھانا پسند نہ تھا۔ وہ خوش رنگ خوش وضع لطیف میوؤں پر رہتا۔ اور صرف اتنے ہی کھانا زندگی رہ سکے۔ پان دن بھر میں بے زردے کے سو دو سو کھا جاتا۔ گانا نو بجے سے رات کے تین بجے تک چھ گھنٹے سننا اور صبح نو بجے تک سویا کرنا۔ مرزا طبعاً مذہبی تھا۔ لیکن اس کو سب پر آشکارا نہ کرنا چاہتا۔ شراب سے اس کو طبعاً نفرت تھی۔ حالانکہ اس کی بیس پشتوں تک کی تاریخ میں اس کے تمام اسلاف و اجداد شراب کے شیدا اور میگساری کے عادی تھے۔ اپنی نسل میں ایک مرزا ہی ایسا تھا۔ جس کو شراب راس نہ تھی۔ اگر کوئی عزیز اپنی جان کی قسمیں دے کر پلاتا تو وہ صرف صحبت کی ہمرنگی کے لئے ایک آدھ گھونٹ سے حلق تر کر لیتا۔ اور اس کا وہ ہنسنا اور چمکنا بالکل جاتا رہتا۔ اور وہ سخت مغموم و متالم ہو کر ایک طرف جا بیٹھتا۔ اس لئے دوست اسے کبھی پینے پر مجبور نہ کرتے۔ اور وہ ان کی راگ رنگ کی محفلوں میں ایسا کھلتا اور چمکتا کہ لوگ سمجھتے کہ یا تو یہ پتے ہے یا صرف پینے والوں کو دیکھ کر شراب کی بو ہی سے مست ہو گیا ہے۔ اور ایک حد تک تھا بھی درست۔ مرزا کسی کو کھانا کھانے دیکھ کر شکم سیر اور پیتے دیکھ کر محو ہو جاتا۔ آنکھوں میں ڈورے آ جاتے اور وہ پکھنے لگتیں۔ مرزا کا شراب کے نشے کے متعلق خیال تھا کہ وہ کوئی چیز نہیں۔ جس کو سرور کہتے ہیں۔ وہ ایک چکر ہے۔ اور وہ چکر کیسا۔ جیسے بچے ہاتھ پھیلا کر "جھایں مایں کوئے کی برات آئی" کہتے ہوئے چکر کھاتے ہیں۔ اور سر چکر آنے لگتا ہے تو لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چل چل کر تھوڑی دور پر بیٹھ کر دم لیتے ہیں۔ یہی پینے کی کیفیت ہے۔ مرزا بُرا۔ بولاکی۔ ایک گھونٹ اندر گیا اور معلوم ہوا کہ حلق سے لیکر پیٹ تک کسی نے ایک گرم سلاخ اتار دی۔ اور شراب خوری کو وہ خدا کے احکام کی صریح نافرمانی سمجھتا۔ اور پینے کے بعد اپنے کو خدا کا مفتوح باغی تصور کرتا۔ غار کا پچھن سے عادی تھا۔ کبھی کبھی مہینے میں بیس روز کی نافرمانی کرتا۔ اور پھر بہت ریخیدہ رہنے لگتا اور کسی آنے والی مصیبت کا انتظار

کرنے لگتا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اگر نماز نہ پڑھی جائے تو ضرور کوئی نہ کوئی آفت نازل ہوتی ہے۔ اگر نماز پڑھنے کے زمانے میں کوئی مصیبت آ پڑتی اور دوست پھیرٹے تو کہتا کہ اگر نماز نہ پڑھتے ہوتے تو یہ اس سے کہیں زیادہ سخت ہوتی۔ صرف نماز ہی کی برکت سے اس کی سختی اتنی ہی رہی۔ ورنہ معلوم نہیں کتنی بڑھ جاتی۔

مرزا تنوع پسند تھا۔ ایک جگہ جم کے نہ رہتا۔ خوب وہی اس کے دوست بن سکتے تھے۔ وہ دوستی کا پہلی نظر میں قائل تھا۔ اگر پہلی ملاقات میں دوستی نہ ہوئی اور مرزا نے پسند نہ کیا تو پھر عمر بھر اس کو وہ دوست نہ بنا سکتا تھا۔ مرزا کو نفرت اور دشمنی سے سخت نفرت تھی۔ وہ کہتا تھا کہ انسان چاہنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ نفرت اور دشمنی کے جذبے کو کچل کر نابود کر دینا چاہئے۔ محبت کر دیا بالکل انجان ہو جاؤ۔ جس شخص سے تم کو محبت نہیں اگر اس کو نہ جانتے ہوتے تو تمہارا کیا نقصان ہوتا۔ اس کو فراموش ہی کر دینا مناسب ہے۔ دشمنی اور نفرت سے انسان خود پہلے جل لیتا ہے تب دوسرے کو جلانے کی غیر اطمینانی کوشش کرتا ہے۔ مرزا کا کہنا کہ خورشید رویوں کی ہی تپش کیا کم ہے۔ جو بیکار کو ادھر ادھر کا جلا پامول لیا جائے۔ مرزا کو جب عشق کا دورہ پڑتا تو وہ اپنے آپ کو اٹھارہ بیس برس کا گرو جوان تصور کرتا اور بڑا مگن رہتا۔

مرزا عورتوں کے عشق کے متعلق بہت سخت رائے رکھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ عورت کو محبت و عشق صرف اپنے ماں باپ بہن بھائی اور اولاد سے ہونا چاہئے۔ شوہر سے بھی اگر عشق کیا جائے تو وہ پسند نہ کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ عورت اس لئے ہے کہ اس سے عشق کیا جائے اور وہ معشوق بنی ہے۔ اگر وہ خود عاشق ہو جائے تو اس نے عورت پنپنے کی توہین کی۔ شوہر سے عشق کو مرزا بڑے بڑے الفاظ میں ادا کیا کرتا۔ وہ کہتا کہ عورت کو شوہر کا وفادار۔ خدمت گزار اور نابعدار ہونا چاہئے۔ شادی کے پچاس برس بعد جب بیوی ستر برس کی اور میاں پچھتر کا ہو اس وقت آپس میں عشق کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ جوانی کے زمانے میں بیوی کے عشق کو پکڑی ہوئی رگ سے تعبیر کرتا اور اس کا مذاق اڑایا کرتا۔ عشق کا اظہار کرنے والی عورت مرزا کو سروپ نکھا کی بہن نظر آتی مرزا کو خود عشق کرنے میں لطف آتا۔ اگر اس سے کوئی اظہار عشق کرتا تو کوسوں بھاگتا۔ اور اگر کوئی معشوق اس کے عشق کا جواب عشق سے دیتا تو مرزا پانچ چھ ہفتے میں بیزار ہو جاتا۔ اس کو عشق میں حرمان نصیبی۔ مفارقت۔ درد۔ اور تکلیف پسند تھی۔ مرزا کی اہم دوستی اس کو ایذا پسند معشوق کا گرویدہ بنائے رکھتی۔ اور جس قدر وہ تعلق کو رکھتے ہوئے بے تعلق بنتا۔ اتنا ہی مرزا اور محبت کے جال میں پھنستا۔ تڑپتا۔ نکلنے کی کوشش کرتا۔ مرا کرتا اور جئے جاتا۔

مرزا کو ساری دنیا نے ہنسنے ہی دیکھا ہوگا۔ روتے سوائے معشوق کے اور کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ وہ کہتا تھا کہ آنسو صرف معشوق کے لئے ہیں۔ وہ بڑے پردے کی چیز ہیں۔ ان کا محرم صرف معشوق ہی ہو سکتا ہے۔ ان کو نا محرموں سے مستور ہی رہنا چاہئے عورت کا آنسو بھولے۔ بلکہ حیوان مردوں کے ہاں بیش قیمت ہے۔ اعتدال پسند جمالیاتی مرد کے پاس عورت کے آنسو کی قیمت ایک ہلکی سی مردانہ مسکراہٹ ہے۔ کیونکہ عورت میں تو گرتے تھے نے آنسو کے غدود زیادہ رکھے ہیں۔ وہ آسانی سے اپنا کام کرنے لگتے ہیں مرد کا آنسو امانول ہے۔ اس پر اگر نا محرم کی نظر پڑے تو وہ پھوٹ جائے۔ مرد جب روح کو منجھ کر کے پگھلاتا ہے تب ایک آنسو نبتا۔ مرد کا آنسو اس کے جذبات۔ اس کے حواس۔ اس کی روح۔ اس کے جسم اس کی جان اس کے تاثرات کا پنچوڑ ہے۔

مرزا بڑا خیالی۔ مزاجی۔ ذکی البص۔ اور اعصاب زدہ تھا۔ اس کی اعصاب زدگی ذرا ذرا سی حرکت سے ظاہر ہوتی۔ اور وہ اس

کو طرح طرح کی ترکیبوں سے کبھی کامیاب اور کبھی ناکامیاب چھپانے کی کوشش کیا کرتا۔ معشوق کا نام سن کر جب وہ اعصاب زدہ ہو جاتا تو اس وقت چہرے کے طور مستقل رکھ کر وہ اس خوبی سے اس کو چھپا جاتا کہ کبھی کسی کو اس کے معشوق کا علم کان نہ ہو۔ ہاں جب اس کا عشق ختم ہو جاتا اور وہ اپنی کیفیات اور تاثرات دلکش اور رنگین طرز ادا سے سنا تا اور جو گل اس نے کھلے ہیں وہ دکھاتا اور اس پاس کے اتنے پتے دیتا تو اس وقت مرزا کے دوستوں کو کچھ معشوق کی شخصیت کا پتا چلتا۔ وہ ہمیشہ اپنے معشوق کی تصویر اور بالوں کی لٹ اور لباس میں سے وہ کپڑا جو جس کے جسمی تعطر سے معطر ہوتا۔ یہ سب نشانیاں لال کلاوے کے ایک دھاگے سے لپیٹ کر رکھتا۔ اور کہتا کہ اس کچے سوت کو بننا اور مضبوط رکھنا تمہارا اپنا کام ہے۔ اس کی حفاظت تو کی ہی جائیگی۔ اس حفاظت کے باوجود بھی ٹوٹ گیا۔ تو اس کے ذمہ دار آپ ہو گئے۔

مرزا کو قلمی تصویریں۔ قلمی کتابیں۔ قدیم چینی کے برتن۔ قدیم ہدیری کے برتن۔ قدیم کانسی۔ تانبے۔ پتیل۔ چاندی۔ سونے مینے کے برتن۔ قدیم شالیں۔ قدیم جامہ واریں۔ قدیم کشیدے کا کام۔ قدیم لباس۔ قدیم اسلحہ۔ قدیم کپڑے۔ قدیم نوادرات جمع کرنے کا بہت شوق تھا اور اس کا مکان ایک اچھا چھوٹا سا قدیم چیزوں کا عجائب خانہ تھا۔ مرزا کو موتی۔ ہیرے اور زمرہ بہت پسند تھے۔ ریشم کے کپڑے بہت پسند کرتا تھا۔ اس کو قدیم لباس پہننے اور قدیم مردانہ زیور پہننے کا بہت شوق تھا۔ اور جب کبھی ان کی نمائش کا موقع مل جاتا۔ کبھی نہ چوکتا۔ مرزا نے علی گڑھ کی دانشگاه میں چھ برس تعلیم پائی تھی۔ اور وہ استاد اور ہم مکتبوں میں عزیز تھا۔ اس کا برتاؤ سب سے محبتانہ تھا۔ اور سب اس کا خیال کرتے تھے۔ مرزا کو مرد بننے کا بڑا شوق تھا۔ اسی لئے وہ ہمیشہ عاشق کا سوانگ بھرتے بھرتے سچ مچ عشق کرنے کا عادی ہو گیا۔ اس کے بے تکلف دوست اس کو زنانہ خطابوں سے مخاطب کرتے۔ اس نے ان باتوں کو اتنا سنا تھا کہ ایک عادت سی ہو گئی تھی۔ اور وہ ان خطابوں سے نہ چڑھتا۔ بلکہ ہنس دیتا۔ کبھی کبھی ان کی برجستگیوں اور ادبی خوبیوں کو سراہا بھی کرتا تھا۔

آغا حیدر حسن



زخ-ش تحفہ درویش

بحر غم میں ہے سخت طغیانی
سر سے اوپر گزر گیا پانی
کب تک اے نزہت ہر شے جگر
شور یا رب سے عرش جنبانی
روئے دھونے سے جان کھونے سے
کہیں بنتے ہیں کام دیوانی
درد دل درد آفریں کو سنا
کر گزرجی میں ہے جو کچھ ٹھانی
دشتِ حدت ہے دشتِ حدت ہے
دیکھ آہستہ کر فرس رانی
بینچر پہلے نقش کر دل پر
عظمتِ بارگاہِ یزدانی
مایہ اشک یاں بضاعت ہو
ہیچ واں شوکتِ سلیمانی
پہلے دے صدقہ ماسوی اللہ کا
پہلے کر جانِ دل کی قربانی
صدقہ فکر سے نکال گھر
ترتیز کر عرق سے پیشانی
نزہت بینوا ہے ہدیہ بدست
ہو قبول جنابِ سلطانی
ہدیہ کیا ایک سادہ دست پر
ہو قبول جنابِ سلطانی
لکھ کے لائی ہوں لفظ "لامانی"

وہیں ہے الفتِ وطنِ فغانستاں

عرفِ مجنوں ہے پیشہ حسانی

ذوقی شاعر سے رات کی سرگوشیاں

زمیں پر رات کی ظلمت کا لہرانا ہے جب پرچم
فراز چنچ پر آزاد روہیں سیر کرتی ہیں
قدم رکھتی ہے سطح ارض پر جب نیند کی دیوی
چمکتی ہے جنوں انگیز سرستی ہواؤں میں
ہوا کے دوش پر جب نکبتیں پھرتی ہیں آواز
اندھیرا حکمراں ہوتا ہے جب سنان! ہوں میں
جب استکھیں بند ہوتی ہیں تنہا سیر کرتا ہے
سکون دیتا ہے زخم فکر کو جب نیند کا مرہم
جلے پیروں زمیں پر خواب کی پریاں ترقی ہیں
سکون کی گود میں جب تھکے گر پڑتی ہے بیداری
فسونِ نغمہ ہوتا ہے خموشی کی فضاؤں میں
نظر کو خواب میں ہوتا ہے جب بچوں کا نظارہ
کنول جب گل پڑے ہوتے ہیں رنگیں خواب گاہوں میں
تو اک ننھا فرشتہ آسمانوں سے اترتا ہے

وہ کچھ الہام برساتا ہے گردوں کی جبینوں سے
تجلی سے بھری ہوتی ہیں اس کی خوابناک آنکھیں
وہ جادو کی چھڑی سے دل کو چھڑیتا ہے چپکے سے
فرشتہ روح کی گہرائیوں میں مسکراتا ہے
وہ اک پیغام لاتا ہے طلسمی سرزمینوں سے
وہ کچھ کہتا ہوا آتا ہے پر معنی اشاروں میں
سمٹ جاتے ہیں دم بھر میں حریم روح کے پردے
تبسم کی طلسمی ضو میں شاعر جھوم جاتا ہے

مئے عرفان چھلک اٹھتی ہے دل کے آئینے میں
چمک اٹھتا ہے وجدان کا شرتا یک سینے میں

خواجہ مسعود احمد ذوقی

اثر

سید اختیار علی تاج

(۱) اردو ڈرامہ کی مفہمیتیں

(۲) — کہ عالم دوبارہ نیست (مختصر فضا)

(۳) ہسپتال

(۴) برفباری کی ایک رات (ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

W

اُردو ڈراما کی مفاہمتیں

ان مثالوں سے واضح ہے۔ کہ جب تک آرٹسٹ اور آرٹ سے لطف اندوز ہونے والوں میں باہم ایک مفاہمت یا قرارداد صریح یا غیر صریح نہ ہو اور آرٹسٹ کو حقائق پیش کرنے کے زیادہ اعلیٰ مقاصد کے لئے واقعیت کے بعض غیر اہم اور اٹنے امور نظر انداز کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ تب تک آرٹ زندہ نہیں رہ سکتے چنانچہ ہر فن میں واقعیت سے انحراف کی کھلی ہوئی مفاہمتیں ہیں۔ جو ہم نے اس فن سے بہرہ اندوز ہونے کی غرض سے آرٹسٹ سے کر لی ہیں۔

اکثر فنون میں ہم ان مفاہمتوں کے ایسے عادی ہو گئے ہیں۔ کہ ہمیں ان کا احساس تک باقی نہیں رہا۔ تصویر کو دیکھ کر کس کو خیال آتا ہے۔ کہ محض بعض مفاہمتوں کی بنا پر یہ شے معقول کئی جاسکتی ہے۔ ہماری طبیعت کچھ اس قسم کی ہے کہ جس چیز سے ہم مانوس ہیں اسے صحیح اور مناسب بلکہ یوں کہئے۔ کہ مطابق عقل قرار دے لیتے ہیں مثال کے طور پر کہتے ہیں۔ کہ امریکہ کے اصلی باشندوں نے جب پہلی مرتبہ ایک ایسی تصویر دیکھی جو پہلو پر سے چہرہ دیکھ کر بنائی گئی تھی۔ تو کسی طرح ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ اس کا باقی آدھا چہرہ کہاں گیا۔ چنانچہ وہ ایک ایک سے اس امر کے متعلق سوال کرتے تھے۔ لیکن ہم لوگ اس قسم کی تصویر دیکھنے کے عادی ہیں۔ روزانہ ایسی تصاویر دیکھتے ہیں۔ اور ہمیں خیال تک نہیں آتا۔ کہ آدھا چہرہ یا ایک کلان غائب ہونا کیا معنی! اسی طرح ہوش نبھانے سے پہلے بچوں کے لئے جنہیں ان مفاہمتوں کا احساس ہی نہیں

بر آرٹ کے قیام کے لئے ضروری ہے۔ کہ آرٹسٹ میں اور ان لوگوں میں جو اس کے آرٹ سے لطف اندوز ہوتے ہیں بعض خاص اور ضروری باتوں کے متعلق ایک قسم کی مفاہمت ہو۔ جس کے رُو سے آرٹسٹ حقیقت کے اظہار میں واقعیت سے انحراف کرنے کو آزاد ہو اور لوگوں کو اپنے آرٹ سے لطف اندوز ہونے کا موقع دے۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے۔ مصوّر آزاد ہے۔ کہ ایک ذرا سے کاغذ پر میلوں لمبے منظر کی تصویر پیش کر دے۔ ہموار سطح پر ایسی چیز دکھا دے جس میں لمبائی چوڑائی کے علاوہ عمق بھی ہو۔ وقت کا ایک لمحہ حرکت کی ایک جھلک سکون میں نقش کر دے۔

اگر کل کو مصوری پر یہ اعتراض ہونے لگے۔ کہ صاحب یہ کیا بات ہوئی۔ کہ انسان ہوتا تو بے چھ فٹ کے لگ بھگ اور مصوّر تصویر اس کی بنا دیتے ہیں چند انچوں میں۔ یا یہ کہ ہر منظر میں طول عرض کے علاوہ ہوتا تو بے عمق بھی۔ مگر منظر کی نیچ دیا جاتا ہے ایک ہموار سطح پر۔ یا مثلاً طوفان میں تو موجیں متحرک ہوتی ہیں۔ اور مصوّر انہیں دکھاتے ہیں محض تندی کی ایک ساکن جھلک میں۔ تو ایسے اعتراضات کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا۔ کہ مصوری کا فن قائم ہی نہ رہ سیکے گا اور ہم تصاویر کے لطف سے محروم ہو جائیں گے۔

اسی طرح سنگتراشی کے فن کو لیجئے۔ مجسموں میں جسامت ہوتی ہے۔ مگر یہ رنگ اور حرکت سے محروم ہوتے ہیں۔ اگر سنگتراش کو اجازت نہ دی جائے۔ کہ وہ حرکت اور رنگ کو نظر انداز کر دے تو ظاہر ہے۔ کہ وہ کام نہیں کر سکتا۔

ہوتا۔ تصویروں کا سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

جو مفاہمتیں فن کے اندر مضمر ہوں۔ وہ مستقل ہوتی ہیں کیونکہ ان کے بغیر فن کی تکمیل اور اس کا قیام مشکل ہے۔ وہ گویا آرٹسٹ اور لوگوں کے درمیان دل ہی دل میں اس مفہوم کا ایک اقرار نامہ ہیں۔ کہ اگر لوگوں نے آرٹسٹ کو یہ اختیار دیا۔ کہ وہ بعض واقعی امور کی صحت کا خیال نہ رکھے تو وہ حقائق کو جس نظر سے خود دیکھنا ہے۔ اسی نظر سے لوگوں کو دکھانے کی انتہائی کوشش کرے گا۔ یہ مفاہمتیں دو جماعتوں کے درمیان ایک فرضی مگر بے انتہا ضروری قرار داد ہیں۔ اور فریقین میں سے کسی کو بھی اس کی شرائط ٹوٹنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

سینما کے فلم بنانے اور دیکھنے والوں میں باہمی مفاہمت اس امر کی ہے (اب ناظر فلم ایجاد ہونے کے بعد شاید قطعی کمنا زیادہ مناسب ہو) کہ اگر لوگوں نے گفتگو اور دوسری آوازوں کا مطالعہ نہ کیا۔ تو ہم تصویروں کے ذریعے ایک اعلیٰ کہانی ان کے سامنے پیش کرینگے۔

اسی طرح ادب پر یعنی موسیقی کے ڈراموں میں یہ مفاہمت مضمر ہوتی ہے۔ کہ دنیا میں ایک ایسی قوم فرض کر لی جائے۔ جس کے افراد بات چیت گانے میں بھی کرتے ہیں۔ اگر ہمیں سینما اور ادب پر اسے لطف اندوز ہونا ہے۔ تو ضروری ہے۔ کہ سب سے پہلے ہم ان شرائط کو قبول کریں، اگر ہم ان ضروری اور اہم شرطوں کو قبول نہیں کرتے۔ تو ہمارا ان سے لطف اندوز ہونا ناممکن ہے اور ایسی حالت میں ہمیں چاہئے۔ کہ ہم انہیں نہ دیکھیں۔

یہ تو ہمیں مستقل مفاہمتیں۔ جن پر مندرجہ بالا فنون میں سے ہر ایک کی بنیاد کھڑی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بعض عارضی اور اتفاقی مفاہمتیں بھی ہوتی ہیں مثلاً سنگتراش جب کان سے کاہت بنا تا ہے تو بے تکلفی سے بنا لیتا ہے۔ کان سے کے اندر ایسا مضبوط سہارا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے مجسمے کی کمزوری کا اندیشہ نہیں ہوتا۔

لیکن سنگ مرمر اس قدر مضبوط نہیں ہے۔ چنانچہ جب سنگ مرمر کا بت بنایا جاتا ہے۔ تو اسے مضبوطی اور پائیداری بخشنے کے لئے وہ نیچے کوئی سہارا دے دینا ضروری سمجھتا ہے۔ اور کچھ نہیں کرتا۔ تو نیچے حصے میں ننھا سا چوترا بنا دیتا ہے۔ یا انسانی جسموں میں پیروں پر کپڑا ڈال دیتا ہے۔ کہ اس سے مجسمہ کو مضبوطی پہنچے گویا سنگ مرمر کے بتوں میں سنگتراش اور لوگوں کے درمیان محض مضبوطی اور پائیداری کی ضرورت کے خیال سے یہ مفاہمت ہے کہ نیچے حصے میں اس قسم کی جن تراکیب سے کام لیا جائیگا۔ وہ قابل معافی سمجھی جائیگی اب یہ مفاہمت ایسی نہیں کہ اس پر سنگتراشی کا فن منحصر ہو۔ مضبوط اور پائیدار ہو یا نہ ہو۔ بہت تو بحال بن سکتا ہے۔ محض ایک ضرورت کی وجہ سے سنگتراش کو ایک رعایت دے دی گئی ہے۔ اور اگر کل کو کوئی ایسا مصالحہ نکل آئے جس کے استعمال سے سنگ مرمر کو تقویت پہنچائی جاسکے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ یہ مفاہمت باقی نہ رہیگی۔

ہنگامی مفاہمت کی ایک بہت دلچسپ مثال اردو تھیٹر میں میری نظر سے گزری تھی۔ ایک مرتبہ البرٹ کمپنی لاہور پہنچی۔ تو اس نے پہلا کھیل سیر پرستان کرنے کا اعلان کیا۔ نمائندگی فٹ پر تھیٹر پہنچ گئے۔ لیکن اتفاق سے کمپنی کا وہ صندوق لاہور نہ پہنچا جس میں پیروں کے پر آ رہے تھے۔ مجبور ہو کر منیجر اسٹیج پر آیا۔ اور اس نے لوگوں سے کہا کہ حضرات ہماری پیروں کے پر سامان میں لاہور نہیں پہنچ سکے۔ اس لئے اگر آپ اجازت دے دیں۔ تو آج پریاں بغیر پیروں کے دکھا دی جائیں۔ لوگوں نے اس کی اجازت دے دی۔ چنانچہ پریاں بغیر پیروں کے آئیں۔ یہ مفاہمت اُسی روز کھیل کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اگلی دفعہ کھیل ہوا تو پیروں کے پر تھے۔

دوسرے فنون کی طرح ڈراما کے فن میں بھی چند مفاہمتیں ہیں جن میں سے بعض تو ضروری اور مستقل ہیں۔ اور بعض عارضی

اور اتفاقی + ضروری اور مستقل مفاہمتیں تھیئٹری کی نوعیت کی وجہ سے ہیں۔ اور وہ تعداد میں تین ہیں + ان میں سے پہلی مفاہمت تو یہ ہے کہ چونکہ ڈراما نویس کو اپنی کمائی زیادہ سے زیادہ تین چار گھنٹوں میں دکھانی ہوتی ہے۔ لہذا تنگی وقت کی وجہ سے اسے اجازت ہے کہ وہ اپنے موضوع کے متعلق صرف نہایت ضروری امور نہایت سخت گیری سے جمع کرے۔ فردعات کو قریب نہ آنے دے۔ اور تمام گفتگو ایسی منتخب اور مختاط لکھے۔ جس میں روزمرہ کی زندگی کی بے ربطی، تکرار اور ابہام نہ ہو + دوسری مفاہمت یہ ہے۔ کہ وہ اپنے ڈراما میں کمائی ایسے انداز سے پیش کرے۔ کہ وہ اسٹیج پر ایکٹروں کی امداد سے پیش کی جاسکے۔ اور اسٹیج پر جو کچھ بھی ہو۔ وہ سب تماشائیوں کو واضح طور پر دکھائی دے سکے + تیسرے یہ کہ اسٹیج پر جو کچھ بھی بولا جائے۔ وہ تماشائیوں کو واضح طور پر سنائی دے سکے +

اگر یہ تین مفاہمتیں نہ ہوں۔ ڈراما نویس واقعیت کے مطابق ڈراما لکھنے پر مجبور ہو۔ یعنی جس طرح ہم زندگی میں بے ربط + مبہم۔ اور ڈیبلے ڈھالے فقرے بولتے۔ ایک ایک بات کو کئی کئی مرتبہ بیان کرتے ہیں۔ الفاظ کی کمی کی وجہ سے بعض اوقات فقرے نامکمل چھوڑ دیتے ہیں۔ بعض اوقات ہیر پھیر کرتے ہیں۔ اگر اسی طرح یعنی وضاحت اور فطرت کے مطابق ڈراما کے کیرکٹر بھی بات کریں۔ تو شاید تین گھنٹے میں ڈراما کا ایک سین بھی ختم نہ ہو سکے + اگر ڈراما نویس ڈراما لکھتے ہوئے اس امر کی گنجائش نہ رکھے۔ کہ کمائی سمجھنے کے لئے جن واقعات کی ضرورت ہے۔ وہ پس پردہ ہو جائیں اور ڈراما میں ان کا حوالہ نہ ہو۔ لوگوں کو ڈراما کی کمائی کے کڑیوں کے وہ ہم حصے نظر نہ آسکیں۔ جن پر کمائی کا حسن منحصر ہے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ ڈراما ایک بے معنی ڈھچر بن جائے۔ لہذا تھیئٹری کے آرٹ میں اجازت ہے۔ کہ ہر کرے کی چوتھی دیوار اور ہر منظر کی چوتھی طرف کی آڑ جو تماشائیوں کی طرف ہو۔ شوق سے دور کر دی جائے۔ چنانچہ

آپ دیکھتے ہیں۔ کہ اسٹیج پر جو کرہ بھی دکھایا جاتا ہے۔ اس کی تین دیواریں ہوتی ہیں۔ چوتھی دیوار جسے لوگوں کی طرف ہونا چاہئے تھا موجود نہیں ہوتی۔ اسی طرح دوسرے مناظر کی چوتھی طرف اڑا دی جاتی ہے۔ نہ کہ تماشہ ہونا ممکن ہو + یہ مفاہمت اس لئے ضروری ہے۔ کہ اس کے بغیر یہ آرٹ قائم نہیں رہ سکتا + اسی طرح اگر ڈراما کی عبارت کا وہ حصہ جس سے کمائی کی ترقی اور کیرکٹروں کی سیرت کا نشیب و فراز سمجھ میں آسکتا ہے۔ تماشائیوں کو سنائی نہ دے۔ اور افراد ایسی گفتگو اسٹیج پر آنے سے پہلے کر آیا کریں۔ یا اسٹیج پر ایسی آواز میں کریں کہ لوگوں تک نہ پہنچے۔ تو ڈراما ہو ہی نہ سکے۔ لیکن چونکہ لوگ ڈراما سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے ڈراما نویس کو اجازت دے رکھی ہے۔ کہ وہ شوق سے خلاف واقعہ گفتگو لکھے۔ دوسری قوموں کے لوگوں کو اپنی کمائی میں لائے۔ تو ان سے بھی اپنی ہی زبان میں گفتگو کرائے۔ زندگی میں جو باتیں دنوں میں طے نہیں ہو سکتیں انہیں ڈراما میں منٹوں میں طے کر ڈالے۔ واقعات آنکھوں کے سامنے واضح طور پر گزارے۔ اور تمام ضروری امور ایکٹروں کی زبانی تماشائیوں کے کانوں تک پہنچا دیے +

یہ تین تو تھیں ڈراما کے متعلق مستقل مفاہمتیں یا شرائط۔ ان کے علاوہ مختلف ممالک میں اپنے اپنے حالات اور اپنی اپنی ضروریات کے مطابق کئی مفاہمتیں عارضی اور اتفاقی بھی ہوتی رہی ہیں۔ اور ہیں + مثلاً انگلستان میں سولہویں اور سترہویں صدی میں جب شکسپیئر کے کھیل نکل رہے تھے اسٹیج کے تقریباً تین طرف تماشائی بیٹھتے تھے۔ سینری استعمال نہ کی جاتی تھی۔ بغیر بلوسات کے ساز و سامان نہ ہونے کے برابر تھا۔ تو ان چیزوں کی کمی شاعری کی امداد سے پوری کر دی جاتی تھی + لمبی لمبی شاعرانہ تقریریں کی جاتی تھیں۔ جو بے قافیہ نظم میں ہوتی تھیں۔ پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا ایکٹر

رکھا جائے یا نہ رکھا جائے + تمام مفاہمتیں روا نہیں ہوتی ہیں لیکن ضروری نہیں کہ روایتیں بھی مفاہمتیں ہوں + مثالی کے طور پر سنسکرت ڈراما میں ڈراما شروع ہونے سے پہلے نٹ اور نٹی کا آنا روایتی طریق ہے۔ لیکن سنسکرت ڈراما ہی میں ایکٹر دن کا میدان میں آ کر یوں گفتگو کرنا گویا وہ محل میں موجود ہیں مفاہمت ہے +

ہم جن مفاہمتوں سے مانوس ہوں۔ ان کو تو بخوشی گوارا کر لیتے ہیں۔ لیکن جن مفاہمتوں سے مانوس نہ ہوں۔ وہ ہمیں بے حد ناگوار گزرتی ہیں + نیویارک کے ایک چینی تھیٹیئر کا حال میری نظر سے گزرا۔ لکھا تھا۔ کہ اس تھیٹیئر میں کوئی اسٹیج نہیں محض ایک پلیٹ فارم ہے۔ کسی قسم کے پردے استعمال میں نہیں لائے جاتے۔ بس کچھ دیوار پر ایک پردہ پڑا رہتا ہے اور اس پردے کے دائیں اور بائیں سے ایکٹر اسٹیج پر داخل ہوتے ہیں۔ سازندے اسٹیج کے اوپر بیٹھے ہیں۔ ایکٹروں کے لباس پر تکلف ہوتے ہیں۔ بڑی بلند آہنگ اور طویل تقریریں کرتے ہیں۔ ساز و سامان نہایت ادنیٰ اور معمولی استعمال کیا جاتا ہے۔ میز کے اوپر دو شمعیں اور ان کے درمیان ایک مورتی رکھ دی۔ تو مندر بن گیا۔ ظاہر کرنا ہوا۔ کہ کوئی شخص فوجی افسر ہے۔ تو وہ کرسی الٹا کر اس پر بیٹھ گیا۔ دریا عبور کرنے کا عمل دکھانا ہوا۔ تو ایکٹر کے ہاتھ میں ایک چوڑے دیا۔ اور وہ اُسے اپنے پیچھے پیچھے ہلاتا ہوا اسٹیج پر سے گزر جاتا ہے۔ بجھے دیا عبور ہو گیا۔ چینی لوگ مزے میں بیٹھے یہ تماشا دیکھتے رہتے ہیں۔ ان مفاہمتوں کا احساس بھی نہیں ہوتا +

جاپانی تھیٹیئروں میں دستور ہے کہ پرامیٹر یعنی وہ شخص جس کے ہاتھ میں تماشے کے دوران میں ڈرامے کا مسودہ رہتا ہے کہ اگر ایکٹر بھول جائے۔ تو بوقت ضرورت اسے لقمہ دے دے کہ پارٹ یاد دلاتا ہے۔ اسٹیج پر تماشا یوں کی آنکھوں کے

جزو تماشا نہ ہوتا تھا۔ بلکہ خود ہی سب کچھ ہوتا تھا۔ مقررانہ انداز سے بولتا تھا۔ جب چاہتا دوسرے ایکٹر کے قریب سے ہٹ کر اور تماشا یوں کے قریب ہو کر ایسی باتیں کر لیتا تھا۔ جو فرض کر لیا جاتا تھا۔ کہ دوسرے ایکٹر کے کان تک نہیں پہنچیں + اس کے بعد جب اٹھارھویں صدی میں انگلستان میں نئے تھیٹیٹر بن گئے۔ تو اس ڈراما کی جگہ مکالمے کے ڈراما نے لے لی ذرا باقاعدہ اسٹیج بن گئی۔ پردے لگ گئے۔ روشنی کا بھی تھوڑا بہت انتظام ہو گیا۔ اب لمبی لمبی شاعرانہ تقریریں بے موقع معلوم ہونے لگیں۔ ان کی جگہ بولی ٹھولی کے لطف نے لے لی پرانی مفاہمتیں مٹ گئیں۔ حالات نے نئی مفاہمتیں بنادیں۔ مثلاً یہ کہ زیادہ لطف کی اور پر معنی گفتگو میں اسٹیج کے اگلے حصے میں آکر روشنی کے قریب ہونے لگیں۔ تاکہ لوگ ان گفتگوؤں کے اثر کٹرڈوں کے چہروں پر پورے طور سے دیکھ سکیں۔ یہ طریق بھی خلاف واقعہ تھا۔ کہ ایکٹر بیٹھے تو اسٹیج کے پچھلے حصے میں تھے۔ اور باتیں کرنے کو آگے آجایا کرتے تھے +

انیسویں صدی میں جب اسٹیج نے آؤرتی کی۔ روشنی کا بہتر انتظام ہو گیا۔ الفاظ سنانے کی بجائے عمل زیادہ واضح طور پر دکھانا ممکن ہو گیا۔ ایکٹروں کو باتیں کرنے کے لئے اسٹیج کے اگلے حصے میں لانے کی ضرورت نہ رہی۔ بلکہ ایک روشن اسٹیج پر ایکٹروں کا زیادہ آگے بڑھ آنا ناگوار معلوم ہونے لگا۔ تو مکالمے کے ڈراموں کی مفاہمتوں کی بھی ضرورت نہ رہی۔ اور سماں بندھنے کا ڈراما وجود میں آ گیا +

اس موقع پر چند الفاظ میں مفاہمت اور روایت کا فرق واضح کر دینا بھی نا مناسب نہ ہوگا۔ مفاہمت میں واقعیت سے اس غرض سے ہٹتے ہیں کہ ہٹے بغیر تماشائی پورے طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ روایت کہتے ہیں۔ خاص باتیں سرانجام دینے کے ایک مسلمہ و مروج طریقے کی۔ اس میں خواہ واقعیت کو مد نظر

سامنے بیٹھتا ہے۔ بس اتنا کیا جاتا ہے کہ اسے ایک چست سیاہ رنگ کا لباس پہنا دیتے ہیں۔ سر پر ایک ٹوپ اڑھاتے ہیں۔ اور اس کا منہ تماشائیوں کی طرف نہیں ہوتا۔ بس اتنی احتیاط سے مراد یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ ہر چند کہیں کہے نہیں ہے۔ اس کے علاوہ لباس بدلوانے والا اور اسٹیج کا منتظم تماشے کے دوران میں بھی اسٹیج پر موجود ہوتے ہیں۔ ایکٹر کو لباس میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت پیش آئے۔ تو لباس بدلوانے والا فوراً حاجت روائی کرتا ہے۔ اسٹیج پر کسی چیز کی ضرورت پڑتی ہے۔ یا نہیں رہتی ہے۔ تو اسٹیج منیجر صاحب دستگیری فرماتے ہیں۔ پارٹ کرتے کرتے اگر ایکٹر کی پیٹی ڈھیلی ہو گئی تو لباس تبدیل کرنے والا خاموشی سے اس کے پاس گیا۔ ایکٹر بول رہا ہے۔ اور وہ حضرت پیچھے کھڑے اس کی پیٹی کس ہے ہیں غرض کر لیا جاتا ہے۔ کہ تماشائی یہ باتیں نہیں دیکھ رہے ہیں۔ انہیں ان حاجت روائوں کی موجودگی کا علم ہی نہیں ہے۔

یہ غیر مانوس مفاہمتیں اگر ہمارے ہاں شروع ہو جائیں۔ تو تھیٹریوں میں اچھی خاصی قیامت برپا ہو جائے۔ ہم ان کے عادی نہیں۔ اس لئے ان کو گوارا نہیں کر سکتے۔ البتہ ہم شکسپیر کے غیر منفی نظم کے عادی ہیں۔ اس لئے اس کے پڑھنے میں ہمیں کسی قسم کا تنقص نہیں محض مفاہمت خواہ کسی ہی خلاف قیاس اور خلاف عادت ہو۔ صرف اسی حالت میں گوارا کی جاسکتی ہے۔ جب اس کے قبول کرنے سے کوئی بہت زیادہ فائدہ حاصل ہو رہا ہو۔ اگر نتیجہ قابل قدر ہے۔ تو مفاہمت جائز قرار دی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر مفاہمت کے باوجود نتیجہ بھی قابل قدر نہ ہو۔ تو ایسی مفاہمت ناگوار اور قابل اعتراض ہوتی ہے۔

انگریزی دان طبقے کو جس نے اگر انگریزی کمپنیوں کے بہت زیادہ کھیل دیکھے نہیں۔ تو انگریزی مصنفین کے بہت زیادہ کھیل پڑے ضرور ہیں۔ اردو ڈراما کی اکثر مفاہمتیں جو انگریزی ڈراما سے خارج ہو چکی ہیں۔ ناگوار گزرتی ہیں۔ اور ان کی بنا پر وہ

اردو ڈراما سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اردو ڈراما نے کن حالات میں جنم لیا۔ کن کیفیات میں سے گزرا اور اب کس منزل پر پہنچ چکا ہے۔ تھیٹریوں کے مالکوں کو کس طبقے سے زیادہ یافت ہوتی ہے۔ اور اس طبقے کا ذوق اور ڈراما سے اس کی توقعات کیسی ہیں۔ اور اس طبقے کے مذاق کی رفتار ترقی کیا ہے۔ ایک تاجران سب چیزوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ہمارا تھیٹری عوام کی دلچسپی کے لئے ہے۔ لہذا جن مفاہمتوں پر عوام کو اعتراض نہیں اور جن کو وہ بہولت جائز قرار دے کر تماشے سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ مالکوں اور ڈراما نویسوں کو ان کے رفع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی آپ کو اگر انگریزی ڈراما کے مطالعہ سے معلوم ہو گیا ہے کہ ان مفاہمتوں کے بغیر کیونکر نہایت لطف میں کھیل لگے اور کئے جاسکتے ہیں۔ تو انہیں اس سے واسطہ نہیں۔ وہ کیوں اشد ضرورت سے پہلے تجربے کے خطرے میں پڑیں۔

اکثر انگریزی دان اصحاب اردو ڈراما سے متنفر ہوتے ہیں۔ اور اپنی نفرت کی سب سے بڑی وجہ بیان کرتے ہیں۔ کہ اردو ڈراما میں کئی باتیں خلاف واقعہ ہوتی ہیں۔ مثلاً بعض مناظر میں بادشاہ سلامت دربار میں تخت پر بیٹھے بیٹھے گمانے لگ جاتے ہیں۔ ہر چھوٹا موٹا کیرکٹر شعر میں باتیں کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایسے اصحاب اردو ڈراما سے متنفر ہو کر ایسے ڈراما کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جسے وہ REALISTIC کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان کو یہ خیال نہیں رہتا کہ REALISTIC سے REALISTIC ڈراما میں بھی کئی باتیں خلاف واقعہ ہوتی ہیں۔ وہ اردو ڈراما کی شاعرا گفتگو سے پریشان ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ برنارڈ شا وغیرہ کے کھیلوں میں بھی جو نشر کیرکٹروں کی زبان سے نکلتی ہے۔ وہ عام گفتگو سے اتنی ہی مختلف ہوتی ہے۔ جتنے شعر۔ حقیقی زندگی میں کوئی شخص ایسی نثر نہیں بولتا۔ اور

نہ اس تواتر سے بول سکتا ہے۔ تاہم جو لوگ اردو ڈراما کے نشو و ارتقا کا غور سے مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان سے پوشیدہ نہیں۔ کہ غیر ضروری منافہتیں دن بدن اردو ڈراما سے بے ہوش ہو رہی ہیں۔ اور منافہتوں سے نقطہ نظر سے اردو ڈراما رفتہ رفتہ نئی صورت اختیار کرنے کی طرف مائل ہے۔ جو منافہتیں ہمارے ڈرامے کے انداز تحریر اور اسٹیجنگ میں تھیں۔ یا اب بھی ہیں۔ ان کو سمجھنے کے لئے ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ اردو ڈراما کی پیدائش اور ترقی کے مختلف مراحل پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔

موجودہ اردو ڈراما کو قدیم سنسکرت ڈراما سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ قدیم سنسکرت ڈراما جسے برہانہ اندر کے ایما سے ایجاد کر کے اس کا نام نٹ دید رکھا۔ اور جس کے پہلے ناکھ کی نائش رشی بھرت کی قیادت میں آکاش منڈل میں ہوئی تھی۔ جس کی غرض دعاغیت۔ جس کے اصول و قواعد اور دوسری تمام ضروری تفصیلات بھرت شاستری مرتب ہوئی تھیں۔ اور جس ڈراما نے کالی اس بھیموتی جاس اور ہرش دیو جیسے زندہ جاوید ڈراما نویس پیدا کئے تھے۔ وہ ڈراما بدھ۔ جین اور ہندو مذاہب کے باہمی منہ کشے اور خانہ جنگی کا شکار ہو کر رہ گیا تھا۔

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سکون کے زمانے میں کئی مرتبہ اس ڈرامے نے پھر ابھرنے کی کوشش کی۔ لیکن پے در پے اس قسم کے واقعات رونما ہوتے رہے۔ کہ یہ فن پھر پھینپنے نہ پایا۔ اور رفتہ رفتہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ جو اس کے اہل نہ تھے۔ اور آخر کار فنا ہو گیا۔

موجودہ اردو ڈراما نے اودھ کے نواب و اجد علی شاہ کے قیصر باغ کی چار دیواری میں جنم لیا تھا۔ نواب و اجد علی شاہ کا دربار شمالی ہند میں حکومت کی بجھتی ہوئی شمع کا آخری سنبھالا تھا۔ علم النفس کے ماہر جانیں۔ کہ وہ کیا کیفیت تھی جس میں اودھ کا دربار اس زمانے میں ڈوبا ہوا تھا سلطنت کی باگیں

اتنی ڈھیلی ہو چکی تھیں۔ کہ ہاتھوں سے نکل گئی تھیں۔ ایک صبی حکومت اتنا فروغ پا چکی تھی۔ کہ سیلاب کی طرح سارے ہندوستان پر چھا گئی تھی۔ لیکن نہ معلوم غم غلط کرنے کی کوشش نے یا ناامیدی کی انتہا میں عشرت کا ایک آخری گھونٹ پینے کی ہوس نے دربار اودھ کے پایہ تخت لکھنؤ کو تعیش کا گوارہ بنا رکھا تھا۔ نشاط کا کون سا نشہ تھا۔ جو اس موقع پر بہم نہ پہنچا گیا۔ جس کی کون سی دلفریزی تھی۔ جس سے محفلین نہ سبائی گئیں۔ اور ہوس کی کون سی تسکین تھی۔ جس سے خلوتوں کو رنگین نہ بنایا گیا۔ لیکن تعیش کی اس فضا میں مرجھائے ہوئے اعصاب کے لئے سکون کہاں! نئی نئی دلچسپیوں اور گماگموں کی تلاش رہتی تھی۔ مخموروں کو اور زیادہ مخمور بنانے کے لئے تیز تر دارو کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس زمانے میں اتفاق سے ایک فرانسیسی کو دربار اودھ میں باریابی حاصل ہو گئی۔ رنگیلے پیا کے لئے انوکھی تفریحیں بہم پہنچاؤ درباریوں کے لئے ایک مستقل مسئلہ بنا رہتا تھا۔ فرانسیسی کو اس کا علم ہوا۔ تو اس نے یورپ کی تفریح ڈراما کا ذکر کیا۔ ڈراما میں سے اوپرا اپنی خصوصیات کی وجہ سے اور دربار اودھ کے حالات کے اعتبار سے نواب کے سامنے پیش کرنے کو مناسب معلوم ہوا۔ چنانچہ پہلے پہل اردو میں جو ناکھ کھیلایا وہ خالص اوپرا تھا۔ اس کا نام اندر سبھا تھا۔ اور اسے سید آغا حسن آمانت لکھنوی نے لکھا تھا۔

یہ ایک پری کی کہانی تھی۔ جو ایک انسان شہزادے پر عاشق ہو کر ایک دیو کی معرفت اُسے پرستان میں اٹھوا منگواتی ہے۔ اور اس کے اصرار پر اسے اندر کی سبھا دکھانے کے لئے لے جاتی اور باغ میں ایک پیڑ پر چھپا دیتی ہے۔ وہاں ایک آؤر دیو اُسے دیکھ پاتا ہے۔ اور پکڑ کر راجہ کے سامنے لے آتا ہے۔ جب راجہ اندر کو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کے اکھاٹے کی پری نے ایک انسان سے دل لگایا ہے۔ تو وہ غیظ و غضب

طبع کا سامان بہم پہنچاتی رہی + اس ڈرامے کے لکھنے میں علاوہ ایک مصنوعی انداز تحریر کے دوسری جس قسم کی مفاہمتوں سے کام لیا گیا۔ ان کو ظاہر کرنے کے لئے اس کے ایک دو اقتباس دے دینا مناسب ہوگا +

جب پری اندر کے اکھاڑے میں سے نکال دی جاتی ہے تو اس کے بعد تماشا بیٹوں کو کچھ معلوم نہیں ہونے پاتا۔ کہ اس پر کیا ہوتی۔ اندر کے اکھاڑے سے نکلنے کے بعد جب وہ دوبارہ اسٹیج پر آتی ہے۔ تو جوگن کے بھیس میں آتی ہے لیکن بھیس تماشا بیٹوں کے سامنے نہیں بدلا گیا۔ اس لئے مصنف یہاں ایک مفاہمت سے کام لیتا ہے۔ جن واقعات کو دکھانے کا ان کے بیان کرنے کو دیوؤں کا ایک کورس بھیج دیتا ہے جو اسٹیج پر آکر یہ نظم گاتے ہیں۔ اور بے تکلفی سے لوگوں کو آگاہ کر دیتے ہیں۔ کہ اس دوران میں کیا واقعات ہو چکے اور تماشا بیٹوں کو اب کیا دیکھنے کے لئے تیار رہنا چاہئے +

دیوؤں کے کورس کے چند اشعار یہ ہیں

جوگن آتی ہے پری بن کے پرستان کے بیچ
سمریں ہاتھوں میں مندرے ہیں پڑے کان کے بیچ
سر پہ اندڑا ہے رکھامنہ پہ رانی ہے بھبھوت
سیلیاں ڈالے ہے گردن میں گریبان کے بیچ
چال متوالی ہے آنکھیں ہیں مئے عشق سے لال
مست شہزادہ گلفام کے ہے دھیان کے بیچ
کیں گلفام کا کوسوں نہیں ملتا ہے پتہ
خاک اڑاتی ہوئی پھرتی ہے بیابان کے بیچ

ایک دیو جوگن کی آمد کی خبر راجہ اندر کو پہنچاتا ہے۔ اور راجہ اس کا گانا سننے کے اشتیاق میں اسے دربار میں بلاتا ہے۔ اس موقع پر مصنف ایک اور مفاہمت سے کام لیتا ہے۔ تماشا بیٹوں کو تو صاف نظر آ رہا ہے۔ کہ یہ جوگن اصل میں اکھاڑے سے

کی حالت میں شہزادے کو تو ایک کنوئیں میں قید کر دیتا ہے اور پری کے پر سچو کر اسے پرستان سے نکال دیتا ہے۔ پری جوگن بن کر فراق یار میں دلسوز گیت گاتی پھر رہی ہے۔ کہ اتفاق سے ایک دیو اس کا گانا سن پاتا اور جوگن کی خبر جا کر راجہ اندر کو سنا تا ہے + راجہ اندر جوگن کو دربار میں بلا کر اس کا گانا سنتا ہے۔ راجہ اور کوئی درباری نہیں پہچانتے پاتا۔ کہ یہ جوگن اصل میں اکھاڑے ہی کی پری ہے۔ راجہ گانے سے بہت محظوظ ہوتا ہے۔ اور خوش ہو کر جوگن کو پان۔ ہار اور رومال پیش کر تا ہے۔ مگر وہ کچھ قبول نہیں کرتی۔ اور منہ ناگی مراد پانے کا قول مانگتی ہے اور جب راجہ قول دے دیتا ہے۔ تو اسے بتاتی ہے۔ کہ میں تیرے دربار کی پری ہوں۔ اور مجھے افام میں اپنا شہزادہ چاہئے ہے۔ راجہ اندر کے لئے اب ایسے وعدہ کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ چنانچہ وہ پری اور شہزادہ کو ملا دیتا ہے +

یہ کھیل چونکہ اس غرض سے لکھا گیا تھا۔ کہ اس سے نواب اودھ کی دلہنگی ہو۔ اور ایک ایسے شخص کے لئے ایک نئی قسم کی تفریح کا سامان بہم پہنچ جائے۔ جسے عشرتوں کی کثرت نے تھکا دیا تھا۔ اس لئے یہ پہلا ڈرامہ خاص کوشش سے تخیل خیز اور بارونق بنایا گیا۔ اس میں ایک پری اور ایک انسان کی انوکھی محبت کا خلاف واقعہ مگر حیرت انگیز موضوع پیش کیا گیا۔ اندر کے اکھاڑے کی روایتی روئی آنکھوں کے سامنے لائی گئی۔ پریوں کی کثرت سے اسٹیج پر چکا چوند کا عالم پیدا کر دیا گیا۔ مشہور راگ التزام سے کھیل میں کھپائے گئے۔ تقریریں اور مکالمے اشعار میں لکھے اور گائے گئے۔ اس طرح یہ تمام کا تمام ڈراما گو خلاف واقعہ باتوں سے پر تھا۔ لیکن مفاہمت کی رو سے جو مراعات ڈراما نویس کو دی گئی تھیں۔ ان سے فائدہ اٹھا کر اس نے ایک اس قدر نئی پر لطف اور انوکھی چیز پیش کر دی جو بیحد کامیاب تفریح ثابت ہوئی۔ اور برسوں اردو کمپنیوں میں ضبط

نکلی ہوئی پری ہے۔ مگر راجہ اور دوسرے دیو پریاں کوئی اسے
 شتخت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ راجہ اس سے پوچھتا ہے کہ
 اسی جوگن لے درو کی مبتلا
 خدا کس پہ ہے کس پہ شیدا ہے تو
 کہاں سے یہاں تیرا آنا ہوا
 کسے ڈھونڈتی پھرتی ہے کو کو
 سنا اپنا گانا مجھے بھی ذرا
 جوگن جواب دیتی ہے۔ کہ
 ہمارا ج پوچھو نہ جوگن کا حال
 مرا مجھ سے معشوق ہے چھٹ گیا
 یہاں ڈھونڈنے اسکو آئی ہوں میں
 سنائی ہوں گانا جو ہے مجھ کو یاد
 اگر روگ سے غیر ہو دل کا حال
 راجہ گانا بھی سنتا ہے اور پھر بھی نہیں پہچان سکتا۔ کہ یہ اسی کے
 اکھاڑے کی مردود پری ہے۔

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ اردو کے پہلے ہی ڈرامے
 میں مستقل مفاہمتوں کے علاوہ وقتی مفاہمتیں بھی کثرت سے تھیں
 ان میں سے کئی مفاہمتوں نے اردو ڈراما میں روایت کی شکل
 اختیار کر لی ہے۔ اور اب تک مستعمل ہیں۔ یہ سہیلیاں بھی جو اسٹیج
 پر آج تک نظر آتی ہیں۔ اندر کے اکھاڑے کی پریوں کی
 اولاد ہیں۔ ان کے دم سے اسٹیج پر وہ رونق ہوئی تھی کہ
 اب تک ڈرامہ نویسوں کو انہیں اسٹیج پر سے نکالنے کا
 حوصلہ پیدا نہیں ہوا۔

جب قیصر باغ اجڑ گیا۔ اور نواب واجد علی شاہ نظر بند کر
 کے کلکتہ کے ٹیبا برج میں بھیج دیے گئے۔ تو اردو ڈراما لکھنؤ
 سے نکل کر بمبئی جا پہنچا۔ اور وہاں پارسیوں کی اولوالعزمی
 تھیسیٹر بیکل کمپنیوں کی بنیاد رکھ دی۔ جس میں اندر سبھا اور

اسی قبیل کے پریوں کے مفاہمتی ڈرامے بہت کثرت سے ہوتے
 رہے۔

جب پریوں کا موضوع پرانا ہو گیا۔ تو بادشاہوں کا موضوع
 شروع ہو گیا۔ ان سب میں خلافت عقل اور خلافت قیاس داستانیں
 ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں کہ خلافتی تنزل اور قومی انحطاط کا زمانہ
 تھا تعلیم اور روشن خیالی پھیلی نہ تھی۔ حکومت چھن جانے کا احساس
 بھی ابھی تازہ تھا۔ اور اس سے طبیعتوں پر ایک مردنی سی چھائی
 ہوئی تھی۔ اس قسم کی داستانیں "اک گونہ بے خودی" کا سامان ہم
 پہنچاتی تھیں۔ یہی داستانیں چھپتی اور شوق سے پڑھی جاتی تھیں
 اور اسی قسم کی چیزیں اسٹیج پر لائی جاتی تھیں۔ ان ڈراموں میں
 بھی محیر العقول باتیں بیان کی جاتیں۔ اور مفاہمتوں سے فائدہ
 اٹھایا جاتا۔ البتہ ان کی تحریر میں اتنا فرق ہو گیا تھا۔ کہ ان میں
 اشعار گائے بھی جاتے تھے۔ اور بولے بھی جاتے تھے۔ ایک اس
 قسم کے ڈرامے کا نمونہ درج کر دینا نامناسب نہ ہو گا۔

ہامان جسے شیطان نے اپنا مرید بنا کر بادشاہ بنا دیا ہے۔
 اپنے بچوں کو شراب پینے پر مجبور کرتا ہے۔ اور جب وہ نہیں مانتے
 تو شیطان کے کہنے پر انہیں شہر بدر کر دیتا ہے۔ ہامان کی لڑکی
 مہرنگار اپنے بھائی سے بچھڑ جاتی ہے۔ اور جنگل میں پریشان پھر
 رہی ہے اور گارہی ہے۔

خدا یا تنگ آئی ہوں ستم اب اٹھ نہیں سکتا
 مرا لاغر ہے تن بارالم اب اٹھ نہیں سکتا
 کہاں تک دشت میں بھٹکوں یہیں اب اپنا سر پکوں
 ہیں چھلے پاؤں میں آگے قدم اب اٹھ نہیں سکتا
 کروں تدبیر گو صدا پر اس سے فائدہ ہے کیا
 ہوا تقدیر میں جو کہ رقم اب اٹھ نہیں سکتا
 (اتنے میں ایک سانپ نکلتا ہے اور مہرنگار کو ڈس لیتا ہے۔ جس
 پر وہ تڑپ تڑپ کر اپنی تکلیف اور درد کا اظہار دوسرے گانے

میں شروع کر دیتی ہے) سہ

بگاڑا نکھایا میں نے تیرا بتا ایسے موزی تو نے مجھے کیوں ڈسا
مصیبت کی باری میں بچا رہی تھی تجھے رسم آیا نہ مجھ پر ذرا
تے زہرنے اب کیا ہے اثر کوئی دم میں ہوگی مری جاں ہوا
اب شیطان ایک بزرگ کے لباس میں داخل ہوتا ہے۔ اور اپنے
آپ کو مخاطب کر کے یہ اشعار پڑھتا ہے۔ سہ

دنیا میں مجھ سے جو بھی کے عار آدمی پائے وہ ایسے سینکڑوں آزار آدمی
جو آج ہو گیا نہ گرفتار آدمی وہ کل بچیکا مجھ سے نہ زہنار آدمی
اسکو دوا کے چلے سے دیکر ابھی ترزا ایمان اسکا کرتا ہوں فی القویں خراب
جس زمانے میں ایسے کھیل لکھے گئے تھے۔ اس زمانے کے لوگ اس قسم
کی مفاہمتیں بخوشی گوارا کر لیتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ وقت اور حالات
ڈراما نویس کا انداز تبدیل کرتے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد مجر العقول
واقعات کی بجائے صرف انوکھے واقعات ڈراموں میں آنے لگے گانے
کی بجائے زیادہ اشعار پڑھے جانے لگے۔ اور ڈراموں میں مقتضے
عبارتیں استعمال ہونے لگیں۔ اس ڈرامے کے وجود میں آنے کی یہ وجہ
تھی۔ کہ ایک تو انگریزی زبان سے کسی قدر شناسائی ہو گئی تھی۔ اور معلوم
ہو چکا تھا۔ کہ وہاں کئی اوپرا اس قسم کے بھی ہیں۔ جن میں صرف گانا ہی
گانا نہیں۔ بلکہ غیر مقتضے نظم اور نثر بھی ہوتی ہے۔ دوسرے اب ڈرامے
کر کے اکثر گویے ایک ٹری کا تجربہ حاصل کر چکے تھے۔ اور تماشے کی کابینہ
کے لئے گانے ہی کی امداد کے محتاج نہ رہے تھے۔ اس زمانے میں اردو
نثر بہت تصنع سے لکھی جاتی تھی۔ تحریر میں قافیوں کا بہت خیال رکھا جاتا تھا
عبارت میں چاشنی پیدا کرنے کو دور دور کے قافے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائے
جاتے تھے۔ یہی نثر اسٹیج پر مروج ہو گئی۔ گانوں کے متعلق نئی مفاہمت
یہ پیدا ہوئی۔ کہ وہ زیادہ تر جذباتی موقعوں پر استعمال ہونے لگے۔
مثلاً سبب کے شروع اور آخر میں دعا۔ فراق۔ وصال۔ لڑائی۔
جوش۔ شکوہ و شکایت۔ پھیر پھاڑ اور اظہار تشکر وغیرہ کے موقعوں
پر۔ اس مفاہمت کے مطابق جو ڈرامے لکھے گئے۔ ان کا بھی ذرا

سامنہ درج کر دیا جاتا ہے۔ کھیل تائید خدا میں دو بچے آدم خوروں
کے ہاتھ پڑ جاتے ہیں۔ جو انہیں اپنے بادشاہ کے حضور میں لے جاتے
ہیں۔ کہ وہ ان کا ناشتہ کرے۔ دربار کا سین ملاحظہ ہو۔ بچے دربار
میں یہ گانا گاتے ہوئے داخل ہوتے ہیں سہ

مالک ہمارے سن لے بنتی۔ اب ہم جان سے جاتے ہیں
دولت چھوٹی حشمت چھوٹی۔ ملک ہمارا چھوٹ گیا
کون ہماری داد کو پہنچے اپنا کس کو پاتے ہیں مالک عالمی الخ
کن لوگوں میں قید ہوئے ہیں جن کو تیرا خوف نہیں
ظلم کا ان کے کون ٹھکانا۔ یہ انسان کو کھاتے ہیں مالک عالمی الخ
محض مفاہمت کی بنا پر بچوں کی اتنی سی فریاد سے آدم خور بادشاہ بچہ
متاثر ہو جاتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ "اے پیارو۔ تم اپنے دل کو نہ پریشان
کرو۔ جو ٹھیک حال ہے بیان کرو"

اس پر دونوں بچے اپنی بربادی کا نوحہ گانے میں شروع کر دیتے ہیں
کیا بتائیں حال اپنا بیکس و ناشاد ہیں
ظلم کے مارے ہوئے ہیں مور و میدا دیں
اس کی قدرت کا کرشمہ کیا کہیں تم سے حضور
شاد گھر ویراں ہوئے ویراں گھر آباد ہیں
اپکون وہ تھا ہماری سلطنت کراں میں تھی
ایک دن یہ ہے کہ مٹی خوار ہے برباد ہیں

بادشاہ سن کر کہتا ہے۔ "معلوم ہوا۔ کہ تم عالی خاندان ہو۔ پراسوس
کہ پریشان ہو۔ لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا۔ کہ تم نے مجھ کو ستمگارا اور گنہگار
کیوں ٹھہرایا؟"

بچوں میں سے ایک کہتا ہے۔ "صاحب۔ آپ کے ظلم کے
طور ہیں۔ آپ آدم خور ہیں۔ اس لئے گنہگار ہیں۔ کہ انسان کو
اللہ نے بڑا رتبہ عطا فرمایا ہے۔ اسے سب مخلوق سے افضل بنایا
ہے۔ انسان ہی تھے حضرت سلیمانؑ۔ اور انسان ہی تھے بنی دوران
لیکن آپ انسان کا خون بہاتے ہیں۔ اور اسے کھاتے ہیں +

اب محض اس ذرا سی دلیل پر کسی منطقی وجہ سے نہیں۔ بلکہ محض مفاہمت کے باعث بادشاہ مردم خوری سے توبہ کر لیتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ "اے خدا پرست پیارو۔ تمہاری نصیحت سے آج توبہ کرتا ہوں۔ کہ اب کبھی ایسا ظلم نہ ڈھاؤنگا۔ انسان کو کبھی نہ کھاؤنگا۔"

اس پر سچے پھر اظہار شکریہ میں گانے لگتے ہیں۔ کہ

اے میرے صاحب کرم کیا بھاری جی

یہ نمونہ اس زمانے کی مفاہمتوں کی خصوصیات خوب ظاہر کرتا ہے۔ واقعات انوکھے ہیں۔ گانا اشعار اور مقفے عبارت استعمال کی جاتی ہے۔ گانے نسبتاً جذباتی موقعوں پر لائے جاتے ہیں۔ اور مقفے عبارت باتوں میں۔ باتوں میں یہ ضروری نہیں۔ کہ کیر کیر کسی معقول دلیل یا موثر دلیل کی بنا پر متاثر ہوں۔ ڈراما نویس ذرا سا بہانہ بنا کر اور مفاہمت سے فائدہ اٹھا کر انہیں متاثر کر لیتا تھا۔

ڈراما کے مفاہمتوں کی یہ حالت تھی۔ جب ہمارے تین نامور ڈراما نویسوں نے مختلف کمپنیوں میں ڈرامے لکھنے شروع کئے۔ یہ منشی و نائک پرشاد طالب بنارسی۔ منشی حمدی حسن احسن۔ اور پنڈت نرائن پرشاد دیشاب تھے۔ ان لوگوں نے ڈراما نویسی کا آغاز تو پرانی مفاہمتوں میں سے کیا۔ لیکن بہت جلد اپنی روش تبدیل کر لی۔ بعض انگریزی کھیلوں کو ہندوستانی مذاق کے مطابق ڈھال کر نئے سرے سے لکھا۔ اور اس مشق سے قابل قدر تجربہ حاصل کیا۔ قرین عقل و قیاس باتیں کرنی شروع کیں۔ ڈراما میں مختلف نتائج محض اپنی مرضی سے نہیں۔ بلکہ معقول منطقی وجوہ کی بنا پر نکالنے لگے۔ مقفے عبارتوں اور اشعار کے ساتھ سادہ نشر بھی ڈراما میں داخل کر دی۔ اور اندازِ تحریر کا یہ طرز قائم کیا۔ کہ ایکڑ پہلے نشر ہوے اور اس کے بعد چند اشعار پڑھ دیا کرے۔ گانوں کی تعداد کم کی۔ اور انہیں ادا سے مطلب کی بجائے ادائے جذبات کا ذریعہ بنادیا یعنی رفتہ رفتہ تمام پرانی مفاہمتوں کو مٹا کر محض اندازِ تحریر کو اور کہیں

کہیں ایسی مفاہمتوں کو رکھ لیا۔ جو اسٹیج کے حالات کے اعتبار سے ترک نہ کی جاسکتی تھیں۔ یہ لوگ بیسویں صدی کے ابتدائی حصے کے ڈراما نویس تھے۔ اس وقت تک تعلیم کا چرچا بھی ہو گیا تھا ایکڑ کا معیار بھی ترقی کر گیا تھا۔ اسٹیج بھی بہتر بن گئی تھی۔ کئی شہروں میں پختہ مندرجے تعمیر ہو چکے تھے۔ یہی تین چیزیں ہیں جو ڈراما میں خصوصیت پیدا کرتی ہیں اور یہ تینوں چیزیں اس زمانے میں ترقی کر رہی تھیں۔ میں یہاں ان ڈراما نویسوں کے ابتدائی کھیلوں کے نمونے دے کر اور ان کی ترقی کے مختلف مراحل بیان کر کے مضمون کو طویل نہیں کرنا چاہتا۔ صرف ایک ڈراما نویس منشی و نائک پرشاد طالب کے آخری ڈراما لیل شہنار کے ایک منظر کا ذرا سا حصہ بطور نمونہ پیش کئے دیتا ہوں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ان ڈراموں میں بلاٹ اور اس کے نشو و ارتقا کے متعلق پرانی مفاہمتوں سے کام نہ لیا گیا تھا۔ اور صرف اندازِ تحریر کی مفاہمت باقی رہ گئی تھی۔

شہناز کا خایہ اند مر جانے کے بعد اس کے خاوند کا بھائی فلک سیر ہاندہ پر قابض ہو گیا ہے۔ اور اس نے شہناز اور اس کے بچوں کو گھر سے نکال دیا ہے۔ جو انتہائی غربت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بڑا بچہ فیروز ملازم ہے۔ اور چھوٹا بچہ انور یتیم خانے میں ہے شہناز بیمار پڑ جاتی ہے۔ اور ایک روز جب زندہ بچنے کی آس نہیں رہتی۔ تو اپنے بچوں کو بلانے کے لئے آدمی بھیجتی ہے۔ ساتھ ہی اپنے دیور فلک سیر کے بیٹے ہمایوں کو بھی اپنی نازک حالت کی اطلاع کرواتا ہے۔ ہمایوں کو باپ کی مخالفت سے باوجود اپنی چچی اور اس کی اولاد سے محبت ہے۔ چنانچہ شہناز دم توڑ رہی ہے۔ کہ وہ آن پہنچتا ہے۔ اس کی چار پائی کے قریب جا کر کہتا ہے۔

ہمایوں۔ چچی جان! میں ہمایوں۔ فلک سیر کا پسر۔ شہناز۔ (آنکھیں کھول کر ہمایوں کی طرف حسرت سے دیکھتی ہے) بیٹا! میں مر رہی ہوں۔ اس گھرانے کے وارث اب تم ہو گے سچ کہو میرے بچوں کی پرورش کرو گے؟

ہمایوں - س

مر جاؤں گا ہر طرح کی تکلیف سہونگا
میں ان کی خبر گیری سے غافل نہ رہونگا
شہناز - ہائے اپنے فیروز اور اپنے انور کو میں کہاں ملو گی (آہ
بھر کر) یہاں نہیں - تو خیر وہاں ملو گی +
ہمایوں - انور یتیم خانے سے فیروز نوکری پر سے آتے ہو گئے - اثر
بلانے گئے ہیں - بلا کر لاتے ہو گئے +
(یک بیک دل کی حرکت بند ہونے سے شہناز چھکی لیتی ہے)
شہناز - ان کو میری دعا! ہمایوں بچوں کو — پا!

(شہناز مر جاتی ہے)

ہمایوں - چچی! چچی! کیا ہے - کچھ بولو - آنکھیں تو کھولو - ہائے
چھکی لی اور چل بسی - افسوس س

محتاج ہو غنی ہو امیر و کبیر ہو
سلطان بے نظیر ہو اعلیٰ سریر ہو
سردار ہو غنی ہو جواں ہو کہ پیر ہو
نادان بے وقوف کہ دانا و پیر ہو
جھگڑا اجل کے ہاتھ سے اک روز پاک ہے
جس خاک سے بنا ہے وہی مشت خاک ہے

(ہمایوں کا باپ فلک سیر جس نے شہناز کو تباہ کیا ہے - ایک سائب
کے ساتھ داخل ہوتا ہے)

فلک سیر - یہ کون سا ساڑ ہے ؟

ہمایوں - کم نصیب شہناز ہے +

فلک سیر - کیا ہوا - کیا مر گئی ؟

ہمایوں - حسرت بھری دنیا سے گزر گئی +

فلک سیر - کس بیماری سے ؟

ہمایوں - کسی کی سنگاری سے +

فلک سیر - (اس ٹھٹھے سے چڑھ کر) اونہ س

قسمت اس کی جب قضا آجائے تو ہم کیا کریں
اختیار اپنا نہ ہو جس بات میں غم کیا کریں
آپ ہم فانی ہیں پھر وروں کا ماتم کیا کریں
مرضی اللہ میں ہم مار کر دم کیا کریں
ہمایوں - (غم سے لاش کو دیکھتا ہے) س
جس کے آگے سے گیا مفلس کوئی ننگا نہیں
اس کی میت ڈھانپنے کو آج اک کپڑا نہیں

(فلک سیر سائیں کے کندھے سے کبل کا جوڑا اتار کر ہمایوں کی طرف
پھینکتا ہے)

فلک سیر - لویہ کبل - ڈھانپو میت +

ہمایوں - (تعجب سے) کبل ؟ جس کی دولت سے آپ شال
دو شالے اوڑھیں اُسے کبل اوڑھائیں !

(آخر ہار کر) اچھا کیا ہوا ! ایک لاش کو اوڑھا کر دوسرا بغل میں
دبالتا ہے ! ایک لاش کو اوڑھایا - اور ایک اپنے لئے رکھ لیا
کہ جس دن میں غریب محتاج ہو جاؤنگا - تو اوڑھوں گا +

فلک سیر - (چڑھ کر) س

نادان بے وقوف یہ تقریر بے ادب

میرا پسر تو ہے کہ مرا پسر بے ادب ؟

ہمایوں - پسر ہوں - گنہگار ہوں - مگر حق پر استوار ہوں - میں
نے اس مرحوم سے قسم کھائی ہے کہ اس کے دونوں بچوں کو
مرتے دم تک سنبھالوں گا - جیونگیا یا مرونگا - مگر ان کو سنبھالوں
گا +

(شہناز کا بڑا رٹکا فیروز گھیر لیا ہوا داخل ہوتا ہے)

فیروز - (یک سخت رک کر) کیا - مر گئی ؟ (ہمایوں سے)

کوچ کر گئی ؟

(فلک سیر سے) تمہارے روبرو - تمہارے دو بدو ؟

فلک سیر - میں ان کی پیامی سے بے خبر تھا - ہمایوں کے بلانے

سے آئے۔ مگر آکے دیکھا۔ تو کام تمام پایا۔
فیروز۔ (ماں کی لاش سے چٹ کر)۔

اماں مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ
چھاتی سے لگاؤ مجھ کو اٹھو
منہ بچوں سے موڑ کر نہ جاؤ
پہلو میں دباؤ مجھ کو اٹھو

ہمایوں۔ (اے اٹھا کر) بھائی دل سنبھالو۔ اتنے بے قرار نہ ہو
فیروز۔

حسرت بھری ستم کی ستائی چلی گئی
بچوں کا منہ نہ دیکھنے پائی چلی گئی

فلک سیر۔ تم لوگوں کی اتنی کج ادائی پر بھی میں یہاں ضرور آتا
دوا علاج کرتا۔ مگر افسوس تم نے خبر تک نہ دی۔
فیروز۔ خبر لینے کا حق تمہارا تھا۔ مگر تمہیں تو ہمارا مٹا دینا گوارہ
تھا (دکر) جیتے جی تو پوچھنے تک کو نہ آئے۔ اور مرنے
کے بعد نماشہ دیکھنے تشریف لے آئے۔

غرض اسی طرح یہ سین چلتا ہے۔

تینوں ڈراما نویس انداز تحریر کے علاوہ بہت معمولی پرانی مفاہمتوں
سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً اسٹیج پر عورت مرد کا ہاتھ ملا کر اور شعر پڑھ کر
اور آئینہ کران کا کھلچ کر دیتے تھے۔

اب اس کے بعد میں آغا حشر کاشمیری کا ذکر کرنا چاہتا ہوں
جو اگرچہ ان تینوں ڈراما نویسوں کے (جن کا ذکر ابھی کیا گیا ہے)
ہمعصر تھے۔ لیکن چونکہ انھوں نے بعض وقتی مفاہمتوں کو دور کرنے
میں بہت کوشش کی ہے۔ اس لئے ان کا ذکر جدا کرنا ہی مناسب
سمجھتا ہوں۔

آغا حشر نے انداز تحریر کے متعلق شروع شروع میں وہ مہمتیں
قبول کیں۔ جو طالب۔ احسن وغیرہ نے رد رکھی تھیں یعنی ڈراما
یوں لکھا۔ کہ کیر کٹر پہلے نشر ہوتے تھے۔ اور اس کے بعد نظم انہوں
نے اس رنگ میں اپنی قادر الکلامی سے اسٹیج پر خوب رنگ جایا۔
اور بید کامیابی حاصل کی۔ لیکن رفتہ رفتہ حالات اور ان کے

ذوق نے انہیں اس مفاہمت کے توڑنے پر آمادہ کر دیا۔ اور
آخر کار انہوں نے اپنا پہلا ڈراما "بن دیوی" ایسا لکھا جو تمام
کا تمام نشر میں تھا۔ اس کے بعد وہ کئی اور ڈرامے بھی نشر میں
لکھ چکے ہیں۔ انھوں نے گانوں کو بہت سختی سے ڈراما سے نکالنا
شروع کیا۔ اور اس وقت غالباً اکیلے ایسے ڈراما نویس ہیں۔ جن
کے کھیل میں گانا بہت کم ہوتا ہے۔ اردو کے ابتدائی کھیل تو
شروع سے آخر تک گانے میں ہی ہوتے تھے۔ بعد میں جب تحت
اللفظ اشعار اور نشر کا رواج ہوا۔ تو بھی گانوں کی تعداد ستر ستر
اسی اسی ہوتی تھی۔ احسن اور طالب کے کھیلوں میں بھی چالیس
چالیس سچاس سچاس گانے ہوتے ہیں۔ لیکن حشر کے تازہ ترین
کھیلوں میں پندرہ سولہ سے زیادہ گانے نہیں ہوتے۔ اور ان
میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں۔ جو مفاہمتا نہیں۔ بلکہ ضرورت
کی وجہ سے جائز طور پر لائے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک طوائف کے
ہاں اس سے فرمائش کی جاتی ہے۔ کہ وہ گانا سنائے۔ اور وہ گاتی
ہے۔ صرف چند گانے مفاہمت کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ جن کو
دور کرنا ہندوستان کے عام تماشائیوں کا ذوق دیکھتے ہوئے ایک
پیشہ ور ڈراما نویس کے لئے خطرے سے خالی نہیں۔ حشر کے ہاں
اب وہی مفاہمتیں ہیں۔ جو انگلستان کے وکٹورین زمانے کے
ڈراما نویسوں میں تھیں۔ مثلاً وہ سوللوکی (Soliloquy)
استعمال کرتے ہیں۔ جس میں ایکٹ اپنے آپ کو مخاطب کر کے بولتا
ہے۔ اور ایسائیڈ (ASIDE) جس میں فرض کر لیا جاتا ہے
کہ ایکٹ کی بات صرف تماشائی سن رہے ہیں۔ اسٹیج پر دوسرے
کیرکٹر نہیں سن رہے۔ لیکن ان کی سوللوکی ایسی نہیں ہوتی۔
جیسی اردو اور انگریزی کے پرانے ڈراما نویسوں میں ہوتی تھی
جن میں کیرکٹر پلاٹ کے واقعات تماشائیوں سے بیان کیا کرتے
تھے۔ کہ اب میں جاؤنگا۔ اور یہ کام کرونگا۔ یا فلاں کام میں اب
اس نیت سے کر رہا ہوں۔ بلکہ ان کے ہاں اس ذریعے سے

کیرکڑ صرف اپنے جذبات اور دلی کیفیات بیان کرتے ہیں جیسے تنہائی میں انسان کبھی کبھی "ہاے اللہ" کہ اٹھتا ہے۔ خیر ہائے اللہ جتنا اختصار تو حشر کے ہاں ایسی تقریروں میں نہیں ہوتا لیکن ان کی نہ میں احساس اسی قسم کا ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ حشر بعض بہت معمولی مفاہمتوں سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً جن ڈراموں میں وہ مسلمانوں کی زندگی دکھاتے ہیں۔ ان میں بغیر کوئی معقول وجہ بیان کرنے کے مسلمان عورت کو بے پردہ ہر کرتے ہیں۔ "سلورکنگ" میں رشیدہ۔ افضل کو گھرانے کے لئے کھلے منہ جوئے خانے میں جا پہنچتی ہے۔ لیکن اس قسم کی مفاہمتیں جن سے کم تنقص اور زیادہ لطف حاصل ہوتا ہے۔ قابل اعتراض نہیں قرار دی جاسکتیں۔ حشر کے کھیل اتنے زیادہ ہیں۔ اور اتنے لوگوں نے دیکھے ہیں۔ کہ میری رائے میں ایک سین کا بہت تھوڑا سا حصہ یہاں نقل کر دینا کافی ہو گا۔

کام لانا طوائف کی نالگہ بعض تماشائیوں سے جیلے سے روپیہ وصول کرنا چاہتی ہے۔ مندرجہ ذیل گفتگو میں کام لانا طوائف اس کی نالگہ راج کنور۔ اس کا سازندہ سدا رنگ اور دو تماشائی بینی اور جگل شامل ہیں۔ بینی اور جگل کی موجودگی میں راج کنور محض سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

راج کنور۔ سدا رنگ جی۔ کندن لال سیٹھ کی گدی آٹھ بجے بند ہو جائیگی۔ میں ذرا ہوتی آؤں۔

بینی۔ راج کنور جی۔ جلسہ سونا کر کے کہاں چلیں؟
راج کنور۔ (کام لانا کی طرف اشارہ کر کے) کیا کہوں۔ یہ تو بچے کی طرح ہٹ کر بیٹھتی ہے۔ آج ایک گلابی ساٹن پر کار چوٹی کام کی پشواز بکنے آئی تھی (کام لانا کو دیکھ کر) وہ دیکھے۔ آنکھ مار کر منع کر رہی ہے۔ نہ باوا میں نہ کمونگی +

کام لانا۔ کہ دو۔ کہ دو۔ یہ سن کر کیا مجھے پھانسی دے دیگے؟
بینی۔ تمہارے ہی روکنے سے تو چلتی موٹر میں پنکچر ہو گیا بانی جی

اب تو تمہیں کسنا ہی پڑیگا۔

راج کنور۔ سرکار۔ آج ان سدا رنگ جی کے ہنونی ایک نئی پشواز بیچنے لائے تھے۔ مال تو ہزار سے اوپر کا نہ تھا۔ مگر پھوٹی بانی جی نے جھٹ بارہ سو دواں لگا دئے۔ کہنے لگیں بسنت پنچھی ہے۔ یہی پشواز پہن کر سرکار لوگوں کے سامنے پانچوٹی بینی۔ سر جی تو اچھی۔ ان کی سمجھ کبھی بے تاں نہیں چلتی۔

راج کنور۔ بس آپ ہی لوگوں نے سخرے اٹھا اٹھا کر اس کا مزاج بگاڑ دیا ہے۔ یہ بھی تو سوچنا چاہئے۔ کہ گھر میں بینک کی طرح ہر وقت روپے نہیں رکھے بھتے۔ کندن لال سیٹھ نے چار آنے بیاج پر بھی روپے نہ دئے۔ تب بانی جی نئی پشواز پہن کر سرکار لوگوں کو کیسے خوش کر دی؟

سدا رنگ۔ بڑی بانی جی۔ یہی دن ان کے اوڑھنے پہننے کے ہیں۔ گھر کے لوگوں سے کیا شرم ہے۔ باہر نہ ملے تو سرکار سے ادھار لے لو۔

کام لانا۔ استاد جی۔ کبیل ڈال کے سرکار کو لوٹ نہ لو۔ ان ہی باتوں سے تو طوائفوں اور مراسیوں کا نام بدنام ہو گیا ہے دیکھو جی۔ تم یا تم ایک پیسہ بھی دو گے تو میں بگڑ جاؤ گی۔ جگل۔ پیسہ دوں گا۔ تب بگڑو گی نا۔ میں تو روپے دوں گا۔ راج کنور بانی یہ لو۔

راج کنور۔ جیو۔ دولت بڑھتی ہو۔ روپوں کو بینک میں سمجھنا میں بیاج کے ساتھ مول لوٹا دوں گی۔

جگل۔ مول معاف ہے اور بیاج میں ان کی مہربانی چاہئے۔ کام لانا۔ دیکھا۔ مول معاف ہے۔ یہ سستے ہی بڑھاپے پر چوٹی آگئی۔ اری نالگاؤ۔ تم بڑی پیسے کی لوبھی ہوتی ہو۔

میں نے اب تک اردو ڈراما کی ایک بہت بڑی اور مٹھو مقام کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ لیکن اس پر کچھ کہے بغیر یہ سرسری تبصرہ

کو ذرا صدمہ نہ پہنچے گا۔

اس کے بعد حشر نے ایک نئی مفاہمت سے کام لیا۔ کہ کھیل کا کامک سرے سے الگ لکھ کر اس کے متفرق سین جگہ جگہ اصل ڈرامے میں ڈالنے شروع کر دئے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح میرے اصل ڈرامے کی تعمیر و تناسب کو نقصان نہ پہنچے گا۔ اور جب مناسب وقت آئیگا۔ یہ دونوں چیزیں جدا جدا کر کے اسٹیج کی جاسکیں گی۔ لیکن اب آخری کھیلوں میں حشر نے اپنی خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے۔ کہ جدا کامک کو کھیل میں سے بالکل نکال دیا ہے۔ اور کھیل میں ایسی طرح تفنن کو دخل دیتے ہیں جس سے تماشا نویس کی تفریح بھی ہوتی ہے اور جس کا کھیل سے ایسا لگاؤ تعلق بھی ہوتا ہے۔ کہ اگر اسے کاٹ دیا جائے۔ تو کھیل ہمینی ہو کر رہ جائے۔ امید ہے حسب معمول حشر کی دیکھا دیکھی دوسرے ڈراما نویس بھی اس نہایت قابل اعتراض مفاہمت کو اپنے تماشاؤں میں سے خارج کرنے کی کوشش کریں گے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے چند الفاظ اسٹیج کی مفاہمتوں پر کہ دینے بھی مناسب ہونگے۔ ہماری اسٹیج پر مناطر (REPRESENTATIVE) یعنی تیشیلی اور (PRESENTATIVE) یعنی مطابق اصل کے بین بین ہوتے ہیں۔ مناظر بنائے جاتے ہیں اصل کے مطابق۔ مگر بنتے نہیں۔ اندر سبھا سے جوشوخ رنگ پردوں میں آئے ہیں۔ تو اب تک مکمل نہیں۔ ہر پردہ مختلف رنگوں کا انبار ہوتا ہے۔ مناظر میں وہ سادگی۔ جسامت۔ ٹھوس پنا اور خوش مذاقی نہیں ہوتی۔ جو سماں باندھنے کے ڈراما کی جان ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہماری کمپنیاں سفری ہیں۔ اور اس قسم کا سامان ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جانا بہت مشکل ہے۔ اگلے پردوں میں عام طور پر ایک ہی پردے کی سطح پر منظر کی تصویر بنا کر (PERSPECTIVE) دکھایا جاتا ہے۔ اور وہ

کسی طرح مکمل نہیں ہو سکتا۔ میری مراد ڈراموں کے کامک یعنی مذاقہ حصے سے ہے۔ ہمارا کامک مفاہمتی ہے۔ اس کا نفس ڈراما سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ تمام کا تمام کامک نکال دیا جائے تب بھی اصل ڈراما ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔ اس کے متعلق ڈراما نویس اور تماشا نویسوں میں یہ مفاہمت ہے۔ کہ آپ تماشے میں ہنسنا بھی چاہتے ہیں۔ تو ہمیں اجازت دیجئے۔ کہ ہم آپ کو ساتھ ساتھ ایک اور کہانی بھی سنائیں۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ قابل اعتراض مفاہمت اردو ڈراما میں اور کوئی بھی نہیں۔ اس اصول پر تو شاید یہ مفاہمت بھی جائز قرار دی جاسکے کہ اگر تماشا ئی اس دن کی خبریں سننا چاہیں۔ تو ایک ایکٹر اسٹیج پر آکر اخبار پڑھنے لگے۔

ہمارے ہاں ابتدائی کھیلوں میں کامک نہ ہوتا تھا۔ کھیل کے بعد ضرورت ہوتی۔ تو ایک نقل دکھا دی جاتی تھی۔ لیکن بعد میں کھیل کے ہیرو کے ساتھ دوست یا نوکر کے مذاقہ کیرکٹر داخل کئے جانے لگے۔ ان کے تفنن کو لوگوں نے پسند کیا۔ تو ڈراما نویسوں نے واد لینے کی حرص میں ان کے بڑے بڑے سین لکھنے اور اصل ڈراما کی ضرورتوں سے ہٹ کر ان کی باقی زندگی کے مضحکہ انگیز واقعات اسٹیج پر لانے شروع کر دئے۔ حشر کے زمانے تک بھی مفاہمت رہی۔ کہ ہنسنا ہے۔ تو ذرا اصل مقصد سے ہٹ کر چند سین دکھانے کی اجازت عنایت فرمائیے۔ حشر نے بھی شروع شروع میں یوں ہی کیا۔ کہ کامک کیرکٹر کا اصل ڈراما سے برائے نام تعلق رکھا۔ اور اس کے تفنن کے غیر متعلق سین بے تکلفی سے لکھتے رہے۔ اس کی مثالیں ”خوبصورت بلا کا خیر سلا“ ”سلورنگ کا وکیل“ اور ”خواب سنی کا فیض“ ہیں۔ ان کیرکٹروں کی پرائیویٹ زندگی کے تمام سین کھیل میں سے نکال دیجئے۔ صرف اتنا ہی حصہ رہنے دیجئے۔ جہاں وہ اصل کھیل کے ساتھ آتے ہیں۔ کھیل کی تعمیر کو یا تماشے کے تسلسل

ایسے نیکے ہیں۔ جو مطابق اصل قرار دئے جاسکیں۔ جن میں مقامی رنگ خوب نمایاں ہو۔ ایسا ایک کھیل خصوصیت کے ساتھ بہت مشہور ہوا تھا۔ جس کا نام علاؤ الدین چراغ تھا۔ اور جو چینی زندگی کا کھیل تھا۔ اس کا تمام سامان کھٹائی کی کمپنی نے چینی انداز کا تیار کرایا تھا ڈراپ ہمارے ہاں اس وقت گرتا ہے۔ جب ایک تصویر بنا کر کھڑے ہوتے ہیں ۛ

یہ ہے سرسری بیان اردو ڈراما اور اس کی مفاہمتوں کے پیدا ہونے کا۔ ان میں سے بعض مفاہمتیں وقتی اور اتفاقی تھیں جو رفع ہو گئی اور ہو رہی ہیں۔ بعض آئندہ رفع ہو جائیں گی۔ مفاہمت خود بری چیز نہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ ضروری بھی ہے یا نہیں اور اس کو جائز قرار دینے سے کوئی غاص فائدہ بھی پہنچتا ہے یا نہیں۔ (DRAMA OF ILLUSION) یعنی سماں باندھنے کا ڈرامہ اچھی چیز ہے یا نہیں۔ اور تخیل کے لئے اتنی غذا بہم پہنچاتا ہے یا نہیں۔ جیسے (REPRESENTATIVE DRAMA) یعنی تمثیلی ڈرامہ پہنچاتا تھا۔ یہ بہت طویل موضوع ہے۔ جس پر میں اس صحبت میں بحث نہیں کر سکتا۔ اگر اردو ڈراما کی مفاہمتوں کی اس تاریخ سے انگریزی دان دوست انہیں اس نظر سے دیکھنے لگے۔ کہ وہ خاص حالات میں پیدا ہوئیں اور خاص حالات میں مٹیں اور خاص وجوہ سے بعض بعض موجود ہیں۔ ان کا نقطہ نظر نفرت کی بجائے دلچسپی کا اور ہمدردانہ بن گیا تو میں تصور کروں گا کہ میری محنت کارت نہیں گئی

یک سخت اسٹیج کی سطح پر آکر ختم ہو جاتے ہیں۔ اگلے پرے میں کبھی کوئی دریا اسٹیج کے کنارے آکر ختم ہو جاتا ہے۔ کبھی پہاڑ اور کبھی جنگل۔ مفاہمت ہے۔ کہ خواہ اسٹیج پر کوئی خاص انتظام نہ ہو۔ مگر فرض کر لیا جائے۔ کہ اسٹیج کا باقی حصہ بھی اس پرے کے منظر کا ایک حصہ ہے۔ بڑے سین میں دریا پہاڑ تمثیل کے انداز میں ہوتے ہیں، اندرونی مناظر میں اب (FORMAL SETTING) یعنی رسمی آرائش سے کام لیا جاتا ہے۔ بقول شخصے فرنیچر بڑے قرینے سے رکھا جاتا ہے۔ اس کی سجاوٹ میں ذوق کو دخل نہیں دیا جاتا۔ ایکسٹرنل میں سے داخل ہوتے ہیں۔ اور مفاہمت ہے کہ رنگ دروانے ہیں۔ کھانے کی بجائے میوہ مٹھائی لائی جاتی ہے۔ اور فرض کر لیا جاتا ہے۔ کہ یہ کھانا ہے۔ آٹھ دس سپاہی آکر لڑتے ہیں۔ اور مفاہمت ہے کہ ان آٹھ دس سپاہیوں کی لڑائی کو گھمسان کا دن سمجھ لیا جائے۔ کھیل کے دوران میں بعض خاص مناظر میں موسیقی سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن اس کی فہم ابھی کم پیدا ہوئی ہے۔ روشنی کا انتظام بہت ابتدائی منزل پر ہے۔ ایکسٹرنل زیادہ تر کام اسٹیج کے اگلے حصے میں فٹ لائٹس کے سامنے آکر کرتے ہیں۔ حرکات میں ناپ تول کا احساس ابھی زیادہ نہیں ہوا۔ لباس پہلے تو پورے پورے تمثیلی ہوتے تھے لیکن اب ان میں واقعیت کا رنگ بھلنے لگا ہے۔ چہرے سفید رنگے جلتے ہیں۔ ہمارے ہاں صرف گنتی کے چند کھیل

”کہ عالم دوبارہ نیست“

فراعنہ مصر کے محل کا دستور تھا۔ کہ ضیافتوں کے بعد جب مہمانوں کی میگساری اور میباکی اعتدال کی حدود سے تجاوز کرنے لگتی۔ تو مبدعہ قصر کا پروہت۔ ممی کی وضع پر تراشی ہوئی دیوتا آیسرس کی لکڑی کی مورت۔ خدام کے کندھوں پر اٹھوا کر ایوان نشاٹیں داخل ہوتا۔ اور اس وقت جب کہ خدام مورت کو اٹھائے اٹھائے مخمور فرعون کے بدست مہانوں میں تھم تھم کر گھوم رہے ہوتے۔ تو پکار پکار کر کہتا۔ انجام ہستی کو دیکھو۔ اور ان ترغیبات سے احتراز کرو۔ جو تمہارے حواس کو فریب میں لاکر تمہیں بھلا دیتی ہیں۔ کہ موت کا سرد ہاتھ ایک روز جانتا پائندار کی آنکھیں بند کر دیگا۔

موت کی چیرہ دستی کا بھیانک نتیجہ آنکھوں کے سامنے آجانے سے منادی کی آواز مقسوم کے گھر پال کی گونج معلوم ہوتی۔ جسے سن کر دست درازوں کے بازو ڈھیلے پڑ جاتے اور مے آشاموں کے ہاتھ پیالوں کو نہ سنبھال سکتے۔ اور ایک لمحہ کے اندر اندر محفل پر مدہوشی اور خود فراموشی کی بجائے حیرت کا خیال آفریں سکوت طاری ہو جاتا۔

لیکن یہ صدیوں کا پرانا دستور جسے زمانہ قدیم کے کسی معلم اخلاق نے وضع کیا تھا۔ اور جس سے اخلاق عامہ کے محافظ۔ پروہت اور پجاری اعتدال و احتیاط کی درس آموزی کیا کرتے تھے۔ ایک ہی رات کے اندر ایک نوجوان فرعون کے ہاتھوں اپنے معانی کی تعبیر میں اچانک یوں منقلب ہوا۔ کہ مورت اور فطرت انسانی کے طالب کے لئے یکساں طور پر استعجاب انگیز ہے۔

وہ رات بلا سرور و دیوی ببط کے تہوار کی آخری ہنگامہ خیز رات تھی۔

مصر کی وسیع مملکت سے ستر ہزار زائر خشکی کی راہ اور کشتیوں میں سوار ہو کر کھڑائیں اور مرلیاں بجاتے اور گیت گاتے کئی روز پیشتر یوسبطس کے شہر میں پہنچ چکے تھے۔ جو اسی سال فرعون اور اس کے پڑھنوں نے پوجا کی تمام خفی و جلی رسمیں ادا کر لی تھیں۔ دیوی کا چولا اور اس کا منڈل جس پر ایک سپنولیا بنا تھا بدلا جا چکا تھا۔ فرعون نے معطر لپ دائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے دیوی کی کانٹے کی مورت پر مل دیا تھا۔ قربانگاہ پر سیاہ و سفید رنگ کے ہزاروں بیلوں کی قربانیاں چڑھ چکی تھیں۔ اور ان کے سران دعاؤں کے بعد کہ فردا اور قوم اور شہر اور مملکت کی بلائیں ان پر ٹل جائیں۔ نیل میں غرق کئے جا چکے تھے۔ دیوی کے حضور میں شہد اور شراب اور کشمش اور کھیر کے چڑھائے چڑھ چکے تھے۔ یوسبطس کے ایک ایک بازار میں عوام کا بحر موج جلاجل اور مجرے بجا بجا کر سارے دن بھن گانا اور دیوی کی جے کے نعرے لگاتا رہا تھا۔ اور اب تمام رسوم ادا کر چکے کے بعد مرد اور عورتیں اور بوڑھے اور بچے ادا کے فرض کی نعت کے احساس کے ساتھ اپنے آپ کو طرب و نشاط کے اس عام میلان کے سپرد کر چکے تھے جس کے تند و پر شور سیلاب کے پیلے سارے اثر و حام کو بہائے لئے جا رہے تھے۔ اور بہار کی اس جذبات انگیز رات میں تابان و فروزاں مندر کی منقش دیواروں کے باہر جا بجا

مشعلیں گھاتے اور جھانجھیں اور الخوزے بجاتے عرباں گیتوں اور ولولہ انگیز ناچوں میں کھوئے ہوئے تھے +

بلار سوپ دیوی بسط کے تنوار کی آخری ہنگامہ خیز رات میں ضیافت کے بعد نوجوان فرعون کا ایوان نشاط محکمات مصر کے تمام قابض کر لوگوں سے پٹا پڑا تھا۔ اور اگرچہ ازو حام کے ہنگاموں سے علیحدہ اور جدا تھا۔ لیکن نہ اتنی دور کہ بیرونی وارتنگیاں محسوس ہوئے بغیر کہ سکتیں نوجوان فرعون کا ایوان نشاط عشرت و تہلل کا ایک نادر و نگینہ خواب تھا۔ جسے معمار اور بنجار اور مصور اور سنگتراش کی متفقہ محو نہ کاوشوں نے زندگی بخش دی تھی عظمت و رفعت میں اہرام کھڑے کرنے والوں کی اولاد کے شایان شان۔ طول و عرض میں اس قدر وافر کہ ایک ازو حام کی مصیبت اس میں ناچیز نظر آتی تھی۔ اس کی وسعت ایک شور قیامت کو اپنے اندر گم کر سکتی تھی + محلے و مصفا فرش پر منقش اور رنگین دیواروں کے ساتھ ساتھ استرکاری کے ستونوں کی ایک دنیا آباد۔ جن کے پائے اور سر قدیم صناعی اور رنگ آمیزی کا ایک فردوس تھے + اور ان کے دریا جابجا دیوی بسط کے عظیم الجثہ مجسمے وقار اور نمکنت میں ترشے ہوئے کھڑے تھے + ایوان کی وسعت کے برابر نیچی نیچی اور چوڑی چلی بے شمار ڈیڑھیاں دو ایسے ہی دوسرے وسیع تختوں کو رہنمائی کرتی تھیں + گرانڈیل صد شاخوں کی مختلف اللون روشنیوں میں انسانی صناعی کا یہ حیرت انگیز مظهر جس میں رنگ و آہنگ کی موجوں پر خوشبوئیں ہلکے لے رہی تھیں۔ اپنی تابانی و درخشانی سے ہوش ربانی کر رہا تھا +

رنگدار پایوں کے ہزاروں گدیے دار تخت اور کرسیاں بھی تھیں۔ جن پر نوجوان فرعون کے مہمان ضیافت کے بعد رنگ رلیوں سے مصفا اندر ہونے کے لئے بیٹھے تھے + نیل کی مچھلیوں اور بطوں اور جنونی جنگلوں کے غزالوں اور گایوں کے کبابوں کے ساتھ مہمانوں کو کرب بھی کھلایا گیا تھا۔ کہ ان کی پیاس بھڑک اٹھے اور وہ اسے وادی نیل کے انگوروں کی لال اور سفید شراب سے بجھا سکیں +

تو مند مہمانوں نے قدح بڑھا رکھے تھے اور گوری ساقین زمرہ کارمینا لئے فراخ حوصلگی سے انہیں لبالب بھر ہی اور خالی مینا ساتھ کی سیہ فام کینزوں کے سپرد کرتی جا رہی تھیں + جام ہونٹوں پر سرنگوں تھے اور منہ پونچھنے والے خادموں کے رومال ہٹا ہٹا کر ہل من مزید کی صدا میں بلند کی جا رہی تھیں +

ایوان کے مختلف حصوں میں مختلف تفریحیں جاری تھیں۔ نچلے تختے میں مزامیر کے غل کے ساتھ نٹ اور بازی گر اور شعبہ باز اور مسخرے اپنے اپنے کمال فن کو نظارہ افروز کر رہے تھے + کئی کئی چرمی گیندیں آگے پیچھے اچھال کر واپسی میں باری باری لپکی اور پھر اچھالی جا رہی تھیں۔ رنگین دائروں والی لکڑی کے اندرونی دائرے پر بخروں سے نشانہ لگایا جا رہا تھا۔ دو دو مرد اور عورتیں زمین پر ٹانگیں پھیلا کر برابر برابر بیٹھتے اور ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈال کر بغیر زمین کا سہارا لئے کھڑے ہو رہے تھے۔ مسخرے اور بونے اپنی چست پھبتیوں اور مضحکہ خیز حرکتوں پر تہقنہ وصول کر رہے تھے +

دوسرا تختہ خوش آواز سازوں اور نامور مغنیوں کے راگوں سے سماعت کے لئے ایک خوش آئند وارتنگی کا سامان مہیا کر رہا تھا + طہنور اور سرود اور نے بجانے والی جامعتیں فضا کو کیف و مستی کی جنت بنا رہی تھیں۔ اور مغنیوں کی نگلے بازیاں متلع ہوش کی غارتگری میں مصروف تھیں + نازنیں اپنے سبک بربط سینے سے لگائے اور کندھوں پر اٹھائے اپنی نازک انگلیوں سے ان کے تاروں کو ہلاتی اور اپنے گیتوں اور تسمبوں سے بھیلیاں گراتی مہمانوں کے درمیان سے گزر رہی تھیں۔ جن کے ذہن عشرت کی ایک انوکھی مہوشی میں جیسے سن تھے +

تیسرے تختے کے پر لے کنا لے ایک جڑاؤ تخت پر جس کے پایوں کو شیروں کے بڑے بڑے سر بنا کر مزین کیا گیا تھا۔ نوجوان

فرعون وقار آمیز منجھل میں بیٹھا تھا + شباب کے اولین مراحل میں اور ناکتہ ۱۔ اس کی میں بھیگ چکی تھیں۔ اور خط بنا شروع ہو گیا تھا + اس نے نفیس ترین کتان کی ایک لمبی اور دودھ سی سفید عبا پہن رکھی تھی۔ جس کی آستینیں چست تھیں۔ اور جس کے دامن پر سنپولیوں کی زرتار قطار نے مہر کا شاہی نشان بنا رکھا تھا + زری کے ایک کمر بند سے جس نے عبا کو خوش مذاقی سے چنبٹیں دے رکھی تھیں۔ سامنے کی طرف باریک چمڑے کی ایک مثلث آویزاں تھی۔ جس پر شوخ رنگوں میں لہریئے کے نقش بنے ہوئے تھے + سر پر مصنوعی بال تھے۔ جن پر کنول کے شگفتہ پھولوں کا سبک سا تاج رکھا تھا۔ گردن میں ہیروں کا ایک ہار دبا رکھا تھا۔ اور بازوؤں۔ کلائیوں اور انگلیوں میں سونے کے موٹے موٹے بازو بند۔ ہینچیاں اور انگشتریاں جن پر تاباں پتھروں سے گر چھ اور چھو اور تصویری خط کے حروف بنے ہوئے تھے +

قد آدم بربط جن کے سروں پر ارواح خمیشہ کے انوکھے پھرے ترشے ہوئے تھے۔ ایک مناسب فاصلے پر کھڑے تھے اور مزاج شناس سازندوں کی مشاق انگلیاں انہیں ایسے سلیقہ سے ہولے ہولے بجا رہی تھیں۔ کہ رقاصہ لڑکیوں کے لطیف رقص کے ساتھ مل کر وہ تھکے ہوئے دماغ پر خوش آئند غنودگی طاری کر سکیں + خوشبوؤں اور روشنیوں میں کھولے ہوئے نشاط پر اس تیسرے تختے میں مہیت سے رنگا ہوا ایک سکون مسلط تھا۔ جس نے ہر قسم کے تجاوز و توافر کو عنان گیر اور تمام حرکات اور آوازوں کو منضبط کر رکھا تھا + پروہت کے نزدیک عشرت کا یہی تصور تھا۔ جو تہوار کی رات میں ایک نیک فرعون کے شایان شان قرار دیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی ضعیف پیشانی پر اطمینان و تشفی لئے اس انشاع آمیز غریب میں دلجمعی سے بیٹھا تھا +

لیکن نوجوان فرعون بے قرار نظر آ رہا تھا + اس کی آنکھوں میں ایک تلکان تھی۔ ایک بے کلی۔ جسے تکلف کی یہ محتاط فضا گھٹلنے کی بجائے بڑھاتی چلی جا رہی تھی۔ حرکات میں ایک اکٹاہٹ۔ ایک دل برداشتگی۔ ماحول کی نوعیت سے سیری۔ اس سارے ماحول میں جو تال مضمحل تھی اس سے بے آہنگی۔ وہ بیٹھا ہوا تھا جیسے ایک تلخی کے امتلا میں۔ صرف ادائے فرض کی تسکین کے سہارے۔ اس لئے کہ پروہت وہاں موجود تھا۔ جس نے اس کی طبع آزاد کو ہمیشہ آئین پرستی کے سلپخے میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی جس کے نزدیک تربیت کا لب لباب ناجائز جذبات کا انسداد تھا۔ اور جس کی خشک دامانی کے لئے وہ تمام جذبات ناجائز تھے۔ جو فرعون کے مقررہ مذہبی و معاشری فرائض سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ یا جن سے اس کے فرعونہ جلال و جبروت میں کوئی عام انسانی خصوصیت جھلک اٹھنے کا احتمال کیا جاسکتا تھا +

وہ بیٹھا ہوا تھا۔ احتجاج کی چھین سینے میں دبائے۔ اس منضبط عشرت کا صدر بننے اور اپنے کشیدہ دل میں پروہت اور رواج کی طرف سے ایک دود آفرین شکوہ لئے + دیوی ببط کے نہوار کی یہ آخری ہنگامہ پر در رات جس کی ریل پیل کا شور باہر اور ایوان نشاط کے نچلے تختوں سے ایک مہم گونج بن کر اس تک پہنچ رہا تھا اسے عجیب طرح متاثر کر رہی تھی۔ ایک انوکھی تشنگی تھی جس نے دل سے زبان تک اس کے سینے اور حلق کو خشک کر رکھا تھا۔ شراب میں اس پیاس کے لئے تسکین نہ تھی۔ وہ اتنی گاڑھی معلوم ہوتی تھی۔ کہ حلق جبر سے اس کے لئے کھلتا تھا + اس کے بے قرار خون کی بڑھی ہوئی حرارت کسی اور تسکین کی نشہ تھی۔ اس تسکین سے بہت مختلف جو ربط کے ہلکے ہلکے ہلتے ہوئے تاروں اور رفاصوں کے لطافت سے اٹھتے ہوئے قدموں میں تھی۔ اور جو اس شبستان کے ضبط و ترتیب اور تہذیب و شائستگی کی حلا میں نظر آ رہی تھی۔ کچھ زیادہ تند۔ و حشیانہ۔ خلاف معمول۔ اپنی نوع میں اس سب سے مختلف جس نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ کچھ اس سے ہمنوا جو ازدحام کے شور و غل کی مدھم گونج میں تھا۔ لیکن زیادہ بلند۔ زیادہ شدید۔ زیادہ بے تکلف۔ حواس کی لطف اندوزی کے لئے زیادہ

واضح۔ جو وہاں نہ تھا۔ جو گلیوں میں تھا۔ ازدحام کے ان وارفتہ مخلوط ناچوں میں جہاں لباس جذبہ کی فراوانی میں حائل ہونے سے معذور تھا جہاں کی فضا میں صرف بدن سے نکلے ہوئے پسینے کی بو تھی۔ جہاں جسموں کا باہمی مس تھا۔ جہاں شانے بھڑکتے تھے۔ جہاں سینہ ہر طرف سے گوشت پوست کے گرم دباؤ میں دب سکتا تھا +

دیوی بسط کے تنوار کی اس آخری ہنگامہ خیز رات کا رنگ رس جو اپنی فراوانی اور بے عنانی میں بخودی دستی کا ایک اہلنا ہوا سمندر تھا۔ اس کے نوجوان خون پر اپنا اضواء پھونک کر اس کو پکار رہا تھا۔ لیکن اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ کہ اپنی روح میں سے اٹھتی ہوئی لبیک کو دبائے چپ چاپ بیٹھا ہے + شفقت پردی سے بچپن ہی میں محروم ہو جانے کے بعد پروہت نے اسے یوں ہی تربیت دی تھی۔ خیال سے اپنے آپ کو بچانے کی تربیت۔ نفس کی ہر پیداوار کو دیکھے یا پرکھے بغیر خود کچل ڈالنے کی تربیت + اور اس نے ہمیشہ پروہت کے کہے پر عمل کرنے اور اپنے نفس کو اپنا سب سے عیار دشمن سمجھنے کی مخلصانہ کوشش کی تھی۔ لیکن آج کی رات میں۔ تنوار کی اس ولولہ انگیز رات میں جب ہر طرف نفس ہی کی برات چڑھی ہوئی نظر آرہی تھی۔ وہ پروہت سے شکوہ آلود برگشتگی اور اپنے نفس سے ایک حجاب آمیز موانست محسوس کر رہا تھا۔ ایک موانست جو اس رات میں حیرتناک رفتار سے ترقی کر رہی تھی۔ جو اس کی تمام ہستی سے ساز باز کرتی ہوئی اس پر چھائی چلی جا رہی تھی اور جس کے دزدیدہ توج کی سرکشی سے اور اپنے ایک دوسرے آپ کی مغلوبیت سے اس کی فطرت کا زیادہ گہرا عمق ایک پوشیدہ مسرت حاصل کر رہا تھا +

اور جذبات کی اس درہمی برہمی میں ایک نیا اور قوی ارمان اس کے اندر جم لے رہا تھا۔ جو شاید اپنی فوزائیدگی کی وجہ سے۔ شاید اپنی اجنبیت کے باعث اسے بے حد محبوب معلوم ہو رہا تھا۔ جس کی قوت کا اصرار۔ جس کی سرکشی کا دعویٰ باوجود درد آمیز ہونے کے ایک عجیب طرح سرور انگیز تھا۔ جس کی سنسناہٹ وہ چاہتا تھا اس کے خون میں فزوں تر ہوتی چلی جائے اور جس کی پھیریاں اسے کسی زیادہ موافق ماحول میں چھوڑ آئیں +

وہ آنکھیں بند کئے اپنے آپ سے خود مغلوب ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ برلبوں کے یلکھت ختم جانے سے وہ چونک پڑا۔ اس نے اپنی گرم گرم آنکھوں پر سے پلکیں ذرا سی اٹھائیں + پچھلا رقص ختم ہو چکا تھا۔ اور ایک نئی رفاصہ اکیلی رقص کرنے کو محفل میں آچکی تھی۔ خاموشی کی علت نے آہستہ سے اس کے شعور سے مس کیا۔ اور اس نے آنکھیں پھر بند کر لیں + لیکن اس مس میں ایک دامنگیری۔ اس کے ارمان کی حرکت کی تال۔ ایک دعوت تھی + اس کی پلکیں رفتہ رفتہ زیادہ اٹھتی چلی گئیں +

روشنی سے دہکتے ہوئے فرش پر ایک نئی رفاصہ جو لبنان کے پتیتے ہوئے صحراؤں میں سے لائی گئی تھی۔ ایک باریک سفید نقاب میں سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی ساکت کھڑی تھی۔ یوں جیسے کسی سنگتراش کی گرمی جنوں ایک سفید جسامت میں حسن تناب کا خواب جمیل دیکھ رہی ہو تفصیل کھوئی ہوئی۔ لیکن خاکہ کی سہانی اور محتاط اور احتیاط میں کامل گولائیاں عشرت نظر۔ اپنے جود میں بھی سجیلی حرکات کا تصور بھڑکاتی ہوئی۔ پیر کا انگوٹھا زمین پر۔ گھٹنے میں خم۔ ایک بازو بدن سے چٹھا ہوا۔ دوسرا جدا جس کے فاصلے اور انگلیوں کے خم میں ایک حرکت تھی ہوئی۔ گردن میں ایک آگاہی۔ بدن کے تناؤ میں ایک تامل۔ جیسے اپنی بے تکلفی میں شباب کی لٹکار سن کر ختم گئی ہو +

ایک خادم نے جھک کر لمبے نقاب کا دامن زمین پر سے اٹھا نا شروع کیا۔ سازوں کے لمبے لمبے تار دھڑکنے لگے۔ ان کی

دھڑکن میں خیال کی مخلوق نے حواس کی دنیا میں جنم لینا شروع کر دیا۔ صبح کے آفتاب میں پلا ہوا اگداڑ سا نولا جسم تکمیل کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اعصاب جن میں سے زندگی کی گرمی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی۔ سرخ اور سبز منکوں کی ایک مختصر جھلک کے مس سے لرزشیں کھاتی ہوئی۔ گد رایا ہوا بدن۔ خط و خال میں ایک بے تکلفی۔ ایک ناتراشیدگی۔ غیر واضح ٹھوڑی۔ ہونٹ موٹے۔ چلا ہونٹ درمیان سے کسی قدر دبا ہوا۔ اور اوپر کا ہونٹ اُچھا ہوا۔ سرخ خون سے پر اور نمناک۔ ناک چھوٹی اور کسی قدر پھیلی ہوئی۔ ننھے نازک جو کچھ سو بگھنے اور کھینچنے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ آنکھیں لمبی اور سیاہ جن میں ایک سحر رقیق ہو کر کبھی پلکوں کی چلن میں چھپنا اور کبھی باہر جھانکنا تھا۔ تنگ پیشانی۔ اور اس پر پھولے ہوئے گھنگرے بالے بال۔

فرعون اسے تک رہا تھا۔ اور اپنی پلکیں پھر گرا مانہ چاہتا تھا۔ وہ اسے عجیب طرح ایک نئی اور تازہ شے معلوم ہو رہی تھی۔ اپنے نوزائیدہ ارمان کی طرح نئی اور تازہ اور اصرار سے بھری ہوئی۔ اس ماحول میں جہاں سب کچھ چھٹا اور جانچا پرکھا ہوا تھا ایک مختلف شے۔ اس کے ارمان کی طرح مختلف۔ جو باوجود مختلف کے بے محل نہ تھی۔ جس کا تضاد منظر کو ایک انوکھی طرح نیا بنا رہا تھا۔ جس میں اس وسیع اور رنگین چھتی ہوئی چار دیواری سے باہر کا پیغام تھا۔ وہاں کا پیغام جہاں سے نعروں اور چیخوں اور قہقروں اور گیتوں کی گونج آ رہی تھی۔ جہاں اُجد پندلیاں اور زندگی سے بھری ہوئی رانیں ٹھک رہی تھیں۔

فرعون کانوں میں ایک سنسنابٹ لئے اس کا ناچ دیکھنے لگا۔ ناچ جو اس کے بھرے بھرے اور لچکتے ہوئے بازوؤں کی میباک حرکات سے شروع ہوا تھا۔ اور جس کا زہر اندر ہی اندر اس کے دھڑپیں لہریں مارتا ہوا درانہ نیچے کو بڑھ رہا اور اس کے تندرست و توانا اعضا میں تند اور ایلی حرکات پیدا کرتا جا رہا تھا۔ حرکات جن میں نہ فرعون کا پاس ادب تھا اور نہ پروہت کا حجاب۔ حرکات جن کا منبع شباب کا جوش مارتا اور کف اُڑا ہوا اچیشہ تھا۔

فرعون کا انہماک بڑھ رہا تھا۔ رقص جیسے اس پر کوئی افسوں پھونکتا جاتا اور اس پر ایک سنسناتی ہوئی معطر غفلت طاری کر رہا تھا۔ ایک غفلت جو اندر سے بیدار اور حیات افروز تھی۔ جس میں وہ سب خیالات کر وٹیں لے لے کر آنکھیں کھول رہے تھے۔ جنہیں اچانک پیدا ہونے پر پروہت کی ہدایت کے مطابق اس نے ہمیشہ کچل ڈالا اور مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ وہ سینے کی گریبوں سے زندہ ہو ہو کر اٹھ رہے اور اس کے نوزائیدہ ارمان کے اندر سما کر اس ناچ پر جھوم جھوم کر وہد کر رہے تھے۔ اور ان کے وجد میں رقاصہ مانوس سی معلوم ہوتی جا رہی تھی۔ ایک گریزان لطافت جو ہمیشہ ٹکڑوں میں اس کے پاس آئی تھی۔ جب وہ دیوی کا چولا بدل رہا تھا۔ نورسی کی پنڈلی کی ایک جھلک نے اسے سرا سیمہ کر دیا تھا۔ جب وہ دیوی کی برہنہ صورت پر مطریپ مل رہا تھا۔ تو اس کی چھنگلی اسی کے مس سے لرز کر قہم گئی تھی۔ جب اس کا رتھ ازدحام میں سے گزر رہا تھا۔ تو یہی تھی جس نے بالوں میں سے کہیں اپنا شانہ اور کہیں اپنی پیٹھ کا اتار ننگا کر رکھا تھا۔ جس کی آنکھیں نگاہیں چار ہونے کے بعد منڈیر کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔ جس کی آواز نے اس ہجوم کے شور میں سے اس تک پہنچنے کا راستہ بنا لیا تھا۔ جو کہیں اس کے آگے آگے بھاگ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اور کہیں اس کے گزر چکنے کے بعد پیچھے اسے پکارتی رہ گئی تھی۔

اب وہ اکٹھی ہو کر کھڑی ناچ رہی تھی۔ ایک ناچ جس کا خروش لمحہ بلمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جو جسم میں سچ چکنے کے بعد اسے چال میں متحرک کرنے لگا تھا۔ لمبے لمبے قدموں کی ایلی چال میں جس کا تعلق گھٹنوں سے زیادہ کولہوں سے تھا۔ جس میں غلوت کی میباکی تھی اور جلوت کا احتراز۔ جس میں رزم کی یورش تھی اور بزم کا پس و پیش۔ جس میں سرور آشام قوت کے اچانک دھاکے تھے اور رعنا ضعف کی

پسپائیاں۔ نفس کے دروازوں پر بیاک و مشک بھی تھی او۔ دبی ہوئی آپر بھی ۛ

فرعون جلتی ہوئی آنکھوں سے اس گد راسے ہوئے جسم کی حرکات کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے انوس اعضا اس وقت کچا ہو کر ایک اجنبی اور ناقابل فہم ہستی بن گئے تھے۔ ایر اپنی نگہیں سے ایک عظیم تسکین پیدا کرنے کی بجائے ایک نئے اور پراسرار طریقہ پر اسے نبرد آزما ہونے کو لٹکا رہے تھے + اس نے رتھ پر کھڑے ہو کر کسی حریف کے سامنے اپنی قوت کی سیاست کو ایسا متاثر محسوس نہ کیا تھا کبھی مقابل کے اسلحہ اور فن نبرد آزمائی کو سمجھنے میں اتنا عاجز نہ رہا تھا۔ لیکن جھر اور تامل کا یہ احساس اسے زیادہ اکسار رہا تھا۔ اس میں سسنبوں کے نئے بیجے پیدا کر رہا تھا۔ غلبہ کا منہ زور ارمان اس کی ساری ہستی میں ایک زلزلہ سا نہ رہا تھا اور پکار پکار کر اسے کہ رہا تھا۔ کہ اس حصول میں وہ سب کچھ ہے جس سے عروبی مردنی زندگی کو ماتی بنا سکتی ہے + زندگی کا یہ کامل سرور جو ہمیشہ اس کے ہاتھوں میں سے پھسلتا رہا ہے۔ جو اس کے بے پناہ ارمان میں دھڑک رہا ہے۔ اس سرکش جسم کو مغلوب کرنے میں ہے۔ اس میں اپنی سخت انگلیوں کے فشار سے نیل ڈال ڈینے ہیں۔ اسے اپنے آغوش کی حرمت سے بے سدھ کر دینے ہیں۔ اور اس کے بھرے بھرے سانولے بازوؤں میں اپنے سفید دانت کاڑ دینے میں ۛ

پر وہت چیں جیں سے اس کی بے کلی کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن اپنے میں جرأت نہ پاتا تھا۔ کہ اس رقص کے طغیان کو روک کر فرعون کی سرخ جلتی ہوئی آنکھوں سے آنکھیں چا کر سکے + وہ اٹھا اور اپنے سلگنے ہوئے غصے کے شعلوں کو دباے پروہتوں سمیت غائبی سے رخصت ہو گیا ۛ

اور رفاصہ کا رقص اپنی تندی اور تفصیل اور وحشیانہ خود فراموشی میں ترقی کرنا چلا گیا + صحرا کی وہ ارواح ہمیشہ جن کی ترغیبات کی دوائیں بھدے مجسموں میں محفوظ تھیں۔ اس کے رقص میں انگڑائیاں لے لے کر جاگ رہی تھیں۔ اور اس کے اندازوں میں اپنا شیطانی افسوں پوری پوری وضاحت سے پھونک رہی تھیں + اس کی آنکھوں میں ان کی غناسی نظریں دبک رہی تھیں۔ اور اس کے نغصوں سے ان کے سانس کی گرم بھاپ نکل رہی تھی ۛ

فرعون کے اندر خواہشوں کی موجیں ختمت اور بلندی اور غضبناکی میں بے پناہ بن گئی تھیں۔ اس کی کمر اور اس کی رانوں میں سوپوں کی طرح چھتی ہوئی گرم لہر میں دوڑ رہی تھیں۔ اس کی تمام ہستی غلبہ کے ایک پھونک ڈالنے والے ارمان سے بھرک رہی تھی + اس کا فرعونانہ جلال نرم گوشت اور لچکتی ہڈیوں کی اس مرکز ہستی کو جو اپنی فوہلی حرکات اور البیلے اندازوں میں اجیت بن بن کر تھرک رہی تھی اس سے زیادہ سرکش نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کے اعضا نے چیتے کی گھات کا انداز اختیار کر لیا تھا۔ کیلخت وہ ایک شیر کی سرعت سے پکا۔ اس کے بازوؤں نے اثر ڈے کا بل ڈال لیا۔ اور ایک زہریلا ناگ بن کر انتقام کی پوری خونخواری میں رفاصہ کو ہونٹوں پر ڈسنے لگا۔ قد آدم ستاروں کے تار شدید دھڑکوں کے ساتھ ٹوٹ کر رہ گئے۔ اور ذرا دیر کو ایک کانپتا ہوا سکوت طاری ہو گیا ۛ

اور پھر ایوان نشاط کا تیسرا تختہ ہاؤ و ہو کے ایک غلک شکاف غل سے گونج اٹھا۔ جس میں مخوں کے منہ کھل گئے۔ قدحوں میں سے شراب ابل ابل کر گرنے لگی۔ مینا فرش پر لڑھکتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ رفاصہ لڑکیوں کی کلاؤں پر پیچھے گر گئے۔ اور ساتنوں کے دامن نار نار ہو گئے ۛ

لیکن یہ رنگ رس ابھی پورے طور پر بے قابو نہ ہونے پایا تھا۔ کہ کیلخت کا نسے کا ایک گھر پال بجنا شروع ہوا۔ اور فرعون کے تخت

کے پیچھے ایک منتشر دردازہ رسم کے تکلف و انتہام سے کھول دیا گیا + چونکی ہوئی نگاہیں اس سمت کو اٹھیں۔ تو دیکھا۔ کہ غضب آلود پردہت می کی وضع پر تراشی ہوئی دیوتا آسیرس کی لکڑی کی مورنی خدام کے کندھوں پر اٹھوا کر ایوان نشاط میں داخل ہو رہا ہے +

غل گھٹنے لگا اور گھٹنے گھٹنے نابود ہو کر رہ گیا۔ تامل آمیز سکوت میں جب خدام می کو اٹھائے اٹھائے نوجوان فرعون کے مہانوں کے سامنے چپ چاپ قہم قہم کر گھومنے لگے۔ تو پردہت پکار پکار کر کہنے لگا۔ "انجام ہستی کو دیکھو اور ان ترغیبات سے احتراز کرو۔ جو تمہارے حواس کو فریب میں لا کر تمہیں بھلا دیتی ہیں۔ کہ موت کا سرو با تھ ایک روز حیات ناپائیدار کی آنکھیں بند کر دیگا +"

پردہت کی آواز جیسے اہرام کے اندر سے گونج گونج کر نکل رہی اور ہڈیوں میں نفوذ کرتی چلی جا رہی تھی + مورنی کے سامنے آتے ہی لرزہ بر اندام مہانوں کے رنگ پیلے پڑ گئے۔ اور حلق سوکھ کر رہ گئے + ہیبت نے دلوں کو دھلا دیا۔ اور عبرت آفریں خاموشی میں محذور نظروں کے اندر سے استغفار کی پو پھٹنے لگی +

فرعون اپنی بوجھل اور عطر پاش خود فراموشی سے چونک اٹھا تھا۔ رفاصہ اس کے بازو پر بے سدھ پڑی تھی۔ وہ اپنے تمام جسم میں ایک پیاسا اور مضر درد لئے ساکت تھا۔ پردہت کے الفاظ کی گونج اس کے کانوں میں شائیں شائیں کر رہی تھی۔ اور اس گونج میں ایک ہیبت کا سایہ اس کے دل پر اترتا آ رہا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا +

اس کی نظر مورنی پر پڑی۔ جسے خدام کے کندھے احترام کی آہستگی اور خاموشی میں اٹھائے لئے آ رہے تھے۔ اس نے خوف آلود پس و پیش سے نظریں اٹھائیں اور آسیرس کی مورنی کو دیکھنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا۔ کہ آسیرس کے ساکت و جامد چہرے میں اس کے اپنے خط و خال ابھرتے چلے آ رہے ہیں۔ زندگی کی روانی سے منقطع۔ موت کی چیرہ دستی سے مغلوب + انجام ہستی کے شدید احساس نے یکجہت اس کے دل کو مٹھی میں لے کر پھینچ ڈالا + ایسے چہرے اور اس بے بسی کے ساتھ زندگی کی رنگینیوں اور دلاویزیوں کو الوداع! مقبرے کے دروازے کا خاموش اور ہیبت اور درد انگیز راستہ! وہ راستہ جو صرف جاتا ہے۔ اور واپس نہیں آتا +

اچانک اس کے بازوؤں میں پڑی ہوئی رفاصہ اپنی مدہوش غفلت میں کراہی۔ اور فرعون کی متامل نگاہیں اس کے چہرے پر چلی گئیں + اس کے مناک ہونٹ ایک شیریں آرزو میں کھلے ہوئے تھے۔ اس کے نازک نتھنوں سے ارمانوں کے لمبے لمبے اور رکتے ہوئے سانس نکل رہے تھے۔ اس کی پھیلی ہوئی پتیلیوں میں نشہ تمنائیں گم تھیں۔ وہ سب کچھ تھا۔ جو یہ مختصر اور عارضی اور اپنی جگہ گاہٹوں میں بھاگتی ہوئی دنیا اپنے اندر رکھتی ہے + اس کا خون جکلیوں کی طرح اس کے دماغ میں تڑپ تڑپ کر پوچھنے لگا۔ اس کو تیاگنا۔ اس سے منہ موڑ لینا۔ اس سر بستہ مسرت کے دروازے پر۔ سے ترستی ہوئی روح لے کر لوٹ جانا + کیوں؟ آخر کیوں؟ اس لئے کہ اس زندگی کے آگے آخرت کا سفود پیش ہے۔ کسی روز۔ شاید کل۔ شاید اسی وقت + اس لئے کہ جب روح اس سفر میں ہوگی۔ تو یہ جسم اس می سے مشابہ ہو جائیگا۔ خشک اور سرو اور بے رنگ اور بے حس۔ ان تمام شیریں ارمانوں سے محروم جو رگوں کے تاروں سے نئے نکالتے اور اس کے ساتھ لہک لہک کر گاتے ہیں۔ صرف ایک تودہ۔ ایک لوتھ۔ ایک ڈھیر جس کی رعنائیاں اور رولفیں جس کی گرمیاں اور بھلیاں۔ جس کے میلان اور ارمان اس نورانی عالم کا تمام حاصل۔ اس حسین دنیا کی ساری متاع عزیز یہیں فنا ہو کر رہ جائیگی +

اس نے بے قرار ہو کر پردہت پر نظر ڈالی۔ جس کی ملامت سے المتی ہوئی نظریں اپنے اقتدار کی جرات اور اپنی بے بسی کے ضعف میں گلا پھاڑ پھاڑ کر اسے فربہ اور دغا باز اور ملعون و مردود قرار دے رہی تھیں + مایوسی اور بے فروختگی کے شدید اعلان میں وہ نوجوان فرعون کو

اپنے تمام ذخائر اور جلال سے عجیب طرح خالی نظر آ رہا تھا۔ اپنے زہد و اتقا میں خشک اور کم ظرف۔ اپنی ناتجربہ کاری میں اٹلے و جاہل۔ جذبات کی بلند آہنگ نائش نے تکلف و تقدس کی جہا اس کے ثنائوں پر سے گرا دی تھی۔ اور وہ اپنی عربانی میں ایک بازاری انسان بن کر نظر آ رہا تھا جس کی گردن کی رگیں پھول سکتی اور جس کا منہ غیظ و غضب سے کھٹ آلود ہو سکتا تھا۔ جس میں نہ زندگی کی چھیدگیوں کی سمجھ تھی اور نہ موت کے اسرار کی فہم۔ جو محض ایک پیشہ ور تھا۔ اور اپنے پیشہ کے فروغ کے لئے دلوں میں ادھام دوسا دوس بیدار کرتا رہا تھا۔

نوجوان فرعون پر دہشت کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اور اپنے سرکش اور باغی نفس کو اس کی گرفت سے آزاد و محسوس کر رہا تھا۔ اس باغی نفس کو جو رقص کے نرم جسم سے حرارت اور اس کے کانپتے ہوئے تنفس سے نشہ پارہا۔ اور اپنے طغیان میں مقسوم سے بھی نبرد آزما ہونے کا بل حاصل کرتا جا رہا تھا۔

ایک نئی سسنی نے اسے بیخود کر دیا۔ اس نے بیکھٹ اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ اور نفس کی سرور انگیز فیروز مندی میں پکار کر بولا "دیوتا آسیرس کی مورتی کو دیکھو اور اس کے پیغام کو سمجھو۔ کہ ہستی انسان کا انجام کیا ہے۔ موت بھاگی آرہی ہے۔ کہ نہیں مغلوب کر لے۔ اس مورتی کی طرح تمہیں جس بنا سے۔ تمہارے حواس اور ہر ذوقی رعنائیوں کے رشتے کاٹ ڈالے۔ اس سنجوگ سے تمہاری روح میں جو سہانی لرزش پیدا ہوتی ہیں انہیں ہمیشہ کو تھما دے۔ عالم دوبارہ نہیں۔ زندگی مختصر ہے۔ اور اگلا پل غیر یقینی۔ اس لئے ان تمام لذتوں سے اپنے سینے بھر لو۔ جو اس حیات ناپائدار کا حاصل ہیں۔ اور جو حواس کے دروازے بند ہو جانے پر پھر تمہیں نصیب نہ ہو سکیں گی۔"

ایوان نشاط کے ضبط و نامل میں سے نفس کی تائید کا ایک پُر خروش غل اٹھا۔ جس میں پر دہشت کا احتجاج ڈوب کر رہ گیا۔

اور اس کے بعد فرعون مصر کے محل کا دستور بن گیا۔ کہ ضیافتوں کے بعد جب مہمان میگساری کی رنگ رلیوں سے لطف اندوز ہونے لگتے۔ تو ایوان نشاط کا مہتمم انہیں عشرت کے انوکھے اور نت نئے احساسات سے لطف اندوزی کی دعوت دینے کو محی کی وضع پر تشریف ہوئی دیوتا آسیرس کی لکڑی کی مورت خدام کے کندھوں پر اٹھو آکر ایوان نشاط میں داخل ہوتا۔ اور اس وقت جبکہ خدام محی کو اٹھائے اٹھائے محض فرعون اور اس کے بدست مہمانوں میں تھم تھم کر گھوم رہے ہوتے۔ تو پکار پکار کر کہتا۔ "انجام ہستی کو سمجھو۔ اور ان تمام لذتوں سے اپنے سینے بھر لو جو اس حیات ناپائدار کا حاصل ہیں۔ اور جو حواس کے دروازے بند ہو جانے کے بعد پھر نصیب نہ ہو سکیں گی۔"

ہسپتال

انسانی دکھ سے بھری ہوئی خاموشی ...
 دواؤں کی تیزلو سے برگشتہ فضا ..
 انہنجی اجلی دیواریں —
 اپنی طہارت میں سرور اور جا بر ...
 چکنا سنگین فریش —
 اور اس پرسنید پوش ڈاکٹروں اور نرسیوں کے بے آواز تیز قدم +
 پیہیوں دار سٹینچر —
 ملول محرابوں کے سکوت میں —
 بے خبر جموں کا کرب اٹھائے —
 احتیاط کی آہستگی میں مڑتے ہوئے +
 کھلی کھڑکیوں کی اداس —
 جسم کی درونماک درد و جہد کا مدہم منظر لئے ...
 کالے پڑے ہوئے پیلے چہرے ...
 سوکھی ہوئی بے بس گردیں ...
 کراہتے ہوئے کئے وقفوں میں اٹھتی ہوئی چیخیں - درد کی چارہ طلب لیکن بے سود فریاد ...
 پھٹی ہوئی آنکھیں غیر معلوم انجام سے مہیب - ناتمام تمناؤں سے اشک آلود ...
 ناچیز اراموں کی دہلا دینے والی تصویریں +
 اور دروازے پر دو دہقان ...
 ایک ماں - ایک باپ -
 زندگی کے ہاتھوں لٹے ہوئے
 کس پہری میں
 اپنے اعماؤں کے ہاتھوں خود مجبور و محروم
 آنکھوں میں استقامی بے چارگی لئے
 ڈر ڈر کر اندر نکلتے ہوئے
 موت سے بند ہوتی ہوئی پلوں میں نیند سمجھتے ہوئے —
 اس نیند میں خوف آلود سہاؤ نے خواب دیکھتے ہوئے
 باہر سڑک پر موٹر کا ہارن بجانے والے - تجھے کیا معلوم !



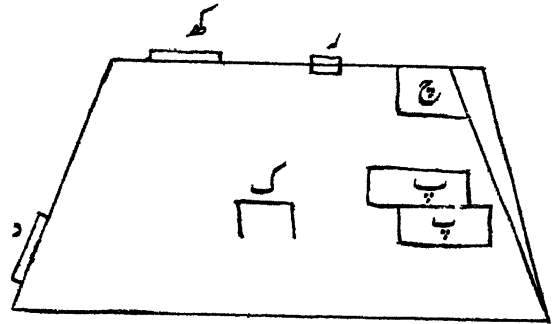
برفباری کی ایک رات

افراد

مرد

عورت

منظر۔ دامن کوہ میں ایک خستہ حال جھونپڑا۔ جو لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر موسم کی چیرہ دستیوں سے پناہ لینے کے لئے کھڑا کر لیا گیا ہوگا۔ نہ صرف آرائش کی ہر کوشش سے اجنبی۔ بلکہ تعمیر کی اتنی خصوصیات سے بھی محروم جنہیں بخار کا پیشہ عادتاً پیدا کر لیتا ہے۔



کھ = کھڑکی

د = دروازہ

چ = چوٹھا

ر = روشن دان

ک = کرسی

پ = پلنگ

اسٹیج کے اترتے رخ دائیں دیوار میں باہر جانے کا دروازہ۔ سامنے

کی دیوار میں دائیں ہاتھ کو ایک کھڑکی۔ دونوں کے کوارٹختوں کے اندر لکڑیاں جڑی ہونے سے مضبوط۔ کہ ہوا کا مقابلہ کر سکیں۔ بائیں ہاتھ اوپر ایک چھوٹا سا روشندان جس میں سلاخوں کی بجائے لکڑیاں لگی ہوئی۔ دیواروں کا رنگ دقت اور دھوئیں کی بدولت سیاہی مائل سرخ۔ روشن دان کے نیچے کونے کی دیواریں وہاں چوٹھا جلائے جانے کے باعث زیادہ سیاہ۔

جھونپڑا راحت و آسائش کے سامان سے یکسر محروم۔ بس بائیں دیوار کے ساتھ برابر برابر دو بان کے بٹنے ہوئے پلنگ۔ پائنتیاں دائیں دیوار کی جانب۔ اور درمیان میں ایک کرسی۔ جس کا بایاں بازو غائب۔ چوٹھے کے اوپر چراغ۔ سامنے مٹی کے چند برتن پکھلی چارپائی کے نیچے ایک دو چھوٹی چھوٹی گھٹریاں۔

سامنے کی چارپائی پر بچہ دھیرے کئے ہوئے ایک لحاف میں سو رہا ہے پکھلی چارپائی پر مرد لحاف اوڑھے پڑا کر دیس لے رہا ہے۔ کرسی پر عورت ٹانگوں کے اوپر کٹل ڈالے بیٹھی ہے۔ گود میں سلاخی کا کام ہے مگر وہ سی نہیں رہی۔ چپ چاپ جھی ہوئی نظروں سے سامنے تک رہی ہے روشن دان میں سے باہر برف گرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد مرد کو کھانسی اٹھتی ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا اور ایک
با آواز آہ بھرتا ہے۔

مرد۔ (عورت کی طرف دیکھے بغیر) برف گرے جا رہی ہے؟
عورت۔ (اُسی طرح سامنے تکتے ہوئے) تم کیوں جائے؟
مرد۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہوگی۔

عورت۔ برف کا وقت سے کیا تعلق؟

مرد۔ ہمیشہ نہیں کر سکتی۔

عورت۔ (پرستنی انداز میں) ... تم برف سے واقف نہیں۔

مرد۔ (طنز سے) کم واقف ہوتا تو بہتر تھا۔

عورت۔ ... تم نے برف کو صرف دیکھا ہے۔ میں اسے سمجھتی بھی
ہوں۔

مرد۔ (سراہستہ سے موڑ کر ذرا دیر عورت کو دیکھتا ہے) ... روشن؟ ان
میں سے نظر آ سکتی ہوگی۔

عورت۔ ... میں سن جو سکتی ہوں۔

مرد۔ کیونکر؟

عورت۔ مجھے معلوم نہیں۔ مگر مجھے اس کا آنا۔ فضا میں تیسرنا یا
تکملانا۔ کھلکھلانا یا بڑبڑاتے ہوئے زمین پر چلا جانا صاف
سنائی دیتا ہے۔

مرد۔ ... تم لیٹ جاؤ۔

عورت۔ ... کہ برف اور زیادہ آنے لگے۔

مرد۔ ... کیوں؟

عورت۔ ... برف کیوں آ رہی ہے؟

مرد۔ ... کون جانتا ہے!

عورت۔ ... میں اور برف دونوں ... ہیں ایک دوسرے کو سمجھنے

دو (دونوں چپ ہو جاتے ہیں)

مرد۔ ... نیند نہیں آتی۔

عورت۔ (آہستہ سے سر پھر کر بچے کو دیکھتی ہے) کم از کم نھاسو رہا ہے

مرد۔ ... ساری عمر ایسی برف پڑنا یاد نہیں۔

عورت۔ ... تمہیں بھوک کی وجہ سے نیند نہیں آتی۔

مرد۔ ... شاید کھانا کھانے سے ٹھنڈ نہ لگتی تھی۔

عورت۔ ... میں نے نہیں کھا تھا۔ ایک روٹی اور کچھ دال باقی
ہے۔

مرد۔ (جواب نہیں دیتا۔ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ذرا دیر متاثر سا رہتا

ہے۔ پھر کھڑکی کے پاس چلا جاتا ہے۔ کوارٹر تھوڑا سا کھول کر باہر

دیکھنے لگتا ہے) نہ معلوم کب تھمتے گی!

عورت۔ (اسی طرح سامنے تکتے ہوئے) ... اس کا تھنا مقرر نہیں

مختصر ہے۔

مرد۔ (کھڑکی بند کر دیتا ہے) ... تم ٹھٹھر رہی ہوگی!

(عورت خاموش رہتی ہے۔ مرد پیچھے اس کے قریب آ کھڑا ہوتا

ہے)

عورت۔ میری بیٹی نہ کرو۔

مرد۔ (عورت کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ پھر دونوں رضا دلوں کو

چھو تا ہے) تم ٹھنڈی ہو! (اس کا مکمل اسے زیادہ اچھی طرح

اڑھاتا ہے۔ عورت بے پرواہ بیٹھی رہتی ہے۔ مرد کھویا کھویا

کھڑا ہو جاتا ہے۔ آخر کرسی کے دائیں بازو پر دائیں دیوار کی طرف

منہ کر کے بیٹھ جاتا ہے) ... کاش تم مجھے طعنے اور گالیاں دے سکتیں۔

عورت۔ ... غلط فہمیوں سے بچنے کا موقع ہے۔

مرد۔ ... مجھے تسکین کی ضرورت ہے ... اپنی تسکین کی ضرورت

... میں ہمیشہ کی طرح اب بھی خود غرض ہوں۔

عورت۔ ... مجھے میری نظروں میں شبید بنانے کی کوشش مت کرو۔

مرد۔ ... تم سمجھتی ہو۔ مجنوں تم نہیں؟

عورت۔ ... (نفوق کے دم آلود سیم سے) تمہیں اس لئے شبہ

ہے۔ کہ میں برفباری میں خاموش اور بے پرواہ ہوں۔

مرد۔ (چپ ہو جاتا ہے۔ آخر سر اٹھا کر سامنے کی دیوار کو گھورنے

لگتا ہے (نہیں۔ تمہیں میں نے درغلایا تھا۔ میں نے۔ میں نے
رات کے ہتابی درپچوں میں۔ شفق کے شہابی درختوں کے نیچے۔
آہوں سے۔ آنسوؤں سے۔ تصور سے۔
عورت۔ (چمکتی آنکھوں سے) وہ تصور اس وقت حقیقت ہے۔
مرد۔ (آنکھیں بند کر کے) کیسی جگرگداز حقیقت!
عورت۔ میرے جنون کی توہین نہ کرو۔
مرد۔ (چپ چاپ کھڑا ہو جاتا ہے۔ سر پھیر کر روشن دان کو دیکھنے
لگتا ہے) برف اندھا دھند گر رہی ہے... اس برفباری
میں اپنی خاطر اسے ٹھنڈا ہوتے ہوئے دیکھنا۔ جس کے لیں
باپ اور بہن بھائی بھڑکتے ہوئے آتش دان کے سامنے ٹٹھائے
ہوئے رخسار لئے بیٹھے ہونگے... یارب! یارب! (سر
موڑ لیتا ہے)
عورت۔... یہ باتیں اس موقع کے لئے غیر موزوں ہیں۔
مرد۔... ہم تنہا ہیں۔
عورت۔... ہم تنہا نہیں ہیں۔
مرد۔... ہمارے علاوہ جو کچھ ہے۔ وہ ان کا خیال دلاتا ہے۔
عورت۔... اونہ۔ دنیا میں ایسے بہترے خوش حال ہیں۔
مرد۔ میں ایک ہی خوشحال گھرانے کا تصور دار ہوں۔
(کھڑکی کے قریب چلا جاتا ہے۔ اور منہ ادھر ہی کئے سر جھکائے
کھڑا رہتا ہے)
عورت۔... برف ان کے مقابلہ میں کچھ نہیں۔
مرد (سر نیچے ڈال کر) کاش وہ اب تک میری یاد پر لعنت
بھیج رہے ہوں!
عورت۔ ان کی باتیں کیوں کر لے رہے ہو۔
مرد۔ میں ان کی یاد میں رہنا چاہتا ہوں۔
عورت۔ کیوں؟
مرد۔ تمہاری اور ننھے کی خاطر۔

عورت۔ (خفیف سی چین جبین سے) میری غیرت اتنی بے حقیقت
نہیں۔
مرد۔ (بھاری آوازیں) مجھے اپنی غیرت کی حقیقت معلوم ہو رہی ہے
عورت۔... چپ ہو جاؤ۔
مرد (کھڑکی کے کواڑ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ ایک آہ بھرتا ہے۔ کھڑکی
کھولتا اور باہر نکلنے لگتا ہے۔ جیسے اپنے آپ سے) ساری
برف ایک ہی بار کیوں نہیں آپڑتی!
عورت۔... یک لخت ہمیں ختم نہیں کرنا چاہتی۔
مرد۔ یہ آہستگی۔ یہ تامل۔ یہ بے فکری روئیں روئیں کو تھکائے
دیتی ہے۔
عورت۔... برف کا یہی منشا ہے۔
مرد (کھڑکی بند کر دیتا ہے)۔... اور اندر نہیں بیٹھے ہوئے دیکھنا
سیدھا۔ ساکت۔ ٹھنڈا۔... تم سو نہیں سکتیں... لیٹ
بھی نہیں سکتیں؟
عورت۔... نہیں۔
مرد (کچھ کہتا کہتا رک جاتا ہے۔ پھر بے بسی کے تقسم سے) ہاں
بے سود ہے! جب اعضا کو پھیلا کر مناسب طریق پر
ڈھانکنے کی توفیق نہ ہو۔
عورت۔... بیٹھنے میں بے پرواہی اور بیفکری ہے۔
مرد۔ لیٹنے کا طنز میں محسوس کر چکا ہوں۔
عورت۔ عجز کا اظہار اندیشہ ناک ہے۔
مرد۔ کاش اپنے آپ کو کوئی دھوکا ہی دینا ممکن ہوتا۔
عورت۔ چپ ہو جاؤ۔ برف بے قابو ہو جائیگی۔
مرد۔ (جا کر چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے)۔... کبھی تمہیں
بھی خیال آتا ہے۔ آسمان کے اُس پار کیا ہے! کوئی آنکھ؟
کوئی دل؟ یا ایک بے اختیاری اور بے بسی۔ جو صرف
اس لئے قوی ہے۔ کہ بلندی پر ہے۔

عورت (فکر مند جیسے تمہارے لئے سو رہنا ناممکن ہے۔
مرد۔ (بیٹابی سے سر ہلا کر خیالات کو منتشر کر دیتا ہے)۔۔۔ نیند بھوک
سے بہت مختلف ہے۔

عورت۔۔۔ کہا جو۔ ایک روٹی اور ٹھوڑی سی دال رکھی ہے
مرد۔ (کسی قدر سختی سے) مجھے معلوم ہے۔
عورت۔ آدھی لے لو۔

مرد (سامنے گھورتے ہوئے) ابھی میں درندگی سے نیچے نہیں پہنچا
عورت۔ نیچے کے لئے صبح کو آدھی کافی ہو جائیگی۔

مرد (بیقراری سے کھڑے ہو کر) عورت چپ ہو جا! ابھی قدرت
مجھے پاگل نہیں دیکھنا چاہتی۔

عورت۔ (جیسے اپنے آپ سے) میں ہار رہی ہوں۔

مرد۔ (کھڑکی کے پاس جاتا اور پیشانی دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑا ہوتا ہے
مڑ کر عورت کو دیکھتا ہے۔ پھر بیقراری سے سر موڑتا اور ایک تخت
کھڑکی کھول لیتا ہے)۔۔۔ برف آئے جا رہی ہے۔۔۔ کیوں
۔۔۔ کوئی کہہ سکتا ہے کیوں؟

عورت۔ ہٹ آؤ۔ دیکھتے رہنا کمزوری کا اعتراف ہے۔

مرد۔ یہ تو اتر۔۔۔ یہ تو اتر۔ (کپٹیوں پر ہاتھ رکھ لیتا ہے)

عورت۔ اس کا بند ہونا ایک طح ممکن ہے۔ صرف ایک طح۔

مرد۔ کس طح؟

عورت۔۔۔ ہم میں حس نہ رہے۔

مرد۔ (سوچتا ہوا سر عورت کی طرف موڑتا ہے) پھر ہیبت اکارت

جانے لگی۔ اس لئے؟

عورت۔ تم اب تک اس مو کے کو نہیں سمجھے؟

مرد۔ (سوچتے ہوئے) در نہ رات کو بھی گریگی۔ دن میں بھی نہ تھکے گی؟

عورت۔۔۔ دن میں کہیں باہر جانا ہے؟

مرد۔ کسی بھروسہ پر نہیں۔

عورت۔۔۔ پھر تھم جائیگی۔

مرد۔ کیوں؟

عورت۔۔۔ جانا امید جو پیدا کرتا ہے۔

مرد۔ ایک موموم امید۔

عورت۔ (آہستہ سے) مایوس بیٹھے رہنے سے بہر حال زیادہ
اذیت بخش۔

مرد۔ (سر جھکا کر)۔۔۔ یوں ہے۔۔۔ تو یوں ہے۔۔۔

میں سمجھا۔۔۔ میں سمجھا۔

عورت۔ میں کبھی کی سب کچھ سمجھ چکی ہوں۔

مرد۔ (نظریں اٹھا کر)۔۔۔ ہم سے زندگی کا مذاق کھیلا جا رہا
ہے۔۔۔

عورت۔۔۔ بنایا جانا کبھی کا ختم ہو چکا۔

مرد۔۔۔ یہ مذاق کے انکشاف کا مرحلہ ہے۔

عورت۔۔۔ مذاق کامیاب ہو چکا ہے۔

(دونوں چپ ہو جاتے ہیں۔ مرد بے معنی نظروں سے باہر دیکھنا
رہتا ہے)

مرد۔۔۔ گائے اوپر سے آتے ہیں۔ آنکھوں کے آگے سے

تیرتے ہوئے نیچے چلے جاتے ہیں۔ جیسے ہمیں بھیپا ہے

ہیں۔

عورت۔۔۔ میں یہ محسوس کر چکی ہوں۔

مرد۔ اس مظاہرہ کے بغیر مذاق کی تکمیل نہ ہوتی تھی نا؟

عورت۔ عملی مذاق بعد کی ایسی پھیڑ ہی کی خاطر کیا جاتا ہے۔

مرد۔۔۔ اور یہ یوں ہی ہوتا رہیگا؟

عورت۔۔۔ تناسب کی فہم انسان میں ہے۔

مرد۔۔۔ انسان کا صبر غیر محدود نہیں۔

عورت (آہستہ سے) مگر بے بسی بھی کھلی ہوئی ہے۔

مرد۔ بے بسی! بے بسی! زندگی اور انسانیت کے ساتھ۔ تمام علم

اور تمام تجربہ کے ساتھ!

(کوڑ پر ہاتھ رکھے کچھ دیر جی ہوئی نظروں سے سامنے تکتا رہتا ہے
پھر یکھٹ کھڑکی بند کر دیتا ہے۔ اور اس کا سانس تیز تیز چلنے لگتا
ہے)

... لیکن ... لیکن ...

عورت - کیا ؟

مرد - ایک اختیار ! ... ایک اختیار ! ...

عورت - (سر پھیر کر درادیر اسے دیکھتی رہتی ہے) ...
خودکشی ! ...

مرد - (عورت کو گھورتا رہتا ہے) ... اس سائے مذاق کا
جواب ہو سکتی ہے - (جلدی سے عورت کے قریب آکر)
نہیں ؟

عورت - (پھر سامنے دیکھنے لگتی ہے - آنکھیں زیادہ کھل جاتی ہیں)
میں نے خودکشی کو یوں نہیں سوچا -

مرد - (جوش میں دو زانو ہو کر اور عورت کے سامنے جھک کر) جواب
میں بے جان ہو جانا ! سچ مچ بے جان ہو جانا !

عورت - (مرد کو تکتے ہوئے) جیسے مذاق پر آنکھیں اور کان بند
کر لئے جائیں ؟

مرد ... تم سمجھیں ؟

عورت - تم بولو - تم بولو - (پھر سامنے دیکھنے لگتی ہے)

مرد - ہم تم دونوں یہاں - اسی جھوپڑے میں - فرش پر - اکٹھے
بے جان ! ذرا سوچو ! ذرا سوچو !

عورت - ہاں ہاں -

مرد ... پھر برف اس پھٹ کو ڈھا دے -

عورت ... اور پڑی ہمارے جسموں کو دبائے -

مرد ... ہوا ان دیواروں کو اڑا لیجائے -

عورت ... سولج یہاں سے ندیاں نکال لے -

مرد ... زلزلے اس مقام کو تسنہس کر ڈالیں -

عورت ... بارشیں اسے ہمالے جائیں -

مرد ... لاشیں رہیں یا غرق ہو جائیں -

عورت ... ہم پھر بھی مسکرا رہے ہونگے -

مرد - (کھڑے ہو کر) زندگی کے مذاق کا کیسا منہ توڑ جواب !

عورت - (چپکتی آنکھوں سے) ہاں ہاں ... برف کے لئے
کیسی مایوسی !

مرد - (جلدی سے اس کے دوسری طرف آکر) اور دیکھنا —
پھر آتشندائوں کی آگ پڑی بھڑکا کرے -

عورت - کھانوں کی ہینڈیاں چوٹوں پر کھد کھد بد کرتی رہیں -
مرد - لوگوں کو بد معنی ہو -

عورت - دسترخوانوں پر قہقہے اڑیں -

مرد - بھاری ٹخافوں میں چہرے مسکرایا کریں -

عورت - ہمارا ذہن سن ہوگا - ہمارا ذہن سن ہوگا -

مرد - سب کے لئے کس قدر مایوسی -

عورت - اپنے آپ سے تھک جائینگے -

مرد - (پھر دو زانو ہو کر) ذرا سوچو - عرضیوں کے جواب میں ملازمت
پیش کی جاتی ہے -

عورت - اور ہمیں اس کی پرواہ نہیں -

مرد - منظوری لینے والے کا منہ (زور سے ہنستا ہے)

عورت - اس کا کھسیانہ پن (ہنس پڑتی ہے)

مرد - (بتیابی سے کھڑے ہو کر) ارے ہاں ! ارے ہاں !

عورت - کیا ؟

مرد - (چارپائی گھسیٹ کر عورت کے قریب کرتا - اور اس پر بیٹھتا ہے)

کوئی دکھ - کوئی بیاری تمہارے والد کو تمہاری یاد دلاتی ہے -

عورت - ان کا موٹر یہاں آکر رکتا ہے -

مرد - ہم کہیں نہیں ہیں -

عورت - یا ہماری لاشیں مسکرا رہی ہیں -

مرد - تمہارے لئے ان کی آرزو۔

عورت - تمہارے لئے ان کا پھٹاؤ۔

مرد - لوگوں سے پوچھ گچھ۔

عورت - کیسے ہو؟ کب ہو؟ کیوں ہو؟

مرد - لوگوں کی آنکھوں میں الزام۔

عورت - اُن کی آنکھوں میں آنسو۔

مرد - پشیمانی کے فقرے۔

عورت - کہ ہاے یہ کیا ہو گیا!

مرد - کہ ہائے میں اب کیا کروں!

عورت - کہ ہائے مجھے کیا معلوم تھا!

مرد - کہ ہائے مجھے یہ دن بھی دیکھنا تھا!

عورت - اور پھر بھائی جان پر جھنجھلاہٹ۔

مرد - کہ یہ سب کیا دھرا تمہارا ہے۔

عورت - ان کا بغلیں جھانکنا۔

مرد - لا جواب ہو کر ہمیں بزدل کہنا۔

عورت - اور دل ہی دل میں ہمارے خاموش جواب پر ششدر رہنا۔

مرد - زباؤں پر ہمارا تذکرہ۔

عورت - آنکھوں میں ہمارے لئے آنسو۔

مرد - (مٹھیاں بند کر کے کھڑا ہو جاتا ہے) آؤہ میں چھلکا پڑ رہا ہوں

عورت - (تیز تیز سانس لے کر) میں جیسے کسی گرم کمرے میں بیٹھی

ہوں۔

مرد - (کرسی کے بازو پر بیٹھ کر) لیکن کیونکر۔ اب کیونکر؟

عورت - (سر پھیر کر مرد سے نظریں ملاتی ہے) ... زہر؟

مرد - پر زہر کا حاصل کرنا؟ (یوں ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ جیسے دماغ

بڑی جیتی سے کام کر رہا ہے)

عورت - (یکلخت) گلا گھونٹ کر؟

مرد - اپنا اپنا؟

عورت - (بچے کو دیکھ کر) مگر بچہ؟ بچہ؟

مرد - ہمارا گلا گھونٹ لینا اس کے لئے بھی کافی ہے۔

عورت - بچھے چھوڑنا زیادہ مشکل ہے۔

مرد - (کھڑا ہو جاتا ہے) ضروری ہے کہ اسے بھی —

عورت - اس کے بغیر اُس پار؟ (مرد کا منہ تکتے لگتی ہے)

مرد - مذاق ہم سے ہے۔ یہ نا سمجھ ہے۔

عورت - (پر مٹنی انداز سے) تم برف کو نہیں جانتے۔ اور پھر اس کا

کھسیانہ پن۔

مرد - ہم دونوں کی طرف سے جواب ناکافی ہے؟

عورت - اس کو چھوڑنا کمزوری ہے۔ جواب کی کمزوری — تمہیں

معلوم نہیں ہوتی —؟

مرد - سمجھتا ہوں۔ سمجھتا ہوں۔ (کھڑکی کی طرف سر موڑ لیتا ہے)

عورت - اسی لئے تو۔

مرد - (یکلخت مڑ کر) میں بتاؤں؟

عورت - کیا؟

مرد - مجھے ایک زہریلی بوٹی معلوم ہے۔

عورت - کہاں؟

مرد - سامنے کے جنگل میں۔

عورت - (تردد سے) باہر اندھیرا ہے۔

مرد - میں آنکھیں بند کر کے وہاں پہنچ سکتا ہوں۔

عورت - باہر برف ہے۔

مرد - فاصلہ کم ہے۔

عورت - بوٹی برف میں دب گئی ہوگی۔

مرد - برف سے لڑا کر اسے پھیننے میں سرور ہے۔

عورت - (پیشی پٹی آنکھوں سے سامنے تکتے ہوئے) تو ابھی! تو ابھی!

مرد - (عورت کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اشتیاق سے سراسر کے

سامنے کرتا ہے) ابھی... ابھی... برف پڑتے ہیں...

برف کے سامنے ۔

عورت ۔ (مسکرا کر گردن اونچی کرتی ہے) جیت ہماری ہے ۔ ہماری ہے ۔

مرد ۔ (کھڑے ہو کر جوش سے) اور میں سمجھ بیٹھا تھا ۔ خدا کوئی شے نہیں ۔

عورت ۔ ہمیں اس نے بے حد و حساب اختیار بخشا ہے ۔

مرد ۔ بے پایاں نعمت ہمارے پاس ہے ۔

عورت ۔ کہ ہم مر سکتے ہیں !

مرد ۔ (سر آسمان کی طرف اٹھاتا ہے) میرے پیارے خدا ۔ میرے پیارے خدا ۔ مجھے تیرے اس سب سے بڑے عطیے کا خیال نہ رہا تھا ۔

عورت ۔ (نظریں اونچی کر کے) یہ قدرت جو تو نے انسان ہی کو دے ڈالی ہے ۔

مرد ۔ جو تو نے اپنے لئے بھی نہیں رکھی ۔

عورت ۔ زندگی کے مذاق کا ۔ عناصر کے مذاق کا جواب !

مرد ۔ مجھے اس کا خیال پہلے کیوں نہ آیا ۔ (کیچت دروازہ کھول کر باہر نکل جاتا ہے)

عورت ۔ (آنکھیں بند کر کے احسانند چہرہ آسمان کی طرف اٹھاتی ہے)

او میرے خدا ! او میرے خدا !

مرد ۔ (اٹپٹے پاؤں ماندر آ کر دفور فٹھندی سے) برف تھم گئی !

عورت ۔ (چپکٹی آنکھوں سے سامنے تکتے ہوئے) اس کے لئے کوئی چارہ نہ تھا ۔

مرد ۔ فضا صاف ہے ۔

عورت ۔ (مسکرا کر) آہ !

مرد ۔ (مٹھیاں اوپر اٹھا کر) ہم نے جواب ڈھونڈ لیا ! ہم نے جواب ڈھونڈ لیا !

عورت ۔ زندگی کے مذاق کا جواب !

مرد ۔ (تیزی سے کھڑکی کی طرف جاتا اور کواڑ پر رکھول کر یوں سامنے

کھڑا ہو جاتا ہے ۔ گویا دعوت مقابلہ دے رہا ہے) تو اب آسکتی

ہے ۔ اور بھی آہستہ ۔ اور بھی تاقل سے ۔ اور بھی بیفکری سے

ہمیشہ ۔ ہمیشہ ۔ ہمیشہ ہم بے خوف ہیں ۔

عورت ۔ (مکمل دلجمعی سے) ہم فقیاب ہیں !

مرد ۔ ہم بھوکے ۔ ٹھٹھرتے ہوئے انسان !

فوری پردہ

سید امتیاز علی تاج

مجید ملک سوال

میں تجھ سے محبت کرتا ہوں
او مجھ سے خفا رہنے والے
او مجھ کو برا کہنے والے
میں تجھ سے محبت کرتا ہوں
میں تیرے نام پہ مرتا ہوں

میں تیرا ادنیٰ بسندہ ہوں
راضی برضا رہنے والا
میں تیرا ادنیٰ بسندہ ہوں
سرگرم و سار رہنے والا
میں تیرا ادنیٰ بسندہ ہوں
قدموں میں گرا رہنے والا

ہر چند میں عشرت زادہ ہوں
ہر چند میں عیش افادہ ہوں
پر تیرے ایک اشارے پر
مٹ جانے پر آمادہ ہوں

تو مجھ سے خفا کیوں رہتا ہے
او مجھ سے خفا رہنے والے
تو مجھ کو برا کیوں کہتا ہے
او مجھ کو برا کہنے والے
میں تجھ سے محبت کرتا ہوں
میں تیرے نام پہ مرتا ہوں

مجید ملک



بمجد ملک آپ بتیاں

دریائے سندھ کی لہروں میں سورج غروب ہو رہا تھا اور میں ایک کشتی میں سوار تھا جسے تین آدمی لمبے لمبے بانسوں سے کھلے رہے تھے۔ اسی کشتی میں ایک بلوچ سوار تھا جس کے سفید بال شانوں تک گر رہے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ ایک سپیرا تھا جس کے ہاتھ میں بین تھی اور ماتھے پر کسی پرانے زخم کا نشان۔ ایک نو عمر لڑکا تھا۔ اور ایک ماہی گیر جس کے بوسیدہ جال میں کوئی مچھلی نہ تھی۔

ایک کشتی بان نے دوسرے سے کہا۔ ”میں تھک گیا ہوں۔ لنگر ڈال دو۔ حقہ بھر لو۔ تازہ دم ہو کے چلیں گے۔“ میں نے پوچھا۔ ”ابھی ہم کناے سے کتنی دور ہیں؟“

بوڑھے بلوچ نے کہا۔ ”کوئی ایک گھنٹے میں پہنچیں گے۔“

سپیرے نے کہا۔ ”نہیں ڈیڑھ گھنٹے میں۔“

نو عمر لڑکے نے کہا۔ ”اس اندھیری رات میں وقت گزارنا بہت مشکل ہے۔“

ادھیڑ عمر کی عورت نے کہا۔ ”میرے ساتھ کوئی پچیس سال کے بعد یہ اتفاق ہوا ہے کہ دریا میں رات ہو گئی ہے وہ رات بھی اسی طرح تاریک تھی۔“

میں نے پوچھا۔ ”اس رات آپ لوگوں نے وقت کیسے گزارا تھا؟“

جواب ملا۔ ”اس رات میرے ساتھ میرا شوہر تھا۔ جو اب اس دنیا میں نہیں۔ اُسے یہ دریا کھا گیا۔“

نو عمر لڑکے نے پوچھا۔ ”کیسے؟“

ادھیڑ عمر کی عورت نے آواز کو قد سے بلند کر کے کہا۔ ”کیسے؟ جیسے دریا کھایا کرتے ہیں۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے پانی کی لہروں کے اندر سما گیا۔ اس جگہ دریا کا کنارہ بہت اونچا تھا۔ میں کناے پہ ان لہروں کے ساتھ دوڑتی رہی جو اُسے بہائے لئے جا رہی تھیں۔ وہ پانی پر دیوانہ وار ہاتھ مار رہا تھا اور میں اپنے سینہ پر۔ میں اُسے ہلاتی رہی لیکن موت اُسے بلا چکی تھی لڑکے نے کہا۔ ”ایسی باتوں سے میرے دل میں ڈر پیدا ہوتا ہے۔ کوئی اور بات کیجئے۔“

عورت نے کہا۔ ”ہاں لوگ کہتے ہیں موت ڈراؤنی چیز ہے لیکن مجھے موت کی باتوں میں مزا آتا ہے۔ تمہیں تو بادشاہوں

اور پریوں کی کہانیوں میں مزا آئیگا۔
 لڑکے نے کہا۔ ”ہاں مجھے بادشاہوں اور پریوں کی کہانیوں میں مزا آتا ہے۔“
 سپیرے نے کہا۔ ”اے تاج الملوک کی کہانی سناؤ۔“

(۲)

میں نے سگریٹ سلگانے کے لئے دیا سلائی جلائی۔ اور اس کی روشنی میں سب کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر کہا۔ ”بادشاہوں کی کہانیوں میں کیا رکھا ہے۔ مزا تو اپنی زندگی کی کہانیوں میں ہے۔ بڑی بی تو اپنی داستان غم سناچکیں۔ اب جوان کے دائیں ہاتھ بیٹھا ہے۔ وہ کوئی آپ بیتی سنائے۔ جب تک چکر پورا ہوگا کنا رہ آجائیگا۔“
 اس تجویز کو سب نے پسند کیا اور سفید ریش بلوچ نے کہا:-

”دائیں ہاتھ میں بیٹھا ہوں۔ اس لئے باری میری ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنی زندگی کا کون سا واقعہ سنائوں۔ ایک ہی واقعہ ہے جو سنانے کے قابل ہے حقیقت یہ ہے کہ وہی واقعہ میری تمام زندگی ہے۔ لیکن اسے بیان کرتے ہوئے میں گھبراتا ہوں۔ خیر۔ غالباً۔ آپ لوگوں میں سے کسی سے بھی اب عمر بھر ملاقات نہ ہوگی۔ اس وقت تاریکی بھی ہے۔ میں آپ کی اور آپ میری صورت نہیں دیکھ سکتے۔ اس لئے میرا کام نسبتاً آسان ہو گیا ہے۔“

”میری عمر بیس سال سے کچھ زیادہ تھی کہ میں نے ایک عورت کو قتل کر دیا۔ کیوں قتل کر دیا؟ یہ ایک لمبی داستان ہے مختصر یہ کہ اس نے یوغائی کی اور میں رشک سے دیوانہ ہو گیا۔ ایک دن جب وہ میرے گاؤں سے کئی میل کے فاصلے پر میرے رقیب کے ساتھ چوہیش بے ہنسنے کے بعد نیند میں بیہوش تھی میں نے اُسے قتل کر دیا۔“

ادھیڑ عمر کی عورت نے کہا۔ ”تم نے بہت خوب کیا۔“

سپیرے نے کہا۔ ”تم بڑے مردانیکے۔“

نو عمر لڑکے نے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

بلوچ نے ایک لمبا سانس لیا۔ ”میں رات ہی رات اپنے گاؤں میں واپس آ گیا۔“

نو عمر لڑکے نے پوچھا۔ ”اور کسی کو پتہ نہ چلا؟“

بلوچ نے اپنی داستان کا تسلسل نہ توڑا۔ ”پولیس آئی۔ تفتیش ہوئی۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ یہاں تک کہ پانچ سال گزر گئے۔ لیکن پانچ سال کے بعد میں نے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کیا۔ مجھے ایک ایسے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا جس کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہ تھا۔“

”میری عادت تھی کہ میں ایک بڑا سا چاقو ہمیشہ اپنے پاس رکھا کرتا تھا۔ ایک دن میں ایک گھنے جنگل میں سے گزر رہا تھا کہ مجھے جھاڑیوں میں سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ میں نے بڑھ کے دیکھا تو ایک آدمی خون میں لتھڑا ہوا جان توڑ رہا تھا۔ میں نے اس کا سراپنی گود میں رکھا۔ اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر گرم کیا۔ لیکن وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈا ہو گیا۔“

میں نے پھر اُسے زمین پر لٹا دیا اور لٹا کے اٹھا ہی تھا کہ دو آدمی آ گئے۔
 ”اس کے بعد کیا ہوا؟ آپ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ مجھ پر قتل کا الزام لگا۔ اور کیسے نہ لگتا؟ میں لاش کے پاس کھڑا تھا۔
 میرے کپڑے خون آلود تھے۔ اور میری جیب میں ایک بڑا سا چاقو تھا۔
 ”مجھے بیس سال قید کی سزا ہوئی۔ تعجب ہے کہ مجھے پھانسی کا حکم نہ ملا۔ میں نے اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنے کی کچھ ایسی
 زیادہ کوشش بھی نہ کی۔ کیونکہ میرا دل کہتا تھا کہ قدرت کا مشاہی ہی ہے کہ مجھے اپنے اصلی جرم کی سزا ملے۔“

(۳)

بوڑھے بلوچ کی کمائی کے اختتام کے بعد کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ دریا کی لہروں یا تھکے ہوئے کشتی بانوں کے پھولے ہتھلے سانسوں کے
 سوا اور کوئی آواز نہ آتی تھی۔ آخر ماہی گیر لڑکے نے مہر سکوت توڑی۔ ”اب کس کی باری ہے؟“
 ادھیڑ عمر کی عورت نے ماہی گیر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”اب ان کی باری ہے۔“
 ماہی گیر نے انگڑائی لی اور اپنے جال کی رسی کو انگلیوں کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ ”میری آپ بتی کیا ہوگی؟ صبح سے لے کر
 شام تک مچھلیاں پکرتا ہوں۔ اگر جال میں مچھلیاں آگئیں تو روٹی کھالی۔ ورنہ یوں ہی سو رہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس
 دریا نے مجھے بھوکا بھی نہیں رکھا۔ مجھے اس سے محبت ہے۔ اس قدر محبت ہے کہ اگر مجھے روزی کمانے کا کوئی اور ذریعہ بھی
 مل جائے۔ اور دو ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہو چکا ہے جب بھی میں اسے چھوڑ کر نہ جاؤں۔“
 ”میں آپ کو اسی دریا کی ایک بات سناتا ہوں۔ جو صحیح معنوں میں ”آپ بتی“ تو نہیں۔ لیکن چونکہ آنکھوں دیکھی بات ہے
 اس لئے اسے ”آپ بتی“ ہی سمجھنا چاہئے۔ آپ کو یاد ہے جب دریا میں طغیانی آئی تھی؟ کوئی سو لہ سال کی بات ہے۔ رو
 ہنگارو کے پیر کے ہاتھی کو بہا کر لے گئی تھی۔ اور سینکڑوں گاؤں تباہ و برباد ہو گئے تھے۔“
 بوڑھے بلوچ نے بات کاٹ کے کہا۔ ”ہاں میرے پاس چھ مہینے کے بعد اطلاع پہنچی تھی۔ میرا ایک چچیرا بھائی بھی اسی رو
 میں بہ گیا تھا۔“

ماہی گیر نے کہا۔ ”ہاں سینکڑوں آدمی۔ سینکڑوں عورتیں۔ سینکڑوں بچے ڈوب کے مر گئے تھے۔“
 ادھیڑ عمر کی عورت کی آواز میں شکایت آمیز تعجب تھا۔ ”پھر بھی تمہیں دریا سے محبت ہے؟“
 ماہی گیر بولا۔ ”ہاں پھر بھی مجھے دریا سے محبت ہے۔ یہ دریا رزاق بھی ہے اور قہار بھی۔ جب مہربان ہوتا ہے تو ہزاروں
 کو روزی دیتا ہے۔ اور جب قہر میں آتا ہے تو ہزاروں کو فنا کر دیتا ہے۔“
 ”ہاں۔ تو اُن ایام میں میری حالت نسبتاً اچھی تھی۔ اور میرے پاس ایک چھوٹی سی کشتی تھی۔ جس میں بیٹھ کے میں مچھلیاں پکڑ
 کے لئے دوسرے کنارے پر جایا کرتا تھا۔ کوئی چار دن تو طغیانی کی یہ حالت رہی کہ بڑے سے بڑے اگن بوٹ بھی کنارے سے
 ہلنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے کئی آدمیوں کو دیکھا کہ درختوں کے تنوں سے چمٹے ہوئے رہتے چلے جا رہے
 ہیں۔ بیچھتے ہیں۔ منٹیں کرتے ہیں۔ لیکن کوئی انہیں بچا نہیں سکتا۔ ایک بست بڑا چھپر تھا۔ جس پر ایک عورت اور دو بچے

بے چلے جا رہے تھے۔ یہ چھپر کسی لہر کے آگے بہتا ہوا کنائے سے چار گز کے فاصلے تک پہنچ گیا۔ اس وقت کس قدر امیدیں ان تین انسانوں کے دلوں میں پیدا نہ ہوئی ہونگی۔ ہم لوگ کنائے پہ کھڑے ہوئے اس انتظار میں تھے کہ چھپر ذرا اور نزدیک آئے تو انہیں پکڑ لیں۔ لیکن نہیں۔ جس طرح ایک لہر انہیں نجات اور زندگی سے اس قدر قریب لے آئی تھی۔ اسی طرح دوسری لہر انہیں دھکیل کر موت کے منہ میں لے گئی۔ اس چھپر کا ٹخ یکدم بدلا۔ اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ تین انسان پھر منجھڑا کی طرف روانہ ہو گئے اور چند منٹ میں ہماری نظروں سے غائب ہو گئے۔

نو عمر لڑکے نے کہا۔ ”آپ لوگ ذرا آگے کیوں نہ بڑھ گئے، یا اسے ہی پھینک دیتے۔“

لیکن ماہی گیر نے نو عمر لڑکے کو درخورِ غنا نہ سمجھا۔ اور سلسلہ کلام جاری رکھا۔

”پانچویں دن پانی کم ہوا تو سرکاری حکم ملا کہ تمام کشتیوں والے اپنی اپنی کشتیاں لے کے دریا میں چکر لگائیں۔ کوئی مرد یا عورت یا جانور نظر آئے تو اسے بچائیں۔ کوئی لاش ملے تو اس کو بھی پکڑ لیں۔ اور ہسپتال میں پہنچا دیں۔ تاکہ اگر زندگی کا کوئی امکان ہو تو ڈاکٹر کو شش کریں۔ ورنہ لواحقین لاش کو پہچان کر لے جائیں۔“

”میری کشتی میں میرے ساتھ تین سپاہی تھے۔ ہم نے کئی لاشیں پکڑیں۔ لکڑی کے کئی صندوق پکڑے۔ تین چار کمینوں کو بچایا لیکن آدمیوں کو بچانے کا وقت اب گزر چکا تھا۔“

”عصر کے قریب میں نے دیکھا کہ دور کوئی آدمی بہتا چلا آرہا ہے۔ ایک سپاہی نے کہا۔ ”یہ بھی کوئی لاش معلوم ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”نہیں۔ لاش کا سر عام طور پر پیچھے ہوتا ہے اور پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ زندہ آدمی کا سر پانی سے باہر ہوتا ہے اور پاؤں پیچھے ہوتے ہیں۔ بہر حال ہم نے اس کی جانب رخ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد اُسے پانی میں سے نکال لیا لیکن اُسے دیکھ کے مجھے سخت تعجب ہوا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور تمام جسم لکڑی کے تختے کی طرح سخت تھا۔ اور پیٹ میں معلوم ہوتا تھا کہ پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں۔“

”خیر ہم نے اس لاش کو ہسپتال میں بھیج دیا۔ ہسپتال کنائے سے کچھ دور خیموں میں تھا۔ ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ یہ لاش بہت پرانی ہے۔ غالباً سو سال پرانی ہے۔ اور دریا اسے کسی قبرستان میں سے ہما کے لے آیا ہے۔ ہمیں حکم ملا کہ کوئی وزن باندھ کے اس کو دریا کے درمیان غرق کر دیں۔ چنانچہ ہم اس لاش کو منجھڑا میں لے گئے اور اس کے ساتھ ایک وزنی پتھر باندھ کے اُسے دریا میں ڈبو دیا۔“

”لیکن ابھی ہم اس جگہ سے پچاس گز ہی دور گئے ہو گئے کہ خدا جانے کیوں میں نے پھر مڑ کر اُدھر دیکھا۔ میں نے تعجب اور گھبراہٹ اسے ہاتھ اٹھا کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”وہ دیکھو“ — لاش بدستور پانی پر تیر رہی تھی!

”ہم کشتی واپس لے گئے۔ لاش کو اٹھایا۔ اس کے ساتھ کوئی وزن نہ تھا۔ اور تعجب پر تعجب اس بات پر ہوا کہ یہ لاش بغیر کسی ظاہر روک کے دریا کے درمیان ایک ہی جگہ پر تیر رہی تھی۔ حالانکہ اُسے قاعدے کے مطابق دریا کی رو کے ساتھ بہ جانا چاہئے تھا۔ خیر۔ ہم نے پھر اس کے ساتھ وزن باندھا اور دریا میں غرق کر دیا۔“

”لیکن چند لمحوں کے بعد وہ لاش پھر پانی کی سطح پر آ گئی!! سچ یہ ہے کہ اس کے بعد ہم ڈر گئے۔ میں چاہتا تھا کہ

ہم پھر جائیں۔ لیکن میرے ساتھیوں نے ہمت نہ کی اور ہم کوئی پچاس گز کے فاصلے سے اس لاش کو پانی کے اوپر دیکھتے رہے۔

”آہستہ آہستہ سورج غروب ہو رہا تھا۔ افق اور دریا کا پانی سرخ ہو چکا تھا۔
”سورج بالکل غروب ہو گیا۔“

”اب ہم نے دیکھا کہ ایک اور لاش بہتی چلی آ رہی ہے۔ اس لاش کا بھی سر آگے تھا اور لمبے لمبے بالوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ لاش کسی عورت کی ہے۔ یہ دوسری لاش اسی روپہ آ رہی تھی جس پہ پہلی لاش تھی۔ جب ان دونوں میں کوئی بیس گز کا فاصلہ رہ گیا تو ہم نے دیکھا کہ پہلی لاش روکے خلاف کچھ آگے کی طرف بڑھی جیسے کوئی استقبال کے لئے بڑھتا ہے۔ ہمارے دیکھنے ہی دیکھتے دونوں لاشیں پہلو بہ پہلو ہو گئیں۔ اس طرح پر کہ شانے سے شانہ مل گیا۔ یوں ملنے کے بعد دونوں لاشوں نے ایک چھوٹے سے محیط میں چکر لگایا اور پھر دونوں غوطہ لگا کے نگاہ سے غائب ہو گئیں۔“

ادھیڑ عمر کی عورت نے کہا: ”محبت موت پر بھی فتح پالیتی ہے۔“

سپیرے نے کہا: ”جن کی تقدیر میں وصال ہو وہ جدا نہیں ہو سکتے۔“

سفید ریش بلوچ نے کہا: ”کاش۔۔۔۔۔۔“ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن کتنے کتنے رک گیا۔

نوعمر لڑکے نے پوچھا: ”پھر کیا ہوا؟“

ماہی گیر نے جواب دیا: ”کچھ بھی نہیں۔“

اس کے بعد دیر تک خاموشی رہی۔ آخر نوعمر لڑکے نے میری طرف دیکھ کر کہا: ”اب آپ کی باری ہے۔“

میں نے چونک کے۔ جیسے کوئی خواب سے بیدار ہوتا ہے۔ کہا: ”اچھا؟“

لیکن ابھی میں آپ بیتی سننے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ کشتی نے کسی چیز سے ٹھوکر کھائی۔

کنارہ آچکا تھا۔

مجید ملک

ہر چند گداہوں میں ترے عشق میں لیکن
ان بواہوسوں میں کوئی مجھ سا بھی عنی ہے
ہر اشک مرا ہے در شہوار سے بہتر
ہر نخت جگر رشکِ عمتیقِ مینی ہے

تمیز

راشد فطرت اور انسان

فطرت :-

”شام ہونے کو ہے اور تاریکیاں چھانے کو ہیں
’امرے ننھے‘ مری جاں‘ لے مرے شہکار آ!
تجھ پر صدقے خلد کے نعمات اور انوار آ!
’امرے ننھے‘ کہ پریاں رات کی آنے کو ہیں
ساری دنیا پر فسوں اپنا وہ پھیلا نے کو ہیں!
تیری خاطر لا رہی ہیں لوریوں کے ہار‘ آ!
تو نہ ہوگا کب تک اس کھیل سے بیزار‘ آ!
اب کھلونے‘ بھی ترے نیندوں میں کھو جانے کو ہیں!

”کھیل“ میں کانٹوں سے ہے دامن صد پارا ترا
کاش‘ تو جانے کہ سامانِ طرب ارزاں نہیں؛
کون سی شے ہے جو وجہِ کاہشِ انساں نہیں؛
آہ! کیوں رہتا ہے دل شیدائے نظارہ ترا!



آکھ رہی راحت بھری آغوش و اتیرے لئے
آکھ میری رُوح بے غم آشنا تیرے لئے!

انسان:

”جانتا ہوں، مادرِ فطرت، بہت آوارہ ہوں،
طفلِ آوارہ ہوں لیکن سرکش و ناداں نہیں،
میری اس ”آوارگی“ میں ”وحشتِ حسیاں“ نہیں،
شوخی ہوں لیکن بہت معصوم اور بیچارہ ہوں۔
تجھ کو کیا غم ہے اگر وارفتہ، نطفہ آ رہا ہوں؟
شکر ہے، زندگی، اہرِ یمن و بیزواں نہیں،
ان سے بڑھ کر کچھ بھی وجہِ کاہشِ انساں نہیں،
میں مگر ان کے افق سے دور اک سیارہ ہوں!

شام ہونے کو ہے اور تاریکیاں چھانے کو ہیں،
تو بلاتی ہے مجھے راحت بھری آغوش میں،
کھیل لوں تھوڑا سا، آتا ہوں، ابھی آتا ہوں میں!
اب تو دن کی آخری کرنیں بھی سو جانے کو ہیں
اور کھو جانے کو ہیں وہ بھی کنارِ دوش میں!
بر چلی بے روح نیندوں میں مری آتا ہوں میں!

ن۔م۔راشد

”ماتر لنک“

آخری وصیت

”اگر وہ لوٹ آئیں۔ تو میں ان سے کیا کہوں؟“

”— یہی کہ میں ان کا عمر بھر انتظار کرتی رہی“

اور جو انہوں نے کچھ اور پوچھا۔ مجھے نہ پہچانا؟

— بہنوں کی طرح نرمی سے بولنا۔ شاید دیکھیا ہوں +

اور جو انہوں نے تمہارا نام لیکر پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟

— تو انہیں یہ میرا چھلا دے دینا۔ خاموشی سے +

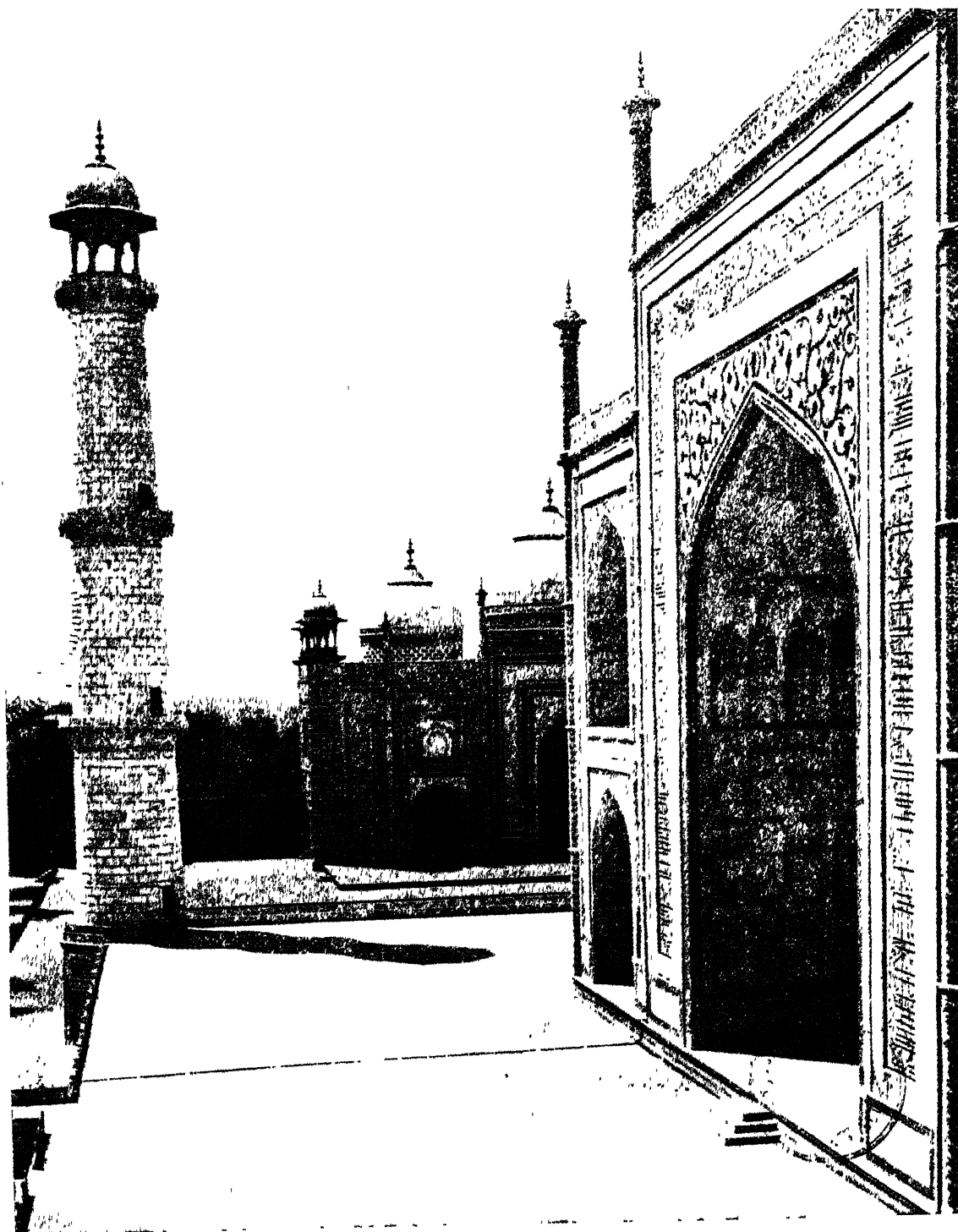
اور جو انہوں نے پوچھا کہ یہ ایوان سنسان کیوں ہے؟

— تو انہیں یہ جل جل کر بجھی ہوئی شمع دکھا دینا اور یہ کھلا دروازہ +

اور جو انہوں نے پوچھا کہ تمہاری سہیلی کو نیند کیسے آئی؟

— کتنا کہ مسکرا کر جان دے دی۔ دیکھنا۔ وہ دردمند نہ ہوں

آنسو نہ بہائیں!



محمد عبداللہ چغتائی

معمارِ تاج

روضہ ممتاز محل اگرہ کی تعمیر کے متعلق انیسویں صدی عیسوی کا ایک مخطوط "خلاصہ احوال بانو بیگم" کے عنوان سے لکھا ہے جو آج قریب قریب ہر کتابخانے میں موجود ہے اس میں ایک طویل فہرست ان کاریگروں کی دی گئی ہے جنہوں نے تاج محل پر کام کیا تھا اور اس سامان کا بھی تفصیلی ذکر ہے جو روضہ تاج پر استعمال ہوا۔ معماروں کی فہرست میں سب سے مقدم نام استاد عیسیٰ کا ہے جس کو ایک ہزار روپیہ مشاہرہ ملتا تھا مغربی مصنفین کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک یورپین تھا۔ اور اس کا اصل نام (AUGUSTIN DE BOURDEAUX) تھا چونکہ وہ مذہباً عیسائی تھا اس لئے مشرقیوں نے اس کا نام عیسیٰ رکھ دیا۔ بات یہ ہے کہ ہم عصر کتب تاریخ اصل معمارِ تاج کے نام کے متعلق خاموش ہیں اس لئے ہر شخص کو قیاس آرائیوں کی جرات ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ تلخ گنج کی کوئی قدیم معاصر تاریخ نہیں ملتی۔ اس زمانے کی تاریخوں میں تاج کا ذکر ضمنی طور پر ملتا ہے جس سے اس کے معماروں کے اسرار و حالات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ اس سلسلے میں نہایت تلاش و جستجو کے بعد جو چیز ملتی ہے وہ پیرس کے کتابخانہ ملی کا نسخہ ۱۶۹۵ء ہے۔ لیکن یہ تالیف بھی ہمارے مقصد تلاش پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتی کیونکہ اس نسخے میں صرف روضہ تاج کی پائینوں کا ذکر درج ہے۔ اس کے ابتدائی حصے کے ردو گراف بھی میں حاصل کر چکا ہوں۔ یہ نسخہ ماہ ربیع الاول ۱۱۸۸ھ کا لکھا ہوا ہے۔ کتاب کے ابتدائی الفاظ ہیں :-

"حقیقت چہرہ عمارت روضہ مقدسہ مگر حضرت ممتاز الزمانی نواب تاج محل مہد علیا ارجند مانو بیگم شرع تیاری عمارت در شہنشاہ و در شاہانہ تمام یافت"

میرے نزدیک یہ نسخہ تاج کے متعلق ہمہ نسخوں میں قدیم ترین اور صحیح بھی ہے باقی تالیفات بالکل بے کی چیزیں ہیں اور موضوعات میں شمار ہونے کے قابل ہیں وہ کسی معاصرانہ مستند ماخذ پر مبنی نہیں ۛ

احمد

شہنشاہ میں تاج بہمان آباد کی عمارت کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ہم عصر مورخین اس کی عمارت کے ذکر میں احمد و حامد و شماروں کے نام کا اپنی مصنفات میں ذکر کرتے ہیں جن کی زیر نگرانی عمارت دہلی تعمیر ہوئی جیسا کہ عمارتِ ذیل سے عیاں ہے :-

۱۔ آغاز تعمیر شہنشاہ نو ہم عصر کتب تاریخ میں درج ہے مگر تاریخ اختتام شہنشاہ اور کتب میں نہیں ہے تاریخ اختتام روضہ کے اندرونی دروازہ بر بڑی محراب کے کتبائے آیات قرآنی کے اخیر میں درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف نسخہ ہڈانے سنی سنائی باتیں نہیں کیں بلکہ کچھ لکھا ہے خود دیکھ کے اور سیاحت کر کے لکھا ہے ۛ ۲۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ نسخہ عمل مصالح مطبوعہ بنگال ایشیائیک سوسائٹی میں تاریخ شہنشاہ لکھی ہے جو سر اسر غلط ہے ابک اور غلطی یہ ہے کہ اس نسخے میں محض "احمد معمار" بجائے "احمد و حامد" چھپا ہے۔ میں نے اس شخص میں دہلی سے ایک خط سرکاری بنگال ایشیائیک سوسائٹی کو تحریر کیا تھا کہ طباعت آئندہ میں یا ایک غلط نامہ کی صورت میں یہ تصحیح کر لجائے، اسی طرح ایک غلطی مائرجی میں بھی ہے مثلاً استاد مری کی جگہ بڑی

۱۔ عمل صالح ہے۔ بعد از پنج ساعت از شب جمعه بیت پنجم ذی حج

مطابق نهم اردی بہشت سال و دوازدهم از جلوس اقدس موافق
ششصد و در زمان محمود و ادان مسعود استاد احمد و حامد سرآمد معماران
نادرہ کارسرای عمرت حال صوبہ دار آنجا و صاحب اہتمام اس
کار مطابق طرحی نادرہ و نقشہ بدیع کہ بیوجہ نظر آں درستی جہت
دنیا بنظر نگاریاں درنہامدہ بود

۲۔ بادشاہ نامہ محمد و ارث ہے۔ حکم اشرف بعد از

پنج ساعت از شب جمعه بیت و پنجم ذی الحج مطابق نهم اردی
سہشت سال و دوازدهم از جلوس اقدس موافق سنہ ہزار و پچہل
و ہشت ہجری کہ مختار دالستوران انجم و افلاک بود استاد احمد
و استاد حامد کہ معماران ماہر بودند و کار عمارت سرآمد سرکاری
عمرت خان برادرزادہ عبداللہ خاں بہادر فیروز جنگ کہ نظم
صوبہ دہلی و اہتمام تاسیس عمارات مذکور با و مفوض فرمود
مطابق طرحی کہ در پیشکادہ خلافت مقرر گشتہ بود رنگ و ریختند
اسی طرح ان دونوں معماروں کے متعلق میں نے کتبہ ذیل شادی یا ماندو
مالوہ میں بڑی مسجد کے قریب ہونگ شاہ کے مقبرہ میں دروازہ کے پہلو
پر کچھ خفی تانبے کی لوح پر دیکھا :

”بتاریخ نهم ربيع الثانی سنہ ہزار و ہفتاد ہجری خیر خیر لطف اللہ

مهندس ابن استاد احمد معمار شاہجہانی درخواجہ جادو رائے و استاد شہوراء

و استاد حامد بجمت زیارت آمدہ بود دو کلمہ یادگار نوشت

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے اپنے مقالہ میں جو انہوں نے
دارۃ معارف اسلامیہ لاہور کے جلسہ میں بعنوان ”لاہور کا ایک مهندس
خاندان“ پڑھا تھا۔ سچوالہ سید مرتضیٰ صاحب مہیڈ کلرک کمانڈر انچیف دہلی
بیان فرمایا تھا کہ استاد احمد و حامد دونوں بھائی تھے اور یہ کہ دہلی میں
اب تک ایک کوچ ”کوچ استاد حامد“ کے نام سے درمیر اور جامع
۱۵۔ از نسخہ برث میوزیم Add ۲۶۲۳۷ عتاد از نسخہ بولین CAPS ORB3
۱۶۔ دونوں نسخوں میں غیرت خاں پڑھا جاتا ہے۔

مسجد کے درمیان موجود ہے ان کی اولاد وہیں سکونت پذیر ہے۔ لاہور
والے کہلاتے ہیں اور آج کل سادہ کاری کا کام کرتے ہیں ”مکھن“ ہے یہ
درست ہو۔ لیکن نہ ان کتب تاریخ سے جن میں ان دونوں کا ذکر ہے
نہ کتبہ متذکرہ بالا سے جس میں دونوں کا نام ہے اور نہ لطف اللہ کی
مثنوی سے جس میں اس نے اپنے خاندان کے افراد کا ذکر کیا ہے یا
واضح ہوتا ہے کہ احمد و حامد بھائی تھے اس لئے اس بات کو تسلیم کرنے
میں کچھ تامل ہوتا ہے ۔

اگر فنی اعتبار سے دیکھیں تو اسی کتبہ ماندو سے بہت سے امور پر
روشنی پڑتی ہے۔ اول یہ کہ استادان فن دیگر ملکی عمارات و آثار کو دیکھنے
کی غرض سے سفر کیا کرتے تھے۔ دوم کتبہ کے الفاظ سے یہ معلوم
ہوتا ہے کہ کاتب لطف اللہ مهندس خود ہے سوم یہ کہ احمد معمار
کے ساتھ لفظ شاہجہانی ایزاد کیا جاتا تھا۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے
کہ اس کو شرف ملازمت شاہی حاصل تھا۔ ماندو میں یہ امر فن تعمیر کے اعتبار
سے ضرور قابل ذکر ہے کہ ماندو میں مغل عمارت کوئی نہیں ہیں صرف
ایک دروازہ عالمگیر کے نام پر ہے جو مغل طرز پر ہے۔ اور نگ زیب
اپنی دوراندیشی سے قدیم یادگاروں کو شکست و ریخت سے بچانے کی
کوشش کیا کرتا تھا۔ ماندو میں اس نے فصیل کو بچھرا کر قائم کیا اور دروازہ
عالمگیر پر کتبہ ذیل ملتا ہے :-

در زمان شاہ عالمگیر خاقان جہاں از سر نو گشت برپا دیں گردون نشان
در ہزار مقتاد و نہ آغاز و ہم انجام یافت ز اہتمام خان عالیشان محمد بیگ خان
در جلوس میں شہنشاہ جہاں اور نگ زیب بود سال یازدہ از روی تحریر بیان
میر انخال ہے کہ متذکرہ معماران جن کے اسماء گرامی کتبہ میں ثبت ہیں۔
اور نگ زیب کے عہد میں شکست و ریخت ماندو کو ٹھیک کرنے کے لئے
آئے تھے اور انہوں نے دروازہ عالمگیر کو بھی تعمیر کیا جو کسی طرح بھی فتح پور
سیکری کے دروازے سے بلندی یا خوبصورتی میں کم نہیں ۔

سید سلیمان ندوی کے پیش کردہ دیوان لطف اللہ مهندس کی
مختصر کیفیت ذیل کے اشعار سے واضح ہے۔ دیوان کی ابتدا انعتیہ

قصیدہ سے جوتی ہے جس کے آخرین صاحب دیوان اپنا اور اپنے
باپ کا نام اور اپنے مشاغل درس تدریس کا ذکر کرتا ہے۔
باش لطف اللہ احمد چہ کنی فخر بعلم جمل ازیں علم تو بہتر کہ نیا بعلم
داراشکوہ کی مدح کرتا ہے جس میں اپنا ذکر کرتا ہے اور ایک جگہ لفظ
ہندس سے لطیف استدلال کرتا ہے۔
درفق من گمان خطامی بری خطامت ہرگز شنیدہ کہ ہندس خطا کنند
اس دیوان میں داراشکوہ کے ایک محل کا ذکر ہے جسے لطف اللہ
نے بنوایا اور اس کی تاریخ نکالی ہے۔

چوں بنا کردہ قصر جاہ و جلال ظل حق بادشاہ عالی ملک
بیشد این عمارت والا تافت چوں سپر برحوالی ملک
گفت معمار قصر تارنجش قصر داراشکوہ والی ملک
۱۰۶۰ھ

بلکہ داراشکوہ کے بیٹے سلیمان شکوہ کی کتخدانی کی تاریخ بھی لکھی ہے۔
گفت جبریل این تاریخش بسلیماں شدہ بلقیس تسریں
۱۰۶۴ھ

ذیل کی شہنوی میں لطف اللہ ہندس اپنے خاندان کا ذکر بھی کرتا
ہے اور اپنے باپ احمد کو باضافہ لفظ شاہجہانی یوں یاد کرتا ہے:-
”نادر العصر استاد احمد معمار لاہوری شاہجہانی“

اس کے بعد اپنے والد کے متعلق کہتا ہے کہ وہ ریاضیات فلکی کی سب
سے بڑی کتاب محبیطی کا ماہر تھا۔ اور خواجہ نصیر الدین طوسی کی مشہور کتاب
”تحریر القیاس“ کا عالم تھا۔ اس کے تین بیٹے عطاء اللہ، لطف اللہ
ہندس اور نور اللہ تھے۔ تینوں صاحب فن تھے۔

شاہ جہاں داوری گیتی ستاں روشنی دودہ صاحب قراں
عرش بریں قبة نرگاہ اوست رشک فلک سدہ درگاہ اوست
احمد معمار کہ در فن خویش صد قدم از اہل ہنر بود بیش
واقف تحریر و مقالات آن آگہ اشکال و حوالات آن
حالی کو اکب شدہ معلوم او سر محبیطی شدہ مفہوم او

از طرف داوری گیتی جناب از طرف عمارت گراں بادشاہ
بو عمارت گراں بادشاہ اگرچہ شہر مضرب ریات شاہ
کرد حکم شہر کشور کشا کرد حکم شہر انجسم سپاہ
باز حکم شہر انجسم سپاہ قلعہ دہلی کہ نادر و نظیر
ایں و عمارت کہ بیان کردہ ایم یک ہنر از گنج ہنر ہائے اوست
چوں نو بد عالم فانی معسر پس سپہر مانند زمرد سترگ
نادر عصر خود مشہور شہر مرد ہنر ورود استاد و فن
محزن علم آمدہ تالسم او نشروی از آب روان پاک تر
منکہ سخن پرورد دانش درم منکہ ربودم زجاں گوی علم
منکہ شدہ آگہ سربنان ثانی آن ہر سہ برادر ہنرم
گرچہ ہندس لقمہ از شہ است ثالث آن ہر سہ برادر ہنر
ماہمہ و معمار عمارت گریم ایک بود قیصر کلامش حجب
گرچہ کما است سال فی زساں کن نشروی از نظم گہر بار تر
دیدہ ز نور سخفش پر فیضا گنج ہنر آمدہ در مشت او
گرچہ ہنرم بے سخن استاد و فن

نادر عصر آمدہ اور خطاب داشت دران حضرت فرخندہ را
بسکہ برود و غنایات شاہ روضہ ممتاز محفل را بسا
شاہ جہاں داوری گیتی سیناہ کردینا احمد روشن جنبہ
در صفحہ خامہ روان کردہ ایم یک گہر از کان گہر ہائے اوست
کرد سوی عالم باقی معسر زان سہ عطا اللہ رشیدی بزرگ
عالم و علامہ و دانائے دہر فاضل و دانشور و جسد زمین
گنج ہنر ہاست تصانیف او نظم خوش غیرت سلک گوہر
بندہ آن جبر سخن پرورم از چمنش یافتہ ام بوی علم
از دم او یافتہ ام قوت جان ہندسہ یک فن بود از صد فہم
نام من دل شدہ لطف اللہ است آمدہ نور اللہ صاحب کمال
ماہمہ استاد و سخن پروریم زان شدہ معمار مراد القب
بیش بود حالی از حال من نظم ہنر آمدہ ہسموار نر
طبع ز لطف سخفش پر صفا ہفت قلم راندہ سر انگشت او
آن یک دین یک بود استاد و فن

گرچہ مراہست مہندس لقب ہندسہ زان ہر سہ برادر طلبہ

اسی دیوان میں احمد کی وفات کے متعلق دو قطعات دئے ہیں جن کے تاریخی اشعار یہ ہیں

نادورالعصر رفت و گفت حسرت شد بفر دوس احمد معمار

تاریخ وفات احمد و گفت محمود العاقبت شد احمد
ان دونوں سے سید صاحب کے نزدیک تاریخ وفات ۱۰۵۹ھ نکلتی ہے

لطف اللہ مہندس تو واضح طور پر تاج "کو" یک گہرا گہرا ہی احمد کہتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر دیگر مورخین کیوں خاموش ہیں۔ قلعہ شاہجہان آباد کی تعمیر کے ذکر میں معماران احمد و حامد کے اسماء ملتے ہیں۔ مورخین بڑی آسانی سے انہیں دونوں (احمد و حامد) یا محض احمد کے متعلق بیان کر سکتے تھے کیونکہ وہی احمد ہے جس کے زیرِ تاج تاج تعمیر ہوا بلکہ احمد کے متعلق دیگر تاریخی اطلاعات سے جو ذیل میں آتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس نے لاہور نیز حسن ابدال وغیرہ میں عمارات تعمیر کیں لیکن تاج کے ضمن میں کہیں ذکر نہیں ملتا فقط لطف اللہ مہندس نے اپنی مثنوی میں ذکر کیا ہے اور تلخ کو اس کی طرف منسوب کیا ہے یہ ایک محتمل ہے جو سمجھ میں نہیں آتا

محمد شفیع گیلانی نے اپنی کتاب "مرآت و اردات" میں شاہجہان کے عہد کی عمارات دو تہانہ شاہجہان آباد، مسجد دہلی، مقبرہ ممتاز محل، آگرہ، بلخ، شالامار لاہور، خانہ نواب آصف خان لاہور کا ذکر کیا ہے مگر اذکر عمارت کے متعلق ایک طویل بیان دیا گیا ہے جس میں وہ اس تعمیر کو احمد معمار کی طرف بالو مناحت منسوب کرتا ہے

قتنا قدر لفظ تفرقہ را بر جبین خلایق ننوشد و عمارات عالی بنائے

لے یقتبس از مضمون سید صاحب

کہ در زمان آن پادشاہ دین پناہ صورت پذیر تمام گشتہ درسیج عصری و دوری معماران دارالثبت اخبار از نقش بندی تصویر نشان نداده اند خصوصاً اس سچہ عمارات کہ در بلا و تفرقہ بحسن مدبر صاحبقران ثانی تا حال آئینہ دار خلد برین است یہی عمارات دولتی شہر ماری کہ موسوم بقلعہ دارالخلافت شاہجہان آباد است و دوم مسجد جامع کہ مقابل قلعہ مذکور و ہمساہ بیت المعمور است سیم مقبرہ ممتاز محل و خزانہ آب آصف خان کہ سرخیل زوجات آن خسر و شیرین کردار بود بر کنار دریا در سواد اکبر آباد واقع است و چارم باغ شالامار لاہور کہ از بنا نامے دولت و اقبال است و در معنی صورت ہندوستان را گلستان ساخت پنجم خانہ آصف صفا کہ در شہر لاہور آئینہ دار کیا نیست۔ چنانچہ ہم چشتی اس عمارت فر دوس اشارت سیاحان جہاں گرد بر روی زمین نشان نمیدہند لیک سلاطین حال دارالملک ہندوستان سر شہر یاران ہفت اقلیم ازین پنج بنائے عالی نہاد افتخار تمام دارند و در حقیقت خانہ نواب مذکور عمارت نیست کہ معمار باصرہ از تشخیص ادراک آن آئینہ دار حیرانست حکایت کنند کہ قریب مبلغ دو کروڑ روپیہ خرچ اہمائے قہرنا مقرر است براں عمارت خرچ شدہ و وسعت عمارت و تعداد مکان بجدیت دو سلطان والا حشم را با کار خاں کافی است گویند کہ چون آصف خان از چار دیوار زندان جانی بوسعت آباد بیدرو دیوار عالم باقی شرافت سلطان دارا شکوہ کہ بخطاب شاہ بلند اقبال سر بلند روزگار بود آنخانہ جہت اقامت خویش از صاحبقران ثانی درخواست و برای اظہار طراح طبع و شہین مختصر مقابل آن عمارت وسیع متعددہ بنیاد نہاد ہنوز کار از نصف تعمیر نگذشتہ بود کہ جرات اتمام ننمودہ بعجز تہیدستی معروف گشت باوجود ولیعہدی سلطنت ہندوستان و منصب پنج ہزاری دآن دولت بقیاس ہمتش مقصور و مفقود گشت و آن امیر عالیجاہ ازین قبیل عمارات بسیار ساختہ گویند چوں

مصلح و پیشرفت کار با وجود تقید خدمات سابقہ بے تکلف تمام خدمت داروں کی و معاری ایجا مقرر نمودہ تجویز نامہ دادند و فی الواقع بعنوانی کہ شنیدہ شدہ بود کہ از کار دانی سرمایہ و افراد اند بہتر از ان بجگہ آزمودن رسیدہ بہ تجربہ پیوستند و معاونت و معاضدت و مطالبہ بہت فرصت پناہ مذکور در فرصت اندک قبلہ خام دور شہر سرانجام نمودند و کارش تابا سخن لنگرہ رسانیدند چنانچہ در اکثر جا لنگرہ ساختہ شدہ و میشو و قلعہ پختہ تھیںابی ہزارگز و کثری صورت تعمیر گرفتہ و کار عمارت روز بروز جاری است و تا آنکہ تمامی عملہ و فحلہ رضامند است کفایت تمام در سر انجام کار با بطور آردہ اند ہمیں طریق در تقدیم خدمات متعلقہ حسن ابدال از پرداخت باغ و منازلی معلی و بند آب دروازہ کشمیری و سربراہی گلہ جاناہ و تعمیر سرائی عمدہ خود با بطرز کردہ و جب پسندیدہ ساعی و سرگرم اند و وضع سنجیدہ سربراہ ساختہ و مساز و از فیض بخشاے نواب امید گاہ امیدوار مجرای ہستند و رینولا کار پردازان خدمت سامی ظاہراً خدمات حسن ابدال بدیکر میخوانند تجویز فرمایند چو مصلح دارانی کہ در ایجا خدمت میکنند بطریق کہ گذارش رفتہ از توابع حسن ابدال اند و رجوع بدار و فہ ایجا خواہند کرد و او برای مجری خود بخوابد گذشت کہ مصلح از قرار واقع در ایجا برسد یقین کہ کار ایجا در تعویق خواہد افتاد نیازمند بحسب این معنی کہ از وقوع تغییر خدمات ایجا از محمد مومن و استاد احمد سرشتہ نظم و نسق کہ در ایجا قرار دادہ بودند شاید از ہم افتند لازم دید کہ حقیقت را در گرامی خدمت انہار سازد و مترصد کہ خدمات مذکورہ نظر بر پیشرفت خدمت ایجا بدستور سابق بحکم مومن و استاد احمد بحال و مسلم باشند کہ بحجبت خاطر در ایجاد آن اشتغال نمایند کہ خدمت دولتانہ فیض آستانہ مبارک مرکز کا قلعہ کشمیر گذہ با ہمہ گر لازم ملزوم داشت باقی الامر بیدکم و بالاختیار الیکم ایام عمر و

لہ۔ از مومن (در اصل نسخہ)

دولت و اقبال دائماً متحد و مستدام باد

برٹش موزیم کے نسخہ ریچ شاہجہانی از ملا فدا ابراہیم پنجم متوفی ۱۰۳۹ھ کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا فرید نے بھی کسی استاد احمد قدوقہ المہندسین سے استفادہ کیا تھا قیاس غالب ہے کہ اسی احمد معمار کی طرف اشارہ ہے جس کے لڑکے لطف اللہ مہندس نے خاندانی روایات کو مد نظر رکھ کر اور اپنے فن ہندی کی وجہ سے اپنا تخلص بھی مہندس کیا +

عطار اللہ رشیدی

متذکرہ بالا اشعار قنوی کے مطابق استاد احمد کا سب سے بڑا لڑکا عطار اللہ رشیدی ہے۔ اس کی دو تصانیف الحجر اور خلاصۃ الحساب ملتی ہیں جو برٹش موزیم میں ہیں :-

”الحجیر مصنفہ عطار اللہ رشیدی ابن احمد نادر کہ توفیق الہی در سنہ الرابع وربعین والہ ہجری مطابق ہشتم سال جلوس حضرت صاحبزادہ برادرنگ لطف و جہان بینی کتاب جبر و مقابلہ ہندوسی موسوم بہ پنج گنت تصنیف بھاسکر اچارج مصنف لیل واتی را کہ در علم حساب کتابی ست بھائق را از زبان ہندوی بھاری آدر دم و دیباچہ کتاب را ابوالمظفر شہاب الدین محمد قران ثانی شاہجہان بادشاہ غازی حلیہ آرائش دادم الخ“

اس دیباچہ میں مصنف کا نام عطار اللہ رشیدی لکھا ہے برٹش موزیم کے ایک مجموعہ کتب حساب میں منتخب ”از لطف اللہ ہندی اور متذکرہ بالا عطار اللہ ابن احمد کی کتاب“ خلاصۃ الحساب وغیرہ ہیں لیکن نسخہ ”خلاصۃ الحساب“ میں عطار اللہ کے ساتھ لفظ رشیدی (اس کا تخلص)

لہ۔ برٹش موزیم Add: 16, 869

لہ۔ برٹش موزیم Add 16, 744

ایزا نہیں ہے۔ یہ کتاب حساب نظم میں ہے جسے مصنف نے داراشکوہ کے نام پر منسوب کیا ہے۔ چند اشعار اپنے متعلق بھی کہے ہیں۔ لطف اللہ مہندس کے اشعار اور عطاء اللہ کے اشعار کو پیش نظر رکھ کر اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کا خصوصیت کے ساتھ داراشکوہ سے تعلق تھا۔ شفیق گیلوی کے الفاظ کے مطابق احمد معمر نے خود داراشکوہ کے لئے ایک محل تیار کیا تھا۔ خلاصہ الحساب کا دیباچہ یہ ہے :-

حمد

شکر بیدوا حسد ازلی حمید بجز دولم یزلی
آن خدائے کہ قیمت ہر فرد رقم اندر سطور نامیہ کرد
پادشاہ ممالک جبروت خالق خلق و مالک ملکوت

نعت

بر محمد صلوٰۃ نامحصور باد تا جذرباشد مجذور
ذات او در مدارج ایجاد چوں یکی در مراتب اعداد
فضل کل از جمال او پیدا عقل کل در کمال او شیدا
از خدا بروی و صحابہ وی صلوٰۃ سلام پی در پی

در مدح پادشاہ شہاب الدین شاہجہان

بعد نعت رسول و حمد اللہ نہ سر در جزو عالمی دولت شاہ
سایہ رحمت الہی جان شاہ آفاق گیر شاہجہان
باسط مسند ظفر بزمیں بو المنظر شہانہ ملت دین
نائب مصطفیٰ باستحقاق باد شاہجہان علی الاطلاق
رستم جہان فگندہ او صد چو افراسیاب بندہ او
خامہ اوست رایت منصوبہ کہ نوید شش جہت نشو

صفت شاہزادہ داراشکوہ

لہذا الحمد ایں سبیکہ ماہ شد مجلی بنام داراشاہ
نیر اعظم سپہر کمال بادشاہزادہ بلند اقبال

قطب آفاق سرور عادل شاہ داراشکوہ دیادل
فخر دنیا و دین سپاہ جہان شرف و دوام شاہجہان
تا بود بر فلک سر و خورشید آن پیکر دین سپر بود جاوید
بانی قصر دولت و اقبال در دیار دل رفعت و اجلال
قرت العین دیدہ ہستی علم عالم زبر دستی
پر شکوہش قبائی دریا تنگ کوہ در وزن حلم او پائنگ

اظهار عجز حال مصنف این کتاب

میکند نظم این خلاصہ راز بنہ مقدم بکمال نیاز
خانزادہ غلام حضرت شاہ ذرۂ بینو اعطی اللہ
پورا ستاد احمد معمار کہ ہنر بود مرکز او پر کار
آن وجہ جہاں کہ در ہنر فن بود بر مان قدرت و ذوالمن
آن ہنر پیشہ کنز تہنیشہ زنگ بر روی ز روی اندیشہ
بود ہر جز و از ہنر این راہ گشت معمار کل درین درگاہ
ورنہ ہر خستہ چو من عامی اندرین باغ کہ شوہد نامی
سنگ این آستان گوہر بار جوہر بخت را بود معمار
من کہ از بندگان در گاہم خانہ زادہ کمینہ شاہم
گرچہ نادان و گول بے ہنم منقبت خوان شاہ بحر درم
نشانم سیاہ را ز سپید خاصہ بر لطف بادشاہت مہید
کاندیں در گرہ غریب نواز در رحمت ہمیشہ باشند باز

صفت عدد و شروع کتاب

نظم روشن چو سلاک گوہر ناز شش دانہ دین بیان علم حساب

ان اشعار سے دیگر امور پر بھی روشنی پڑتی ہے، یعنی یہ رسالہ اس وقت لکھا گیا جب بادشاہ شاہجہان زندہ تھا اور داراشکوہ اس وقت اسم با مستفی بلند اقبال تھا عطاء اللہ اپنے باپ احمد معمار کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ شاہجہان کا شمار کل تھا غالباً یہی وجہ ہے کہ کتبہ

مانڈو میں اس کے نام کے ساتھ لفظ شاہجہانی ایزا دیا گیا ہے یعنی تمام عمارتی کام اس کے سپرد تھا اور تاج محل بھی بیشک اس میں شامل ہے۔ لطف اللہ نے صاف اس کی تعمیر کو اپنے باپ کی طرف منسوب کیا ہے۔ عطار اللہ نے اپنے متعلق صراحت سے کہا ہے کہ میرا بھی اسی درگاہ شاہجہانی سے تعلق ہے۔ اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ عطار اللہ رشیدی عالمگیر کے زمانہ میں بھی ملازم سرکار رہا۔ جب دلرس باغیچہ رابعہ دورانی زوجہ اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ تاج محل کی طرح کاروضہ تعمیر کیا جائے لہذا یہ کام عطار اللہ معمار کے سپرد کیا گیا۔ فن کے اعتبار سے یہ عمارت بھی انہی روایات کی متبع ہے۔ چنانچہ میں نے مقبرہ دلرس بانو کو کئی بار دیکھا ہے اور مولینا عبدالحق کے مہمان کی حیثیت سے اس روضہ کے ملحقہ مکان میں چند روز رہنے کا فخر بھی حاصل کیا ہے۔ یہ روضہ بالکل تاج محل اگرہ کی نقل ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ویسا ہی تعمیر ہو اگرچہ وہ بات حاصل نہیں ہوئی تاہم ظاہری صورت میں تاج کا تصور ضرور آتا ہے اس پر خوش قسمتی سے کتبات موجود ہیں جن سے واضح ہے کہ اس کا معمار عطار اللہ تھا۔ جو مقبرہ کے دروازہ پر پتیل کے ٹکڑے پر ہیں۔

۱۔ این دروازہ باہتمام رخصت پناہ اہوائسم بیگ داروضہ طیارشد
۲۔ این روضہ منورہ درمعماری عطار اللہ بعل مہیبت لے طیارشد
۱۰۷۲ھ

لطف اللہ مهندس

لطف اللہ مهندس بیشمار کتب کا مصنف ہے۔ شرح خلاصہ الحنا منتخب الحساب، رسالہ خواص اعداد، تذکرہ آسمان سخن۔ دیوان مهندس اس کے رسالہ ”نخب الحساب“ کا میرا اپنا ذاتی نسخہ میرے سامنے ہے۔ اس کی ابتدا ہے :-

الحمد لله رب العالمین ... اما بعد می گوید فقیر لطف اللہ مهندس ابن استاد احمد معمار لاہوری غفر اللہ لہ ووالدیہ و احسن الیہما والیہ کہ کتاب حساب را تصنیف است او محقق و تحریر مدق شیخ بہار الدین محمد بن حسن عالمی است رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ شتمست بر قواعد شریفہ و فوائد لطیفہ باشارت خلاصہ دو دمان سیادت منتخب خاندان وزارت میر محمد سعید ابن میر محمد یحییٰ ادا م اللہ اقبالہ و ضاعف اجلالہ ترجمہ کردم چون آن نسخہ خلاصہ نام داشت این نسخہ را منتخب تمام نام تمام تالیف این رسالہ است^۱

لطف اللہ مهندس کی دوسری تصنیف ”رسالہ خواص اعداد“ چار مقالوں میں ہے اور یہ اس نے ابن سینا کے تتبع میں حساب پر لکھا ہے :-

الحمد لله ... اما بعد می گوید فقیر لطف اللہ مهندس متخلص بمهندس ابن استاد احمد معمار لاہوری کہ این رسالہ ایست کہ علم ارشامی (ARITHMETIC) خواص اعداد بدان اسدک اللہ تصنیف پیش از یک باز کند زوج النفع شیخ رئیس

لطف اللہ مهندس جس کا شاعر ہونا بخلص مهندس اس کے اپنے دیوان سے ثابت ہو چکا ہے اس نے تذکرہ دولت شاہ کا اختصار آسمان سخن کے عنوان سے نظم کیا جسے سپرنگر نے تہرہ مخطوطات اودھ میں ۱۲۲۰ پر بیان کیا ہے۔ وہ کتنا ہے کہ لطف اللہ مهندس ابن احمد نے اس کا نظم میں اختصار کیا اس کے مقدمہ سے جو بارہ اشعار پر مشتمل ہے، فاضل کرمانی نے تذکرہ دولت شاہ کو فارسی نظم میں اکبر کے زمانہ میں لکھا تھا اور سات طبقہ کے بجائے دس میں کیا تھا مگر لطف اللہ مهندس نے جو اورنگ زیب کا جمع

۱۔ انقلاب روزانہ ۲۰ اپریل ۱۹۳۲ء رپورٹ ادارہ معارف اسلامیہ لاہور سہ برسش موزیم ۶۷۴ و ۶۷۵ A d d 1

۲۔ برلن لائبریری مخطوطات مشرقیہ ۵۸۲۷ Paterson میں ایک مخطوطہ تذکرہ کے متعلق ہے جو لطف اللہ ابن احمد ابن یوسف ابن حسین ابن عبد اللطیف ۴ رمضان ۱۰۹۹ھ بیان کیا گیا ہے۔

امام الدین الریاضی

اس خاندان کے دیگر افراد بھی مہندس و شاعر تھے۔ تذکرہ ہمیشہ بہار "مصنف کشت چند میں مولینا امام الدین کا ذکر ملتا ہے جس کے متعلق سپرنگر نے اپنی فہرست مخطوطات اودھ ص ۱۲۱ میں لکھا ہے کہ اسے امام الریاضی کہا جاتا تھا اور یہ باشندہ لاہور تھا۔ لیکن سکونت دہلی میں تھی۔ اس کا والد لطف اللہ مہندس بہت بڑا ریاضی دان تھا اور اس کی کتابیں مدارس میں رائج تھیں ۱۱۳۶ھ میں زندہ تھا۔ اس کے ایک شاگرد نے المجسطی کی شرح کی ہے۔ تذکرہ "صح کلش" میں ریاضی کا ذکر ذیل کے الفاظ میں مع چند اشعار کے ملتا ہے:-

"ریاضی۔ امام الدین خرزند مولانا لطف اللہ مہندس لاہوری کہ قلعہ ارک شاہجہان آباد بصوابید رازی زرنیش بنیاد گرفتہ ریاضی متوطن شاہجہان آباد گردید از ازاں شہرت مدت العمر بیرون نرفتہ ماہر علوم درسیہ بودہ و در سبق علم ریاضی از معاصرین قصب السبق بودہ در عبادت و ریاضت و برع و در حدیث خود نداشت و در سنہ خمس و اربعین و ائۃ و الف قدم بطریق سیر ریاضی رضوان گذاشت ۵

ازیں اندیشہ کھاد افغ شد بر سببہ قالی را
شہر ہنگ مجلس تصویر جان نہا
سیاب و ارگشتہ شدن اعتبار ما
نعم بہر خطش از احاطہ بیرون است
ندام از چہ شدی سنگدل کہ بیار است
بجاس رسید و نہ پرسی کہ حال اچون است
مصنف "ہمیشہ بہار" کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ مولینا امام الدین اس کا ہم عصر تھا۔ اور یہ کہ اس کا انتقال ۱۱۵۵ھ میں ہوا ۶

میرزا خیر اللہ

خیر اللہ بن لطف اللہ نے جس کا پورا نام ابو الخیر المحاطب بہ

تھا۔ اس نظم کو شکل ثانی دی اس نے دو برج زائد کئے تاکہ تعداد دائرۃ البروج کے نشانات کے ساتھ مناسبت پیدا کر لے اور اس وجہ سے اس کا نام آسمان سخن رکھا۔ قریباً دو سو پچاس اشعار میں ہے اور ہر ایک میں شاعر کا نام ہے ۷

شکر خدائی کہ آسمان سخن بیا فرید محیط نہ آسمان کمن
اس طرح لطف اللہ مہندس کا تذکرہ بالا دیوان بھی اس کی تصانیف ہی سے ہے۔ لیکن اس کا سب سے بڑا کام ترجمہ ہے "مصور صوفی" مصنف عبد الرحمن الصوفی المتوفی ۷۶۳ھ کی کتاب کا جو ستاروں کے اشکال و صورت پر ہے اس کتاب کے بہت سے قدیم مصور نسخے کتب خانہ ملی پیرس میں موجود ہیں۔ اور ان سے قدیم مصوری پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ لطف اللہ مہندس نے سنہ ۱۱۵۵ھ میں اپنے باپ احمد کے کہنے پر اس کا ترجمہ فارسی میں کیا اس کا ایک نسخہ مسلم یونیورسٹی میں لطف اللہ مہندس کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے ۸

نور اللہ

شنوی مہندس سے احمد کے تیسرے لڑکے نور اللہ کا پتہ چلتا ہے۔ عام طور پر اس کا کوئی کام یا کارنامہ بیان نہیں کیا جاتا۔ افسوس ہے کہ ہم اپنی یادگاروں کو کبھی غور سے نہیں دیکھتے جن لوگوں نے دہلی کی جامع مسجد کو غور دیکھا ہے اور اس کے گیارہ دروں کے کتبات کو پڑھا ہے۔ ان کو معلوم ہے کہ ان کا کاتب ہی نور اللہ ابن احمد تھا جس نے اپنے نام کو لطف اللہ احمد کے تبارح میں "نور اللہ احمد" لکھا ہے اس سے صاف واضح ہے کہ یہ شخص برہمہ موقع تعمیر مسجد ہذا اپنے بزرگوں کے ہمراہ تھا اور کتباً لکھنے میں ماہر تھا ۹

۱۔ دیوان لطف اللہ کا خانہ: ۶، شہر ذی الحجہ ۱۱۵۵ھ بمطابق ۱۷۴۲ء۔
۲۔ تاریخ خدیاری۔ بتاریخ سبتر رمضان المبارک ۱۱۵۵ھ دیوان مہندس خیز شد
۳۔ برکار و اب ابراہیم خان بہادر "کتاب میں آخری قطعہ تاریخی سنہ ۱۱۵۵ھ کا ہے۔
۴۔ کتب فہرست مسلم یونیورسٹی و مضمون سید صاحب۔

بعض تذکرہ نویسوں نے اس کا نام میرزا خیر اللہ بھی لکھا ہے۔
اس سے صاف واضح ہے کہ جے سنگھ دالی جے پور کا "جشن تر"
اسی خیر اللہ کی اختراع کا نتیجہ ہے ۛ

محمد علیؒ

محمد علی ریاضی بن خیر اللہ ہندس جس نے اپنے باپ کی کتاب
"تقریب التقریر" کو صاف کر کے اس پر دیباچہ لکھا ہے۔
خاندان احمد معمار ابھی دوز تک پہنچا ہے ۛ

ۛ۔ مضمون سید سلیمان صاحب ۛ

محمد عبداللہ چغتائی

خیر اللہ خاں ہندس ہے۔ محمد شاہ اول کے زمانہ میں اپنا نام پیش
کیا۔ یہ بہت بڑا ریاضی دان اور مخترع تھا۔ اس کا ذکر تذکرہ "سفینہ
خوش گو" مولفہ بندر ابن خوشگو متوفی ۱۱۱۷ھ نسخہ بانکی پور میں
امام الدین الریاضی کے حال میں ملتا ہے :-

"وامر ملا ابوالخیر معروف بخیر اللہ برادر اعیانی وی در
بیت و ہندسہ و اکثر علوم بیکانہ روزگار است چنانچہ راج
و ہیراج جے سنگھ سوائی زمیندار انیر کہ دیں ایام خیال
صد بستن در پیش داشتہ قریب بیست لک روپیہ در
بست سال صرف این کار نمودہ باستصواب ابوالخیر
مذکور است۔ و حق آنست کہ ذات او بر زمانہ ثبت
است"

نگار خانہ پچین

آئینے والی حسینہ

چاندنی میں وہ آئینے کے سامنے بے حرکت کھڑی ہے۔ عریاں ہے۔ مگر اس کے سر کے لمبے لمبے اور
گھنے بالوں نے اس کے تمام جسم کو چھپا رکھا ہے ۛ

لو اس نے انگڑائی لی۔ اور ایک پھولوں سے لدے پھندے پیڑ کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اور اس پیڑ سے
پھول جھڑنے لگے

مجید ملک آغاز

مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں مگر اے حسینہ نازیں
تو ہو مجھ سے دور اگر کبھی
مجھے ڈھونڈتی ہو نظر کبھی
تو جگر میں اٹھتا ہے درد سا
مرا رنگ رہتا ہے زرد سا
مگر اے حسینہ نازیں مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں

۲
مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں مگر اے حسینہ نازیں
تو اگر ہو جمع عمام میں
کسی کھیل میں کسی کام میں
تو میں چھپ کے دور ہی دور سے
تجھے دیکھتا ہوں غمور سے
مگر اے حسینہ نازیں مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں

۳
مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں مگر اے حسینہ نازیں
تو کہے یہ مجھ سے اگر کبھی
ہمیں لا دو لعل و گہر کبھی
تو میں دور دور کی سوچ لوں
میں فلک کے تارے بھی ٹوچ لوں
یہ ثبوت شوق کمال دوں
تیرے پاؤں پر انہیں ڈال دوں
مگر اے حسینہ نازیں مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں

جلیل لکھنوی زمرہ پردازِ بال

اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا
مغیجے ہیں متحیر، متبسم ساقی
زندگی چھوڑ دیے پیچھا مرا میں باز آیا
دل ہو یا روح و جگر کان کھڑے کس کے ہوئے
پینے والے بجھے پینے کا نہ انداز آیا
دل جو گھبرائے قفس میں تو ذرا پر کھولوں
عشق آیا کہ کوئی مفدہ پرداز آیا
زندہ پھیلانے ہیں چلو کو تکلف کیسا
زور اتنا بھی نہ لے حسرت پرواز آیا
نہ گیا پر نہ گیا شمع کا رونا کسی حال
ساقیا ڈھال بھی دے جام خدا ساز آیا
گو کہ پروانہ مرحوم سادہ ساز آیا
اک خموشی میں گلوتم نے نکالے سب کام
عنزہ آیا نہ کر شمع نہ تمہیں ناز آیا
بے امیر اب چمن نظم ہے ویران جلیل
اب تک ایسا نہ کوئی زمرہ پرداز آیا

فصاحت پلا جنگ جلیل لکھنوی

مجدد ملک پرانے دوست

طاری ہے۔

بچہ پر بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ اور شاید سو جاتا لیکن روش پر دو آدمی
آہے ہیں۔ دو نو فیشنیل۔ مغزی لباس میں۔ ایک کے سر پر بیٹ ہے۔
دوسرے سر سے تنگا ہے۔ جو سر سے تنگا ہے۔ اس کے گلے میں سرخ رنگ کی کٹائی ہے۔
سرخ کٹائی والا بچہ کے پاس آکر یکدم رک جاتا ہے۔ بیٹ والا
آٹھ دس قدم آگے جا کر ٹھہر جاتا ہے۔ یعنی اس انتظار میں ہے کہ اس کا
ساتھی گفتگو کر چکے تو دو نواہنی راہ لیں۔
سرخ کٹائی والا اونگھنے والے کو غور سے دیکھتا ہے گویا پہچاننے کی
کوشش کر رہا ہے :-

”اہا! شاکر“

اونگھنے والا جسے شاکر کے نام سے مخاطب کیا گیا ہے ہوشیار
ہو کے بیٹھ گیا ہے۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہے کہ اس نے
نوار د کو نہیں پہچانا۔

”شاکر! میرے دوست شاکر!“

لیکن مخاطب نے اب بھی نوار د کو نہیں پہچانا۔ اس کے چہرے
پر استعجاب واضح اور جلی طور پر منقوش ہے۔

سین — ایک میونسپل پارک۔ اس پارک میں یا کم از کم
پارک کے اس حصے میں آمد و رفت بہت کم ہے۔ ایک روش کے پاس
ایک بچہ رکھا ہے۔ لیکن پودوں اور درختوں میں اس طرح گھرا ہوا ہے
کہ نصف نظر آتا ہے اور نصف نظر نہیں آتا۔

بچہ خالی ہے۔ لیکن نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچہ کے اس حصہ
نصف پر جو آنکھوں کے سامنے نہیں کوئی بیٹھا ہے۔ ہاں ضرور بیٹھا
ہے۔ کیونکہ بیٹھنے والے نے جمائی لے کر اپنا دایاں بازو بچہ کی پشت پر
پھیلا دیا ہے۔ اور اب اس کا بازو۔ فقط بازو۔ سب کو نظر آ رہا ہے۔

غالباً یہ آدمی ایک جگہ بیٹھا بیٹھا تھک گیا ہے۔ ورنہ اپنی جگہ سے
اٹھ کر۔ دو چار قدم چل کر۔ جمائی لے کر بچہ کے اس حصہ نصف پر کیوں
آبیٹھتا جو ہمیں نظر آ رہا ہے۔

اب چونکہ وہ ہمارے سامنے آبیٹھا ہے۔ ہم اطمینان اور دلجمعی سے اس
کے متعلق رائے قائم کر سکتے ہیں۔ بے چارہ۔ فلک زدہ۔ ”سورت ہمیں۔
حالش پیرس“۔ پھٹے ہوئے بھدے سے بوٹ۔ لٹھے کا پا جامہ جو آج
سے چند روز پہلے ضرور سفید ہو گا۔ ایک بہت بڑا اور خوب ٹاکوٹ۔

کیا تعجب ہے رات کو لحاف کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہو۔ اور سر
پر ترکی ٹوپی جس پر کشش انایب شعری سے کوئی ڈیڑھ ڈیڑھ انچ نکلتی
اور میل۔ سرایت کر چکا ہے۔ کبھی کسی دفتر میں کلرک ہو گا۔ لیکن اب غالباً
بلکہ یقیناً برسر روزگار نہیں۔ شاید اسی غم سے بے چارہ راتوں کو سو نہیں سکتا
کیونکہ اس وقت اس کی آنکھیں نیند سے بھاری ہیں اور اس پر غنوغی ہی

”آپ سچ کہتے ہیں۔ اگر غیرت دو دوستوں کے مل بیٹھے ہیں،
حاصل ہو تو غیرت نہیں غیریت ہے۔“

”بے شک، قطعاً اور لازماً طوریہ“

”میں مانتا ہوں کہ میرا نام شاکر ہے“

”خدا کا شکر ہے تم نے اعتراف کیا“

”میں اپنی خستہ حالی کی وجہ سے انکار کر رہا تھا۔ آپ جانتے

ہیں غربت اور افلاس کی وجہ سے انسان اپنی نظروں میں خود

“ذلیل ہو جاتا ہے“

”لیکن ان باتوں کو بھول جاؤ۔ خدا نے مجھے بہت کچھ دیا

بے۔ تمہاری مصیبتیں تو چند ہزار روپے میں ٹل سکتی ہیں۔“

”چند ہزار! یعنی آپ کے پاس۔۔۔۔“

”جے شک“

”لیکن میں بہت بد قسمت ہوں۔ میں نے ابھی تک آپ کو

نہیں پہچانتا

”شاعر۔ مصائب لے مہمارے فراع کو ملے لڑ دیا ہے۔ اپنے

حافظے پر زور دیا۔ اچھا۔ لویہ سکریٹ پیو۔ اس سے حافظے کو

مردمیلی — ہیٹ وائے کی طرف اشارہ کرے — ان سے

موت۔ یہ میرے چھوٹے بھائی اسید ہیں

رسیدہ پیرا جی ایف جی — بین بانک کم

”شاگرد! کہو تو اے اکابر! دوست! آج سے دس

سال پہلے جو زرخند کا بیج زراعت نام —“

”محمود نام؟“

”مہموزن۔ اور کیا۔ اور یاد کرو ایک بہت بڑا مکان جس کی

ایک جانب میں رہی تھا۔ حافظے پر زور ڈالو۔ مذاقاً۔

سنگریٹ کے دو ایک کش اور لو۔“

سامنے کے بٹنوں کے پاس ایک سوراخ کرتا ہے۔ پھر جیب میں سے ایک ہیرا نکال کے اس سوراخ میں ڈال دیتا ہے اور اسے سرکاتا ہوا جیب کے نیچے استر تک پہنچا کر اظہارِ اطمینان کے لئے ایک لمبا سانس لیتا ہے۔

”اب مزے ہیں۔ اب میں دنیا کے غم و فکر سے آزاد ہوں“

”تم عجیب آدمی ہو۔ تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔“

”تمہاری سمجھ ہی کتنی ہے۔“

”اب یہ ہیرا اس آدمی کے پاس رہیگا“

”نہیں اس کوٹ کے پاس رہیگا۔“

”اور کوئی جگہ نہ تھی۔“

”تم بے وقوف آدمی ہو۔ شر کے مشہور ترین جوہری کے ہاں سے ایک بیش قیمت ہیرا دن دھاڑے غائب ہو جاتا ہے۔ پولیس کس پر شبہ کریگی، اس شہر میں ہیروں کے مشہور ترین قردادوں پر۔ یعنی — اپنی طرف اور اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتا ہے — آخر پولیس والے آپ سے ناواقف تو ہیں نہیں۔“

”پھر“

”پھر کیا۔ میں سمجھتا ہوں اور ایک آدھ گھنٹے کے اندر ہمارے مکان کی تلاشی ہوگی۔ اس وقت بھی ہمارے لئے ڈھنڈیا پڑ رہی ہوگی۔ ہم اس ہیرے کو کہاں چھپا سکتے تھے۔ آخر ہیرا ہے۔ کوئی موٹر کار تو نہیں کہ فوراً غائب کر دوں۔“

”گویا موٹر بہت آسانی سے غائب ہو سکتا ہے۔“

”بیشک۔ موٹر۔ ہاتھی۔ آدمی اور اسی قسم کی اور چیزیں تو چند منٹ میں غائب کی جاسکتی ہیں۔ لیکن ہیرا۔ ہیرے کی

شاگرد کے ماتھے پر بل ہیں۔ ابرو درمیان سے جڑ گئے ہیں۔ گویا گہری سوچ میں ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آرہی ہے۔ ماتھے کے بل مٹ رہے ہیں۔ بھویں کھل رہی ہیں۔ اب وہ مسکرا رہا ہے :-

”سعید!“

”خدا کا شکر ہے آخر تم نے مجھ کو پہچان لیا۔“

دوران گفتگو میں رشید اور شاگرد یعنی ہیٹ والا اور اوگھنے والا بیچ پر بیٹھ گئے تھے۔ لیکن سعید یعنی سرخ نکٹائی والا بدستور کھڑا ہے۔

شاگرد نے ابھی اپنا سگریٹ ختم نہیں کیا۔ لیکن وہ مضحک سا بورہا ہے۔ سگریٹ پینے کے بعد اس نے تین چار جمائیاں بھی لی تھیں۔ اب اس پر خنودگی چھا رہی ہے۔ سگریٹ اس کے ہاتھ سے گر گیا ہے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بیچ کی پشت پر اپنا سر رکھ دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سو گیا ہے۔

سرخ نکٹائی والا مسکرا رہا ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں استہزا ہے۔ وہ شاگرد کو شانے سے پکڑ کر کھینچتا ہے۔ شاگرد گہری نیند سو رہا ہے۔

سرخ نکٹائی والا کھلکھلا کے ہنستا ہے۔ اور اپنے ساتھی کو مخاطب کرتا ہے :-

”چا تو دو“

”یہ لو۔ اس سے کیا ہوگا“

”دیکھتے رہو“

وہ اپنے خوابیدہ اور بے ہوش ”دوست“ کے کوٹ میں

تمہارا کام ہے۔ دنیا میں اور کسی کو اس کوٹ کی ضرورت نہیں۔ صرف تمہیں ہے۔ تمہارے مقابلے پر کوئی حریف نہیں۔ پھر کیا مشکل ہے۔ اور یاد رکھو۔ تمہیں تو۔۔۔ نائٹک کے انداز میں سینہ تان کر اور ہاتھ ہلا کر۔۔۔

پہاڑ ٹوٹ پڑے آسمان پھٹ جائے
شب سیاہ میں ڈائن کوئی لپٹ جائے
مقابلے میں کوئی فوج آگے ڈٹ جائے
تمہارے جسم کا ایک ایک عضو کٹ جائے
مگر کوٹ ہاتھ سے جانے نہ پائے

”تم سنجیدگی سے کبھی بات نہیں کرتے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جب یہ آدمی سو کے اٹھیں گے تو کیا سمجھے گا؟“
”سیدھی سی بات ہے۔ ایک آدمی نیم غنودگی کی حالت میں ایک بیچ پر بیٹھا ہے۔ دو آدمی آتے ہیں۔ اس سے کہتے ہیں تو ہمارا پرانا دوست ہے۔ ہزاروں روپے دینے کا وعدہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ پھر سو جاتا ہے۔ بہت ہی گہری نیند سو جاتا ہے۔ جب نیند کھلتی ہے۔ تو نہ کوئی پرانا دوست ہے نہ نیا۔ وہی بلغ کا کونہ ہے۔ وہی بیچ۔ اب تم ہی بتاؤ جاگے گا تو کس نتیجے پر پہنچیں گے؟“
”سمجھے گا سب کچھ خواب تھا۔“

”یقیناً۔ اُسے تعجب ضرور ہوگا۔ دل میں شبہات ضرور پیدا ہونگے لیکن آخری فیصلہ یہی ہوگا کہ سب کچھ خواب تھا۔“
”تم بہت دانا آدمی ہو۔“

”اور کیا تمہاری طرح۔ اچھا اب یہاں سے چلو۔ میں گھر جاتا ہوں۔ تم کچھ فاصلے سے اس پر نگاہ رکھو اور بس ایک مرتبہ اس کا مکان دیکھ لو۔ کوئی آدھ گھنٹے میں اسے ہوش آجائے گا۔“

دو نو آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔ لیکن چند قدم ہی جاتے ہیں کہ

اور بات ہے۔ بہر حال اب تم نے میدان مار لیا ہے۔ مجھے فکر تھی تو اتنی کہ کہیں اس بچے آدمی سے باتیں کرتے کرتے تمہارا نیا دوست نہ آدھکے۔

”نیا دوست کون؟“

”انسپیکٹر سعید“

”میں نے تو کبھی اس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔“

”نہیں نے۔ لیکن اس خرافات کی داد دو کہ میں نے تمہارا نام ’رشید‘ بتایا اور اپنا نام ’سعید‘ کہلوا لیا۔ تمہیں معلوم ہے انسپیکٹر سعید کے بھائی کا نام رشید ہے۔“

”ہاں۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ اس کوٹ میں سے میرا نکالا کیسے جائیگا؟“

”نکلنے کی ضرورت نہیں۔“

”پھر کیا ہوگا؟“

”جب پولیس سے ہمیں کوئی خدشہ نہ ہے تم کوٹ لے آنا۔ وہ کیسے۔“

”یہ تم جانو۔“

”اگر اس عرصہ میں یہ تلاش کوٹ بیچ دے۔“

”تمہارے پاس کیوں نہ بیچے؟“

”اگر اس کے مکان کو آگ لگ جائے۔“

”اگر مکان کو آگ لگ جائے تو آدمی کی جان بچانا خدا کا کام ہے۔ لیکن کوٹ کو شعلوں سے تم بھی بچا سکتے ہو۔“
”اور اگر یہ مرجائے تو۔۔۔۔۔“

”تو بھائی۔ تم ملّا بن جانا۔ اور اسے غسل دینا۔ اترے کپڑے تمہیں مل جائیں گے۔“

”اور اگر۔۔۔“

”کیا اگر مگر لگا رکھی ہے تم نے۔ بندہ خدا ہر حالت میں اس کوٹ کے مالک کو۔ نہیں۔ اس کوٹ کو نگاہ میں کھنا

”میں شاکر۔ سعید اور رشید کا پرانا دوست۔ میرے دوستو۔
 جھوٹی غیرت دوستوں میں غیرت پیدا کرتی ہے۔ میں کیسے مان
 لوں کہ آپ لوگوں نے ابھی تک مجھے نہیں پہچانا۔ اچھا یہ سگریٹ
 لیجئے۔۔۔ یہ دہی سگریٹ ہے جو سرخ نکلٹائی والے۔ نے
 اونگھنے والے کو دیا تھا۔ سعید۔ لو یہ سگریٹ پیو اور
 اپنے حافظے پر خوب زور ڈالو۔ یاد کرو آج سے دس سال
 پہلے۔ ایک بہت بڑا مکان۔ اور ایک مینار۔ اب بھی
 چند سال کے لئے۔ غالباً دس سال کے لئے۔ آپ ایک
 بہت بڑے مکان میں رہینگے۔ مینار بھی ہو گا۔“
 ”لیکن تم ہو کون“

سرخ نکلٹائی والے کی آواز میں غصہ ہے :-
 ”احمق یہ انسپکٹر سعید ہے“
 ”خدا کا شکر ہے آخر آپ نے مجھے پہچان لیا۔ میرے
 دوستو میرے پاس ہزاروں روپے تو نہیں لیکن میری
 طرف سے یہ تحفہ قبول کیجئے۔“

جیب میں سے ہتھکڑیاں نکالتا ہے۔۔۔

مجید ملک

وہ شخص جو ابھی پنج پر بیہوش پڑا تھا۔ ہوش میں آجاتا ہے۔ آنکھیں
 کھول دیتا ہے۔ تیزی سے سر اٹھاتا ہے۔ اس پر غنودگی کے کوئی
 آثار نہیں۔ غنودگی کے بجائے غیر معمولی قسم کی چستی ہے۔ بلکہ
 جہاں پہلے وہ فلک زدہ۔ مریض دالم معلوم ہوتا تھا۔ اب وہ
 ایک تیز۔ طرار۔ جوانمرد قسم کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ معاً آواز
 آتی ہے :-

”میرے دوستو بھیرو۔ تم مجھے چھوڑ کے جانا چاہتے ہو لیکن
 میں برسوں کے پرانے دوستوں کو نہیں چھوڑوں گا۔“

دو نو کا رنگ فہم ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ آخر ہیٹ والا
 سکوت توڑتا ہے۔

”تم کون ہو“
 ”تم مجھے پہچانتے نہیں۔ اپنے حافظے پر زور ڈالو۔ میں
 تمہارا پرانا دوست ہوں۔“

ہیٹ والا بے انتہا خوف زدہ ہے۔ لیکن سرخ نکلٹائی والے
 کی گھبراہٹ اب کم ہو رہی ہے۔
 اور اونگھنے والا ہنس رہا ہے :-

”آپ نے ابھی تک مجھے نہیں پہچانا۔ میرے دوستو معلوم
 ہوتا ہے کہ آپ لوگ انقلاباتِ زمانہ کی وجہ سے ایک پرانے
 دوست کو پہچاننے سے گریز کرتے ہیں؟“

ہیٹ والے کی حالت قابلِ رحم ہے :-

”لیکن تم ہو کون؟“

نواب سجاد علی خاں (نواب آت کر نال)

”اے۔ اے۔ اے۔“

شمالی ہندوستان میں ایک پروفیسر ہیں۔ ان کا نام ؟ ”اے۔ اے۔ اے۔“ سمجھ۔ سمجھ۔ سمجھ لیجئے نہیں۔ یہی ہے۔ شوخ۔ چنچل خوش وضع۔ اور — مضمون نگار۔ شاید یہ تعارف کافی نہیں۔ نہ سہی۔ دیکھنا یہی ہے کہ ”اے۔ اے۔ اے۔“ کو کون کون پہچانتا ہے۔

”اے۔ ون۔“ انگریزی زبان کا محاورہ ہے۔ جس چیز کی انتہائی تعریف مقصود ہوتی ہے۔ اس کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر ہمارے پروفیسر صاحب اے تھری ہیں۔ بظاہر دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ اے کا طویل سلسلہ کہیں مشہور۔ مسٹر اے سے تو نہیں جانتا۔ مگر نہیں۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ کہ اس سے اس کا کوئی مادی تعلق نہیں۔ اگر دور کی کچھ روحانی نسبت ہو تو خبر نہیں۔ خدا بھلا کرے اس آداگون کا۔ آپ ملک سندھ کے مایہ ناز فرزند ہیں۔ اور دورِ حاضرہ کی دو اعلیٰ یونیورسٹیوں کے ڈبل گریجویٹ یعنی بمبئی اور لندن کے۔ خشک جھلے ہوئے ریگستان کو کسی شاداب اور سرد وادی کوہ سے کیا واسطہ۔ علم و جہالت میں اسی قدر فرق ہے۔ جتنا روشنی اور تاریکی میں۔

علوم جدید کی آغوش میں پرورش یافتہ۔ اور یورپ کی آزاد فضا میں نشو و نما پائے ہوئے خیالات کسی دقیانوسی نظام تمدن کے کب متحمل ہو سکتے ہیں۔ شان و شوکت کی نمائش قابل نفرت۔ جواہرات کی تابش۔ اطلس و کنجواب کی چمک دمک لائق نفرت۔ بجا اور درست۔ ہاں اگر صنف نازک کے حسن کو دوبالا کرنے۔ ناز و ادا کو کافر ماجرا بنانے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ تو سبحان اللہ کیا کہنا۔ ہندوستانی اسباب زینت مردوں کے لئے مذموم اور بہت ہی مذموم۔ ان سے نسوانیت جھلکتی ہے۔ زنانہ پن ٹپکتا ہے۔ یگر صنف لطیف کے لئے مردانہ آرائش اور ہمتائی عریانی واجب و درست۔ پسندیدہ اور لائق تعریف۔ کیوں اور کس لئے۔ حسن کا فرمان او تمذیب جدید کا فتویٰ۔ جائے احترام ہے۔ مجبوری ہے۔ تہذیب کیا۔ معیار تہذیب کیا۔ جبر و استبداد کی خوشامد اور قوت و طاقت کی پرستش۔ ایک غلامانہ ذہنیت اور ایک طفلانہ تقلید۔

چیتے کی سی پتلی کمر۔ نازک نازک ہاتھ پاؤں۔ بوٹا سا قد۔ عورت کے لئے زیور حسن اور عطیہ قدرت مگر مرد کے لئے معیوب اور فطرت کی ستم ظریفی۔ خوش قسمتی کہئے یا بد قسمتی یہ سب خوبیاں ہمارے پروفیسر صاحب میں موجود ہیں۔ اور ستم یہ ہے۔ کہ ان کا انہیں احساس بھی ہے۔ کافی احساس ہے۔ بلکہ نہایت ہی کافی۔ بونڈ سٹریٹ کے خوش وضع اور شوخ رنگ سوٹ۔ جاذب نظر ریشی نکٹائی اور رومال۔ خوبصورت جراب اور شوز کا شوق ہے۔ چہرے کو ریش و بروٹ سے پاک و صاف رکھنا ضروریات زندگی میں داخل ہے۔ اعضا کے نازک تناسب کو زیادہ دل آویز بنانے کی خواہش ان کی خوبصورتی کو انتہائی حد تک نمایاں کرنے کی تمنا۔ کیا جذبہ نسوانیت

کی کرشمہ سازی نہیں؟ کراچی کے ماہر فن خیاط آپ کی نازک اندامی اور دلربا اعصنائی جس قدر چاہیں تعریف کریں۔ اور آپ حلقہٴ اجاب میں اس تعریف پر جتنا چاہیں فخر و ناز کریں۔ ہم تو ان خوبیوں کو صنف نازک اور صرف صنف نازک ہی کے لئے موزوں اور مناسب سمجھتے ہیں۔

سر کے بالوں کی ژویدگی اور رجعت قفری۔ جو شمالی ہند کی ایک مشہور دشمن عقل و خرد قوم کا طرہٴ امتیاز ہے۔ اور تنگی پیشانی۔ دماغی لہروں کے تناسب اور خیالات کے توازن کے متعلق شکوک پیدا کرتی ہے۔ شکوک فلفط بھی ہوتے ہیں اور صحیح بھی۔ آپ علم ادب کے پروفیسر ہیں۔ کیوں ہیں۔ اور کس لئے۔ اس کا غالباً خود ان کے پاس بھی جواب نہیں۔ کالج باقاعدہ جاتے ہیں۔ لیکچر دیتے ہیں۔ سب کچھ کرتے ہیں۔ دل نہیں چاہتا ہے مگر کرتے ہیں۔ کرنا پڑتا ہے۔ غالباً اسی کا نام مقدر ہے۔

پلنگ کے ساتھ آپ کو خاص محبت ہے۔ ایسی محبت جیسی شیر خوار بچے کو ماں کی گود سے۔ یا اتا کے گوارے سے۔ کابلی پر محمول کرنا تو ظلم ہو گا۔ کیونکہ آپ کبھی کبھی ٹینس بھی کھیلتے ہیں۔ خاص خاص ڈن پارٹیوں میں بھی شرکت فرماتے ہیں۔ گاہ گاہ کی شب بیداری تک کو جائز سمجھتے ہیں۔ اگر اس کا نتیجہ بزمِ نغمہ و سرود کی پر لطف شرکت ہو۔ کیونکہ علم موسیقی سے لگاؤ ہے اور کافی لگاؤ ہے۔ دعویٰ نہیں ہے۔ دعویٰ ہو بھی نہیں سکتا۔ مگر پھر بھی دعویٰ ہے۔ اس لئے کہ دعویٰ ہے۔ زبان سے نہ سہی دل سے تو ہے۔

سیر و سیاحت کا بھی شوق ہے۔ ایک دوست کو ممنون فرمانے کے لئے جنوبی ہند اور جزیرہ سنگلیپ کا سفر بھی اختیار کر چکے ہیں۔ آثارِ صنادید کے ملاحظے نے تاریخ ہند اور بالخصوص سلطنت مغلیہ کے حالات کے مطالعہ کا ولولہ پیدا کر دیا ہے۔ جس کی بناءً منوچی جیسے گننام اور ناقابلِ اعتبار مؤرخ کو لائبریری کی تاریکیوں سے نکل کر کچھ روز کے لئے دنیا کی روشن فضا میں ہوا کھلنے کا موقع نصیب ہو گیا۔ اور کپڑے کپڑوں کے دندان و شکم سے جس کا وہ بھیج معنوں میں مسختی ہے۔ چندے نجات مل گئی۔ مگر پلنگ پھر بھی پلنگ ہے۔ اور پلنگ نوازی آپ کی طبیعتِ ثانیہ۔ گھر پر زیادہ تر وقت اسی کی صحبت میں بسر ہوتا ہے۔ اور ملاقات کا کمرہ۔ جو مختصر مگر مذاقِ سلیم کا نمونہ ہے۔ دوستوں کی طرح آپ کی بے افتنائی کا شاک۔ اس کا سبب وجہ۔ جو کچھ بھی ہے۔ ایک معمہ ہے۔ ایک بیحد ہے۔ پروفیسر صاحب ایک با مذاق اور خوش طبع رفیقِ صحبت ہیں۔ بشرطیکہ دماغ حاضر ہو۔ طبیعت کو سکون ہو۔ اور دل کو قرار ہو۔ مگر یہ کیفیت اپنے بس کی بات نہیں۔ امکان کم اور عدم امکان زیادہ۔ نہ وابستہ بہار نہ پابند خزاں معمولی سے معمولی واقعہ درہم برہم کر دینے کے لئے کافی ہے۔ برسات میں قدرے اضافہ یا گرمی کی تھوڑی سی زیادتی ایسے غیر معمولی ناگوار اثرات پیدا کر دیتے ہیں۔ کہ عقل بیچارہ لگاتار بد مذاں رہ جاتی ہے۔ بہر حال جس وقت اور جب کبھی عناصر میں اعتدال ہوتا ہے۔ عارضی یا قدرے پائدار مستقل طور پر تو غیر ممکن ہے۔ تو بذلتِ سنجی اور سلیس ضلعِ جگت کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہے۔ سخن شناسی اور نکتہ سنجی کی اہلیت ہے۔ دوسروں کو خوب داد دینا جانتے ہیں اور خود خراج تحسین حاصل کرنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ اسیکچ لکھنا لمحاتِ فرصت کا محبوب مشغلہ ہے۔ بعض اوقات یہ شوق جنون کی حد سے تجاوز کر جاتا ہے۔ جس کی تصدیق پلنگ کی آہ و زاری اور ٹائپ رائٹر کی فریاد سے بخوبی ہو سکتی ہے۔

آپ انگریزی زبان میں لکھتے ہیں۔ اچھا لکھتے ہیں اور بہت اچھا لکھتے ہیں۔ اعلیٰ زبان۔ ندرت بیان۔ دلکش محاورات۔ پر مذاق طرزِ تحریر۔ ان سب خوبیوں کا اجتماع معمولی بات نہیں۔ یہ سب پروفیسر صاحب کے ہر مضمون میں کم و بیش پائی جاتی ہیں اور بعض میں تو بدرجہ کمال موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معمولی سے معمولی مضمون میں بھی ایک عجیب دلکشی اور روزمرہ کے سادہ واقعات میں جدت اور

خاص قسم کی جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یقیناً یہ ایکیچ ہندوستانی ادب میں ایک دلچسپ اور قابل قدر نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں مضمون جب تیار ہو جاتا ہے۔ تو پھر خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ کسی بچہ کو نیا کھلونا پا کر اتنی مسرت نہ ہوتی ہوگی۔ بحریات میں تلاطم سا برپا ہو جاتا ہے۔ اور سکون اضطراب میں منتقل ہو کر بھولے ہوئے احباب کی یاد تازہ بلکہ ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ سچ ہے۔ دل بھر کے داد اور مل بھی سکتی ہے کہاں۔ بس پھر تو کسی بے تکلف دوست کا کمرہ اور بیئر کی بوتل۔ خود پڑھنا اور دوسروں سے پڑھوانا ہر عمدہ فقرہ پر داد طلب تقاضوں کی بوچھاڑ۔ قابلیت کا راگ اور علمیت کا ترانہ۔ ایکیچ کیا ہے۔ ایک آئینہ ہے۔ جس میں برائی اور بھلائی پہلو پہ پہلو واضح اور صحیح طور پر نمایاں نظر آتی ہے۔ ایک طرف صاحب مضمون کی صفات کی طرح سرائی دوسری طرف اس کی کمزوریوں کو طشت از بام کرنا۔ مگر دونوں ایک لطیف اور دلچسپ مذاق کے پیرایہ میں۔ دل آزاری کی نیت سے نہیں۔ یا اہانت کے خیال سے نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اور قطعاً نہیں۔ مقصد اصلاح کرنا ہوتا ہے نہ کہ رسوا کرنا۔ آئینہ اور شانہ والا قطعہ اس قول کا ثبوت ہے۔

پروفیسر صاحب کو دوسروں کے احساسات کی قدر ہے۔ حفظ مراتب کا لحاظ ہے۔ انس و محبت کے جذبات بھی معقول تعداد میں رکھتے ہیں جو صرف وقت کے منتظر اور تحریک کے محتاج ہیں۔ آپ کے دوست بھی ہیں۔ اور اچھے دوست ہیں۔ مگر کم اور بہت کم۔ سب اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ لائق و فائق۔ سب تو نہیں مگر بعض کی نسبت یہ گمان ہے۔ گمان نہیں بلکہ یقین ہے۔ ہونا نہ چاہئے مگر ہے۔ کہ آپ کے بعد بھی ان کے دل آپ کی یاد سے کبھی خالی نہ ہونگے۔ اور زبان قصیدہ خوانی سے سیر نہ ہوگی۔ اس کی دلیل یہی کہ بے دلیل ہے۔ اچھا وقت آنے دو۔ زمانہ خود بتا دیگا۔

غرض فلسفیانہ طبیعت عالمانہ ذہنیت۔ طفلانہ مزاج اور نسوانی خود پسندی۔ ایک عجیب مرکب ہے۔ ایک مجموعہ اعداد ہے جس کا نام پروفیسر ”اے۔ اے۔ اے“ ہے۔

رکن الدولہ شمشیر جنگ نواب سجاد علی خاں

جی ڈھما جائے ہے سحر سے آج رات گزریگی کس خرابی سے
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
برقع اٹھتے ہی چاند سا نکلا داغ ہوں اسکی بیجابی سے

میر تقی میر



019
17

نغمۃ حقیقہ

ابوالاثر حقیقہ جالندھری

(۱)

جھوٹا سب سنسار

پیارے

جھوٹا سب سنسار

موہ کا دریا لوبھ کی نیسا کامی کیوں ہمار
موج کے بل پر چل نکلے تھے آن پھنسے منجہدار

پیارے

جھوٹا سب سنسار

جھوٹا سب سنسار

پیارے

جھوٹا سب سنسار

تن کے اجلے من کے میلے دھن کی دھن اسوار
اوپو اوپر راہ بتائیں اندر سے بٹ مار

جھوٹا سب سنسار

پیارے

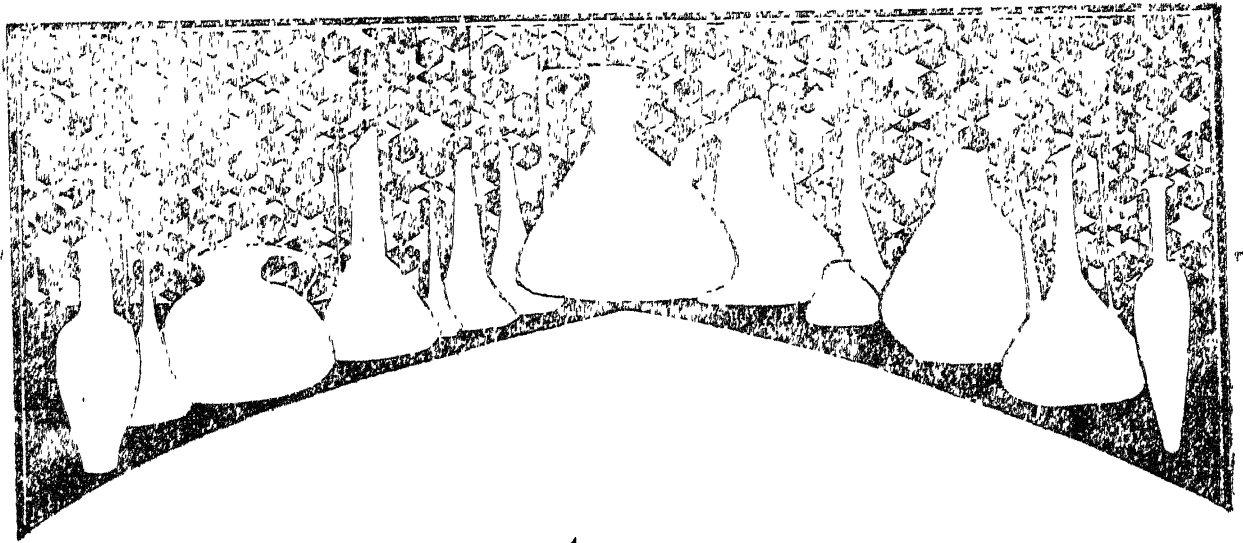
جھوٹا سب سنسار



سرِ حشر کام آئی نہ مری سخن طسرازی
 کہ میں نامہٴ عمل پر نہ شہید تھا نہ غازی
 سرِ سر بلند میرا ہے نیاز مند تیرا
 مرے ناز کو بھی دیکھے تری شان بے نیازی
 فقط ایک بات کہ کر کوئی بات ہے کہ چپ ہوں
 مجھے بے زباں سمجھ کر نہ کرو زباں درازی
 نہ متاع نور حاصل نہ میں حور ہی سے وصل
 نہ میں خود فریب واعظ نہ میں سادہ دل نمازی
 میری زندگی ریا ہے۔ مگر اس کا غم ہی کیا ہے
 کہ ابھی بچھا ہوا ہے مرا دامِ پاکبازی

جرم کو جوشِ ندامت میں سمونا چاہا
 داغِ مے کو شر و تسنیم سے دھونا چاہا
 عشق نے حسن کے افعال پہ رونا چاہا
 تحمِ احساسِ مگر سنگ میں بونا چاہا
 ہائے کس درد سے کی ضبط کی لقیں مجھے
 ہنس پڑے دوست میں نے کبھی رونا چاہا
 آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر
 ناخدا نے مجھے ساحل پہ ڈونا چاہا
 سنگدل کیوں نہ کہیں تنکے والے مجھ کو
 میں نے پتھر کا پرستار نہ ہونا چاہا
 دیدہ تر سے بھی سرزد ہوا اک جرمِ عظیم
 حشر میں نامہ اعمال کو دھونا چاہا
 حضرت شیخ نہ سمجھے مے دل کی قیمت
 لے کے تسبیح کے رشتے میں پرونا چاہا
 پھر دم نزع توقع ہوئی دلداری کی
 رکھ کے سر زانوئے دلدار پہ سونا چاہا
 کوئی مذکور نہ تھا غیر کا لیکن تم نے
 باتوں باتوں میں یہ نشتر بھی چھبونا چاہا
 جنسِ شہرت بہت ارزاں تھی مگر میں نے حینِ ط
 دولتِ وقت کو بیکار نہ کھونا چاہا





(۴)

بتوں کو کبھی آپ سچا نہ جانیں نہ ان کے دہن میں ان کی زبانیں
 زمانے میں چپے ہیں دیر و حرم کے بڑی رفعتوں پر ہیں دونوں کانیں
 بتوں کی نگاہیں مجھے ڈھونڈتی ہیں فضاؤں میں جب گونجتی ہیں اذانیں
 ہمیں پیار ہے ان سے ہم جانتے ہیں وہ سمجھیں نہ سمجھیں نہ جانیں نہ جانیں

جوانی گئی پھر بھی ہم اور ناصح

جہاں مل گئے پھر لگیں داستانیں

(۵)

مجھے شاد رکھنا کہ ناشاد رکھنا
مرے دیدہ و دل کو آباد رکھنا
میں گے تمہیں راہ میں ہستکدے بھی
ذرا اپنے اللہ کو یاد رکھنا
بھلائی نہیں جاسکیں گی یہ راتیں
تمہیں یاد آئیں گے ہمسما یاد رکھنا
تمہیں بھی قسم ہے کہ جو سر جھکا دے
اسی کو تہ تیغ بیداد رکھنا
الہی وہ برباد کرتا ہے مجھ کو
الہی اُسے شاد و آباد رکھنا

(۶)

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات - یاد نہ تم کو آسکے
تم نے ہمیں بھلا دیا - ہم نہ تمہیں بھلا سکے
تم ہی نہ سُن سکے اگر قصہٴ غم سنیگا کون
کس کی زباں کھلیگی پھر - ہم نہ اگر سنا سکے
ہوش میں آچکے تھے ہم جوش میں آچکے تھے ہم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اٹھا سکے
روفق بزم بن گئے لب پہ حکایتیں رہیں
دل میں شکایتیں رہیں لب نہ مگر ہلا سکے
عجز سے اور بڑھ گئی - برہمی مزاج دوست
اب وہ کرے علاج دوست کی سمجھ میں آسکے

ابوالاثر حنیف



آغا احمد علیہ کامیاب ناکام

رچرڈ نارمن اپنی سنگار میز کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ابھی ابھی نہا کر نکلا تھا۔ اور ڈریسنگ گون پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ جس کو وہ آہستہ آہستہ سگریٹ کیس پر مار رہا تھا کہ کش لگاتے وقت تمباکو کے ٹکڑے منہ میں نہ آنے پائیں + دروازہ کھلا اور اس کا خدمتگار چاندی کی طشتری میں ایک ملاقاتی کارڈ رکھے ہوئے داخل ہوا۔ کارڈ پر لکھا ہوا تھا "ہیلنا ٹالمیج"

نارمن میز کے آئینہ میں اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ اس کو ایک تیس منٹیں برس کے خوشرو نوجوان کا چہرہ نظر آ رہا تھا جس کے سنہرے بال ہاتھ پر کھڑے ہوئے تھے اور جس کی آنکھوں کے گرد ہلکے ہلکے سیاہ دائرے نظر آتے تھے۔ گو اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سا ہنس تھا لیکن گالوں اور آنکھوں کے گرد چند ایک شکنیں نمودار ہو چکی تھیں جن سے اس کا چہرہ یاس انگیز اور پر حسرت بن گیا تھا +

نارمن آج خوش تھا۔ رات اس کے کھیل کو امید سے بڑھ کر کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ ہر ڈرامہ نویس کھیل کی پہلی رات کا انتظار بہت بے صبری اور امید و ہم کی حالت میں کرتا ہے۔ لیکن نارمن کے کانوں میں اب تک لوگوں کی تالیوں کی آواز اور دوستوں کی مبارکبادیں گونج رہی تھیں۔ اب تک اس کا دل اس خوشی کی یاد سے دھڑکنے لگتا تھا جو اس کو کھیل کے اختتام پر تقریر کرنے سے ہوتی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ صبح کے تمام اخباروں نے کھیل کا ذکر شاندار الفاظ میں کیا تھا۔ کئی نامی گرامی مصنفین سے اس کا مقابلہ کیا گیا تھا۔ بعض کشادہ دل نقادوں نے تو اس کے کھیل کے متعلق یہاں تک لکھ دیا تھا کہ وہ ڈرامہ کی تاریخ میں یادگار رہیگا +

رچرڈ نارمن اس نے ایک ماہ پہلے شائع کیا تھا وہ اب تک دھڑا دھڑا کر رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی سے پورا مطمئن ہوتا اگر ایک چیز خدمتگار نے کسی قدر توقف کے بعد کہا۔ "حضور ایک خاتون باہر کھڑی ہیں۔"

نارمن نے سگریٹ انگلیوں میں دبا کر بے پرواہی سے کارڈ اٹھایا۔ ہیلنا ٹالمیج! نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے آنکھیں پھاڑ کر کارڈ کو دیکھا۔ شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ اس پر صرف یہ دو لفظ تھے ہیلنا ٹالمیج! اس کا سانس تیزی سے آنے لگا۔ وہ ایک دم کھنکھنے والا تھا۔ ہاں ہاں اس خاتون کو لے آؤ۔ جلد جاؤ۔ لیکن اچانک رک گیا +

دس سال پہلے کے واقعات بجلی کی تیزی سے یاد آگئے اور اس کی آنکھوں کے سامنے وہی مناظر پھر نے لگے +

دس سال پہلے وہ ایک رقص گاہ میں گیا تھا۔ اس وقت وہ ایک معمولی اور غیر معروف طالب علم تھا۔ وہ رقص گاہوں میں جانے

کا عادی نہ تھا۔ اس کو ایسے مشاغل کے لئے وقت کم ملتا تھا۔ لیکن اس رات موسم غیر معمولی طور پر خوشگوار تھا۔ چنانچہ اس کے دل میں اس بات کی امنگ پیدا ہوئی کہ وہ رقص گاہ میں جائے گا۔

پہلے ہی ناچ کے دوران میں ایک لڑکی ناچتی ہوئی اس کے قریب سے گزری۔ نارمن کی نظر اس پر جم کر رہ گئی۔ کوئی بیس برس کی عمر۔ سیاہ بال۔ نکلتا ہوا قد۔ ہلکا پھلکا جسم۔ گویا ناچ ہی کے لئے بنا ہے۔ بہت بے تکلفی سے ناچتی جا رہی تھی۔ ایک دگدگلا مسکراہٹ سے جس میں کسی قدر بے پرواہی ملی ہوئی تھی اپنے شریک رقص اور دوسرے ناچنے والوں کو دیکھتی جاتی تھی۔ باقی وقت نارمن اپنی آنکھیں اس کی طرف سے نہ ہٹا سکا۔ اسے محسوس ہوا کہ کئی اور نوجوان بھی اس کو متوازنہ تک پہنچے ہیں۔ وہ اتنا محو تھا کہ کسی غلطی پر اسے اپنے ساتھی سے معافی بھی مانگنی پڑی۔ ناچ ختم ہونے پر اس نے اپنے ایک دوست سے لڑکی کا نام پوچھا۔

اسے معلوم ہوا کہ لڑکی کا نام ہلینا ٹالیج ہے۔ اس کا باپ پروفیسر ٹالیج جس کو مرے ہوئے دو تین سال ہو گئے ہیں ایک متمول آدمی تھا۔ اب ہلینا بالکل آزاد ہے۔ کیونکہ اس کی والدہ بچپن ہی میں مر چکی ہے۔ ادبی شوق کے علاوہ اسے موسیقی میں بھی کچھ دسترس ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے دوست نے ہلینا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کہ وہ خوبصورت ہے بلا کی خوبصورت۔ لیکن ان بچوں کی طرح جو بن مان کے پلتے ہیں لاڈلی اور مزاج کی تیز ہے۔“ پھر اس نے نارمن کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر ہنستے ہوئے کہا۔ ”تم کوشش کرو تمہارے ایسے حسین نوجوانوں پر تو ایسی لڑکیاں پھر دک جاتی ہیں“ اس نے اپنے دوست پر ایک حقارت آمیز نظر ڈالی۔

نارمن نے بہت کوشش کر کے اس سے تعارف حاصل کیا اور اس کے ساتھ ناچنے کی درخواست کی۔ ہلینا نے بے پرواہی سے نظروں سے تکتے ہوئے اپنی خفیف سی مسکراہٹ سے اس کی درخواست منظور کر لی۔ نارمن کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ ہلینا دل ہی دل میں اس کی اس گھبراہٹ پر ہنسیگی۔ ناچ میں ہلینا کے مس سے نارمن کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ اسے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ہوا میں اڑا جا رہا ہے۔ آج تک اس کو کسی عورت نے اتنا مسحور اور از خود رفتہ نہ بنایا تھا۔ ناچ کا تمام وقت ایک خواب کی سی کیفیت میں گزر گیا۔

نارمن گھر کی طرف روانہ ہوا تو راستہ بھر وہی خیالات اس کے ذہن میں گھومتے رہے۔ بستر پر لیٹا تو بھی وہی منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اور اس کا جسم انہیں محسوسات سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ابھی تک ہلینا کے آتشیں اور رسیلے ہونٹ مسکراہٹ سے کچھ کھلے ہوئے تھے۔ اور ان میں سے اس کے سفید دانت چمک رہے تھے۔ ابھی تک اس کی نیم وا آنکھیں اس کو اور باقی ناچنے والوں کو بے پرواہی سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ بار بار سر کو ایسے جھٹکتی تھی جیسے ماتھے پر سے بال ہٹا رہی ہو۔ ابھی تک اس کا معطر سانس نارمن کے منہ اور گردن پر محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے جسم میں بار بار بجلی سی دوڑ جاتی تھی اور دل کی حرکت تیز ہو جاتی تھی۔ اب تک اس کے بازو ایک لطیف اور سٹول جسم کو تھامے ہوئے تھے۔ رات بھر اسے اچھی طرح نیند نہ آئی۔ پریشان خوابوں میں بھی ہلینا ہی کو دیکھتا رہا۔ دن بھر نارمن کوئی کام نہ کر سکا۔ شام کو وہ پھر رقص گاہ میں گیا۔ لیکن ہلینا وہاں موجود نہ تھی۔ بہت کوشش کے بعد وہ ایک دن ہلینا سے ملا۔ لیکن اپنی فطری شرم اور عصبیت سے وہ کوئی بات نہ کر سکا۔ اب رات دن نارمن کو یہی الجھن رہتی تھی۔ ایک بار جب اس نے بڑی ہمت کر کے ہلینا سے اپنے عشق کا اظہار کیا تو اس نے مسکرا کر نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف بے پرواہی سے دیکھا۔

اور اس کی باتوں کو مذاق میں اڑا دیا۔ ان دنوں ایک ہانکے چھیلے ایکڑ سے ہلینا کا دوستانہ تھا جس کا پیشہ ایکٹنگ کے علاوہ عشق بازی بھی تھا۔

اس معمولی سی مایوسی نے نارمن کو بہت متاثر کیا تھا۔ اس کی طبیعت میں قنوطیت پہلے سے موجود تھی اب وہ گہرا رنگ اختیار کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ مغموم اور لمول نظر آتا تھا۔ چھ ماہ اسی پریشانی میں گزر گئے۔ آخر ایک روز ہلینا نے چند ایک دوستوں کے سامنے نارمن کو بری طرح جھڑک دیا۔

نارمن نے اپنے دل کو سمجھایا کہ اب ہلینا سے ملنا بیکار ہے۔ لیکن عہد کیا کہ وہ اپنی باقی زندگی اس کی یاد میں گزار دیگا۔ عالم میں نارمن نے اپنی نظموں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ شائع کیا۔ جس میں قنوطیت کا جذبہ بہت غالب تھا۔ ان تمام نظموں میں اس نے اپنی نامرادی کا حال بڑے دردناک الفاظ میں بیان کیا تھا۔ اس کی وہ نظم جس میں اس نے ہلینا کو مخاطب کر رکھا تھا خصوصیت سے بہت مقبول ہوئی۔ نارمن اس کتاب کی کامیابی پر بہت حیران ہوا تھا۔ اسے اس کی بالکل امید نہ تھی۔ جب وہ اخبارات میں اپنی تعریفیں پڑھتا تو تعجب کرتا۔ آہستہ آہستہ اس کے عشق کا قصہ بھی مشہور ہوتا جا رہا تھا۔

کچھ عرصہ بعد نارمن نے ایک ناول لکھا جس کو اس کی نظموں سے زیادہ قبولیت حاصل ہوئی۔ اس میں ایک ایسے نوجوان کا قصہ تھا۔ جس کو عشق میں ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اس کی زندگی بہت تلخ ہو جاتی ہے۔ اس میں عورتوں کی سنگدلی اور خود پسندی کے خلاف بہت زہرا لگایا تھا۔ کتاب کا آخری باب جس میں وہ نوجوان بالکل مایوس ہو کر اپنی پردرد زندگی کا خاتمہ کر لیتا ہے بڑا شاندار تھا۔ جس وقت زہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر رہا ہوتا ہے تو وہ اپنی محبوبہ کو یاد کرتا ہے اور بہت پیارے الفاظ میں اس کو آنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس ناول میں نارمن نے بہت کچھ اپنا ہی واقعہ لکھا تھا۔ اس کی اشاعت پر اس کا شمار مشہور مصنفوں میں ہونے لگا تھا۔

نارمن کے تمام ناولوں افسانوں اور ناولوں کی بنیاد مایوسی، نامرادی اور اسی قسم کی دوسری قنوطیت آمیز باتوں پر ہوتی تھی۔ وہ مایوسی اور خاص طور پر عشق میں ناکامی کے جذبات کو بیان کرنے میں بے مثل تھا اور یہ سب کچھ ہلینا کی بدولت تھا جس کی یاد نارمن سے کبھی جدا نہ ہوتی تھی۔ رقص گاہ کی وہ رات اس کے لئے ایک حسین خواب بن گئی تھی۔ گو وہ اب ہلینا سے ملتا نہ تھا لیکن اس کے متعلق ارٹنی ارٹنی خبریں سنتا رہتا تھا۔

اسے معلوم ہوا تھا کہ ایکڑ کے ساتھ ہلینا کی دوستی ایک سال سے زیادہ نہ بھٹ سکی کیونکہ اس عرصہ میں وہ اپنی کافی دولت اور عزت لٹا چکی تھی۔ پھر اس نے ایک وارفٹ مزاج شخص مورگن سے شادی کر لی جس کی ادباشی اور شراب خوری نے اسے شادی کے بعد صرف تین سال زندہ رکھا۔ خاوند کی موت کے بعد اس نے اپنا نام ہلینا ٹارگن سے بدل کر پھر ہلینا ٹالچ رکھ لیا تھا۔ اب اس کی زندگی بہت بے ترتیب ہو گئی تھی۔ اس نے کئی مردوں سے عشق کیا تھا اور اس کے آخری عاشق نے اسے سخت دھوکا دیا تھا۔ نارمن نے یہ سب کچھ باتوں ہی باتوں میں سنا تھا۔ اس کی محبت میں ذرہ برابر فرق نہ آیا تھا۔ وہ اسے اسی طرح چاہتا تھا اور اپنی

مایوسی کے گیت اسی زور شور سے گاتا تھا۔ اب اس وقت وہ اس کے دروازے پر کھڑی تھی ! نارمن نے رات اس کو تھیسٹر میں دیکھا تھا۔ وہ سوچنے لگا اس کو کھیل دیکھ کر میرا خیال آیا ہوگا۔ اور اپنی غلطی کا احساس

ہوا ہوگا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ میں دس سال تک ایک ایسے شخص سے کھنچی رہی ہوں جو مجھے چاہتا ہے۔ مجھ پر جان تک قربان کرنے کو تیار ہے۔ اس احساس پر اس نے یہاں آنے کا ارادہ کیا ہوگا اور اب وہ میرے دروازے پر کھڑی ہے +
 نارمن ملاقاتی کارڈ ہاتھ میں لئے ان باتوں پر گویا نظر ڈالنا جا رہا تھا۔ جس بات کو وہ ایک مبہوم خواب یا بعض اوقات ایک دوراز عقل و قیاس بات خیال کرتا تھا وہ پوری ہو چکی تھی۔ ہلینا ٹالیج اس کے دروازے پر کھڑی تھی ! وہ ہمیشہ سے یہی چاہتا تھا اور تمام عمر اس کو اس بات کی زبردست خواہش رہی تھی۔ لیکن اس کے پورا ہو جانے کی امید نہ تھی۔ ہلینا کی آمد نے اس کی زندگی کے نظام کو تہ و بالا کر دیا تھا +

اس نے سوچا میں نے اپنی زندگی کی بنیاد یابوسی اور ناکامی پر رکھی ہے۔ اسی جذبہ سے متاثر ہو کر میں نے اپنی نظمیں اور افسانے لکھے ہیں۔ اب میں ایک مشہور مصنف ہوں۔ میرے عشق کی ناکامی کی داستانیں زبان زد خلافت ہیں۔ کیا اب ہلینا سے مل کر اپنی زندگی کا بنیادی پتھر اکھاڑ دوں ؟ اور اس شاندار عمارت کو جس کی تعمیر آرزوؤں کے خون سے کی ہے منہدم کر دوں ؟ اپنی یابوسی کو ختم کر دوں ؟ اس کا مرانی میں بربادی ہے +

خدمتگار طشتری ہاتھ میں لئے خاموش کھڑا تھا۔ نارمن کی گہری سوچ نے اسے کسی قدر حیران کر دیا تھا۔ وہ ایک دوبار آہستہ سے کھانسا بھی تھا لیکن نارمن متوجہ نہ ہوا تھا۔ آخر اس نے دبی آواز میں کہا۔ ”حضور ایک خاتون باہر کھڑی ہیں +“
 نارمن کی سوچ میں کسی قدر نفرت اور تلخی تھی۔ جس چیز کے لئے مدتوں سرگردان رہا تھا جب وہ مل رہی ہے تو اسے لینے کی جرأت نہیں ! اب اسے معلوم ہوا کہ اس کی زندگی کتنا بڑا فریب ہے ! وہ اب تک اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہا ہے۔ اس کو اپنی یابوسی کے لئے صرف ایک بہانہ کی ضرورت تھی۔ اب اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ہلینا کو قبول کر کے اپنی زندگی کو بدل ڈالے +
 خدمتگار نے پھر کہا۔ ”حضور باہر ایک خاتون کھڑی ہیں !“

نارمن نے ملاقاتی کارڈ طشتری میں واپس رکھ دیا اور آئینہ میں اپنا عکس دیکھنے لگا۔ پھر سگریٹ کو سگریٹ کیس پر مارتے ہوئے کہا :-

”جو خاتون باہر کھڑی ہیں ان سے کہ دو کہ میری ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی“ +

آغا عبدالحمید

پہلے سکول
سائنس تھریڈ



فلک پیم انسان کہ شیطان؟

فرانسیسی شاعر یا مژ کی ایک مختصر نظم کا لفظی ترجمہ یہ ہے :-

دعا کہ شاعر
بہشت میں
گدھوں کے ساتھ جائے :-

”اے خدا جب تو مجھے بلائے تو کاش یوں کرے
کہ کسی میلے کے دن بلائے جب سڑکیں گرد آلود ہوتی ہیں -
زمین پر ہمیشہ سے میری عادت ہے کہ ایسے رستے پر چلتا ہوں جو مجھے پسند ہو -
میں چاہتا ہوں کہ تیری بہشت کی طرف بھی (جہاں ستارے
تمام دن چمکتے ہیں) اپنی پسند کی سڑک پر چلوں -
اُس بڑی شاہراہ پر ہاتھ کی لکڑی لے کر چل کھڑا ہوں
جس پر بوجھ تلے جھکے ہوئے گدھے جا رہے ہوں اور میں
اپنے پیالے دوستوں گدھوں سے کوں
”میں فرانسیسی یا مژ ہوں، بہشت کو جا رہا ہوں
کیونکہ جہاں خدائے برگزیدہ ہے وہاں کوئی دوزخ نہیں -
میرے ساتھ آؤ۔ اے میرے زنگاری آسمان تلے کے دوستو !
غریب کو پیالے، بوجھ اٹھانے والو ! جو اپنے بلے بلے

کان ہلا کر پھروں کو
 غصے سے بھرے چوٹ لگانے والے ڈنڈوں کو
 اور جھنجھٹائی مکھیوں کو
 ہٹاتے رہتے ہو۔“

اے خدا! مجھے اپنے سامنے ان حیوانوں کے ہمراہ پیش ہونے دے۔
 ان سے مجھے بچد پیار ہے کیونکہ وہ اپنے سر میٹھی اداؤں کے ساتھ
 جھکاتے ہیں اور جب چلتے چلتے رک جاتے ہیں تو اپنے پھوٹے پھوٹے
 پاؤں اس قدر نرمی سے پاس پاس جما دیتے ہیں کہ جو دیکھے
 مہی رحم کرے۔

اے خدا! مجھ کو آنے دے اور میرے ساتھ ان کے دس لاکھ کانوں کو،
 اور ان سب کو جو اپنے پہلوؤں پر بھاری بھاری کس اٹھاتے ہیں۔
 اور ان سب کو جو پہلوؤں کی گاڑیاں کھینچتے ہیں۔
 اور ان سب کو جو اپنی پیٹھ پر ٹوٹے پھوٹے کنستروں سے ڈھکتے ہیں۔
 اور ان سب گدھیوں کو جو لنگڑا کر چلتی ہیں کیونکہ
 ان کے پیٹ چمڑے کی بوتلوں کی طرح پُر ہیں۔
 اور ان سب کو جن کو جیتھروں سے ڈھالکا جاتا ہے
 کیونکہ ان کے سینے والے زخموں کے گرد
 صدی مکھیوں کے جھنڈ کے جھنڈ جمع ہوتے ہیں۔

اے خدا! مجھے اپنے پاس بہشت میں آنے دے مع سب گدھوں کے
 اور فرشتوں کو حکم دے کہ وہ ہمیں وہاں لے جائیں جہاں تیرے دریا
 اپنے ساحلوں کے ساتھ لطف سے پیش آتے ہیں۔
 جہاں درختوں سے ”چیری“ کے گچھے لٹکتے ہیں۔
 ایسی ”چیری“ کے جو رحمدل کنواریوں کے ہنسنے والے رخساروں کی طرح نرم ہے۔
 اور اے خدا! جہاں تیرا مکمل امن ہے ہاں مجھے بھی اپنے گدھوں کی طرح بنا
 کہ میں آسمانی دریاؤں کے اوپر جھکا رہوں تیرے گدھوں

کی طرح جو اپنی میٹھی اور عاجزانہ غربت کے ساتھ تیری دائمی محبت کے شفاف پانیوں میں
منعکس ہوتے ہیں۔

انسانی دعاؤں کے غارزار میں یاہز کی یہ بھولی سی دعا گویا کنول کا پھول ہے۔ جس دنیا میں اکثر لوگ حکومت، دولت، فتح اور انتقام
کی دعاؤں کے تیروں سے آسمان کا کلیجہ پھلنی کرتے رہتے ہیں یاہز کی دعا کا وجود غنیمت ہے مگر مگر.....

۲

اس سے بحث نہیں کہ فرانس میں یا یورپ میں اس نظم کا اثر کیا ہوا۔ ممکن ہے کہ گدھوں کے ساتھ انسانی سلوک پہلے سے
بہتر ہو گیا ہو۔ قیاس ہے کہ ایسا ہوا۔ بیمار گدھوں کے لئے ہسپتال بنائے گئے اور گدھوں کے ساتھ بدسلوکی کرنے والے مستوجب
سزا قرار دئے گئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اب باقی کرہ زمین پر بھی گدھوں کے ساتھ بمقابلہ سابق بدسلوکی کم ہو جائے اور آخر کار
مفقود ہو جائے۔ محض اپنی نظروں میں اپنا وقار زیادہ کرنے کے لئے انسان مختلف اقسام کی غیر ضروری بدسلوکیوں میں (گدھوں
کے ساتھ بیویوں کے ساتھ) بغیر اس قسم کی نظموں کے بھی کمی کر رہا ہے۔

اس سے بھی بحث نہیں کہ بیزبان حیوانوں کے ساتھ ہزار ہا سال کے مسلسل ظلم کی رو سیاہی کسی بعد کی خود غرضانہ توبہ سے
دھل نہیں سکتی۔ بے زبان حیوانوں پر جو قدرت انسان کو حاصل ہے اور جس طرح انسان نے اپنے اختیار کو استعمال کیا ہے
اس سے فطرت کا اور فطرت کے ساتھ انسان کا منہ ایسی بری طرح کالا ہے کہ اگر اور کسی غرض کے لئے نہیں تو اس ظلم کی پاداش کے
لئے ایک یوم الحساب کی اشد ضرورت ہے۔ انسان کی مکروہ عادتوں میں سے مکروہ ترین یہ ہے کہ ظلم کم کرے تو اپنی روحانی ترقی پر
فخر کرتا ہے۔ شرم کو انسان سے شرم ہے۔

دنیا میں صرف ایک ہی بے رحم ظالم حیوان ہے اور وہ انسان ہے مگر بے رحمی سے بڑھ کر یہ بیجائی ہے کہ انسان آرزو کرے کہ خدا
کے حضور میں مسکین اور نیک گدھوں کے ہمراہ پیش ہو۔ یہ گویا خدا کو بھی ظلم میں شریک ہونے کی دعوت ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے
جفا پیشہ انسان کو بھی وہی رتبہ دے دے جو گدھے کا حق ہے اور یہ محض اس لئے کہ شاعر گدھوں سے محبت کر کے ایک انوکھے
کفارے کا طلبگار ہے۔ گدھوں کے بے تہ میں ہرگز محض ایک شاعر کی محبت کی وجہ سے یہ ناروا کمی نہیں ہو سکتی کہ انسان گدھوں
کے برابر میں بیٹھے۔ یاہز کی یہ آرزو جس غلط خیال پر مبنی ہے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ مختصر اودہ خیال یہ ہے کہ ظالم
مظلوم کے ساتھ ہمدردی کر کے اپنے مظالم کو مٹا سکتا ہے۔ یہ قطعی غلط ہے۔

یامز گوزمانہ حال کا شاعر ہے۔ مگر ایک متروک تخیل کا شکار ہے۔ اسے اتنا بھی پتہ نہیں کہ یہ ہماری دنیا جسے جہلا ایک آئینوالے دوزخ اور ایک آنے والی بہشت کا پیش خیمہ بنائے بیٹھے ہیں دراصل ایک بڑی ہوئی دنیا کا دوزخ ہے۔ اس بڑی ہوئی دنیا میں جو بڑی ہستیاں تھیں وہ یہاں گدھے ہیں۔ جو ان سے بھی زیادہ بُری تھیں وہ یہاں انسان یعنی اس دوزخ کے شیطان ہیں۔ یہ ان شیاطین کی سزا ہے کہ وہ صرف گدھوں پر ظلم نہیں کرتے بلکہ خود اپنے ہمجنسوں پر بھی ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ خدائی کارخانے میں انصاف شاعرانہ قسم کا ہے۔ شیطان سمجھتا ہے کہ شیطان کوئی اور ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا اور یہ دوزخ واقعی ایک دارالامتحان ہوتا تو آج سے لاکھوں پہلے مٹ جاتا۔ کیونکہ انسانوں کے امتحان کی ضرورت نہیں۔

فلک پیم

نگار خانہ چین

دو بانسریاں

ایک دن شام کو میں دریا کے کنارے بیٹھا تھا۔ اس پار سے ایک بانسری کی صدا میرے کان میں آئی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی میں نے اسی وقت بانس کے پیڑ سے ایک نئے کاٹی۔ اور اس بانسری کا جواب دینے کی کوشش کی۔

بس اس شام سے ہر روز رات کو جب بستی والے سو جاتے ہیں۔ تو دریا کے دو نوکناروں سے دو خوش گلو پرند ایک دوسرے کو پکارتے ہیں۔ اور دیر تک پکارتے رہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے آشنا تو نہیں۔ مگر وہ ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتے ہیں۔

عزیز لکھنوی

”شعبہ صنعت“

ہلچل ہے زمانے میں عالم تندرہ والا ہے کس مسک نے اس جانب ملکوں کو اٹھایا ہے
دیراں کدو دل میں اب سیسے دھرا کیا ہے کچھ داغ ہیں حرکت کے کچھ خون تمنہا ہے
ہو عزیم طلب صداق تو یاس نہیں ہوتی جس نے تجھے ڈھونڈا ہے اس نے تجھے پایا ہے
ہر نقش فائیرا ہے شعبہ صنعت میں نے تجھے اے دینا بزرگ میں دیکھا ہے
دل چاہے اگر تیرا تو پوچھ مے دل سے در غم الفت کی ٹیسوں میں مڑا کیا ہے
ہنسنے ہوئے اٹھے ہیں ہمیش کی نیند دل سے شاید کسی مکیں کو روتا ہوا دیکھا ہے
آنے کا عزیز اپنے مطلب کے جانہا ہے جینے کا یہ مطلب اک دن ہیں مڑنا ہے

عزیز لکھنوی

اصغر

روح نشاط

قص مستی دیکھتے جوش تمنا دیکھتے
کم سے کم حسنِ نخل کا تماشا دیکھتے
روزِ روشن مابینِ شب یا صبحِ چمن
اس طرح کچھ رنگ بھجنا نگاہِ شوق میں
صدِ مانِ صد مکانِ ایرِ جانِ آں جہاں
جن کو اپنی شوخیوں پر آج اتنا ناز ہے
جان دے کر ہم نے رکھا ہے حجابِ ہر کو
سا منے لا کر تجھے اپنا تماشا دیکھتے
جلوہِ یوسف تو کیا خوابِ لیلا دیکھتے
ہم جہاں سے چاہتے وہ روتے زیبا دیکھتے
جلوہِ خود مٹیاب ہو جانا وہ پردا دیکھتے
تم نہ آجائے تو ہم جنت میں کیا کیا دیکھتے
وہ کسی دن میری جانِ ناشکیبا دیکھتے
توڑ کر شیشے کو پھر کیا رنگِ صہبا دیکھتے

میکدے میں زندگی ہے شو نو شانوس ہے

مٹ گئے ہوتے اگر ہم جامِ مینا دیکھتے

سید اصغر حسین گونڈوی



اثر

پطرس (سید احمد شاہ بخاری)

(۱) لاہور کا جغرافیہ (مزاحیہ مضمون)

(۲) سیب کا درخت (افسانہ)

(۳) فرمودہ پطرس (فارسی اشعار)

175✓

لاہور کا جغرافیہ

تمہید - تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کہ لاہور کو دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے۔ اس لئے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنے کی اب ضرورت نہیں کہ کڑے کو دائیں سے بائیں گھمایئے حتیٰ کہ ہندوستان کا ملک آپ کے سامنے آکر بٹھ جائے۔ پھر فلاں طول البلد اور فلاں عرض البلد کے مقام انقطاع پر لاہور کا نام تلاش کیجئے۔ جہاں نام کڑے پر مرقوم ہو۔ وہی لاہور کا محل وقوع ہے۔ اس ساری تحقیقات کو مختصر مگر جامع الفاظ میں بزرگ یوں بیان کرتے ہیں۔ کہ لاہور لاہور ہی ہے اگر اس پتے سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا۔ تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔

محل وقوع - ایک دو غلط فہمیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور پنجاب میں واقع ہے۔ لیکن پنجاب اب پنجاب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں۔ اور جو نصف دریا ہے۔ وہ تو اب بہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ طے کا پتہ یہ ہے۔ کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہیں۔ ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا رہتا ہے۔ بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے۔ اس لئے اب یہ بتانا بھی مشکل ہے۔ کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔

لاہور تک پہنچنے کے کئی رستے ہیں۔ لیکن دو اہمیں سے بہت مشہور ہیں۔ ایک پشاور سے آتا ہے اور دوسرا دہلی سے + وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے رستے اور یو۔ پی کے حملہ آور دہلی کے رستے وارد ہوتے ہیں۔ اول الذکر اہل سیف کھلاتے ہیں اور غزنوی یا غوری تخلص کرتے ہیں۔ موخر الذکر اہل زبان کھلاتے ہیں۔ یہ بھی تخلص کرتے ہیں اور اس میں مدد ملتی رکھتے ہیں +

حدود اربعہ - کہتے ہیں کسی زمانے میں لاہور کا حدود اربعہ بھی ہوا کرتا تھا۔ لیکن طلبا کی سہولت کے لئے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے۔ اور روز بروز واقع تر ہو رہا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے۔ کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہو گا جس کا دارالخلافہ پنجاب ہو گا۔ یوں سمجھئے کہ لاہور ایک جسم ہے۔ جس کے ہر حصے پر ورم نمودار ہو رہا ہے لیکن ہر ورم مواد فاسد سے بھرا ہے + گویا یہ توسیع ایک عارضہ ہے جو اس جسم کو لاحق ہے +

آب و ہوا - لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں۔ جو قریباً سب کی سب غلط ہیں حقیقت یہ ہے۔ کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے۔ کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے۔ میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجے پر پہنچی۔ کہ اس ترقی کے دور میں جبکہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ اہل لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں۔ بلکہ ہمدردانہ غور و غوض کی مستحق ہے +

لیکن بد قسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی۔ اس لئے لوگوں کو ہدایت کی گئی۔ کہ مفاد عامہ کے پیش نظر اہل شہر ہوا کا بیجا استعمال نہ کریں۔ بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لئے ہوا کی بجائے گرو اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جابجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لئے مرکز کھول دئے ہیں جہاں یہ مرکبات مفت تقسیم کئے جاتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے۔ کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج برآمد ہونگے +

بھرسائی آب کے لئے ایک سکیم عرصے سے کمیٹی کے زیر غور ہے۔ یہ سکیم نظام سقے کے وقت سے چلی آتی ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ نظام سقے کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اہم مسودات بعض تو تلف ہو چکے ہیں۔ اور جو باقی ہیں ان کے پڑھنے میں بہت دقت پیش آرہی ہے۔ اس لئے ممکن ہے تحقیق و تدقیق میں چند سال اور لگ جائیں۔ عارضی طور پر پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے۔ کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ امید کی جاتی ہے۔ کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر محلے کا اپنا ایک دریا ہوگا۔ جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہونگی۔ اور بھر پھلی کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگلی بھی ہوگی۔ جو رائے دہندگی کے موقع پر ہر رائے دہندہ ہیں کر آئیں گے۔

نظام سقے کے مسودات سے اس قدر ضرورت ثابت ہوئی ہے۔ کہ پانی بچانے کے لئے نل ضروری ہیں۔ چنانچہ کمیٹی نے کڑوڑوں پڑے خرچ کر کے جابجا نل لگوا دئے ہیں۔ فی الحال ان میں ہائیڈروجن اور آکسیجن بھری ہے۔ لیکن ماہرین کی رائے ہے۔ کہ ایک نہ ایک دن یہ گیسیں ضرور نل کر پانی بن جائیں گی۔ چنانچہ بعض بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ چمکتے ہیں۔ اہل شہر کو ہدایت کی گئی ہے۔ کہ اپنے اپنے گھر کے نلوں کے نیچے رکھ چھوڑیں۔ تاکہ مین دفن پر تاخیر کی وجہ سے کسی کی دشمنی نہ ہو۔ شہر کے لوگ اس پر بہت خوشیاں منا رہے ہیں۔

ذرائع آمد و رفت۔ جو سیاح لاہور نشریہ لائف لانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ ان کو یہاں کے ذرائع آمد و رفت کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔ تاکہ وہ یہاں کی سیاحت سے کما حقہ اثر پذیر ہو سکیں + جو سڑک بل کھاتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گزرتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے + یہ وہی سڑک ہے جسے شیر شاہ سوری نے بنایا تھا۔ یہ آثار قدیمہ میں شمار ہوتی ہے۔ اور بیحد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں کسی قسم کا رد و بدل گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خدقین جوں کی توں موجود ہیں جنہوں نے کئی سلطنتوں کے تختے الٹ دئے تھے۔ آجکل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں اُلٹے ہیں اور عظمت رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لئے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پھنپے لگا لیتے ہیں۔ اور سامنے دو ہک لگا کر ان میں ایک گھوڑا ٹانگ دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو تانگہ کہتے ہیں۔ شوقین لوگ اس تختہ پر موجود منڈھ لیتے ہیں۔ تاکہ پھسلنے میں سہولت ہو اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جائے +

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں۔ قصابوں کی دکانوں پر انہی کا گوشت بکنا ہے اور زین کس کر کھایا جاتا ہے۔ تانگوں میں ان کی بجائے بنا سستی گھوڑے استعمال کئے جاتے ہیں بنا سستی گھوڑا شکل و صورت میں و مدار تالے سے ملتا ہے۔ کیونکہ اس گھوڑے کی ساخت میں دم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے۔ حرکت کرنے وقت اپنی دم کو دبا لیتا ہے۔ اور اس

ضبط نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے۔ تاکہ سڑک کا ہر تاریخی گڑھا اور سانگے کا ہر ہچکولا اپنا نقش آپ پر ثبت کر سکا اور آپ کا ہر ایک مسام لطف اندوز ہو سکے۔

قابل دید مقامات - لاہور میں قابل دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ لاہور میں ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دھری بنائی جاتی ہیں۔ پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں۔ اور پھر اس پر اشتہاروں کا پلستر کر دیا جاتا ہے۔ جو دیوارت میں رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکائے جاتے ہیں۔ مثلاً اہل لاہور کو مژدہ "یا" اچھا اور ستامال "اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے۔ جن کے مخاطب اہل علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں۔ مثلاً گریجویٹ ورزی ہاؤس "یا" سٹوڈنٹوں کے لئے نا در موقعہ "یا" کہتی ہے ہم کو خلق خدا غائبانہ کیا۔ "رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری ایک مکمل ڈاکٹر کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دروازے کے اوپر بوٹ پائش کا اشتہار ہے۔ دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتہ مندرج ہے۔ بائیں طرف حافظے کی گولیاں کا بیان ہے۔ اس کھڑکی کے اوپر انجمن خدام ملت کے جلسے کا پروگرام چسپاں ہے۔ اس کھڑکی پر کسی مشہور لیڈر کے ناگہی حالات بالوضاحت بیان کر دئے گئے ہیں۔ عجمی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مس نغمہ جہان کی تصویر اور ان کے فلم کے محاسن گنوار کھے ہیں۔ یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں اور ہر نیا مژدہ۔ ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلاب عظیم کی اطلاع چشم زدن میں ہر ساکن چیز پر لپ دی جاتی ہے۔ اس لئے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ اور ان کے پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو بجد وقت پیش آتی ہے۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے۔ کہ بعض بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے خود دیوار پر نقش کر دئے جاتے ہیں۔ یہ وقت بہت حد تک رفع ہو گئی ہے۔ ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ نہیں رہا۔ کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لئے بھول جائے۔ کہ پچھلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا تھا اور لوٹتے تک وہاں اہالیان لاہور کو تازہ اور کھسنے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب وٹوئی سے کہا جاسکتا ہے۔ کہ جہاں بحدت جلی "محمد علی دندان ساز" لکھا ہے۔ وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے۔ جہاں "بجلی پانی بھاپ کا بڑا ہسپتال لکھا ہے۔ وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں۔ خالص گھی کی مٹھائی "قتیبا علی صاحب ناز" کا مکان ہے۔ "کرشنا بیوٹی کریم" شالامار باغ کو اور "کھانسی کا مجرب نسخہ" جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

صنعت و حرفت - اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔ ہر سالے کا ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے۔ اور عام نمبر صرف خاص موقعوں پر شائع کئے جاتے ہیں۔ عام نمبر میں صرف ایڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کچن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں۔ اس سے ادب کو بہت فروغ نصیب ہوتا ہے۔ اور فن تنقید ترقی کرتا ہے۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے۔ پریزیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں۔ اس لئے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں۔ چونکہ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں۔ اس لئے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کا افتتاح کرتا ہے۔ سہ پہر کو کسی سنیما کی انجمن میں مس نغمہ جان کا تعارف کرتا ہے۔ اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈرامے میں شامل ہوتا ہے۔ اس سے ان کا مطمح نظر وسیع رہتا ہے۔ تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے۔ جو تینوں موقعوں کا کام آسکتی ہے۔ چنانچہ سامعین کو بہت سہولت ہوتی ہے۔

پیداوار۔ لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلباء ہیں۔ جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں ہونی جاتی ہے اور عموماً اواخر بہار میں پاک کر تیار ہوتی ہے +

طلباء کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چند مشہور ہیں۔ قسم اول جمالی کہلاتی ہے۔ یہ طلباء عام طور پر پہلے درزیوں کے ہاں تیار ہوتے ہیں۔ بعد ازاں دھوبی اور پھرنائی کے پاس بھیجے جاتے ہیں۔ اور اس عمل کے بعد کسی رسٹورنٹ میں ان کی نمائش کی جاتی ہے۔ غروب آفتاب کے بعد کسی سینما یا سینما کے گرد و نواح میں رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے۔ شمعیں کٹی ہوتی ہیں لیکن سب کی تصاویر ایک البم میں جمع کر کے اپنے پاس رکھ چھوڑتے ہیں۔ اور تعطیلات میں ایک ایک کو خط لکھتے بہتے ہیں۔ دوسری قسم جلالی طلباء کی ہے۔ ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے۔ اس لئے ہندوستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لئے نکلتے ہیں اور جو دو سخا کے خم لٹکھاتے پھرتے ہیں۔ کالج کی خوراک انہیں راس نہیں آتی۔ اس لئے ہاسٹل میں فروکش نہیں ہوتے۔ تیسری قسم خیالی طلباء کی ہے۔ یہ اکثر روح اور اخلاق اور آواگون اور جمہوریت پر باوازد بلند خیالات کرتے پائے جاتے ہیں۔ اور آفریش اور نفسیات جنسی کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے بہتے ہیں۔ صحت جسمانی کو ارتقاء انسان کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے علی الصباح پانچ چھ ڈنر پیتے ہیں اور شام کو ہاسٹل کی چھت پر گرے سانس لیتے ہیں۔ گاتے ضرور ہیں لیکن اکثر بے سرے ہوتے ہیں چوتھی قسم خالی طلباء کی ہے۔ یہ طلباء کی خالص ترین قسم ہے۔ ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا۔ کتابیں امتحانات۔ مطالعہ اور اس قسم کے خرچے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے۔ جس معصومیت کو ساتھ لے کر کالج میں پہنچے تھے اسے آخر تک ملوث ہونے نہیں دیتے اور تعلیم اور نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح تئیس دانوں میں زبان رہتی ہے +

پچھلے چند سالوں سے طلباء کی ایک اور قسم بھی دکھائی دینے لگی ہے لیکن ان کو اچھی طرح سے دیکھنے کے لئے محرب شیشے کا استعمال ضروری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت پر ملتا ہے۔ اور اگر چاہیں۔ تو اپنی اتنا کے ساتھ زنا ڈبے میں بھی سفر کر سکتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر شرط عائد کر دی ہے۔ کہ آئندہ صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کئے جائیں۔ جو دو دوہ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں +

طبعی حالات۔ لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں +

سوالات

- (۱) لاہور تمہیں کیوں پسند ہے ؟ مفصل لکھو۔
- (۲) لاہور کس نے دریافت کیا اور کیوں ؟ اس کے لئے سزا بھی تجویز کرو۔
- (۳) میونسپل کمیٹی کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھو۔





جان گالزوردی

سیب کا درخت

”سیب کا درخت۔ موسیقی اور سنہری پھول“
(ہیالٹس)

جنگل کی پہلی اونچی پہاڑی تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسے ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں دو نو بیٹھ کر لےج کھائیں (ایشرسٹ کو تو کبھی کسی چیز کی تلاش نہ تھی)۔ ادھر ادھر چاروں طرف غرز کے سنہری پھول آگے آگے تھے۔ لالچ کے ہرے ہلکے پھلے پھلے پھولوں پر ادھر ادھر کی دھوپ پڑ رہی تھی۔ اور ان میں سے لیموؤں کی خوشبو آرہی تھی۔ سامنے گہری وادی کا منظر جنگل کے لمبے لمبے ٹیلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ ٹیلا کو آبی رنگوں سے تصویریں کھینچنے کا شوق تھا۔ ہر ارمان انگیز منظر اس کے دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا۔ اس پر طبیعت ایسی کہ جھٹ ہر بات کا فیصلہ کر لیتی۔ چنانچہ یہی مقام اسے موزون معلوم ہوا۔ رنگوں کا ڈیہ ہاتھ میں لیا۔ اور موٹر سے نیچے اتری۔

”کیوں فرینک؟ یہ جگہ ٹھیک ہے؟“

ایشرسٹ کی شکل کچھ کچھ شلر سے ملتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا۔ کہ اس کے ڈاڑھی تھی۔ شلر کے ڈاڑھی نہ تھی۔ گالوں پر کے ہال سفید تھے۔ لمبا قد۔ لمبی لمبی ٹانگیں۔ بڑی بڑی بھورے رنگ کی کھوئی کھوئی سی آنکھیں۔ جو پر معنی ہوتیں تو چہرے پر ایک حس آجاتا۔ ناک ذرا ایک طرف کو۔ ڈاڑھی اور مونچھوں کے بیچ میں

اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ کے دن ایشرسٹ اور اس کی بیوی جنگل کے کنارے موٹر میں سیر کر رہے تھے۔ ان کا ارادہ تھا۔ کہ دن بھر سیر کرنے کے بعد رات اس تقریب کی خوشی میں ٹور کی کے مقام پر گزریں۔ جہاں ان دو نو کی سب سے پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ تجویز ٹیلا ایشرسٹ کی تھی۔ جس کی فطرت میں جذبہ پرستی کی ایک جھلک بھی پائی جاتی تھی۔ ٹیلا میں اب وہ پہلے کا ساحل نہ تھا۔ نہ وہ نیلی آنکھیں۔ نہ وہ پھول کی سی لطافت۔ نہ وہ چہرے اور اعضاء کی نازک پاکیزگی جسے دیکھ کر آنکھوں کو تسکین ہوتی تھی۔ نہ وہ سیب کے شگونے کی سی رنگت جس نے آج سے پچیس سال پہلے ایشرسٹ کے دل کو ایک ہی جھلک میں موہ لیا تھا۔ لیکن تینتالیس برس کی عمر ہونے پر بھی اپنے شوہر کی وفادار رفیق تھی۔ چہرہ اب بھی حسین تھا۔ گالوں پر ہلکے ہلکے داغ پڑ گئے تھے۔ اور آنکھوں میں ایک لبریزی سی آگئی تھی۔

ٹیلا ہی نے موٹر کو ایسے مقام پر ٹھہرایا۔ جہاں بائیں ہاتھ کو مرغزار کی اونچی چڑھائی تھی۔ اور جنگل کا ایک تنگ سا خطہ جس میں زیادہ تر بیج اور لالچ اور کہیں کہیں چیر کے درخت آگے ہوئے تھے۔ اس وادی کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ جو سڑک سے لے کر گھرے

ہونٹ ذرا کھلے ہوئے۔ اڑتالیس برس کی عمر۔ چپ چاپ کھانے کی ٹوکری اٹھائے موٹر سے نیچے اتر پڑا۔

”دیکھو فرینک! قبر!“

مرغزار کی اونچان سے ایک پاک ڈنڈی نیچے کو اترتی تھی۔ جو جنگل کے تنگ خطے کے ساتھ ہو کر ایک پھاٹک میں سے نکل جاتی تھی۔ جہاں یہ پاک ڈنڈی سڑک کو عموداً کاٹتی تھی۔ وہاں سڑک کے کنارے سٹی کی ایک ڈھیری تھی۔ چھ فٹ لمبی۔ فٹ بھر چوڑی۔ ادھر گھانس اگی ہوئی تھی۔ مغرب کو ایک پتھر کھڑا تھا۔ جس پر کوئی اللہ کا بندہ بلیک تھارن کی ایک ٹہنی اور کچھ نیلے پھول ڈال گیا تھا۔ ایشرسٹ نے قبر کو دیکھا۔ تو شاعرانہ دل امنڈ آیا۔ سوچا چوراہے پر تو اسی شخص کی قبر بناتے ہیں جس نے خودکشی کی ہو! اللہ اللہ خانی انسان بھی کیسے کیسے تو ہمت پر تکیہ کرتا ہے! لیکن جو کوئی بھی یہاں دفن ہے۔ سکھ کی نیند سو رہا ہے۔ قبر کے سرہانے ایک نامہوار سا پتھر ہے۔ سر پر کھلے آسمان کا سا تباہ ہے اور راہ چلتے لوگ فاتحہ پڑھ جاتے ہیں طبعی موت فرما۔ تو کسی قبرستان میں سیلا ہوا مقبرہ ہوتا۔ اور چاروں طرف بدوضع قبریں۔ جن پر طرح طرح کے لامعاصل کلمات کندہ ہوتے۔ منہ سے کچھ نہ بولا۔ جانتا تھا گھر کے لوگوں میں فلسفہ بگھارنا بیسود ہے۔ چپ چاپ مرغزار کی جانب چل دیا۔ ایک دیوار کے نیچے کھانے کی ٹوکری رکھی۔ بیوی کے بیٹھنے کو کہیں بچھایا۔ (کیونکہ جب اسے بھوک لگی۔ تو تصویر کشی چھو کر یہیں آئیگی) اور حیب سے قرے کا ہپالٹس کا ترجمہ نکالا۔ تھوڑی دیر میں سپرین اور اس کے انتقام کی داستان پڑھ چکا۔ تو آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ نیلگوں آسمان پر بگلا سے بادلوں کو دیکھ کر ایشرسٹ کا دل آج اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ کے دن نہ معلوم کس چیز کے لئے تڑپنے لگا۔ سچ ہے۔ زندگی اور فطرت انسانی کا آپس میں جوڑ نہیں! انسان کی زندگی کتنی ہی پاک اور ارفع ہو۔ پھر بھی اندری اندر ایک ہوس ایک جستجو لگی رہتی ہے۔ اور زندگی خالی خالی معلوم ہوتی

ہے۔ کیا عورتوں کے دل کا بھی یہی حال ہے؟ یہ کون جانے! انسان میں ایک جدت پسندی ہے جس کی وجہ سے وہ نئے عیش کی تلاش میں رہتا ہے۔ اور مستانہ وار نئے خطروں میں پڑنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر اس کی تسکین ہو جائے۔ تو جہاں پہلے طبیعت میں ایک تنگی تھی۔ وہاں اب ایک سیری آ جاتی ہے۔ طبیعت اکٹا جاتی ہے! اطمینان مفقود ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ یہ مرض لاعلاج ہے۔ زندگی اور تہذیب یافتہ انسان کا آپس میں جوڑ نہیں! انسان کو یہ قدرت تو حاصل ہے۔ کہ حسن کو فن کے کسی نمونے کے اندر قید کر کے ہمیشہ کے لئے ایک جگہ جکڑ رکھے۔ اور جب اسے دیکھے یا پڑھے۔ ہمیشہ اسی قابل قدر علو اسی تسکین بخش نشے کا احساس ہو۔ لیکن اُسے یہ قدرت نہیں۔ کہ اسی طرح اپنی زندگی کے اندر بھی اپنی مرضی کا ایک گلزار بنائے۔ جس میں بقول اس خوش گفتار یونانی کورس کے ”سیب کا درخت ہو۔ موسیقی ہو اور سنہری پھول ہوں۔“ جس انسان کے اندر احساس حسن موجود ہے اُسے زندگی میں جنت نہیں مل سکتی۔ دائمی مسرت اس کے قبضے سے باہر ہے۔ بعض بعض لمحے البتہ اس قسم کی دلفریبی سے ضرور معمور ہوتے ہیں۔ جن میں ایک سرریعہ بخودی آپ ہی آپ انسان پر طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن جتنی دیر میں ایک بادل سوچ کے سلسلے سے گزر جاتا ہے۔ اتنی دیر میں یہ لمحے بھی گزر جاتے ہیں جس طرح فن حسن کو قید کر لیتا ہے۔ اسی طرح ان لمحوں کو قید کر رکھنا ممکن نہیں۔ یہ اُن لمحوں کی طرح گریز پا ہیں۔ جن میں انسان کو اُس روح فطرت کے درخشاں یا بھلملاتے ہوئے جلوے کی ایک بھلاک دکھائی دے جاتی ہے۔ جو انسانوں سے دور اپنی سوچ میں مستغرق بیٹھی ہے۔ اس مقام پر اور اس لمحے کے اندر جیکہ دھوپ اس کے چہرے پر پڑ رہی ہے۔ تھارن کے درخت پر گنگو بول رہا ہے۔ گورس کی خوشبو سے ہوا میں شہد کی سی چاشنی ہے۔ چاروں طرف بلیک تھارن اور نوخاستہ قرن کے چھوٹے چھوٹے پتوں کی ہر بادل ہے اور سفید براق بادل پہاڑیوں اور پرکیف وادیوں کے ادھر آسمان پر

ایک پگ ڈنڈی جنگل کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی سڑک کو کاٹ کر نکل جاتی تھی۔ دونوں دوست سڑک کے کنارے گھاس پر بیٹھے سستا رہے تھے اور جیسا کہ نوجوانوں کا قاعدہ ہے۔ کائنات کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ دونوں کا قد چھ فٹ سے اونچا تھا۔ اور جسم چھرا ایشرسٹ کا رنگ ذرا پیلا تھا۔ تجیل پسند طبیعت۔ ہمیشہ کھوپا کھریا سا رہتا تھا۔ گارٹن نے نرالی طبیعت پائی تھی۔ جس کا اندازہ پوری طرح لگانا مشکل تھا۔ کچھ کرخت تھا۔ کچھ ٹیڑھا بینکا جیسے زمانہ قدیم کا کوئی حیوان ہو۔ دونوں کو ادب سے بہت دلچسپی تھی۔ دونوں سر سے ننگے تھے۔ ایشرسٹ کے بال ہلکے رنگ کے۔ ملائم اور لمروں والے تھے۔ اور کنپٹیوں پر سے یوں اوپر کو اٹھتے تھے جیسے کوئی ہمیشہ انہیں پیچھے کو جھٹک رہا ہو۔ گارٹن کے بال سیاہ رنگ کے تھے۔ اور از حد بے ترتیب۔ دو دو دوست چلتے چلتے میلوں نکل گئے تھے۔ لیکن بسنے میں اپنے سوا اور کوئی رہرو نظر نہ آیا تھا۔

گارٹن کہ رہا تھا۔ تم میری بات مان لو۔ رحم صرف شعور نفس کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جو آج سے پانچ ہزار سال پہلے مفقود تھا۔ جب رحم نہ تھا تو دنیا کے لوگ زیادہ مزے میں تھے ایشرسٹ نے جو بادلوں کی حرکت کا تاثر دیکھ رہا تھا۔ جواب دیا۔ بہر حال میرا یہ عقیدہ ہے۔ کہ دنیا میں رحم کا وہی رہنہ ہے۔ جو صدف کے اندر موتی کا ہے۔

گارٹن بولا۔ ہر خوردار موجودہ زمانے کی تمام بے اطمینانی رحم ہی کا نتیجہ ہے۔ جانوروں کو دیکھو۔ امریکہ کے اصلی باشندوں کو دیکھو انہیں صرف اپنے اپنے دلکھ کا احساس ہے۔ اور اس کا موقع بھی کبھی کبھی پیش آتا ہے۔ لیکن ہمیں دیکھو۔ کس دوسرے کی داڑھ میں بھی درد ہو۔ تو ہم بیقرار ہو جاتے ہیں۔ آخر اوروں پر ترس گھانے سے کیا حاصل؟ میں توکتا ہوں۔ وحشیوں کی طرح دوسروں کے غم سے نجات حاصل کر لو اور اطمینان سے رہو۔

ایشرسٹ نے کہا۔ میرا شرط لگاتا ہوں۔ کہ تم اس پر عمل کبھی

ہلکے ہلکے اڑ رہے ہیں۔ ایشرسٹ کی آنکھوں کے سامنے قدرت کا جلوہ پنہاں بے نقاب ہے۔ لیکن چشمِ زدن میں یہ جلوہ غائب ہو جائیگا۔ جیسے پتہ کا چہرہ جو ایک چٹان کے کونے پر سے دکھائی دے رہا ہو۔ انسان کی نگہ سے خوفزدہ ہو کر غائب ہو جاتا ہے۔ ایشرسٹ کیلکٹ اٹھ بیٹھا۔ اسے کیلکٹ اس بات کا احساس ہوا۔ کہ گھاس کا یہ تختہ۔ یہ تنگ سی سڑک۔ پیچھے یہ پرانی دیوار۔ یہ سب منظر کچھ پاؤں سا معلوم ہوتا ہے۔ جب وہ موڑ میں سوار تھے۔ تو اس نے خوب عادت اس طرف توجہ نہ کی تھی۔ لیکن اب تو وہ آنکھیں بھاڑ بھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس مقام سے کوئی آدھ میل کے فاصلے پر ایک فارم ہاؤس واقع تھا۔ جہاں سے وہ پچیس سال ہوئے ایک دن اسی موسم میں ٹور کی کوریوراء ہوا تھا۔ اوریوں سمجھتے کہ پھر کبھی واپس نہ آیا تھا۔ دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ گذشتہ زندگی کا ایک ایسا لمحہ یاد آ گیا جس کی دلفریبی اور بخودی ہاتھ میں آکر نکل گئی تھی۔ ایک ایسا لمحہ جو پھر ٹیڑھا ہوا کسی نامعلوم دنیا کو اڑ گیا تھا۔ دفعۃً ایک ایسے ریلنے کی یاد پھر تازہ ہو گئی جو شیرینی اور شہاب سے لبریز تھا۔ لیکن جو کیلکٹ منقطع ہو گیا تھا۔ ہاتھوں کو ٹھوڑی کے نیچے رکھے اوندھے منہ زمین پر لیٹ گیا اور نوخاستہ سبزے کو جس کے نیچے میں ہلکے ورٹ کے ننھے ننھے پھول اگ رہے تھے۔ کھوئی ہوئی نظروں سے ملتا رہا۔

اور جو کچھ اُسے یاد آیا۔ وہ یہ تھا۔

(۱)

فرینک ایشرسٹ اور اس کا دوست رابرٹ گارٹن ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ زمانہ تعلیم کا آخری سال گزار چکنے کے بعد یکم مئی کو دونوں سیاحت کی غرض سے پایادہ سفر کر رہے تھے۔ برٹینٹ سے میل چلے تھے اور ارادہ تھا۔ کہ چیگ فورڈ پہنچ کر دم لینگے۔ لیکن ایشرسٹ کے گھٹنے میں ایک دفعہ فٹ بال کھیلنے میں چوٹ لگی تھی۔ چلتے چلتے گھٹنے میں درد ہونے لگا۔ یہاں تک کہ قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔ نقشے کو دیکھا۔ تو ابھی سات میل باقی تھے۔ ایک چوراہے کے پاس جہاں

نہ کر و گئے۔
گمارٹن غور و فکر کے انداز میں اپنے بے ترتیب بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔
”رکھ رکھاؤ کی زندگی میں انسان پوری طرح نشوونما نہیں پاسکتا۔ جذبات کو اپنے اوپر حرام کر لینا غلطی ہے۔ ہر جذبہ مفید ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے زندگی کو سیرانی حاصل ہوتی ہے۔“
”اور اگر کوئی جذبہ توقیر نسواں کے اصول کے منافی ہو۔ تو پھر؟“
”تم نے بالکل انگریزوں کی سی بات کی ہے۔ انگریزوں کے سامنے جذبے کا ذکر کرو۔ تو وہ سمجھتے ہیں۔ اس سے مراد جسمانی لذت ہے، وہ جذبے کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ لیکن شہوت سے نہیں گھبراتے۔ بشرطیکہ کسی اور کو معلوم نہ ہو جائے۔“
”ایشٹرسٹ نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ ایک ننھے سے نیلے رنگ کے پھول کو آسمان کے سامنے رکھ کر گھما رہا تھا۔ تھارن کے ایک درخت پر لگنے والے بولنا شروع کیا۔ خوش رنگ آسمان کے نیچے۔ جہاں چل آگے بڑھے ہوں اور پرندے چھا رہے ہوں۔ رابرٹ کی باتیں کتنی بے معنی معلوم ہوتی تھیں۔ ایشٹرسٹ بولا۔

”یہاں پاس ہی کوئی فارم ایسا نہیں جہاں ہم رات گزار سکیں؟ میں چل نہیں سکتا۔ میری ٹانگ دکھتی ہے۔“
”لڑکی بغیر شرٹ کے نرم نازک اور پیاری آوازیں بولی۔
”جناب یہاں قریب تو ہمارا ہی فارم ہے۔“
”کہاں؟“

”اس طرف۔ نیچے کو۔“
”ہم وہاں رات گزار سکتے ہیں؟“
”میرا خیال تو ہے۔“
”تو ہمیں رستہ بتا دو۔“
”آئیے۔“

ایشٹرسٹ لنگڑاتا لنگڑاتا ساتھ چل پڑا۔ جب وہ چپ ہوا تو گمارٹن نے جرح شروع کر دی۔
”تم ڈیون شائر کی بھینے دالی ہو؟“
”نہیں جناب!“
”تو پھر؟“

”میرا وطن ویلز میں ہے۔“
”ٹھیک۔ میں بھی کتنا تھا کہ شکل سے تو تم کیلٹ معلوم ہوتی

”چلو اب چلیں۔ کسی فارم میں جگہ مل جائے۔ تو رات وہیں گزاریں۔“
جب یہ الفاظ کہے تو وہ دیکھ رہا تھا۔ کہ سامنے ایک لڑکی ٹوگری اٹھتا مرغزار کی ادبچان سے نیچے اتر رہی ہے۔ آسمان کے بالمقابل (جو ایشٹرسٹ کو لڑکی کے خمیدہ بازوؤں سے دکھائی دے رہا تھا) اس کے جسم کا خاکہ واضح نظر آ رہا تھا۔ ایشٹرسٹ نے جو حسن کا نظارہ کیا کرتا تھا۔ بغیر یہ سوچنے کے کہ اس سے فائدہ کیا پہنچتا ہے۔
دل میں کہا۔ ”بہت خوب!“ لڑکی نے گہرے رنگ کے موٹے اونٹنی کے کپڑے کا سایہ پہن رکھا تھا۔ ہوا کے زور سے سایہ اس کی ٹانگوں کے ساتھ چمٹ رہا تھا۔ اور اس کی پھٹی پرانی طاؤسی رنگ کی ٹوپی اور پٹا گئی تھی۔ بھورے رنگ کا بلاؤزر پرانا اور گھسا ہوا تھا جو تپتے ہوئے تھے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ سرخ اور

ہو — تو یہ فارم تمہارا نہیں؟
 "نہیں۔ میری خالہ کا ہے۔"

"اور تمہارا خالو؟"
 "وہ زندہ نہیں۔"

"تو فارم کا کام کون چلاتا ہے؟"

"میری خالہ اور خالہ کے تین لڑکے۔"

"تمہارا خالو تو ڈیون شائر کا رہنے والا تھا؟"
 "جی ہاں۔"

"تمہیں یہاں آئے ہوئے بہت عرصہ گزر چکا ہے؟"
 "سات سال۔"

"ویلز کے بعد یہ جگہ نہیں کچھ پسند بھی آئی؟"
 "معلوم نہیں جناب۔"

"شاید تمہیں ویلز اب یاد بھی نہ رہا ہو؟"

"اچھی طرح یاد ہے۔ وہ جگہ تو کچھ اور ہی تھی۔"
 "مجھے بھی تم سے اتفاق ہے۔"

ایشر سٹ یسٹ بولا۔

"تمہاری عمر کیا ہے؟"

"جناب۔ سترہ سال۔"

"اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"میگن ڈیوڈ۔"

"ان کا نام رابرٹ گارٹن ہے۔ میرا نام فرینک ایشر سٹ ہے۔ ہمارا ارادہ تو تھا۔ کہ چیگ فورڈ پہنچنے سے پہلے

دم نہ لیں۔ لیکن —"

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کی ٹانگ دکھ رہی ہے۔"

ایشر سٹ مسکرا دیا۔ اور جب وہ مسکراتا تھا تو اس کے

چہرے پر ایک حسن سا آجاتا تھا۔

ادنیچان سے نیچے اتر کر جنگل کے برابر سے نکلے تو سامنے

فارم دکھائی دیا۔ پتھر کی ایک عمارت تھی۔ لمبی اور نیچی نیچی۔ کھڑکیوں میں
 پٹ لگے تھے۔ ارد گرد ایک احاطہ تھا۔ جس میں سوڑ اور مرغیاں اور ایک
 بوڑھی گھوڑی ادھر ادھر پھر رہی تھی۔ پرے کو گھاس سے ڈھکی ہوئی
 ایک پہاڑی تھی۔ جس پر سکاچ فرکے چند درخت اگے رہے تھے۔
 سامنے سیب کے درختوں کا ایک پرانا باغ تھا جن کے شگوفے پھوٹ
 رہے تھے۔ باغ کے کنارے کنارے ایک ندی بہ رہی تھی۔ اور ندی
 کے پار ایک لمبا مرغزار پھیلا ہوا تھا۔ سیاہ اور ترچھی آنکھوں والا
 ایک چھوٹا سا لڑکا ایک سوڑ کی رکھوالی کر رہا تھا۔ گھر کے دروازے
 کے پاس ایک عورت کھڑی تھی جو انہیں دیکھ کر آگے بڑھی۔ لڑکی نے
 کہا۔۔

"یہ میری خالہ مسز نیرو کو موب ہیں"

خالہ مسز نیرو کو موب کی آنکھ بچوں والی جنگلی بطخ کی مانند سیاہ اور
 تیز تھی۔ گردن میں بھی وہی سانپ کی سی اٹھان تھی۔

ایشر سٹ نے کہا۔ "ہیں آپ کی بھانجی بے تے میں مل گئی۔ یہ کہتی
 ہے۔ یہاں رات بسر کرنے کا انتظام ہو جائیگا۔"

"ہو تو جائیگا۔ لیکن آپ دو نو کو ایک ہی کمرے میں سونا پڑیگا۔"

میگن بیٹی جاؤ۔ وہ خالی کمرہ ان کے لئے صاف کر دو۔ کمرے کا
 ایک پہلہ بھی لیتی آنا۔ چائے تو آپ پیئینگے؟

یو کے دو درختوں اور چند پھولدار جھاڑیوں سے ایک محراب
 سی بنی ہوئی تھی۔ لڑکی اس میں سے گزر کر گھر کے اندر غائب ہو گئی

گلابی رنگ کے پھولوں اور یو کے سبز پتوں کے سامنے اس کی ٹپٹی
 کا طاؤسی رنگ بھلا معلوم ہوتا تھا۔

"آپ کی ٹانگ میں تکلیف ہو رہی ہوگی۔ چل کر پارلر کے اندر آؤ
 کیجئے۔ آپ کالج میں پڑھتے ہیں؟"

"پڑھتے تھے اب تو فارغ ہو چکے۔"

مسز نیرو کو موب نے دانشمندانہ انداز میں سر ہلایا۔
 پارلر کا فرش اینٹوں کا تھا اور اس پر چمکتی ہوئی صاف کرسیاں

تھارن کے درخت اور جنگلی پھول اُگ رہے تھے۔ پرے ایک اونچے مگر ہموار ٹیلے پر بیچ کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ ہر شاخ ہوا میں جھوم رہی تھی۔ بہار کا ہر پرندہ چہچہا رہا تھا۔ اور سورج کی ترچی شعاعوں سے گھاس پر دھوپ چھاؤں کی شطرنجی سی بھی تھی۔ اسے کئی چیزیں یاد آئیں۔ تھیوٹرٹس اور دیائے چرل۔ چاندنی اور وہ دیوڑ جس کی آنکھوں میں شبنم کی سی تازگی اور طراوت تھی۔ اتنی باتیں یاد آئیں کہ معلوم ہوتا تھا۔ کسی بات کا خیال نہیں اور وہ بغیر کسی وجہ کے خوش تھا۔

۲

چائے دیر سے پی گئی۔ لیکن تھیوٹرٹس کھانے کو ساتھ انڈے کریم۔ مرتبہ اور پتلے پتلے تازہ کیک تھے جن پر زعفران کے پھینٹے دئے ہوئے تھے۔ چائے کے دوران میں گارٹن کیلٹ قوم کے متعلق ایک طویل تقریر کرتا رہا۔ ان دنوں ہر جگہ کیلٹوں کا چرچا تھا۔ گارٹن خود بھی کیلٹ تھا۔ اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کہنے میں بھی اسی قوم کا خون موجود ہے۔ تو اس قدر دلچسپی پیدا ہوئی کہ اپنے سے باہر ہو گیا۔ وہ ایک کرسی پر دراز تھا۔ جس کے گدیوں میں گھوڑے کے بال بھرے تھے۔ ہاتھ کا بنا یا ہوا ساگرٹ اس کے خمدار ہونٹوں کے کجج ہیں جیسے لٹک رہا تھا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی سرد مہر آنکھوں کو ایشرسٹ کی آنکھوں میں ڈالے اہل ویلز کی شائستگی کو سراہتا رہا۔ ویلز کو چھوڑ کر انگلستان میں آجانا ایسے ہی ہے جیسے انسان چینی کے برتنوں کو چھوڑ کر مٹی کے برتن استعمال کرنے لگے۔ فرینک آخر پھر انگریز ہے۔ اسے کیا معلوم اس ویلز کی رہنے والی لڑکی میں کس درجہ شائستگی اور اس کی فطرت میں جذبات کی کس قدر گنجائش ہے! اپنے گیلے سیاہ بالوں کو ہلکے ہلکے اپنی انگلیوں سے پریشان کرتا رہا اور بالو صاحت یہ ثابت کیا کہ یہ لڑکی عین بین ان نظموں کے مطابق ہے۔ جو ویلز کے کسی داستان گو شاعر نے بارہویا صدی میں لکھی تھیں۔

ایشرسٹ سو فے پر چت لیٹا گرے رنگ کا ایک پائپ پی رہا تھا۔ تھا قد اور اس لئے ٹانگیں سو فے سے بہت باہر نکلی ہوئی تھیں اس نے گارٹن کی باتوں کو توجہ سے نہ سنا۔ جب لڑکی دوبارہ کیک

اور ایک سونا پڑا تھا جس کے گدیوں میں گھوڑے کے بال بھرے ہوئے تھے۔ ایک میز تھی۔ مگر اس پر میز پوش نہ تھا۔ مگر اس قدر صاف تھا کہ معلوم ہوتا تھا کبھی استعمال نہیں ہوا۔ ایشرسٹ فوراً سو فے پر جا بیٹھا اور دیکھتے ہوئے گھٹنے کو ہاتھوں میں تھام لیا۔ مسز نیرو کو صبر اسے بغور دیکھتی ہی ایشرسٹ اپنے باپ کا اکھوتا بیٹا تھا۔ اس کا باپ کیمیا کا ایک سابق پروفیسر تھا۔ تاہم لوگوں کو اس لڑکے میں امیرانہ نگہ نظر آتا تھا۔ گو ایشرسٹ کو اپنی عالی نگاہی کی وجہ سے اکثر ان کی موجودگی تک کا احساس نہ ہوتا۔

”یہاں کوئی ندی ہے۔ جہاں ہم نہا سکیں؟“

”باغیچے کے ساتھ ایک ندی ہے۔ لیکن اس میں تو بیڑ کر بھی سڑک پانی نہیں پہنچتا۔“

”کتنی گہری ہے؟“

”یہی کوئی ڈیڑھ فٹ۔“

”ادہ تو بہت ٹھیک ہے۔ ہے کس طرف کو؟“

”جگ ڈنڈی کے ساتھ ساتھ چلے جائیے۔ دائیں ہاتھ کو جو دوسرا پھاٹک آئیگا۔ پلوں میں سے گزر کر سامنے ایک بڑا ساسیب کا درخت ہے۔ سب سے الگ۔ اس کے پاس ہی تالاب ہے۔ مچھلیاں کھپنے کا شوق ہو تو تالاب میں مچھلیاں بھی ہیں۔“

”مچھلیاں ہمیں ہی نہ کھڑیں۔“

”مسز نیرو کو صبر مسکرا دی اور بولی۔“ جب آپ واپس آئیئے تو چائے تیار ہوگی۔“

ندی میں ایک جگہ ایک چٹان کا بند لگا تھا۔ جس سے پانی رک گیا تھا اور ایک تالاب سا بن گیا تھا جس کی تہ ریتی تھی۔ وہ بڑا ساسیب کا درخت سب درختوں سے نیچا تھا۔ اتنا نیچا کہ اس کی شاخیں ندی کے پانی پر جھکی پڑتی تھیں۔ کونپلیں پھوٹ آئی تھیں۔ شگو فے کھلنے کو تھے اور قرمز کی کلیاں چٹک رہی تھیں۔ اس چھوٹے سے تالاب میں ایک ہی آدمی نہا سکتا تھا۔ چنانچہ ایشرسٹ کنا سے پر منتظر کھڑا اپنے گھٹنے کو ملتا رہا۔ اور اس مرغزار کا نظارہ کرتا رہا۔ جس میں چٹانوں کے درمیان

ظاہر تھا۔ کہ یہ لوگ کھانے پر بیٹھنے والے ہیں۔ چنانچہ گارٹن بولا :-

”اگر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم کھانے کے بعد آجائیں“ اور جواب کا انتظار کئے بغیر دونو پھر پارلر میں آ بیٹھے۔ لیکن باورچیخانے کی اس رونق۔ اس گرامہٹ ان خوشبوؤں اور ان چہروں کے بعد یہ چمک دار کردہ پہلے سے بھی کچھ اجازت معلوم ہونے لگا۔ دونو دوست پڑمردہ ہو کر پھر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

”لڑکے شکل سے بالکل جیسی معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں صرف ایک لڑکا سیکن تھا۔ وہ جو بیٹھا بندوق صاف کر رہا تھا۔ اور وہ لڑکی تو نفسیاتی نقطہ نظر سے دقیق مطالعے کی چیز ہے“ ایشرسٹ کے ہونٹ پھر ٹک اٹھے۔ گارٹن اُسے اس وقت بالکل گدھا معلوم ہوتا تھا۔ دقیق مطالعے کی چیز! کیا بکو اس ہے! وہ لڑکی تو جنگل کا ایک پھول ہے۔ جسے دیکھنے سے دل کو ٹھنڈک سی ہوتی ہے۔ مطالعہ!

گارٹن بولا :-

”جدبانی لحاظ سے وہ لڑکی ایک حیرت انگیز چیز ہے صرف اس کے بیدار ہونے کی کسر ہے۔“

”تو کیا جناب اسے بیدار کیجئے گا؟“

گارٹن اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس کا خم دار قسم کر رہا تھا۔ ”کیا بد مذاقی کی بات ہے! بالکل انگریزوں کی سی!“

ایشرسٹ پائپ کے کش لگاتا رہا۔ بیدار ہونے کی کسر ہے! اس بیوقوف گارٹن کو تو دیکھو۔ اپنے آپ کو کیا کچھ سمجھے بیٹھا ہے! ایشرسٹ نے کھڑکی کھول دی اور جسم باہر کو تھکا کر کھڑا ہو گیا۔ باہر اندھیرا ہو چکا تھا۔ گاڑی خانے اور فارم کی عمارتیں دھندلی اور نیلی نیلی۔ اور سیب کے درختوں کا باغیچہ غیر واضح نظر آ رہا تھا۔ ہوا میں ان لکڑیوں کے دھوئیں کی بو تھی جو باورچیخانے میں جل رہی تھیں۔ ایک پرندہ جو ابھی جاگ رہا تھا۔ بیدلی سے چھپایا

لے کر اندر آئی تھی۔ اس وقت سے اس کی شکل رجبے دیکھ لینا پھول یا قدرت کے کسی اور حسین منظر کی دیر سے کم نہ تھا! آنکھوں میں سائی ہوئی تھی۔ لڑکی نے عجیب انداز کے ساتھ ایک جھرجھری لے کر اپنی آنکھیں نیچی ڈال لی تھیں! درچپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

گارٹن نے کہا۔ چلو باورچیخانے میں چل کر اسے ایک نظر اور دیکھ لیں۔

باورچیخانے کی دیواروں پر سفیدی پھری ہوئی تھی۔ چھت میں بڑے بڑے شبنمیر لگے تھے۔ جن میں بھی ہوئی سؤر کی راہیں لٹک رہی تھیں کھڑکی میں پھولوں کے گیلے پڑے تھے۔ دیوار پر بندوقیں چینی اور جست کے عجیب و غریب آنخوڑے اور ملکہ وکٹوریہ کی تصویریں کیلوں سے آویزاں تھیں۔ بیچ میں معمولی لکڑی کی ایک لمبی تنگ سی میز بھی تھی جس پر پالے اور چمچے رکھے ہوئے تھے۔ اوپر چھت سے پیاز کی گٹھیوں کی ایک لڑی لٹک رہی تھی۔ آتشدان خاصا گہرا تھا جس کے ایک طرف دو چھوٹے لڑکے بڑی تیز کے ساتھ نچلے بیٹھے تھے۔ اور دوسری طرف ایک بھوری آنکھوں اور سرخ چہرے والا موٹا سا جوان آدمی بیٹھان کے پھوسٹوں سے بندوق کی نالی صاف کر رہا تھا۔ اس کی پلکوں اور سر کے بالوں کی رنگت بالکل ان پھوسٹوں کی سی تھی۔ دونوں کے درمیان ایک بڑے دیگے میں اسٹوپک رہا تھا۔ جو خوشبو سے بہت خوش ذائقہ معلوم ہوتا تھا۔ اور سامنے سبز زیترو کو مب کسی سوچ میں بیٹھی چمچ ہلا رہی تھی۔ دو اور نوجوان جن کی آنکھیں ترچھی اور بال سیاہ تھے اور جو چہروں سے ان دو چھوٹے لڑکوں کی طرح عیار معلوم ہوتے تھے۔ دیوار کے ساتھ سہارا لگائے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک پست قد ادھیڑ عمر کا آدمی۔ داڑھی موچھ منڈی ہوئی کارڈورائی کی بر جس پنے کھڑکی میں بیٹھا ایک پرانا سا اخبار پڑھ رہا تھا۔ صرف میگن ہی کام کاج میں لگی ہوئی تھی اور پیسے میں سے سیب کی شراب کے جگ بھر بھر کر میز پر رکھتی جا رہی تھی۔

سوئے چلا ہوں۔“

(۳)

ایشرسٹ ہمیشہ غفلت کی نیند سوتا تھا۔ لیکن جب گارٹن سوئے کے کمرے میں آیا۔ تو گو ایشرسٹ بظاہر گری نیند میں تھا۔ لیکن درحقیقت بالکل جاگ رہا تھا۔ کمرے کی چھت نیچی تھی۔ گارٹن بستر میں پٹ پٹا کر چت لیٹا تاریکی کے طلسم پر ناک بھوں چڑھا کر دنیا و ما فیہا سے یخچر پڑا تھا۔ لیکن ایشرسٹ کو آؤں کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کا گھٹنا دکھ رہا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ اسے اور کوئی تکلیف نہ تھی۔ دنیا کے تفکرات رات کے وقت ایشرسٹ کے آرام میں کبھی خلل انداز نہ ہوتے تھے اور سچ پوچھو تو اسے زندگی میں کوئی فکر ہی نہ تھا۔ بیرسٹروں کی فہرست میں نام درج ہو چکا تھا۔ تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ دنیا اس کے سامنے کھلی پرٹی تھی۔ والدین کی وفات کے بعد گھر کے علاقے سے بھی پاک ہو چکا تھا۔ ذاتی آمدنی چار سو پاؤنڈ سالانہ تھی۔ اب اس کی آزادی میں بھلا کیا حائل تھا؟ جہاں چاہے جائے۔ جو چاہے کرے۔ جب چاہے کرے۔ اس کا بستر سخت تھا۔ اس لئے اسے بخار نہ ہونے پایا۔ سرٹنے کے پاس ایک کھڑکی کھلی تھی۔ جس میں سے رات کی خوشبو کمرے کے اندر پھیل رہی تھی اور ایشرسٹ بستر میں لیٹا اس خوشبو کو سونگھ رہا تھا۔ گارٹن سے کھجا ہوا تھا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تین دن تک پیدل سفر میں جس شخص کا ساتھ رہا ہو اس سے کھج جانا قدرتی امر ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اس رات اس کے باقی تمام خیالات شفقت آمیز تھے۔ بعض تصورات سے تو دل میں ہوکیں اٹھ رہی تھیں۔ بعض سے طبیعت میں ایک ہیجان سا پیدا ہوتا تھا۔ اسے اس نوجوان کا چہرہ یاد آیا جو باورچخا میں بیٹھا بدوق صاف کر رہا تھا۔ جب دو نو دوست باورچخا نے اس میں داخل ہوئے تھے۔ تو اس نے یکلفت آنکھیں اٹھا کر پہلے ان دونوں کو اور پھر فوراً ہی اس لڑکی کو جو اس وقت سیب کی شراب کا

گویا اسے اندھیرے پر تعجب ہو رہا ہے۔ اصطبل سے ایک گھوڑے کی جو کھڑا دانہ کھا رہا تھا شیردہی اور جھوٹے کی آواز آئی۔ سامنے جنگل تھا جو تاریکی میں دور دور تک پھیلا ہوا معلوم ہوتا تھا اور اس سے پرے عجوب سنائے تھے جو ابھی پوری طرح عرباں نہ ہوئے تھے اور جن کی سفید شاخوں نے گہرے نیلے آسمان کو چمکنی کر دیا تھا۔

ایک آؤ کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ایشرسٹ نے ایک لمبا سانس لیا۔ ایسی رات میں باہر آزاد پھرنا کتنا پر لطف ہوگا! تھوڑی دیر کے بعد سڑک پر کھلے سموں کے ٹاپوں کی آواز آئی اور تین ٹپو اس اندھیرے میں دھندلے سیاہ سامنے سے گزرتے دکھائی دئے جن کی کالی ایال دار گردنیں پھاٹک کے اوپر سے نظر آ رہی تھیں۔ جب اس نے پائپ کو ٹھونک کر خالی کیا۔ اور اس میں سے شراب کی ایک پھلجھڑی سی نکلی۔ تو جا فور بدک کر بھاگ نکلی۔ ایک چمگا دڑ پھر پھڑپھڑاتی ہوئی نکلی گئی۔ اس کی ہلکی ہلکی چیپ چیپ کی آواز شکل سے سنائی دیتی تھی۔ ایشرسٹ نے اپنا بازو پھیلا دیا ہتھیلی پر اس پر پڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یکلفت اسے اوپر کی منزل میں بچوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جوتے تھپ تھپ فرش پر گرے اور پھر ایک نرم اور نازک آواز سنائی دی۔ لڑکی کی آواز۔ جو بچوں کو بستر میں سلا رہی تھی۔ وہ الفاظ صاف اور صاف طور پر کان میں پڑے: ”نہیں رک۔ میں بلی کو ساتھ نہ سلائے دوں گی۔“ پھر ننھے بچوں کے قدموں کی آواز آئی۔ کسی نے ہلکے سے ان کے ایک تھپڑ مارا اور پھر کوئی ہلکی آواز میں ایسی پیاری ہنسی ہنسا۔ کہ ایشرسٹ کا نپ سا گیا۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کسی نے پھونک ماری ہو۔ موم بتی جس کی روشنی تاریکی پر انگلیاں پھیر رہی تھی۔ سمجھ گئی اور خاموشی چھا گئی۔ ایشرسٹ کھڑکی سے ہٹ آیا اور کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ اس کا گھٹنا دکھ رہا تھا اور اس کی رُوح لول تھی۔

گارٹن سے کہا تمہیں باورچخا نے میں جانا ہو تو جاؤ میں تو

جاگ اٹھائے جا رہی تھی ایک نظر دیکھا تھا۔ اس کی نظر میں نہ ذہانت پائی جاتی تھی نہ بیداری نہ ہم وہ ایسے آدمی کی نظر ضرور تھی جو دفعتاً چونک اٹھا ہو۔ اُس وقت ایشرسٹ نے اس بات کا دھیان بھی نہ کیا تھا۔ لیکن حیرت ہے۔ کہ اس کا تصور نہایت واضح طور پر اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ جس طرح اس لڑکی کا تروتازہ چہرہ اسے نہ بھولتا تھا۔ ویسے ہی اس نوجوان کا سرخ چہرہ۔ نیلی آنکھیں ہلکے رنگ کی پلکیں اور سن کے سے بال بھی اس کی یاد سے محو نہ ہوتے تھے۔ کھرکی کے سامنے پردہ نہ تھا۔ اس کی بجائے تاریکی کی ایک مستطیل سی دکھائی دے رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اس تاریکی میں سحر کی روشنی نمودار ہوئی۔ ایک نیم خوابیدہ کوسے کی بیٹی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک بلیک برڈ نے جن کی آنکھ ابھی پوری طرح نہ کھلی تھی۔ اپنی خوش الحانی سے خاموشی کے طلسم کو برہم کر دیا۔ کھرکی کے چوکھٹے میں بڑھتی ہوئی روشنی کی مستطیل کو دیکھتے دیکھتے ایشرسٹ کی آنکھ لگ گئی۔

دوسرے دن اس کا گھٹنا بہت سوجا ہوا تھا۔ اس لئے پیدل سفر کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ گارٹن کو اگلے دن لندن پہنچنا تھا۔ وہ دپڑ کے وقت وہاں سے رخصت ہو گیا۔ چلتے وقت اس کے ہونٹوں پر ایک طنز آمیز تبسم دیکھ کر ایشرسٹ بہت چڑا۔ لیکن جب وہ دوڑتا دوڑتا ڈھلوان سڑک کے موڑ تک پہنچ کر نظر سے اوجھل ہو گیا۔ تو ایشرسٹ کا غصہ فوراً اتر گیا۔ یو کے درختوں کی محراب کے پاس گھاس کا ایک قطعہ تھا۔ ایشرسٹ دن بھر وہیں ایک سبز رنگ کی چوکی پر آرام سے بیٹھا رہا۔ سورج کی شعاعیں خوشبودار پھولوں کا عطر کھینچ رہی تھیں اور پھولدار بھاڑیوں سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ ایشرسٹ ایک سرور کے عالم میں بیٹھا کبھی پائپ سلگا لیتا۔ کبھی منظر کا لطف اٹھاتا۔ اور کبھی کسی سورج میں مصروف ہوتا ایک فارم کے اندر بہار کے موسم میں میٹھا رہنمیاں عالم وجود میں آتی ہیں۔ ننھی ننھی جانیں انڈوں اور کلیوں سے جنم لیتی ہیں۔ فارم کے

لوگ اس عمل کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور نوزائیدہ ہستینوں کی دیکھ بھال اور پرورش میں لگ جاتے ہیں۔ ایشرسٹ اس قدر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ کہ ایک مادہ ہنس اپنے چھ بچوں کو جن کی گردنیں زرد اور پیٹ بھورے رنگ کی تھیں۔ ساتھ لئے مُٹکتی مُٹکتی قریب آ پہنچی اور بچے ایشرسٹ کے پیروں کے پاس گھاس کے پتوں پر اپنی ننھی ننھی چوکیں تیز کرنے لگے۔ کبھی کبھی مسز نیر کو موب یا میگن آن کر پوچھ جاتی کہ کیوں صاحب آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ ایشرسٹ مسکرا کر جواب دیتا۔ نہیں تھینک یو! مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں یہاں بڑے مزے میں ہوں۔ چائے کے وقت وہ دونوں سیاہ رنگ کی ایک لمبی سی پلٹس ایک پیالے میں ڈال کر اپنے ساتھ لائیں۔ سوئے ہوئے گھٹنے کو دیر تک غور سے دیکھتی رہیں اور پلٹس اس پر باندھ گئیں۔ جب وہ چلی گئیں۔ تو ایشرسٹ کو لڑکی کا وہ نیچی آدا میں ”اوئی“ کہنا۔ وہ ہمدردی کی نظروں سے دیکھنا وہ ہاتھ پر ہلکی سی تیوری ڈالنا یاد آیا۔ اور جب اسے خیال آیا۔ کہ گارٹن اس لڑکی کے متعلق کتنی فضول باتیں کرتا تھا۔ تو ایک بار پھر گارٹن سے چڑ ہو گئی۔ اس نے یہ ذرا نہ سوچا کہ آخر اس میں چڑنے کی کیا بات ہے۔ جب لڑکی چائے لائی۔ تو ایشرسٹ نے پوچھا :-

”میگن۔ یہ تو کہو۔ میرا دوست بھی تمہیں پسند آیا؟“
میگن نے منہ سکڑ لیا۔ گویا ڈرتی تھی۔ کہ کہیں مسکرا دوں تو بد تمیزی نہ سمجھی جائے۔ پھر بولی

”بڑے ہنسور تھے وہ۔ ہم سب کو ہنساتے رہے۔
وہ بہت لائق معلوم ہوتے تھے۔“

”کیا ایسی بات کہی انہوں نے، جو تم سب کو ہنسا دیا؟“
”وہ مجھ سے کہتے تھے۔ تم بارڈوں کی بیٹی ہو۔ بارڈ کیا ہوتے ہیں؟“

”بارڈ ان شاعروں کو کہتے ہیں۔ جو آج سے کئی سو سال پہلے
ویلز میں رہتے تھے۔“

”تو بھلا میں ان کی بیٹی کیونکر ہوئی؟“

”میرے دوست کا مطلب یہ تھا۔ کہ وہ تم ہی جیسی لڑکیوں کے متعلق گیت گایا کرتے تھے۔“

میگن نے اپنی بھویں سکیر کر کہا۔ ”انہیں مذاق سوچا ہوگا کیا میں ویسی لڑکی ہوں؟“

”میری بات پر یقین کر لو گی؟“

”کیوں نہیں!“

”میرے خیال میں وہ سچ کہتا تھا۔“

لڑکی مسکرا دی۔

ایشرسٹ نے دل میں کہا۔ ”تم واقعی خوبصورت ہو۔“

”وہ یہ بھی کہتے تھے۔ کہ جو شکل و صورت سے سیکسن معلوم ہوتا ہے۔ اس کا کیا مطلب تھا؟“

”جو کونسا ہے؟ وہ جس کی نیلی نیلی آنکھیں اور لال لال چہرہ ہے؟“

”ہاں وہ میرے خالو کا بھتیجا ہے۔“

”اچھا؟ تمہاری خالہ کا لڑکا نہیں؟“

”نہ۔“

”ان کا مطلب یہ تھا۔ کہ جو کی شکل ان لوگوں سے ملتی ہے جو تقریباً چودہ سو سال پہلے انگلستان پر آکر قابض ہو گئے تھے۔“

”اچھا؟ ان کا حال تو میں جانتی ہوں۔ تو کیا جو واقعی سیکسن ہے؟“

”گارٹن کو ایسی باتوں کا جنون ہے۔ لیکن جو کا چہرہ قدیم زمانے کے سیکسنوں سے کچھ ملتا ضرور ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“

میگن کے اس آخری جملے سے ایشرسٹ کے دل میں گدگدائی ہوئی۔ مختصر سا جملہ تھا۔ لیکن اس میں کتنی سادگی اور خوش اسلوبی

پائی جاتی تھی۔ ظاہر ہے۔ کہ یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ پھر

بھی اس نے کس سلیقہ اور شائستگی کے ساتھ ہاں میں ہاں ملا دی تھی۔

”وہ کہتے تھے۔ کہ باقی لڑکے تو سب کے سب نرے چپسی ہیں

یہ بھلا کیوں کہا؟ خالہ ہنس تو دیں لیکن یہ بات ناگوار انہیں

ضرور گزری اور میری خالہ کے بیٹوں کو تو بہت غصہ آیا۔ خالو

تو کسان تھے۔ کہیں کسان بھی چپسی ہوتے ہیں؟۔ یوں

لوگوں کا دل دکھانا بہت بری بات ہے۔“

ایشرسٹ کے دل میں آیا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے

کے بھینچے۔ لیکن منہ سے صرف اتنا کہا۔ ”میگن تم سچ کہتی ہو

۔ اور ہاں کل رات تم ہی بچوں کو بستر میں سلا رہی تھیں نا؟

مجھے نچلی منزل میں آواز آرہی تھی۔“

میگن کے چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ ”آپ چائے پیجئے

ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ کہیں تو میں اور چائے لا دوں؟“

”کبھی تمہیں اپنے کسی کام کو بھی فرصت ملتی ہے؟“

”واہ ملتی کیوں نہیں؟“

”آخر میرے بھی آنکھیں ہیں۔ میں نے تو تمہیں فارغ کبھی نہیں

دیکھا۔“

میگن نے ماتھے پر تیوری ڈال لی۔ جیسے دماغ میں کوئی بات

ہے۔ جسے سمجھا نہیں سکتی۔ چہرہ اور بھی لال ہو گیا۔ جب وہ

چلی گئی۔ تو ایشرسٹ نے سوچا۔ کیا وہ یہ سمجھتی تھی۔ کہ میں اس

سے دل لگی کر رہا ہوں۔ میں تو ایسے مذاق پر موت کو ترجیح دیتا

ہوں۔

ایشرسٹ کی وہ عمر تھی۔ جس میں بعض لوگ حسن کو ایک پھول

سمجھتے ہیں۔ اور اس کے نطائے سے ان کے دل میں عورت کی

توقیر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ایشرسٹ اپنے گرد و پیش سے اکثر

غافل رہتا تھا۔ چنانچہ اسے یہ احساس دیر کے بعد ہوا کہ وہ بوجہ

جس کے متعلق گارٹن نے کہا تھا کہ شکل سے سیکسن معلوم ہوتا ہے

اصطبل کے دروازے کے باہر کھڑا ہے۔ بادامی رنگ کی میلی سی جس بکچڑ سے بھرے ہوئے گیسٹر اور نیلے رنگ کی قمیص میں وہ ایک تفت کی چیز معلوم ہوتا تھا۔ نہ چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ نہ بشرے پر زہانت کے آثار۔ کسی اڑیل جانور کی طرح عجیب و حرکت کھڑا تھا۔ چہرہ اور بازو سرخ تھے۔ سر پر دھوپ پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے اس کے بال کاتی ہوئی اون کی طرح معلوم ہوتے تھے۔

جب اس نے دیکھا۔ کہ ایشرسٹ میری طرف دیکھ رہا ہے۔ تو احاطے میں سے گزر کر باور چچانے کے دروازے کی طرف چل دیا۔ اور مکان کے کونے پر سے مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چال سے ظاہر ہوتا تھا کہ نوجوان دیہاتی۔ ہقانوں کی طرح آہستہ آہستہ بھاری بھاری قدم نہ اٹھا سکے کی وجہ سے شرماتا ہے۔ ایشرسٹ پر اس سی پڑ گئی۔ اکھڑ لوگ! طبیعت پر کتنا ہی زور ڈالئے ایسے لوگوں سے نباہ بھلا کیسے ممکن ہے؟ لیکن اس لڑکی کو دیکھو۔ جوتے پھٹے ہوئے کھڑے ہاتھ۔ پھر بھی اس میں کتنی رعنائی ہے؟ شاید گارٹن ہی کا کتنا ٹھیک ہو۔ اور یہ سب کیلٹ خون کا اثر ہو۔ بہت ممکن ہے اس کی تعلیم اس سے زیادہ نہ ہو۔ کہ تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتی ہو لیکن وہ تو ہیرے کی مانند ہے۔ اسے تو قدرت ہی نے عجیب و اصیل پیدا کیا ہے۔

وہ ڈاڑھی مونچھ منڈا ادھیڑ عمر کا آدمی جسے کل رات باور چچانے میں دیکھا تھا۔ ایک کتے کو ساتھ لئے احاطے میں داخل ہوا۔ گایوں کو دودھ دہنے لے جا رہا تھا۔ ایشرسٹ کو اب معلوم ہوا۔ کہ ایک ٹانگ سے لنگڑا ہے۔

”اچھے اچھے جانور لئے جا رہے ہو۔“

لنگڑے آدمی کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس کی نظریں اوپر اٹھی رہتی تھیں (مدتوں دکھ سننے سے آنکھ میں اکثر یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے)۔

”ہاں بہت خوبصورت ہیں۔ دودھ بھی بہت دیتی ہیں“

”اُن کی شکل ہی سے معلوم ہو رہا ہے۔“

”آپ کی ٹانگ تو پہلے سے بہتر ہے؟“

”تھینک یو۔ رفتہ رفتہ اچھی ہو رہی ہے۔“

لنگڑے آدمی نے اپنی ٹانگ کو ہاتھ لگا کر کہا۔ ”اس دکھ کو میں خوب جانتا ہوں۔ صاحب! گھٹنے کی تکلیف بہت بڑی تکلیف ہے۔ میرا گھٹنا دس سال سے خراب ہے۔“

ایشرسٹ نے آواز سے ہمدردی کا اظہار کیا (ایسی ہمدردی آواز نکالنا عرفہ الحال لوگوں کے لئے بہت سہل بات ہے) لنگڑا آدمی پھر مسکرا دیا۔

”پھر بھی خدا کا شکر ہے۔ ورنہ وہ تو ٹانگ ہی کاٹنے لگے تھے“ اچھا؟“

”جی ہاں۔ اور پہلے تو بہت ہی برا حال تھا۔ میں تو اسے بہت ہی غنیمت سمجھتا ہوں۔“

”میرے گھٹنے پر تو دو ابا بندھ گئی ہیں۔ جس سے بہت فائدہ ہے۔“

”ایک بوٹی تھی جو لڑکی کہیں سے توڑ لائی تھی (بچہ لوں سے بہت اچھی طرح واقف ہے یہ لڑکی) بعض لوگ صاحب بوٹیوں کی خاصیتیں خوب سمجھتے ہیں۔ میری ماں تو اس بات میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ اچھا صاحب خدا کرے آپ جلدی اچھے ہو جائیں۔ گو آن!“

ایشرسٹ مسکرا دیا۔ ”بچہ لوں سے واقف ہے! اور وہ خود پھول سے کیا کم ہے؟“

شام کے کھانے پر بطخ کا ٹھنڈا گوشت۔ جنکٹ اور سیب کی شراب تھی۔ کھانا کھا چکا تو لڑکی کمرے میں آئی۔

”خالہ پوچھتی ہیں۔ آپ ہمارے مے ڈے کیک کا ایک ٹکڑا کھائیگے؟“

”ہاں مگر باور چچانے میں بیٹھ کر۔“

”شوق سے — آپ کے دوست تو چلے گئے۔ اکیلے آپ کا دل گھبراتا ہو گا؟“

”اے نہیں — لیکن یہ کمو میرا باد چچانے میں آنا کسی کو برا تو نہ لگے گا؟“

”واہ برا کیوں لگتا۔ ہمیں تو بلکہ بہت خوشی ہوگی۔“

ایشرسٹ کو اپنے گھٹنے کا خیال نہ رہا۔ بکھرتا ہوا تھا۔ تو لڑکھڑاکر پھر بیٹھ گیا۔ لڑکی نے ایک سسکی بھری اور اپنے بازو سامنے پھیلا دیے۔ ایشرسٹ ان چھوٹے چھوٹے کھردرے، سانولے ہاتھوں کو پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جی میں آیا۔ ان ہاتھوں کو ہونٹوں سے لگالے لیکن اپنے آپ کو روکا۔ لڑکی نے قریب آ کر کندھا آگے بڑھا دیا۔ ایشرسٹ اس کے سہارے چل کر دروازے تک پہنچا۔ اس شانے پر ہاتھ رکھنے سے جو لطف حاصل ہوا۔ عمر بھر کسی چیز کے مس سے نصیب نہ ہوا تھا۔ اتنی عقلمندی ضرور کی۔ کہ چلتے چلتے سینڈیٹیں سے اپنی چھڑی نکال لی۔ اور باد چچانے میں پہنچنے سے پہلے ہاتھ لڑکی کے کندھے سے ہٹا لیا۔

اس رات وہ ایسا غافل سویا۔ کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا صبح اٹھا۔ تو گھٹنے کا درم بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ دو پہر تک اسی چن میں کرسی پر بیٹھا شعر موزون کرتا رہا۔ سہ پہر کے وقت ان دو چھوٹے لڑکوں کو جن کا نام نکت اور رکت تھا ساتھ لے کر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ ہفتے کا دن تھا۔ اس لئے وہ اسکول سے جلدی لوٹ آئے تھے۔ ایک سات سال کا تھا ایک چھ سال کا۔ شرمیلے مگر ذہین۔ رنگ بہت گورا نہ تھا۔ اور بالوں کی رنگت بھی سیاہ تھی۔ ایشرسٹ سے بچے بہت جلد مانوس ہو جاتے تھے۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں دونو پڑ پڑ باتیں کرنے لگے۔ سولے مچھلیوں کے باقی جانوروں کو مارنے کے جتنے طریقے انہیں یاد تھے چار بچے تک ایک ایک کر کے سب ایشرسٹ کو سکھا دیے۔ پھر پلٹے گھوڑوں تک چڑھا کر پیٹ کے بل ندی کے کنارے مچھلیوں کی تاک میں

لیٹ گئے۔ گویا۔ اس فن میں بھی کچھ نہ کچھ مہارت انہیں ضرور حاصل ہے۔ لیکن ہنستے اس قدر تھے اور غل اس قدر مچاتے تھے کہ ایک مچھلی بھی قریب نہ پھسکی۔ ایشرسٹ بچے کے درختوں کے جھنڈ کے پاس ایک چٹان پر بیٹھا پرندوں کے گیت پر کان لگائے انہیں دیکھتا رہا۔ آخر کار رنگ جو ران دونوں سے بڑا تھا۔ مچھلیوں کے کھیل سے اکتا کر اس کے پاس آکھڑا ہوا اور بولا :-

”جیسی ہوا اسی پتھر پر بیٹھتا ہے۔“

”وہ کیا بلا ہے؟“

”معلوم نہیں۔ کبھی اُسے دیکھا نہیں۔ مگر میگن کتنی ہے کہ وہ یہیں بیٹھتا ہے۔ بڑھے جم کو ایک دفعہ نظر آیا تھا جس دن ابا کے سر میں ٹٹونے لات ماری۔ اس سے پہلے رات کے وقت ہوا یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ یہاں بیٹھ کر سانگی بجاتا ہے۔“

”کونسا راگ بجاتا ہے وہ؟“

”معلوم نہیں۔“

”اس کی شکل کیسی ہے؟“

”کالے رنگ کی۔ بڑھا جم کتنا ہے۔ اس کے جسم پر بال ہی بال ہیں۔ بڑا سخت ہوا ہے۔ کبھی کبھی دن کو بھی آجاتا ہے۔“ پھر اپنی ترجیحی سیاہ آنکھوں کے ڈھیلے پھرا کر کہا۔ ”مجھے تو اٹھا کر نہیں لے جایگا۔ میگن اس سے بہت ڈرتی ہے۔“

”میگن کو کبھی نظر آیا ہے؟“

”کبھی نہیں۔ لیکن میگن آپ سے نہیں ڈرتی۔“

”واہ مجھ سے بھلا کیوں ڈرتی؟“

”وہ آپ کے لئے دعا مانگتی ہے۔“

”چل بد معاش۔ تجھے بھلا کیسے معلوم ہے؟“

”جب میں سویا ہوا تھا۔ تو وہ کہہ رہی تھی۔ خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر ایشرسٹ پر بھی۔ بڑی دھیمی آواز میں دعا مانگ رہی تھی میں نے خود اسے سنا ہے۔“

”تم بڑے بد معاش ہو۔ جو باتیں تمہیں خود بھی نہ سنی جائے تھیں وہ تم اوروں کو سنا رہے ہو۔“

لڑکا چپکا ہو گیا۔ اور پھر بڑے فخر سے بولا :-

”میں خرگوش کی کھال اتار لیتا ہوں۔ میگن تو کھال اتارتی ہوئی دیکھ بھی نہیں سکتی۔ مجھے لہو اچھا لگتا ہے۔“

”اچھا جناب کو لہو اچھا لگتا ہے؟ جن کہیں کا؟“

”جن کیا ہوتا ہے؟“

”جن اسے کہتے ہیں جو دوسروں کو دکھ پہنچا کر خوش ہو۔“

”چھوٹے لڑکے نے ماتھے پر تیوری ڈال کر کہا۔“ جو خرگوش ہم کھاتے

ہیں وہ تو مرے ہوئے ہوتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے نک۔ میں معافی مانگتا ہوں۔“

”میں بینڈک کی کھال بھی اتار لیتا ہوں۔“

لیکن ایشرسٹ کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ”خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر ایشرسٹ پر بھی۔“ نک نے دیکھا۔ کہ ابھی تو اچھی خاصی باتیں

کر رہا تھا۔ اور اب جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا۔ بہت حیران ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تو دوڑتا ہوا پھر ندی پر جا پہنچا۔ جہاں فوراً ہی پھر دونوں

نے مل کر مہنسا اور غل مچانا شروع کر دیا۔

جب میگن چائے لے کر آئی۔ تو ایشرسٹ نے پوچھا۔

”میگن۔ جیسی ہوا کیا چیز ہے؟“

میگن نے چونک کر سر اٹھایا :-

”اس کا قدم بہت منحوس ہے۔“

”تم بھوت پریت کو مانتی ہو؟“

”اللہ کبھی اس کی شکل نہ دکھائے۔“

”نظر کیوں کر آئیگا۔ کچھ ہو تو نظر آئے۔ بڑے رجم نے یونہی کسی ٹو

کو دیکھ لیا ہوگا۔“

”نہیں نہیں۔ ان چٹانوں میں بھوتوں کا ڈیر لہے۔ یہاں ان

لوگوں کے بھوت رہتے ہیں۔ جو بہت عرصہ پہلے یہاں آباد تھے۔“

”تو بہر حال جیسی تو نہ ہوئے نا! یہاں کے قدیم باشندے تو چھپو

کے آنے سے بہت عرصہ پہلے مر کھپ گئے تھے۔“

میگن نے صرف اتنا کہا۔ ”سب منحوس ہیں۔“

”پریوں؟“ اور اگر یہاں بھوت ہیں بھی۔ تو خرگوشوں کی طرح اپنا

جنگل میں رہتے ہیں۔ اب جنگل میں جو پھول اگتے ہیں وہ منحوس

ہوتے ہیں؟ یہ ٹھارن کے درخت بھی تو سب خود رو ہیں۔ یہ تو

منحوس نہیں۔ اور بھوت منحوس ہو گئے! میں رات کو جنگل میں

جا کر اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ آؤنگا۔ بلکہ ان سے دو چار

باتیں بھی کر آؤنگا۔“

”ارے نہیں! نہیں!“

”میں ضرور جاؤنگا اور جا کر اس چٹان پر بیٹھونگا جہاں ہوا بیٹھتا

ہے۔“

لڑکی نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”خدا کے لئے!“

”پریوں؟ اگر مجھے کچھ ہو گیا۔ تو بھی کیا مضائقہ ہے؟“

لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا۔ ایشرسٹ پیار کے انداز میں بولا:-

”خیر میں جانوں نہ جانا ہی بہتر ہوگا۔ آخر اب یہاں سے بھی تو

جلد کوچ کرنا پڑیگا۔“

”جلد؟“

”تمہاری خالہ آخر کب تک مجھے رہنے دینگی؟“

”ہم تو گرمیوں کے موسم میں ہمیشہ کمرے کرائے پر دے دیتے

ہیں۔“

ایشرسٹ نے اپنی نظر میں لڑکی کے چہرے پر گار کر پوچھا:-

”تم چاہتی ہو۔ میں ٹھہر جاؤں؟“

”ہاں۔“

”تو آج رات میں تمہارے لئے دعا کروں گا“

ایشرسٹ نے تمہارے کے لفظ پر خاص زور دیا۔ میگن کا چہرہ منتما اٹھا۔ چین بچیں کرے سے باہر نکل گئی۔ ایشرسٹ نے چائے کو ابھی ہاتھ نہ لگایا تھا۔ پتیاں ابھی اچھی طرح بھیگی نہ تھیں۔ اپنے آپ کو بہت برا بھلا کہا۔ یہ کیا منہ سے نکل گیا؟ یہ میں نے کیا کیا؟ خوشنما پھولوں کو اپنے جوتے کی ٹھوک سے کچل ڈالا۔ میں بھی رابرٹ گارٹن کی طرح گدھا ہوں۔ شہر کا بے ہنسنے والا۔ کالج کا طالب علم۔ اس لڑکی کو سمجھنے سے بالکل قاصر

(۴)

اگلے ہفتے ایشرسٹ کو یقین ہو گیا۔ کہ اب گھٹنے کی تکلیف جاتی رہی کیونکہ اس نے ارد گرد کے علاقے کی خوب سیر کی۔ ایشرسٹ پر اب کے سال موسم بہار کی وہ دو کیفیتیں آشکارا ہوئیں کہ آنکھیں کھل گئیں۔ کبھی کسی بیچ کے سرخ و سفید شکوفوں کو جو گرے نیلے آسمان کے بالمقابل دھوپ میں کھلے ہوئے یا کبھی کبھی سکاچ فرکے تنوں اور ٹمنوں کو جو تیز روشنی میں ٹیلے معلوم ہوتے تھے۔ ایک نشے کے عالم میں بیٹھا دیکھنا رہتا۔ یا پھر جنگل میں لالچ کے درختوں کا نظارہ کرنا۔ جو ہوا کے زور سے سلامی ہو گئے تھے پچھلے ٹمنے کالے کالے تھے۔ اوپر کی ٹمنیوں میں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ جو ہوا کے جھونکوں سے پھر ٹک اٹھتیں۔ تو درخت میں ایک زندگی سی آجاتی۔ کبھی سڑک کے کنارے گھاس پر نیٹ جاتا۔ اور ہفتے کے پھولوں کے گچھوں کو دیکھتا رہتا یا سوکھے ہوئے برکین میں کھڑا دیوہی کی گلابی گلابی کلیوں کو جن کے آوارہ دکھائی دیتا تھا۔ انگلیوں سے چھوڑا رہتا۔ کبھی گلوں کو چھانے لگتے۔ کبھی سبز ہر بول اٹھتے۔ کبھی آسمان کی بلندی سے کوئی لارک اپنے گیت کے موتیوں کو قطروں کی طرح ایک ایک کر کے زمین پر ٹپکاتا۔ بہا میں کئی دیکھی تھیں۔ لیکن ان میں یہ بات نہ تھی۔ وہ بہا میں سبزہ دگل کی بہا میں تھیں۔ یہ بہا رول کی بہا تھی۔ دن کے وقت گھر کے لوگوں سے ملنا کم ہوتا۔ جب میگن کھانا لے کر آتی تو یا گھر کے کسی کام کاج میں لگی ہوتی۔ یا اسے احاطے میں ننھے ننھے جانوروں کی دیکھ بھال کرنی ہوتی۔ اس لئے ایک دو ہاتھوں سے

زیادہ نہ بھرتی۔ لیکن شام کے وقت ایشرسٹ باورچی خانے کی کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتا۔ پائپ سلگنا لیتا۔ اور لنگڑے جم یا منیر کو مہربانیاں باتیں کرتا رہتا۔ لڑکی سینا پر دنا لے بیٹھتی یا کھانے کے برتن بھانپتی پھرتی۔ بعض دفعہ اسے یہ احساس ہوتا کہ میگن اپنی پھلکتی ہوئی بھوری بھوری آنکھوں سے ٹکٹکی لگائے پیٹھی پیٹھی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ اس سے عجیب نخوت آمیز مسرت ہوتی۔ دل کی وہ کیفیت ہوتی۔ جو ایک بلی کی ہوتی ہوگی جب وہ میاؤں میاؤں کرتی ہے۔

ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ اتوار کے دن شام کے وقت ایشرسٹ باغیچے میں لیٹا بلیک برڈ کی آواز پر کان لگا کر ایک غشتیہ نظم موزون کر رہا تھا۔ کہ اتنے میں بھانپک کے بند ہونے کی آواز آئی۔ اور درختوں کے بیچ میں آگے آگے لڑکی اور اس کے پیچھے پیچھے وہ لال لال کھوں والا دھقان بھاگتے نظر آئے۔ ایشرسٹ سے میں گھر کے فاصلے پر آکر لڑکی بھڑکی۔ جو بھی آن پہنچا۔ دو نو آنے سامنے کھٹے ہو گئے۔ ایشرسٹ گھاس میں لیٹا ہوا تھا۔ اس پر کسی کی نظر نہ پڑی لڑکا آگے بڑھنا تھا۔ لڑکی اسے پیچھے بھاگتی تھی۔ لڑکی کے چہرے پر طیش اور پریشانی تھی۔ اور لڑکے کا چہرہ؟ کسی کو کیا معلوم تھا۔ کہ اس دھقان کے لال چہرے پر بھی اتنا اضطراب ظاہر ہو سکتا ہے۔ ایشرسٹ کو یہ منظر دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ وہ بکھلتا اڑھ کھڑا ہوا۔ دو نو نے اسے دیکھا۔ میگن نے اپنے ہاتھ ڈھیلے چھو ڈئے اور ہٹتی ہٹتی ایک درخت کے تنے کے پیچھے جا کھڑی ہوئی لڑکا گھبرا کر کنارے کی طرف بھاگ نکلا اور پھلانگ مار کر غائب ہو گیا۔ ایشرسٹ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا لڑکی کے پاس آیا۔ وہ حسن کی صورت ہو نہ کو دانٹوں میں دبائے بالکل ست بنی کھڑی تھی۔ نظریں زمین دوز تھیں۔ ملائم سیاہ بال چہرے پر پریشان تھے۔ ایشرسٹ نے کہا۔ ”میں معافی مانگتا ہوں“

لڑکی نے سر نیچا ڈالے پلکیں اٹھا کر پھی پھی آنکھوں سے

بکھٹ بیتاب ہو کر باہیں اس کے گرد ڈال دیں۔ اور سینے سے لپٹا کر اس کا ماتھا چوم لیا۔ پھر کچھ سہم گیا۔ میگن کا رنگ زرد تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ لمبی لمبی سیاہ پلکوں نے بے رنگ رخساروں پر صفت باندھ رکھی تھی۔ بے جان بازو پہلوؤں کے ساتھ لگے تھے۔ اس کے سینے کے مٹس سے ایشرسٹ کے بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ ایک آہ بھر کے کما "میگن" اور اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اس گہری خاموشی میں ایک بلیک برڈ چھپا یا۔ پھر لڑکی نے ایشرسٹ کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔ پہلے رخسار پھر ہونٹوں سے لگایا اور اسے دیوانہ وار چوما اور پھر بھاگ کر سیب کے درختوں کے کالی دار تنوں میں غائب ہو گئی۔

ایشرسٹ ایک پرانے مڑے مڑے درخت پر جس کی شاخیں زمین کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھیں بیٹھ گیا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اور جو اس پریشان تھے۔ ان گلابی گلابی کلیوں کو جن میں کی ایک کلی کھل کر سفید ستارہ بن گئی تھی۔ ان شگوفوں کو جنہوں نے میگن کے بالوں کے ارد گرد دھپولوں کا ایک تاج گوندھ دیا تھا۔ کھوئی کھوئی نظروں سے تکتا رہا۔ حسن کے ہاتھوں شکست کھائی تھی یا خدا جانے بہار کا جادو چل گیا تھا۔ بہر حال دل مسرت اور احساس فتحندی سے لبریز تھا۔ ٹانگیں اور بازو پھر ٹک پڑے تھے۔ کچھ سہما ہوا بھی تھا۔ یہ آغاز ہے۔ مگر کاہے کا آغاز؟ بھنگے نئے کاٹ پڑے تھے۔ مچھراڑا کر اس کے منہ میں گھسنے کی کوشش کر پڑے تھے۔ ککو اور بلیک برڈ چھپا ہے تھے۔ بنیل ہنس پڑے تھے۔ سورج کی شعاعیں زمین کے متوازی پڑ رہی تھیں۔ سیب سے شگوفے کھلے ہوئے تھے۔ اس کے چاروں طرف بہار کی کیفیات میں پہلے سے زیادہ حسن اور پہلے سے زیادہ زندگی آگئی تھی۔ درخت کے تنے سے اٹھا اور باغیچے سے باہر نکل گیا۔ اسے کسی کھلی جگہ کسی کھلے آسمان کی ضرورت تھی۔ جہاں چل کر اپنے جذبات سے مفاہمت کرے۔ اس نے

ایشرسٹ کو ایک نظر دیکھا۔ ایک سسکی بھری اور مڑک چل دی ایشرسٹ اس کے پیچھے گیا۔

"میگن"

لیکن وہ نہ رکی۔ آخر ایشرسٹ نے پیچھے سے اس کا بازو پکڑ لیا اور آہستہ سے اسے اپنی طرف موڑ کر کہا۔

"ٹھہر جاؤ۔ مجھ سے بات تو کرو۔"

"آپ مجھ سے کیوں معافی مانگتے ہیں؟ مجھ سے معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اچھا تو میں جو سے معافی مانگ لیتا ہوں۔"

"اسے میرے پیچھے آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

"تم پر عاشق ہو گا اور کیا؟"

لڑکی نے زور سے پاؤں زمین پر مارا۔

ایشرسٹ ہنس دیا۔ "کو تو میں اسے ڈانٹ دوں؟" لڑکی بکھٹ جذبے سے بیقرار ہو کر رونے لگی۔

"آپ مجھ سے دل لگی کر رہے ہیں۔ آپ ہم لوگوں کی ہنسی اڑاتے ہیں۔"

ایشرسٹ نے اس کے دونو ہاتھ پکڑ لئے لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی۔ سچی کہ اس کا تمنا ہوا اچھوٹا سا چہرہ اور اس کے پریشان بال ایک سیب کے درخت کے گلابی شگوفوں میں جا لگے ایشرسٹ نے اس کا ایک ہاتھ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ دل میں سوچا میں عورت کی کتنی قدر کرتا ہوں۔ وہ اکھڑ جو میرے مقابلے میں کتنا حقیر ہے۔ اور یہ احساس محض اتنی سی بات سے پیدا ہوا کہ اس کھر درے ہاتھ کو ہونٹوں سے چھو لیا تھا۔ میگن اس وقت تک اپنا جسم چرائے کھڑی تھی۔ لیکن اب بکھٹ فخر فخر کا پتی ہوئی ایشرسٹ کی طرف بڑھی۔ میٹھی میٹھی سی حرارت ایشرسٹ کے بدن میں سر سے پاؤں تک پھیل گئی۔ سمجھ گیا کہ اس نازک بدن بھولی بھالی حسین دوشیزہ کو میرے ہونٹوں کے مٹس خوشی ہوئی ہے

جنگل کا رخ کیا۔ بھاڑی میں سے ایک میگ پائی نے ایش کے درخت پر سے اڑ کر جنگل والوں کو اس کے آنے کی خبر کر دی۔ جس شخص کی عمر پانچ سال سے زیادہ ہو۔ اس کے متعلق کیا کوئی کہہ سکتا ہے۔ کہ اسے کبھی عشق نہیں ہوا؟ جب قص کی تعلیم لے رہا تھا۔ تو جن کے ساتھ ناچتا تھا ان پر عاشق تھا۔ سکول کی چھٹیوں میں کئی لڑکیوں پر عاشق ہوا۔ عشق کا نشہ جب ایک دفعہ چڑھنا شروع ہوا۔ تو پھر شاید ہی کبھی اترا۔ ہمیشہ (کم و بیش دور سے) کسی نہ کسی کی پرستش کرتا رہا۔ لیکن یہ عشق سب سے نرالا تھا یہاں دوری کا تو سوال ہی نہ تھا۔ یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ یہاں تو درج مسرت سے لبریز تھی۔ اور دل میں مردانگی کے تکبیل پانے کا احساس تھا۔ ایسے جنگلی پھول کو انگلیوں میں تھامے رہنا۔ جب دل چاہے اسے ہونٹوں سے لگا لینا اور اسے خوشی کے مائے کا پیستے ہوئے محسوس کرنا۔ اس میں کتنا سرور ہے۔

اپنے خیالات میں محو تھا۔ کہ شام ہو گئی۔ چٹانوں کے ترشے ہوئے شامی وضع کے ڈھیروں پر تاریکی چھا گئی۔ اور قدرت کی آواز نے کہا یہ تمہارے لئے نئی دنیا ہے۔ جس طرح انسان گرمیوں کے موسم میں صبح چار بجے اٹھ کر باہر نکل جائے تو چرند پرند اور درخت اسے گھور کر دیکھتے ہیں اور اسے محسوس ہوتا ہے گویا ہر چیز نئی ہے۔

وہ گھنٹوں وہاں بیٹھا رہا۔ لیکن جب سردی محسوس ہونے لگی تو اٹھا۔ پتھروں اور مہیروں کی جڑوں کے بیچ میں سے رستہ ٹوٹتا ہوا سڑک تک پہنچا۔ سڑک کی پکڑنڈی پر نکلا اور پھر مرغزار کے برابر ہوتا ہوا باغیچے میں داخل ہوا۔ وہاں پہنچ کر دیاسلانی جلائی اور گھڑی کو دیکھا۔ بارہ بجنے والے تھے باچھ گھنٹے بیشتر دن کی روشنی کچھ بچتی تھی۔ اور پرندے چھاپے سے تھے۔ لیکن اب تو چاروں طرف تاریکی مسلط تھی۔ اور کہیں بھی زندگی کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ اور پھر بکلیخت اس نے اپنے عشق روستائی کو بیرونی نقطہ نظر سے دیکھا۔ تصور میں اس گھاگ رشتہ بینی مسزینو کو مہ کی ترش روئی اس کی ساتپ کی سی مڑی ہوئی گردن اس کی تیز سیاہ آنکھ سب باتوں کا جائزہ لیتی ہوئی دکھائی دی۔ جیسی وضع لڑکوں کے شبہات ان کے ناشائستہ طعنے سنائی دے۔ اکھڑتو کا چہرہ غصے سے لال نظر آیا۔ صرف دکھ بھری آنکھوں والا لنگڑا رحم ہی ایسا تھا۔ جس کا تصور تکلیف دہ نہ تھا۔ گاؤں کے شرابخانے میں کیا کیا چہ میگوئیاں نہ ہو گئی۔ بوڑھی عورتیں جنہیں اکثر سیر کے

جنگل کا رخ کیا۔ بھاڑی میں سے ایک میگ پائی نے ایش کے درخت پر سے اڑ کر جنگل والوں کو اس کے آنے کی خبر کر دی۔ جس شخص کی عمر پانچ سال سے زیادہ ہو۔ اس کے متعلق کیا کوئی کہہ سکتا ہے۔ کہ اسے کبھی عشق نہیں ہوا؟ جب قص کی تعلیم لے رہا تھا۔ تو جن کے ساتھ ناچتا تھا ان پر عاشق تھا۔ سکول کی چھٹیوں میں کئی لڑکیوں پر عاشق ہوا۔ عشق کا نشہ جب ایک دفعہ چڑھنا شروع ہوا۔ تو پھر شاید ہی کبھی اترا۔ ہمیشہ (کم و بیش دور سے) کسی نہ کسی کی پرستش کرتا رہا۔ لیکن یہ عشق سب سے نرالا تھا یہاں دوری کا تو سوال ہی نہ تھا۔ یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ یہاں تو درج مسرت سے لبریز تھی۔ اور دل میں مردانگی کے تکبیل پانے کا احساس تھا۔ ایسے جنگلی پھول کو انگلیوں میں تھامے رہنا۔ جب دل چاہے اسے ہونٹوں سے لگا لینا اور اسے خوشی کے مائے کا پیستے ہوئے محسوس کرنا۔ اس میں کتنا سرور ہے۔

ہاں مگر اس سرور کے ساتھ ایک الجھن بھی ہے۔ اس جھل کو آخر کرے کیا؟ دوبارہ اس لڑکی سے کس طرح ملے؟ پہلا پیار تو کچھ ٹھنڈے دل سے کچھ ترس کھا کر کیا تھا۔ لیکن اب تو ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اب تو جانتا ہے۔ کہ اسے بھی مجھ سے عشق ہے کس جذبے کے ساتھ اس نے میرے ہاتھ کو چوما تھا۔ کس زور کے ساتھ اسے سینے سے لگایا تھا۔ بعض لوگ ایسے ہیں کہ جب انہیں خراج عشق ادا کیا جائے۔ تو ان کی فطرت میں ایک کرختگی آجاتی ہے۔ لیکن ایشرسٹ ان لوگوں میں سے تھا۔ جو محبوب بن کر جھک جاتے ہیں۔ کسی کو گرویدہ دیکھ کر خود مسحور ہو جاتے ہیں۔ ان کے جذبات میں گرمی اور طبیعت میں گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ عشق کو ایک مجھو سمجھتے ہیں۔ جس سے ان کی فطرت میں ایک علو پیدا ہوتا ہے۔

ایشرسٹ جنگل کے ٹیلوں کے درمیان بیٹھا عجب کشمکش میں گرفتار تھا۔ دل کے اندر جو بہار کھل گئی تھی اس کے مزے لوٹنے کو

وقت ٹرک پر چلتے دکھا تھا۔ کیا کیا باتیں بنائیں گی۔ اور پھر اس کے اپنے دوست کیا کینے۔ رابرٹ گارٹن تو رخصت ہوتے وقت آٹھکار انداز سے اور طنز کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ اس کا دل گھن سے بھر گیا لمحے بھر کو اسے اس اسفل طعنہ زن دنیا سے نفرت ہو گئی جس میں انسان زندگی گزارنے پر مجبور ہے جس پھاٹک کے سہارے کھڑا تھا۔ اس کی سیاہی مدھم پڑ گئی۔ اور ایک نور کی جھلک اس کے برابر سے گذر کر نیلی نیلی تاریکی میں پھیل گئی۔ چاند نکل آیا۔ ایشرسٹ نے مڑ کر دیکھا عجیب نظارہ تھا۔ چاند مٹی کے پستے کے اڈپر دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن سرخ اور قریباً گول۔ ایشرسٹ نے گھر کی طرف قدم اٹھائے۔ بگڈنڈی پر رات اور گوبر اور نوخاستہ سبزے کی خوشبو آرہی تھی۔ احاطے میں مویشی بڑے بڑے کالے کالے دھبے سے معلوم ہوتے تھے۔ اس سیاہی میں کہیں کہیں ان کے پیلے پیلے سینگوں کے توس دکھائی دیتے تھے۔ جیسے آسمان سے ہلال لوگوں کے بل آگے ہوں۔ گھر میں کہیں روشنی نظر نہ آئی۔ بے پاؤں ڈیوڑھی تک پہنچا اور ایک یو کے درخت کی تاریکی میں گم ہو کر میگن کی کھڑکی کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ کھڑکی کھلی تھی نہ معلوم میگن سو رہی ہے۔ یا اس کی جدائی میں پریشان بیقرار کر دیں بدل رہی ہے۔ کھڑکی کو تک رہا تھا کہ ایک آؤ بولا۔ بجز ندی کے ہلکے ہلکے مسلسل و متواتر شور کے چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آؤ کی آواز جیسے رات کی تاریکی میں گونج اٹھی دن کو لگوڑوں کا چھمانا رات کو آؤوں کا بولنا۔ ایشرسٹ کے دل کے ہنگاموں کا ان سے بہتر ترجمان کون ہو سکتا ہے۔ دفعتاً میگن نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ ایشرسٹ درخت سے ذرا ہٹ آیا اور نہایت ہلکی آواز میں بولا "میگن"۔ میگن پیچھے ہٹی۔ غائب ہو گئی۔ پھر آئی باہر کو جھکی۔ ایشرسٹ اس گھاس کے قطعے پر پنچوں کے بل آگے بڑھا۔ سبز کرسی سے ٹھوکر لگی دم روک لیا۔ میگن کے چہرے اور پھیلے ہوئے بازو میں جو غیر واضح نظر آئے

تھے۔ کوئی حرکت نہ ہوئی۔ ایشرسٹ نے کرسی سرکا کر دیوار کے ساتھ لگا دی اور چپ چاپ اس پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ بڑھایا تو میگن تک جا پہنچا۔ میگن کے ہاتھ میں دروازے کی بڑی سی چابی تھی۔ ایشرسٹ نے گرم ہاتھ تھنڈی چابی سمیت زور سے پکڑ لیا۔ میگن کا چہرہ دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ ہونٹوں کے بیچ میں دانت چمک رہے تھے اور بال پریشان تھے۔ کپڑے اس نے ابھی نہ اتارے تھے۔ بیچاری ایشرسٹ کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ "تو بصورت میگن" اس کی گرم گرم کھردری انگلیاں ایشرسٹ کی انگلیوں سے پٹ گئیں بشرے سے کھوئی کھوئی معلوم ہوتی تھی۔ چہرے پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ اس چہرے تک ہاتھ کا پہنچ جانا بھی کتنی خوش نصیبی بنے آؤ پھر بولا۔ سویٹ برائے کی خوشبو ایشرسٹ کے نتھنوں میں سما گئی۔ فارم کا ایک کتا بھونکا میگن کی انگلیاں ڈھیلی پڑ گئیں اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔

"گڈ نائٹ میگن"

"گڈ نائٹ جناب"۔ وہ چلی گئی۔ ایشرسٹ آہ بھر کر نیچے اتار کر پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ اس کے سولے اب کیا ہو سکتا ہے۔ کچپ چاپ جا کر سو رہے۔ لیکن پھر بھی وہ بہت دیر تک تجس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کے بازو اس میں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ لیکن وہ نیم تنہم چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ وہ گرم انگلیاں۔ اسے یاد آرہی تھیں جو چابی اس کی ہتھیلی میں دبا کر اس کے ہاتھ کو لپٹ گئی تھیں۔ اور ایشرسٹ پر ایک نشہ سا چھایا ہوا تھا۔

۵

رات کو بھوکا ہی سو گیا تھا۔ لیکن صبح اٹھا۔ تو طبیعت میں گرائی سی تھی۔ جیسے رات کھانا پیٹ بھر کر کھایا ہو۔ کل کی سرگزشت عشق برسوں پہلے کی ایک کہانی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس دن پھر صبح میں ایک عجیب دلفریبی تھی۔ بہار کا موسم آج اپنے پورے جو بن پر تھا۔ آؤ رات سنہری پھول تمام مرغزار پر چھائے گئے تھے اور کھڑکی میں سے باغیچہ

سیب کے شکوفوں سے ڈھکا ہوا نظر آتا تھا۔ جیسے کسی نے گلابی اور سفید رنگ کا لحاف بچھا دیا ہو۔ جب ایشرسٹ نیچے اترتا تو دل ڈر سا رہا تھا۔ کہ میگن سے سامنا نہ ہو جائے۔ لیکن جب اس کا ناشہ میگن کی بجائے مسز نیرو کو مب لے کر آئی۔ تو ایشرسٹ کو ناگوار گزرا اور مایوسی ہوئی۔ آج مسز نیرو کو مب کی تیز آنکھ اور سانپ کی سی گردن پہلے سے بھی زیادہ چوکنی تھی۔ اسے کہیں معلوم تو نہیں ہو گیا!

”اچھا مسٹر ایشرسٹ۔ رات آپ گویا چاند کے ساتھ ساتھ میرے کتے رہے۔ کھانا بھی کہیں کھایا یا نہیں؟“

ایشرسٹ نے سر ہلا دیا۔

”ہم نے تو آپ کے لئے کھانا رکھ چھوڑا تھا۔ لیکن میں جانوں آپ کا دماغ اتنا مصروف تھا۔ کہ کھانے کا خیال بھی نہ آیا ہوگا“ کیا وہ اپنے ویلز کے لہجے میں (جس پر پیچم کی بولی بہت غالب آتی جا رہی تھی) اس کا مذاق اڑا رہی تھی؟ اگر اسے اس بات کا علم ہو جائے تو — ایشرسٹ نے اس وقت دل سے کہا ”نہیں نہیں میں یہاں سے چلا جاؤنگا“

لیکن ناشہ کرچکنے کے بعد میگن سے ملنے کی خواہش ہر لمحہ بڑھتی گئی۔ دل میں ڈرتا تھا۔ کہ کہیں کسی نے اس سے ایسی سی بات نہ کہ دی ہو۔ جس سے سب بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ تاہم وال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے۔ جو صبح سے اس نے شکل تک نہیں دکھائی۔ وہ عشقیہ نظم جو کل سہ پہر کو سیب کے درختوں کے نیچے اس پر اس قدر چھائی ہوئی تھی۔ اب اسے اتنی پھیکی معلوم ہوئی کہ مسودہ پھاڑ ڈالا۔ اور اس کی بتیاں بنا بنا کر ان سے پائپ سلگایا۔ اس ہاتھ کو پکڑ کر چوم لینے سے پہلے وہ عشق کی رمزوں سے محض بیخبر تھا۔ اور اب تو کوئی بھی کیفیت ایسی نہیں جس سے وہ آگاہ نہ ہو۔ لیکن ان کیفیات کو نظم کرنا گویا پانی کی لہریں گننا ہے۔ ایک کتاب لانے کو سونے کے کمرے میں گیا۔ دہان

پہنچا تو دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میگن اس کا بستر لگا رہی تھی ایشرسٹ دروازے میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ میگن نے جھک کر تکیے کو عین اس جگہ پر جہاں ایشرسٹ کے سر رکھنے سے بچ گیا تھا۔ چوم لیا۔ ایشرسٹ کے دل میں بیلخت مسرت کا ایک طوفان بپا ہوا۔ اب اس پر کس طرح ظاہر کرے کہ میں نے دیکھ لیا ہے۔ اگر بے پاؤں واپس لوٹ گیا اور اس نے آہٹ سن پائی۔ تو اوہ بھی برا ہوگا۔ میگن نے تکیے کو ہاتھ میں اٹھالیا۔ معلوم ہوتا تھا۔ رخسار کے نقش کو مٹانا نہیں چاہتی۔ پھر اسے نیچے رکھ دیا اور دروازے کی طرف مڑی۔

”میگن“

لڑکی نے چونک کر اپنے ہاتھ رخساروں پر رکھ لئے۔ لیکن اس کی آنکھیں ایشرسٹ کے آ رہا دیکھ رہی تھیں۔ ایشرسٹ کو ان تھلکتی ہوئی آنکھوں کی گہرائی پاکیزگی اور ان میں رقت انگیز وفا کی جھلک اٹکا اس قدر احساس پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ رُک رُک کر بولا۔

”رات تم میرے انتظار میں بیٹھی رہیں۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔“

لڑکی کچھ نہ بولی۔

”میں رات جنگل میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔ بڑا سہانا وقت تھا اب میں۔ میں۔ کتاب لینے اوپر آیا تھا۔“

میگن کا وہ تکیے کو بوسہ دینا یاد آیا۔ ہمت بڑھی۔ دل میں ایک جوش سا اٹھا۔ قریب آیا اور اس کی آنکھیں چوم لیں۔ رگوں میں خن تیز تیز دوڑنے لگا۔ دل نے کہا۔ ”اب بتاؤ۔ کل جو کچھ ہوا تھا۔ وہ تو دفعتاً۔ اضطرابی حالت میں سرزد ہوا تھا۔ لیکن اب؟ اب کس منہ سے کہو گے کہ۔۔۔۔۔“ لڑکی نے اپنا ماتھا ہونٹوں سے الگ نہ کیا۔ ایشرسٹ کے ہونٹ نیچے کو سرکتے گئے۔ اور آخر کار میگن کے ہونٹوں سے جا ملے۔ عمر بھر میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی کو مکمل احساس عشق کے ساتھ چوما ہو۔ بوسہ عشق جس میں کیف اور نشہ لیکن

ساتھ ہی ساتھ ایک معصومیت سی بھی تھی۔ اس سے دونوں میں سے کس کا دل زیادہ تڑپا ہوگا؟

”رات کو جب سب لوگ سو جائیں تو اس بڑے سے سبب کے درخت کے پاس ملنا۔ میگن وعدہ کرو۔“

میگن نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ ”میں وعدہ کرتی ہوں۔“
میگن کا رنگ فق تھا۔ ایشرسٹ نے کچھ اُسے دیکھا۔ کچھ اس سائے واقعے پر غور کیا۔ سم گیا۔ لڑکی کو چھوڑ کر نجی منزل میں اتر آیا جانتا تھا کہ اب پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ اس کے عشق کو قبول کر لیا اپنا عشق ظاہر کر دیا۔ اب باقی کیا رہ گیا ہے؟ کتاب لانا تو بھول ہی گیا تھا۔ خالی ہاتھ اس سبز کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کے سامنے او پیچھے فارم کے لوگ کام کاج میں مشغول تھے۔ لیکن ایشرسٹ کی نظریں مبہوت تھیں۔ اتر بھی رہا تھا کچھنا بھی رہا تھا۔ نہ معلوم کتنی دیر یونہی بیٹھا رہا۔ اور پھر جو دیکھا۔ تو دایں ہاتھ کو ذرا پیچھے ہٹ کر جو کھڑا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کھیت پر سے ابھی ابھی لوٹا ہے جسم کا بوجھ کبھی اس ٹانگ پر ڈال دیتا کبھی اس ٹانگ پر چرے کا رنگ ڈوبتے سوچ کی مانند تھا۔ نیلی قمیص کی آستینیں چڑھا رکھی تھیں۔ بازوؤں کی رنگت اور چمک پکے ہوئے آردوں کی سی تھی۔ لال لال ہونٹ کھلے ہوئے تھے اور سانس دھونکنی کی طرح سنائی دیتا تھا۔ نیلی نیلی آنکھیں۔ سن کی سی پلکیں۔ نظریں ایشرسٹ کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔ ایشرسٹ نے طنز سے پوچھا:-

”کیوں جو۔ کوئی خدمت میرے لائق؟“

”ہاں“
”کیا؟“

”تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں۔“
ایشرسٹ پہلے ہی کونسا مسکین صورت تھا۔ اور اب تو وہ اور بھی تن کے بولا:-

”تمہاری بہت حیرانی ہے۔ لیکن تمہیں حدیٰ فوجدار بننے کو کس نے کہا؟“

جو ایک دو قدم آگے بڑھا۔ محنتی نوجوان کے پسینے کی بوائیٹر کے نکتوں کو ناگوار گزری۔

”تم یہاں کیوں ٹھہرے ہو؟“

”میری مرضی۔“

”چندیا کی استری ہو گئی۔ تو مرضی مرضی سب بھول جائیگی۔“

”تو تمہارا ہاتھ کس نے روکا ہے؟“

جوان نے کچھ نہ کہا۔ صرف سانس اور بھی تیز ہو گیا۔ جوان اور پھرے ہوئے ساند کی طرح آنکھوں سے آگ برسنے لگی۔ غصے کے مائے چہرے کے پٹھے اینٹھ گئے۔

”میگن تمہیں نہیں چاہتی۔“

اکھڑ بد تمیز دہقان کی یہ بات سن کر ایشرسٹ کے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی۔ حقارت اور غصے اور حسد سے آگ بگولا ہو گیا۔ اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ بکھخت اٹھا۔ کرسی پیچھے کو دھکیل دی اور بولا:-

”ایسی کی تیری تمہاری۔“

یہ الفاظ منہ سے نکالے تو سامنے میگن نظر پڑی۔ بادامی رنگ کا کتے کا پلا گود میں اٹھائے دروازے میں کھڑی تھی جلدی سے پاس آئی اور بولی۔ ”دیکھو اس کی آنکھیں نیلی ہیں۔“

جو چل دیا۔ گردن کا رنگ سیج جی قرمزی ہو رہا تھا!

ایشرسٹ نے کتے کے ہونٹوں کو پیار سے پھیرا۔ کتا بڑے سے مینڈک کی مانند موٹا تازہ بڑے مزے سے میگن کی گود میں لیٹا تھا۔

”یہ ابھی سے تمہیں پیار کرنے لگا ہے۔ سبھی تم سے پیار کرتے ہیں۔“

”جو آپ سے کیا کہ رہا تھا؟“

”کہتا تھا۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میگن کو تمہاری ضرورت نہیں۔“

لڑکی نے پاؤں فور سے زمین پر مارا۔ پھر آنکھ اٹھا کر ایک پجارن کی نظروں سے ایشرسٹ کو دیکھا۔ ایشرسٹ کانپ اٹھا۔ جیسے کسی پردانے کے پر جلتے دیکھ لئے ہوں۔
 بولا۔ ”آج رات! بھولنا مت!“

”نہیں۔“ سر جھکا کر کہنے کو پیار کیا اور اس کے موٹے تلنے جسم سے چہرہ ڈھلپنے اندر چلی گئی۔

ایشرسٹ گنڈنڈی کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ مرغزار کے پھاٹک پر وہ لنگڑا آدمی ملا۔ گائیں چرا رہا تھا۔ ایشرسٹ بولا۔
 ”جم۔ بڑا اچھا موسم ہے۔“

”گھاس کے لئے بہت اچھا ہے۔ اس لئے اوک کے درخت ایش کے درختوں سے پہلے ہرے ہو گئے۔ مثل ہے۔ کہ جب اوک کے درخت ایش سے پہلے۔“

ایشرسٹ نے یونہی پوچھا۔ ”جم جب تمہیں جیسی ہوا نظر آیا تھا۔ تو تم کہاں کھڑے تھے؟“

”بس اس بڑے سیب کے درخت کے نیچے سمجھ لیجئے۔“

”کیا واقعہ بھی کچھ تھا یا یونہی؟“

”اب یہ تو خدا جانے۔ کم از کم مجھے یہی معلوم ہوا۔ کہ کھڑا ہے۔“

”یہ ہوا اتنا کیوں ہے؟“

لنگڑے آدمی نے دھیمی آواز میں کہا۔

”کسی کی برائی تو نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن کہتے ہیں۔ کہ سٹر نیرو کو مب نسل کا جیسی تھا۔ آپ جانتے ہیں۔ جیسی لوگ

اپنی نسل کے آدمی کو ہاتھ سے جلانے نہیں دیتے۔ انہیں کسی نہ کسی طرح خبر پہنچی ہوگی۔ کہ سٹر نیرو کو مب مرنے والا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھوت کو بھیج دیا۔ کہ جاؤ۔ تم پاس

رہو۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں۔“
 ”دیکھنے میں کیسا تھا؟“

”پھرے پر بال ہی بال۔ یوں چلتا تھا جیسے ہاتھ میں فڈل اٹھا رکھا ہو۔ بعض لوگ کہتے ہیں۔ بھوت پریت سب جھوٹ۔ ہے۔ لیکن صاحب اندھیری رات میں اس کہنے کے جسم پر روٹنگٹے کھڑے ہوتے تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ خود چاہے مجھے بھوت نظر نہ آیا ہو۔“
 ”چاند نکلا ہوا تھا؟“

”کوئی بارہویں تیرہویں رات تھی۔ چاند ابھی ابھی نکلا تھا۔ اور ان درختوں کے پیچھے سنہری سنہری دکھائی دے رہا تھا۔“

”تمہارا خیال ہے بھوت منحوس ہوتے ہیں؟“
 لنگڑے آدمی نے اپنی ٹوپی پیچھے سرکا دی۔ اوپر اٹھی ہوئی نظروں سے ایشرسٹ کو اور بھی خور سے دیکھنے لگا۔

”صاحب یہ تو خدا جانتا ہے۔ لیکن آخر بھوت یوں لمبے مائے کیوں پھرتے ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں۔ کہ خدا کے ان بھیدوں کو ہم کیا جانیں۔ بعض لوگوں کو کچھ نظر آتا ہے۔ بعض کو نہیں آتا۔ اب ہمارے جو کو یا ہمارے لڑکوں کو لیجئے۔ سامنے بڑی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن میگن کی نظر کیا مجال کبھی چوک جائے۔ جو ہوگا۔ دکھائی دیگا۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی نظر آئے گا۔“

”وجہ یہ ہے کہ وہ حساس ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”میرا مطلب ہے وہ ہر چیز کو محسوس کرتی ہے۔“

”یہ سچ ہے۔ میگن کا دل بڑا نرم ہے۔“

ایشرسٹ کو اپنے چہرے پر خون دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔ نمبا کو کی تھیلی آگے بڑھا دی۔ ”لو پائپ بھرو۔“



منشی تصویر
داتہ بیہوت سنگھ

تھینکی حضور۔ بس لاکھوں میں ایک ہے یہ لڑکی۔“
ایشرسٹ نے جواب میں مختصر سا فقرہ کہا۔ تھیلی پیٹ لی اور چل دیا۔

اُس کا دل نرم ہے۔ بجا لیکن میں بھی بھلا کس فکر میں ہوں۔ میری نیت کیا ہے۔ ادھر ادھر کھیتوں میں گھومتا پھرا۔ لیکن اس خیال نے پیچھا نہ چھوڑا۔ کھیتوں میں بٹرکپ کے پھول اُگ رہے تھے اور لال رنگ کے پچھڑے گھاس چر رہے تھے۔ آسمان پر اہلیں اڑ رہی تھیں۔ واقعی ایش کے درخت ابھی ہرے نہ ہوئے تھے لیکن اوک کے درختوں پر بھورے بھورے سنہری پھول کھل رہے تھے۔ ہر درخت کا رنگ جدا تھا کسی کی اٹھتی جوانی تھی۔ کوئی اپنے پورے جوبن پر تھا۔ نکو اور ہزار ہا پرندے چھپا رہے تھے۔ چھوٹی ڈھچھوٹی نیلے کا پانی دمک رہا تھا۔ قدیم زمانے کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ عیش و عشرت کا زمانہ آنے والا ہے۔... باغ جنت میں... ایک بھڑ اس کی آستین پر آ بیٹھی۔ ایک بھڑ سے دو ہزار بھڑیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور ایک بھڑ کو مار ڈالو تو گویا جو سب ان شکوفوں سے اگیٹگے وہ دو ہزار بھڑوں کی دستبرد سے محفوظ ہو جائینگے۔ پر کون ایسا سنگدل ہوگا۔ جو ایسے خوشگوار موسم میں کسی کی بھی جان لے سکے۔ ایک کھیت میں سرخ رنگ کا ایک جوان ساند چر رہا تھا۔ ایشرسٹ نے اسے دیکھا تو جو کی شکل یاد آئی۔ لیکن ساند نے ایشرسٹ سے کچھ تعرض نہ کیا۔ شاید یہ پست قد جانور خود بھی اس سنہری چراگاہ کی خوبصورتی اور موسمی سے مست تھا۔ ایشرسٹ بے کھٹکے ندی کے پاس ڈھلوان پر جا پہنچا۔ سامنے ایک پہاڑی چٹانوں کا تاج پہنے کھڑی تھی۔ بلیو بل اس کثرت سے اگ رہے تھے۔ کہ زمین پر ایک نیلی سی دھند چھا گئی تھی اور سب کے کوئی بیس درخت شکوفوں سے لدے کھڑے تھے۔ ایشرسٹ گھاس پر لیٹ گیا۔ کھیتوں کے منظر پر اوک کے شکوفوں اور بٹرکپ کے پھولوں کا سنہری رنگ چرٹھا ہوا تھا لیکن یہاں ٹیلے رنگ کی پہاڑی کے دامن میں تو جیسے آسمان کا حسن زمین پر اتر

آیا تھا۔ ایشرسٹ اس فرق کو دیکھ کر محو حیرت تھا۔ لکھوں کا چھپنا اور ندی کا شور البتہ ویسے ہی سنائی دے رہا تھا۔ بہت دیر تک لیٹا رہا۔ شہد کی مکھیوں کے سوا اور کوئی ساکتی نہ تھا۔ سورج نے رفتہ رفتہ اپنا رخ بدل لیا۔ اور سب کے درختوں کے سائے بلیو بل کے بھولوں پر پڑنے لگے۔ دیوانہ وار خیال آیا۔ آج صبح اُٹھے چر رہا تھا۔ آج رات سب کے پیڑ کے نیچے ملاقات ہوگی۔ بن دیو یاں ایسے ہی درختوں میں آرام کرتی ہیں۔ اور سوکھے ہوئے برکین کی رنگت کے نیچے کاٹو ڈالے دیونا ان کے انتظار میں پڑے بہتے ہیں۔ ہوش میں آیا تو لگو چھپا رہے تھے اور بہتے پانی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ لیکن سورج پہاڑی کے نیچے جا چھپا تھا۔ ڈھلوان پر ایک خنکی سی آئی تھی۔ اور کہیں کہیں خرگوش باہر نکل آئے تھے۔ سوچا۔ ”آج رات جس طرح زمین سے ہر شے باہر ابھری آ رہی تھی اور ایک غیر مرئی ہاتھ کی نرم اور پراسرار مشاطگی سے اس کا حسن ہر لمحہ آشکار تر ہو رہا تھا۔ اسی طرح اس کے دل اور اس کے حواس کی بھی جیسے نہیں ایک ایک کر کے کھلتی جا رہی تھیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا سب کے درخت کی ایک ہٹنی توڑ لی۔ شکوفوں میں میگن کا ساحن صحرانی دہی سپی سا شہبانی رنگ۔ وہی نازگی اور کھلے ہوئے پھولوں میں میگن کی سفید رنگت۔ وہی دل کو موم کر دینے والی نفوذی جلوہ گر تھی۔ ٹہنی کو کوٹیں لگایا دل کے اندر جو بہا کھل رہی تھی اس کا تاثر خوش فحندی کے ایک گہرے سانس کے ساتھ ہونٹوں سے باہر نکلا لیکن خرگوش بدک کر بھاگ گئے۔“

۶

اوڈیے کی جلد آدھ گھنٹے سے ایشرسٹ کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن پڑھا ایک لفظ بھی نہ تھا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے کتاب رکھ دی اور احاطے میں سے ہو کر باغیچے میں پہنچ گیا۔ پہاڑ کے عقب سے سنہری رنگ کا چاند ابھی ابھی نکلا تھا اور ایک ایش کے درخت کی نیم برہنہ ٹہنیوں میں سے ایک نورانی پر ہلال محافظ فرشتے کی طرح چھانک رہا تھا۔ سب کے پیڑوں کے نیچے ابھی

اندھیرا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ میں کہاں ہوں اور مجھے کس طرف جانا ہے۔ ناہموار گھاس کو پاؤں سے ٹوٹل ٹوٹل کر اُٹھے بڑھا۔ اس کے پیچھے قریب ہی کسی تاریک چیز نے حرکت کی اور ڈکار لینے کی سی آواز آئی۔ تین بڑے بڑے سُر دریا چونکے اور ہل جل کر پھر ایک دوسرے کے پہلو میں دیوار کے نیچے لیٹ گئے۔ اس نے کان لگا کر سنا۔ ہوا بند تھی۔ لیکن راہ میں ندی کی سرگوشیاں اور قہقہے دو چند سنائی دیتے تھے۔ ایک پرندہ (نہ معلوم کونسا) لگاتار پپ۔ پپ۔ پپ کر رہا تھا۔ اور ایک نائٹ جار کے اڑنے اور ایک الو کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ایشرسٹ ایک دو قدم بڑھا اور پھر رک گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے سر کے ارد گرد ایک دھندلی سی سفیدی چھائی ہوئی ہے جس میں زندگی دھڑک رہی ہے۔ ساکن اور سیاہ درختوں پر مینا رکیاں اور شگوفے جن کے نقش پھیلے ہوئے اور دھندلے سے دکھائی دے رہے تھے۔ بڑھتی ہوئی چاندنی کے طلسم سے زندہ ہو رہے تھے اُسے ایک عجیب احساس ہوا۔ کہ وہ تنہا نہیں بلکہ رفیقوں کی صحبت میں ہے۔ گویا کئی لاکھ پروانے یا فرشتے کہیں سے اڑ کر آئے ہیں اور تاریک آسمان اور تاریک زمین کے درمیان آکر ٹھہر گئے ہیں اور اس کی آنکھوں کے برابر اپنے پر کھول رہے ہیں اور بند کر رہے ہیں۔ اس ہوشربا لمحے کے حسن سے مسحور ہو کر جس میں کوئی آواز کوئی خوشبو نہ آتی تھی۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ باغیچے میں کیوں آیا تھا۔ وہ حسنِ پُراں جس میں زمین دن بھر ملبوس ہی تھی چاندنی اسے تحلیل نہ کر سکی۔ صرف اس کی وضع بدل ڈالی۔ جھاڑیوں اور شاخوں میں سے ہوتا ہوا جن پر وہ زندہ سفیدی سفوف کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ آگے نکل گیا اور بڑے سبب کے درخت تک جا پہنچا۔ اندھیرے میں بھی وہ درخت باقی درختوں سے گھیر اور بلندی میں قریباً دو گنا۔ کھلے میدان اور ندی کی طرف جھکا ہوا صاف پہچانا جاتا تھا۔ گھنی

ٹہنیوں کے نیچے پہنچ کر وہ پھر رک گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ وہی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اور نیم خوابیدہ سُر دھیمی آواز میں ڈکرا رہے تھے۔ اس کے سس سے تنے کی کھر دہی کائی دار سطح میں سے کوئلے کی مٹی کی سی خوشبو نکلی۔ کیا وہ آئینگی؟ کیا سچ سچ؟ ہر کھراتے ہوئے مسحور مانتا ہے مخلوق کے درمیان اس کے دل پر ہر طرح کی بدگمانی نے احاطہ کر لیا۔ یہاں کی کوئی شے بھی اس دنیا کی معلوم نہ ہوتی تھی۔ یقیناً یہ مقام فانی عاشقوں کے لئے نہیں۔ ایشرسٹ اور اس دہقانے لڑکی کے لئے نہیں صرف دیوتاؤں اور دیویوں کے لئے بنا ہے۔ اگر وہ نہ آئی تو کیا طبیعت کو ایک اطمینان ایک خلصی کا سا احساس نہ ہو گا؟ لیکن پھر بھی اس کے کان اسی کی آہٹ سننے کے منتظر تھے۔ وہ نامعلوم پرندہ بدستور پپ کر رہا تھا۔ ندی کا شور بدستور سنائی دے رہا تھا۔ اور درخت کی ٹہنیوں میں مجوس چاند ندی کو جھانک رہا تھا۔ آنکھ کے برابر جو شگوفے تھے وہ معلوم ہوتا تھا ہر لمحہ زندہ تر ہو رہے ہیں۔ ان کا پر اسرار نقری حسن بھی ایشرسٹ کی بیتابی کا ایک جزو بنا جا رہا تھا۔ اس نے ایک ٹہنی جس پر تین شگوفے کھل رہے تھے۔ توڑ لی۔ پھل دار درختوں کے شگوفوں کو نرم۔ پاکیزہ۔ مقدس۔ نوخیز شگوفوں کو توڑنا اور پھر پھینک دینا کیا یہ گناہ عظیم نہیں؟ یکجہت پھانک کے بند ہونے کی آواز آئی۔ سُر پھر جاگ اُٹھے اور ڈکرانے لگے۔ ایشرسٹ درخت کے ساتھ سہارا لگائے کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کائی دار تنے کو دبائے تھے۔ میگن کو دکھایا۔ توجیرت سے دم روک لیا۔ اس کی خاموش رفتار ایک پری کی سی تھی جو درختوں کے بیچ میں پھر رہی ہو۔ جب قریب پہنچی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا تاریک جسم ایک چھوٹے سے درخت کا حصہ ہے۔ اس کا سفید چہرہ شگوفوں میں کا ایک شگوفہ ہے۔ وہ چپ چاپ ایشرسٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایشرسٹ نے دھیمی آواز میں کہا۔ میگن!

اور ہاتھ بٹھا دئے۔ وہ سیدھی دوڑ کر اس کے سینے سے آگئی۔ جب اس کا دل اپنے دل کے ساتھ دھڑکتا ہوا محسوس کیا۔ تو ایشرسٹ نے اپنے دل کو فویرسواں اور دفور عشق سے لبریز پایا چونکہ وہ اس دنیا کی نہ تھی۔ نوجوان تھی معصوم تھی۔ اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھی عشق میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور کسی طرح اپنی حفاظت نہ کر سکتی تھی۔ اس تاریکی میں اس کا محافظ نہ بنے تو اور کیا کرے؟ مگر چونکہ وہ ہمہ تن حسن اور سادگی تھی اور زندہ شکوفہ کی طرح بہار کی اس رات کا ایک جزو تھی۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ کہ وہ جو کچھ دے وہ سب کا سب قبول نہ کر لے۔ اور اس کے دل کی بہار اور اپنے دل کی بہار دونوں کی تکمیل نہ کرے؟ یہ دو جذبے اپنی اپنی طرف اسے کھینچ رہے تھے۔ لڑکی کو زور سے سینے کے ساتھ لگایا۔ اور اس کے بالوں کو بوسہ دیا۔ کچھ معلوم نہ ہوا۔ کہ کتنی دیر دونوں اپنی خاموش دہان کھڑے رہے۔ ندی بڑبڑاتی رہی۔ آؤ بولتے رہے۔ چاند چپکے چپکے بلند تر اور سفید تر ہوتا گیا۔ ان کے ارد گرد شکوفے زندہ حسن کے دل کی دھڑکن سے اور بھی چمک اٹھے۔ ہونٹوں کے وصل نے گفتگو کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گفتار کا یہاں کوئی کام نہیں۔ بہار صرف سرسراتی ہے اور سرگوشیاں کرتی ہے۔ بہار بولتی نہیں۔ لیکن بہار کے کھلے ہوئے پھول پھوٹی ہوئی کونپلیں ندیوں کی سبکیائی۔ ان کی خوش آہنگ والہانہ جستجو یہ تقریر و گفتار سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ اسی طرح بہار بعض اوقات زندہ بھی ہو جاتی ہے۔ اور ایک پرامر اساحر کی طرح دو عاشقوں کے پاس کھڑی ہو کر ان دونوں کے گرد اپنی باہیں ڈال دیتی ہے۔ اپنے انگلیوں کے مس سے ان پر اپنا جادو پھیر دیتی ہے۔ اور پھر وہ ہونٹوں سے ہونٹ ملائے۔ سبز اس بوسے کے سب کچھ بھول جاتے ہیں جب میگن کا دل اسکے دل کے ساتھ دھڑک رہا تھا اور میگن کے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر پھر ٹک رہے تھے۔ ایشرسٹ کے

دل کو نیلی مسرت کے سوا اور کوئی احساس نہ تھا۔ قسمت میں ہی لکھا تھا کہ وہ اس کی آغوش کو زینت بخشے۔ عشق کا کہا کون موڑ سکتا ہے؟ لیکن جب سانس لینے کو ان کے ہونٹ جدا ہوئے۔ تو دہائی فوراً حائل ہوئی۔ البتہ عشق کا جذبہ اب پہلے سے زیادہ منہ زور تھا ایشرسٹ نے ایک آہ بھر کر کہا :-

”او میگن۔ تم کیوں آئیں؟“

میگن نے نظر اٹھائی۔ کچھ حیران تھی۔ کچھ مجروح۔

”جناب آپ ہی نے بلایا تھا“

”میری جان مجھے جناب نہ کہو۔“

”تو پھر کیا کہوں؟“

”فرینک“

”میں نہیں کہہ سکتی۔ ہرگز نہیں۔“

”تو کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں؟“

”دل پر میرا زور نہیں۔ میں ہمیشہ آپ کے پاس رہنا چاہتی

ہوں اور بس“

”بس“

دھیمی آواز میں جوں سے جوں شکل سنائی دیتی تھی۔ میگن نے کہا

”آپ کے پاس نہ رہ سکی۔ تو میں مرجائوں گی۔“

ایشرسٹ نے ایک لمبا سانس لیا۔

”تو آؤ پھر میرے پاس آؤ!“

”اوہ!“

اس ”اوہ“! میں جو ڈر اور مسرت تھی اس سے ایشرسٹ

پر ایک نشہ سا چھا گیا۔ دھیمی آواز میں بولا :-

”میں تمہیں لندن لے چلوں گا۔ میں تمہیں سب دنیا کی سیر

کراؤں گا۔ اور میگن میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ہر طرح تمہارا

خیال رکھوں گا۔ کبھی تم سے درشتی کے ساتھ پیش نہ آؤں گا“

”اگر میں آپ کے پاس رہ سکوں تو یہی کافی ہے“

”ود دیکھو!“

ایشترسٹ کو روشن ندی - ہلکے سنہری رنگ کے فرز چمکتے ہوئے
بیچ کے درختوں اور ان کے پیچھے چاندنی میں اس پہاڑی کے سوا
اور کچھ نظر نہ آیا - پیچھے سے اس کو میگن کی سہمی ہوئی آواز سنائی
دی - ”جیسی ہوا!“
”کہاں؟“

”وہ درختوں کے نیچے - پتھر کے پاس۔“

ایشترسٹ نے برا فروخت ہو کر ندی کو پھاندا اور بیچ کے درختوں
کے جھنڈ کی طرف چلا - چاندنی کا فریب ہے! کچھ بھی نہیں اچھاؤں
اور تھارن کے درختوں کے بیچ میں بڑبڑاتا اور لعنتیں بھیجتا ادھر
ادھر بھاگتا اور ٹھوکریں کھاتا پھرا - واہیات! فضول! پھر سیب
کے درخت کے پاس گیا لیکن وہ جاچکی تھی - اسے ایک سرسراہٹ - سورتوں
کے ڈکرانے اور پھاٹک کے ہنر ہونے کی آواز سنائی دی - وہ چلی گئی صحن
وہ پرانسیب کا درخت وہاں رہ گیا - اس نے اپنی بائیں تنے کے گرد ڈال دیں -
کہاں اس کا نرم جسم کہاں یہ سخت تناؤ؟ کھردری کاٹی اس کے چہرے کو چھو
رہی تھی - کہاں اس کا کھردرا پن - کہاں اس کا نرم رخسار؟ صرف خوشبو جھگل
کی خوشبو - کم و بیش ویسی تھی اور اس کے اوپر اور اس کے ارد گرد شگوفے پہلے
سے زیادہ زندہ - چاندنی میں پہلے سے زیادہ روشن - دکتے اور سانس
لیتے معلوم ہوتے تھے -

(۷)

ٹور کی سٹیشن پر ریل سے اتر کر ایشترسٹ نے سمندر کا رخ کیا اور
ساحل کے ساتھ ساتھ رُک رُک کر ٹھٹھارایا - کیونکہ وہ انگلستان کے
ساحلی مقامات کی اس ملکہ یعنی ٹور کی سے اچھی طرح واقف نہ تھا - اپنے
لباس کا چندان خیال نہ تھا - اس لئے اُسے اس بات کا احساس نہ
ہوا - کہ یہاں کے باشندے اسے تعجب کی نگاہوں سے دیکھ رہے
ہیں - وہ ایک موٹی سی نارفوک جیکٹ - گرد آلود بوٹ اور پٹی پرانی
ٹوپی پہنے لمبے لمبے قدم اٹھائے چلا جا رہا تھا - اس بات سے

ایشترسٹ نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا:-

”کل میں ٹور کی جاؤنگا - اور وہاں سے روپیہ لے کر تمہارے لئے کپڑے
خریدوں گا - ان کپڑوں میں خواہ مخواہ لوگ شہ کرینگے - پھر ہم چیکے
سے لندن چلے جائینگے - اور وہاں پہنچ کر اگر تمہیں مجھ سے محبت
ہوئی - تو شادی کر لینگے۔“

میگن کے بالوں کی تھرتھراہٹ سے اس کے سر کی جنبش کا پتہ

چلتا تھا -

”نہیں نہیں میں یہ نہیں کر سکتی - میں صرف آپ کے پاس رہنا
چاہتی ہوں۔“

اپنی مردانگی سے خود ہی مخمور ہو کر ایشترسٹ نے کہا:-

”نہیں بلکہ میں تمہارے قابل نہیں - میگن تمہیں مجھ سے محبت
کب پیدا ہوئی؟“

”جب میں نے آپ کو سڑک پر دیکھا اور آپ نے مجھ پر نگاہ
ڈالی - پہلی ہی رات مجھے آپ سے محبت ہو گئی تھی - لیکن یہ
کبھی مجھے وہم میں بھی نہ آیا تھا - کہ آپ مجھے چاہینگے۔“
یکھت گھٹنوں کے بل جھک کر ایشترسٹ کے پاؤں کو چومنے
لگی -

ایشترسٹ کا نپ اٹھا - فوراً اس کو اٹھایا - اور بھینچ کر گلے سے

لگالیا - بہت پریشان ہو گیا تھا - اس لئے کچھ بول نہ سکا - میگن نے

کہا - ”آپ مجھے کیوں چومنے نہیں دیتے؟“

”مجھے تمہارے پاؤں چومنے چاہئیں۔“

میگن کی سکر اہٹ سے ایشترسٹ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے

چاند کی روشنی میں ایشترسٹ کے قریب میگن کے چہرے کی سفیدی

اور اس کے کھلے ہوئے ہونٹوں کا ہلکا گلابی رنگ - ان میں سیب

کے شگوفوں کا ساندہ غیر ارغی حسن تھا -

اور پھر یکھت میگن نے آنکھیں پھاڑ کر دکھے ہوئے انداز میں

سامنے دیکھا - کسما کر اس کی آغوش سے اپنا آپ چھڑایا اور بولی -

”بس یہی جو عام طور پر ہوتا ہے“

”بہت خوب“

جب وہ چلی گئی تو ایشرسٹ کھڑکی میں لٹکے ہوئے لباسوں کو پریشان نظروں سے دیکھتا رہا اور یکجہت اسے خیال پیدا ہوا۔ کہ میگن۔ اس کی میگن۔ سوائے کھروری پٹی کے سوائے کھرورے بلاؤز اور دہقانی ٹوپی کے یعنی سوائے ان کپڑوں کے جن میں اُسے بارہا دیکھا تھا۔ کسی اور لباس میں بہت ہی عجیب معلوم ہوگی۔ نوجوان عورت بازو پر بہت سے کپڑے ڈالے واپس آئی۔ اور ایک ایک لباس کو اپنے طرہ دار جسم کے ساتھ لگا لگا کر دکھانے لگی۔ ان میں سے ایک کا فاختی رنگ ایشرسٹ کو بہت پسند آیا۔ لیکن میگن کو یہ لباس پہنے ہوئے تصور نہ کر سکتا تھا۔ نوجوان عورت چلی گئی اور چند اور کپڑے اٹھا لائی۔ لیکن ایشرسٹ کا دماغ سن ہو گیا تھا۔ کیا چنے اور کیونکر چنے؟ ٹوپی اور جوتا اور دستاؤں کی بھی ضرورت ہوگی اور فرض کر و سب کچھ خرید کر اُسے پتھا دیا۔ اور اس لباس نے اسے بالکل ہی بے رنگ بنا دیا۔ جیسے انوار کے کپڑے اکثر دہقانوں کو بناتے ہیں۔ تو پھر کیا ہوگا! سفر میں بھی اپنے ہی کپڑے کیوں نہ پہنے ہاں۔ لیکن ان کپڑوں میں وہ بہت نمایاں معلوم ہوگی۔ یہ ہنسی کھیل نہیں۔ خور و فکر کا معاملہ ہے۔ نوجوان عورت کو بے معنی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کیا معلوم یہ سب کچھ مار گئی ہو اور مجھے محض ایک بد معاش شخص سمجھتی ہو۔ آخر کار بولا: ”یہ فاختی رنگ کا لباس علیحدہ رکھ دو۔ میں اس وقت فیصلہ نہیں کر سکتا۔ دو پہر کے بعد پھر آؤنگا۔“

نوجوان عورت نے ایک آہ بھری۔

”بہت اچھا۔ بہت خوبصورت لباس ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس سے موزون لباس نہیں مل سکتا۔“ ایشرسٹ نے کہا۔ ”ہاں نہیں۔“ اور چل دیا۔

محض بخیر کہ لوگ اس لباس کو حیرت سے تنک رہے ہیں۔ اس کا بینک لندن میں تھا۔ لیکن وہ اس تلاش میں تھا کہ یہاں اس کی کئی شاخ موجود ہو۔ تو یہیں سے روپیہ نکلوا لے۔ جب بینک میں پہنچا تو اس کے خوشگوار خیالات کو پہلا دھچکا لگا۔ انہوں نے پوچھا۔ آپ ٹورکی میں کسی کو جانتے ہیں؟ جواب ملا۔ نہیں۔ انہوں نے کہا آپ لندن تار بھجوتے تھے۔ وہاں سے جواب آئیگا۔ تو ہم بڑی خوشی سے آپ کو روپیہ ادا کر دیں گے۔ محسوس کاروباری دنیا کے مشتبہ سانس نے اس کے درخشاں تصورات کو دھندلا کر دیا۔ لیکن تار اس نے بھیج دیا۔

ڈاک خانے کے سلمے عورتوں کے ملبوسات کی ایک دکان نظر پڑی۔ اس نے کھڑکی میں لٹکے ہوئے کپڑوں کو انوکھے پن کے احساس کے ساتھ دیکھا۔ اپنی مجبور دہقانی کے لئے کپڑے خریدنا خاصا پریشان کن ثابت ہوا۔ دکان کے اندر گیا۔ ایک جوان عورت سامنے آئی۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور لمبھے پر خفیف سے تعجب کے آثار تھے۔ ایشرسٹ بغیر کچھ بولے اُسے نکلتا رہا۔

”کئے جناب؟“

”مجھے ایک نوجوان خاتون کے لئے لباس خریدنا ہے۔“ نوجوان عورت مسکرا دی۔ ایشرسٹ نے ماتھے پر نیوری ڈالی بکھلت اور بڑے زور سے اس بات کا احساس ہوا۔ کہ یہ زمائش انوکھی فرمائش ہے۔

نوجوان عورت نے جلدی سے کہا:-

”کس قسم کا لباس چاہتے آپ کو؟ بہت وضعدار؟“

”نہیں سیدھا سادا۔“

”یہ نوجوان خاتون کس قد کی ہیں؟“

”معلوم نہیں۔ بس تم سے دو اینچ چھوٹی ہونگی۔“

”مگر کا ناپ آپ مجھے بتا سکتے ہیں؟“

میگن کی سمر!

ہوتے مکانات کی ایک ہلائی قطار کے سامنے آکر ٹھہر گئے۔ جو سمندر سے ذرا ہٹ کر واقع تھے۔ عین وسط میں ایک ہوٹل تھا۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔

”میرے کمرے میں آکر منہ ہاتھ دھو لو۔ لہجہ ابھی تیار ہوا چاہتا ہے۔“

ایشرسٹ نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔ فارم ہوس میں پندرہ دن تک صرف ایک کنگھی اور دو قمیصوں پر گزارہ کیا تھا اور یہاں تو کئی کپڑے اور کئی برش رکھے تھے۔ سوچا عجیب بات ہے۔ انسان کو احساس بھی نہیں ہوتا۔ کہ — ”کاسے کا احساس؟“ اسے ٹھیک معلوم نہ تھا۔

ہیلی ڈے کے ساتھ بیٹھنے کے کمرے میں لہجہ کھانے گیا تو تین اجنبی چہرے نظر آئے۔ رنگ بہت گورا۔ آنکھیں نیلی۔ ہیلی ڈے نے کہا۔ ”یہ فرینک ایشرسٹ ہیں۔ یہ میری چھوٹی بہنیں ہیں۔“ تینوں چہرے یکجہت ادھر اٹھے۔

دو تو بہت ہی چھوٹی تھیں۔ ایک دس سال کی ایک گیارہ سال کی لیکن تیسری کی عمر سترہ سال کے لگ بھگ تھی۔ قد لمبا بال ہلکے رنگ کے۔ سرخ و سفید رخسار جن کو سورج نے ذرا سنولا دیا تھا۔ بھویں سامنے سے نیچی دائیں بائیں سے ذرا اٹھی ہوئی تھیں۔ اور ان کی رنگت سر کے بالوں سے قدرے گہری تھی۔ آوازیں تینوں کی ہیلی ڈے کی طرح بلند اور لبثاں تھیں تینوں سیدھی کھڑی ہو گئیں۔ جلدی جلدی ہاتھ ملایا۔ ایشرسٹ پر ایک تجسس نظر ڈال کر فوراً آنکھیں ہٹالیں۔ اور سہ پہر کے مشاغل کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔ ایک ڈانٹا اور باقی دو اس کی داسیاں معلوم ہوتی تھیں۔ فارم کی زندگی کے بعد ان کی مشورہ پر جوش۔ بے تکلف گفتگو۔ ان کا پرسکون منہ ہوا بے تکلف انداز شائستگی پہلے تو اٹکھا اور پھر اس قدر مافوس معلوم ہوا کہ فارم ہوس کا ماحول یکجہت کسی دور دراز دنیا کا خواب معلوم

مشتبہ دنیا کے کاروباری پن سے پھر ایک بار آزاد ہو کر اس نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر اپنے تصورات میں مشغول ہو گیا تصور میں اس بھولی بھالی پیاری لڑکی کو دیکھا جو اپنی زندگی اس کی زندگی کے ساتھ وابستہ کرنے کو تیار تھی۔ دیکھا کہ دو نورات کے وقت چپکے سے باہر نکلے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔ وہ جنگل میں جا رہے ہیں اس کا بازو لڑکی کی کمر کے گرد ہے۔ لڑکی اپنے نئے کپڑے اٹھائے جا رہی ہے۔ علی الصبح وہ کسی دور دراز جنگل میں پہنچ گئے ہیں۔ لڑکی نے اپنے پرانے کپڑے اتار کر نئے کپڑے پہن لئے ہیں۔ شیش پر صبح کی گاڑی تیار کھڑی ہے۔ جس میں سوار ہو کر وہ اپنے ہنی مون کے سفر کو روانہ ہو گئے ہیں۔ اور پھر لندن نے انہیں نگل لیا ہے اور عشق کے خواب سچے ثابت ہو رہے ہیں

”فرینک ایشرسٹ! واللہ رگبی کے بعد تمہیں آج دیکھا ہے“

ایشرسٹ کے اٹھتے کتے ٹسکن صاف ہو گئے۔ جو چہرہ اس کے قریب تھا۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور بشرے پر آفتاب کی جھلک تھی۔ ایسے شخص کا چہرہ تھا۔ جس کا آفتاب دل آفتاب فلک کے ساتھ مل کر اس کی زندگی کو درخشاں بخش رہا ہو۔

”اے! بھل ہیلی ڈے!“

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”کچھ نہیں۔ یونہی گھوم رہا تھا۔ ردیہ لینے آیا تھا میں جنگل میں رہتا ہوں۔“

”لہجہ کے لئے کہیں جانا تو نہیں؟ آؤ ہمارے ساتھ لہجہ کھاؤ میرے ساتھ میری بہنیں بھی ہیں۔ انہیں خسرہ نکلا تھا۔“

ایک دوسرے کی ہانہ میں ہانہ ڈالے دو تو وہاں سے روانہ ہوئے اور ایک پہاڑی پر سے ہوتے ہوئے شہر سے باہر نکل گئے ہیلی ڈے کا چہرہ آفتابی تھا۔ تو آوازیں بھی بھت اور تازگی اور خوش دلی پائی جاتی تھی۔ کہ یہاں اس اجاڑ مقام میں تو سوائے ہناتے اور کشتی چلانے کے اور کوئی شغل نہیں ہوتا

ہونے لگا چھوٹی ہنوں کا نام سبینا اور فریڈا اور بڑی ہن کا نام سیٹلا تھا۔

ٹھوڑی دیر کے بعد سبینا اس کی طرف متوجہ ہوئی اور بولی۔
”آپ ہمارے ساتھ مچھلیاں پکڑنے چلیں گے؟ بہت لطف رہیگا۔“

اس غیر متوقع بے تکلفی پر متعجب ہو کر ایشرسٹ نے کہا۔
”مجھے تو آج سہ پہر واپس جانا ہے۔“

”اچھا۔“

”جانا ملتوی نہیں کر سکتے؟“

یہ سیٹلا کا فقرہ تھا۔ ایشرسٹ اس کی طرف مڑا۔ اور سر ہلا کر مسکرا دیا۔ کیا حسن تھا! سبینا نے افسوس کے لہجے میں کہا:
”ملتوی کر دیجئے تو بہتر ہو“ اس کے بعد پھر غاروں اور تیرنے کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔

”آپ بہت دور تیر سکتے ہیں؟“

”قریباً دو میل۔“

”سچ سچ۔“

”خوب!“

”واقعی!“

تینوں نے نیلی نیلی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دی تھیں۔
ایشرسٹ کو اپنی نئی اہمیت کا احساس ہوا۔ خوشگوار احساس۔
پیلی ڈے نے کہا:-

”ایشرسٹ تمہیں ٹھہرنا پڑیگا۔ ہمارے ساتھ نہانے نہ چلو گے؟
میں تو کہتا ہوں۔ رات یہیں ٹھہر جاؤ۔“
”ہاں۔ ضرور۔“

لیکن ایشرسٹ نے پھر مسکرا کر سر ہلا دیا۔ اور پھر بکلیخت ہی لڑکیاں اس کے کھیلوں اور جسمانی کرتبوں کے متعلق دھڑا دھڑا اس سے سوالات پوچھنے لگیں۔ رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ وہ کالج میں کشتی

بھی چلاتا رہا ہے۔ فٹ بال کی ٹیم میں بھی شامل تھا۔ اور ایک میل کی دوڑ میں اول بھی آیا تھا۔ لہجہ ختم ہوتے تک اس نے اپنی ان صفات کی بدولت لڑکیوں کے دل میں گھر کر لیا۔ چھوٹی لڑکیاں مصر ہوئیں کہ ہمارے ساتھ چل کر وہ غار دیکھئے جہاں ہم کھیلنے جاتی ہیں۔ چنانچہ طوطوں کی طرح ٹائیس ٹائیس کرتی وہ ایشرسٹ کو ساتھ لئے غار کی طرف روانہ ہو گئیں۔ پیچھے پیچھے سیٹلا اور اس کا بھائی تھا غار دوسرے غاروں کی طرح سیٹلا ہوا اور تاریک تھا۔ خوبی اس میں صرف یہ تھی کہ اندر ایک پانی کا تالاب تھا جس میں سے کئی جانور پکڑ کر بوتلوں میں بند کئے جاسکتے تھے۔ سبینا اور فریڈا نے جن کی سڈول سانولی پٹیلیاں موزوں سے بے نیاز تھیں۔ تالاب کے بیچ میں کھڑے ہو کر ایشرسٹ کو شمولیت کو دعوت دی۔ تاکہ تینوں اکٹھے مچھلیاں پکڑیں۔ ایشرسٹ نے ٹوپی اور موزے اتار دئے۔ جس کے دل میں احساس حسن ہو اُسے وقت گزرتا معلوم نہیں ہوتا۔ دو خوبصورت بچے پانی میں کھیل رہے تھے۔ نوجوان ڈائنا کناٹے پر کھڑی تھی اور جو کچھ یہ تالاب میں سے نکالتے تھے۔ اُسے تعجب اور حیرت سے پکڑتی جاتی تھی ایشرسٹ یوں بھی وقت کا اندازہ ٹھیک نہ لگا سکتا تھا۔ جب گھڑی جب سے نکالی۔ تو حیران رہ گیا۔ تین کب کے بچ چکے تھے۔ گویا بینک بند ہو گیا ہوگا۔ اور روپیہ آج نہ مل سکیگا۔ اس کے بشرے کو دیکھ کر چھوٹی لڑکیاں چلانے لگیں۔

”اُہا۔ اب تو آپ کو ٹھہرنا ہی ہوگا۔“

ایشرسٹ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اُسے میگن کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ ناشتے کے وقت میگن سے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ ”میری جان میں سامان خریدنے لور کی جارہا ہوں۔ آج شام واپس آ جاؤنگا اگر موسم اچھا ہوا۔ تو آج رات ہی چل دیں گے۔ تم تیار رہنا۔“ اُسے یاد آیا کہ میگن تھرتھرا اٹھی تھی۔ اور اس کے الفاظ کو سن کر بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ دل میں کیا کیسی؟ پھر بکلیخت احساس ہوا۔ کہ تیسری لڑکی۔ لمبا قد۔ گورا رنگ۔ ڈائنا کا ساحن۔ تالاب کے

کنائے پر کھڑی متحیر بنی آنکھوں سے اُسے بخور دیکھ رہی ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے؟ انہیں کیا معلوم آج رات کے لئے اس نے دل میں کیا ٹھان رکھا تھا؟ اگر انہیں معلوم ہو جائے۔ تو وہ نفرت کا اظہار کر کے اسے تنہا غار میں چھوڑ کر خود چلے جائیں۔ اس خیال سے کچھ مایوسی ہوئی کچھ شرم سی آئی۔ گھڑی کو جیب میں ڈال کر بیکھٹ بولا:-

”ماں آج تو نہیں جاسکتا“

”ابا ہا۔ اب تو آپ ہمارے ساتھ ہی نہائیگے!“

یہ خوبصورت بچے کس قدر بے فکر تھے۔ سٹیلا مسکرا رہی تھی۔ ہیلی ڈے کہ رہا تھا۔ ”لطف آگیا۔ بس رات کے کپڑے میں نہیں دسے دوںگا۔“ اس تمام خوشدلی سے متاثر نہ ہونا ناممکن تھا لیکن پھر بھی پشیمانی اور تنہا کے جذبات سے دل دھڑکنے لگا۔ اداسی کے لمحے میں بولا:-

”مجھے ایک تار بھیجنا ہے“

”تالاب کے کھیل سے اکتا گئے۔ تو ہوٹل کو لوٹ آئے۔ ایشرسٹ نے مسز نیرو کو موب کے پتے پر اس مضمون کا تار بھیجا۔“ افسوس ہے مجھے رات یہیں ٹھہرنا ہوگا۔ کل آؤنگا۔“ اس سے دل کچھ ہلکا ہوا موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی سی گرمی جسم کو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ سمندر پر سکون اور نیلا نیلا تھا۔ اور ایشرسٹ تیراکی کا شوقین! خوبصورت بچوں کی تعریف و توصیف سے اس کی نخوت کی تسکین ہوتی تھی۔ سٹیلا کو اور ہیلی ڈے کے بشاش چہرے کو دیکھ کر طبیعت کو خوشی حاصل ہوتی تھی۔ گویا میگوں کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے اپنی اصلی زندگی کو آخری نظر دیکھ رہا ہے پہلی ڈے سے غسل کا لباس مستعار لیا اور اسٹھے روانہ ہوئے۔ ہیلی ڈے اور ایشرسٹ نے ایک چٹان کی اوٹ میں کپڑے اتارے۔ سب سے پہلے ایشرسٹ پانی میں داخل ہوا۔ اور اپنی زبانی اپنی جو تعریفان کو سنا چکا تھا۔ اس کو سچ ثابت کرنے کے لئے جان بوجھ کر دلیرانہ

تیر کر دوڑ نکل گیا۔ مڑ کر دیکھا۔ تو ہیلی ڈے ساحل کے ساتھ ساتھ تیر رہا تھا۔ لڑکیاں پانی اچھال رہی تھیں اور لڑکیاں لگا رہی تھیں۔ اور چھوٹی چھوٹی لہروں کے سامنے بھی اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیتی تھیں ایشرسٹ عام طور پر ایسے نظائے کو خفارت کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت لڑکیوں کی یہ کمزوری معقول اور دلکش معلوم ہوئی کیونکہ اس کے مقابلے میں اسکا اپنا کمال بہت ہی غایاں معلوم ہوتا تھا۔ جب ان کے قریب پہنچا۔ تو سوچنے لگا۔ میں ایک اجنبی ہوں میری شمولیت کیوں انہیں ناگوار نہ گزرے۔ اس نازک بدن دوشیرہ کے قریب جلتے ہوئے اسے شرم آتی تھی۔ لیکن سبینا نے اسے خود بلایا کہنے لگی مجھے تیرنا سکھا بیسے۔ چھوٹی لڑکیوں نے اسے اس قدر مصروف رکھا۔ کہ اسے یہ معلوم کرنے کا کہ سٹیلا اس کے قرب سے مانوس ہو چکی ہے یا نہیں۔ موقع ہی نہ ملا۔ بیکھٹ سٹیلا چونک کر پکاری۔ ایشرسٹ نے دیکھا تو سٹیلا مرمی اور نازک بازو پھیلانے جسم ذرا آگے کو جھکائے مگر کمر تک پانی میں گھڑی ہے اس کے تر چہرے پر دھوپ کی وجہ سے چٹٹیں سی پڑ رہی ہیں اور وہ سہمی ہوئی ایک طرف کو اشارہ کر رہی ہے۔

”فل کو دیکھو! یہ کیا کر رہا ہے؟ ارے دیکھو!“

ایشرسٹ تار ڈگیا۔ کہ فل خطرے میں ہے۔ وہ ایشرسٹ سے سوگزن کے خاصیلے پر تھا۔ اس کے پاؤں اکٹڑ چکے تھے اور وہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ بیکھٹ اس نے ایک چیخ ماری۔ بازو اونچے کئے اور پانی میں ڈوب گیا۔ لڑکی اپنے بھائی کی طرف بڑھی۔ لیکن ایشرسٹ نے ”واپس جاؤ۔ سٹیلا“ کہ کر اسے روک دیا اور خود اپکا۔ عمر بھر اس قدر تیز کبھی نہ تیرا تھا۔ ہیلی ڈے دو سے زیادہ غوطے نہ کھانے پایا تھا۔ کہ ایشرسٹ نے اسے پکڑ لیا۔ حادثے کی وجہ تشخ اعضا تھی لیکن اسے سچانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کیونکہ اس نے ذرا مزاحمت نہ کی۔ آخر وہاں پہنچے جہاں ایشرسٹ لڑکی کو روک گیا تھا۔ جب زمین پر پاؤں لگے تو لڑکی بھی آگے آئی

فل کو اٹھا کر ساحل پر لے گئے۔ ایشرسٹ اور سٹیلا اسکے بازوؤں اور ٹانگوں کو مالش کرتے رہے۔ چھوٹی لڑکیاں سہمی ہوئی پاس کھڑی رہیں۔ تھوڑی دیر میں ہیلی ڈے مسکرانے لگا اور اس قدر تکلیف کا موجب ہونے پر ندامت کا اظہار کرنے لگا۔ ایشرسٹ سے بولا۔ ذرا سہارا دو۔ تو میں کپڑے پہن لوں۔ ایشرسٹ سہارا دینے لگا۔ تو سٹیلا کے تر-اشک آلود-سرخ چہرے پر جس کا سکون برہم ہو چکا تھا۔ نظر پڑی۔ سوچنے لگا میں نے اسے سٹیلا کر پکارا تھا۔ اس نے برا تو نہیں مانا۔

کپڑے پہن رہے تھے۔ تو ہیلی ڈے نے نیچی آوازیں کہا۔
"ایشرسٹ تم نے مجھے موت سے بچایا ہے"
"کیا کہ رہے ہو!"

کپڑے پہن چکے تو ہوٹل میں آئے۔ لیکن ابھی کچھ پریشان تھے۔ باقی لوگ تو چائے پر بیٹھ گئے۔ ہیلی ڈے کو لٹا دیا۔ مرتبہ اور روٹی کے ایک دو ٹکڑے کھا چکی۔ تو سبینا بولی۔

"آپ نے تو بہت بہادری دکھائی۔" اور فریڈا بولی
"آپ کمال کے آدمی ہیں۔"

ایشرسٹ نے دیکھا کہ سٹیلا کی نظریں نیچی ہیں۔ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہاں سے اس نے سبینا کو دھیمی آوازیں کہتے سنا۔ آؤ خونی قسم کھائیں۔ کہ ہم ہمیشہ دوست رہیں گے۔ فریڈا تمہارا چاقو کہاں ہے؟ کنکھیوں سے دیکھا۔ کہ تینوں نے چاقو کی نوک اپنے جسم میں چھپا کر خون کا ایک ایک قطرہ نکالا ہے۔ اور کاغذ کے ایک ورق پر کچھ لکھ رہی ہیں۔ وہ مڑ کر دروازے کی طرف چلا۔

"اب نیوے نہ بنئے۔ یہاں آئیے۔" چھوٹی لڑکیوں نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور گھسیٹ کر میز تک لے آئیں۔ میز پر وہ کاغذ پڑا تھا۔ جس پر خون سے ایک انسان کی تصویر بنی تھی اور خون ہی سے تین نام لکھے تھے۔ سٹیلا ہیلی ڈے۔ سبینا

ہیلی ڈے۔ فریڈا ہیلی ڈے۔ کاغذ پر بہتے ہوئے لہو سے ایسی شکل بن گئی تھی۔ جیسے ایک ستارے کی شعاعیں ادھر ادھر پھیل رہی ہوں۔ سبینا بولی۔

"یہ بیچ میں تم ہو۔ تمہیں معلوم ہے۔ اب تو ہم تمہیں چوبینگی اور فریڈا بولی۔" ارے ہاں۔ واقعی۔

ایشرسٹ کے لئے کوئی مغفرت تھا۔ اس کے گیلے بال اس کی آنکھوں کے سامنے لٹک آئے تھے۔ کسی نے اس کی ناک کو جیسے کاٹ لیا۔ اس کے بائیں بازو پر کسی اور نے چٹکی بھری اور دانت اس کے رخسار پر آگے۔ اس کے بعد انھوں نے اس کو چھوڑ دیا۔ اور فریڈا بولی :-

"سٹیلا اب تمہاری باری ہے"

ایشرسٹ کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا جسم اکڑا ہوا تھا میز کے اُس طرف سٹیلا کا بھی یہی حال تھا سبینا نے ایک طفلانہ تمقہ لگایا۔ اور فریڈا پکاری :-

"اب چلو بھی۔ نہیں تو سب مزا کر رہا ہو جائیگا۔"

ایشرسٹ کے جسم میں ایک عجیب و غریب محجوب سے اشتیاق کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے نیچی آوازیں کہا۔
"بکو مت۔ بہت شریر لڑکیاں ہو تم!"

سبینا پھر ہنس دی۔

"اچھا تو سٹیلا اپنا ہاتھ چوم لے اور تم اس کے ہاتھ کو لے کر اپنی ناک سے لگا لو۔ آپ کی ناک ہے بھی اس طرف کو مڑی ہوئی۔"

سٹیلا نے سچ مچ اپنا ہاتھ چوم کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ایشرسٹ نے بڑی متانت کے ساتھ اس خنک نازک ہاتھ کو اپنے رخسار سے لگایا۔ چھوٹی لڑکیاں تالیاں بجانے لگیں اور فریڈا بولی :-

بس اب جب موقع آیا ہمیں آپ کی جان بچانی ہوگی؟ میں

چائے کا ایک اور پیالہ پی لوں سٹیلا؟ لیکن ایسی ہلکی پانی
 سی چائے نہیں جیسے تم نے پہلے مجھے دی تھی۔“
 چائے کا دور پھر چلنے لگا۔ ایشرسٹ نے وہ دستاویز نہ کر کے
 جیب میں رکھ لی۔ پھر خسرے پر۔ نارنگیوں پر چمچے سے شہد
 کھانے پر اور سکول نہ جانے کے فوائد پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایشرسٹ
 چپکا سنتا رہا۔ صرف کبھی کبھی سٹیلا سے جس کے چہرے کی سرخ
 و سفید رنگت پھر عود کر آتی تھی۔ آنکھیں چار ہو جاتیں۔ اور نظروں
 بنی نظروں میں عہد رفاقت کا اعادہ ہوتا رہتا۔ ایک اجنبی کے
 ساتھ ان بشارت لوگوں کے مشفقانہ سلوک سے ایشرسٹ کے دل
 کو راحت ہوئی۔ ان کے ہنستے ہوئے چہروں سے آنکھیں نہ ہٹا
 سکتا۔ چائے کے بعد چھوٹی لڑکیاں تو سمندری کائی کو خشک کرنے
 کے شغل میں مصروف ہو گئیں۔ اور ایشرسٹ کھڑکی کے قریب جو
 نشست تھی۔ اس پر بیٹھ کر سٹیلا سے باتیں کرتا رہا اور سٹیلا
 کی کھینچی ہوئی آبی رنگوں کی تصاویر کو دیکھتا رہا۔ اس پر ایک
 خوشگوار خواب کی سی کیفیت طاری تھی۔ وقت اور واقعے اور
 اہمیت اور حقیقت کا احساس معطل و معلق ہو گیا تھا۔ کل وہ پھر
 میگن کے پاس چلا جائیگا اور اس لطف و مسرت کی کوئی نشانی
 اس کے پاس نہ ہوگی۔ بجز اس کاغذ کے جو ان بچوں کے خون
 سے رنگین تھا۔ بچے! سٹیلا تو عمر میں میگن کے برابر ہے۔ وہ بچہ
 کیونکر ہوئی؟ اس کی باتیں۔ تیز تیز۔ قد سے خشک اور محبوب
 تاہم دوستی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی۔ ایشرسٹ کی خاموشیوں
 میں کسی ساز کی آواز کی مانند گونج اٹھتی تھیں۔ سٹیلا کے انداز
 میں ایک خنکی۔ ایک دوشیزگی پانی جاتی تھی۔ جیسے کسی افسانے
 کی محبوبہ پھولوں کی جھونپڑی میں بیٹھی ہو۔ جلی ڈس کے پیٹ میں
 بہت سا کھاری پانی جا چکا تھا۔ اس لئے وہ کھانے پر نہ آیا۔
 کھانے کے دوران میں سبینا بولی۔
 ”میں تو آپ کو فرینک بلایا کرونگی۔“

اور فریڈا پکار اٹھی۔ ”فرینک۔ فرینک۔ فرینکی۔“
 ایشرسٹ نے مسکرا کر تعظیماً سر جھکا دیا۔
 ”جب کبھی سٹیلا آپ کو مسٹر ایشرسٹ کہہ کر بلائے اسے جرم نہ
 ادا کرنا ہوگا۔ مسٹر ایشرسٹ کہنا کیا فضول معلوم ہوتا ہے۔“
 ایشرسٹ نے سٹیلا کی طرف دیکھا۔ جس کا رنگ حجاب سے
 سرخ ہو رہا تھا۔ سبینا ہنس دی۔ فریڈا بولی :-
 ”وہ دیکھو۔ وہ دیکھو شرمناک رہی ہے۔ اللہ سے شرم۔“
 ایشرسٹ نے دائیں بائیں دونوں لڑکیوں کے سنہری بال
 پکڑ لئے۔ اور بولا :-

”دیکھو لڑکیو۔ سٹیلا کو مت چھیڑو۔ نہیں تو میں تم دونوں کو
 باندھ دوں گا۔“
 فریڈا بولی۔ ”تم بڑے وحشی ہو۔“
 اور سبینا نے محتاط بن کر کہا۔ ”تم جو اُسے سٹیلا بلاتے ہو۔“
 ”تو کیوں نہ بلاؤں؟ سٹیلا بہت اچھا نام ہے۔“
 ایشرسٹ نے ان کے بال چھوڑ دیئے۔ سٹیلا! اس
 گفتگو کے بعد وہ بھلا اُسے کس نام سے پکارے گی؟ لیکن اس
 نے نام استعمال ہی نہ کیا۔ سونے کا وقت آیا۔ تو ایشرسٹ
 نے عہد اُکھا :-
 ”گڈ نائٹ۔ سٹیلا۔“

”گڈ نائٹ مسٹر۔ گڈ نائٹ فرینک! آج تم نے
 بہت ہی بہادری دکھائی۔“
 ”اس کا ذکر مت کرو۔“

سٹیلا کا مصافحہ سیدھا سادا مصافحہ تھا۔ لیکن لمحے بھر کو
 اس نے ایشرسٹ کا ہاتھ ذرا زور سے دایا۔ اور پھر پکچخت
 اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

ایشرسٹ خالی کمرے میں جیس و حرکت کھڑا رہا۔ صرف
 کل رات کا ذکر ہے۔ کہ سیب کے پیڑوں اور زندہ شگوفوں

تمہیں کیا بتاؤں۔ تم خود ہی سمجھ لو۔ میں نے شکر کیا۔ کہ اس کے بارے میں میرا ضمیر صاف تھا۔ بہر حال تمہاری بدولت میں زندہ ہوں۔ ورنہ اس وقت تاریک گہرے سمندر میں محو استراحت ہوتا۔ وہاں نہ لیٹنے کو بستر ملتا۔ نہ پینے کو تمباکو۔ کچھ بھی نہ ملتا۔ ایشرسٹ جب ہم مرجاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے؟

ایشرسٹ بولا :-

”میں جانوں شعلوں کی طرح بجھ جاتے ہیں۔“

”واللہ؟“

”شاید بجھنے سے پہلے تھوڑا بہت ٹمٹما لیتے ہوں۔“

”یہ تو بہت غم انگیز خیال ہے۔ بہر حال — میری

بہنیں تو اچھی طرح پیش آئیں؟“

”بہت اچھی طرح۔“

ہیلی ڈے نے اپنا پائپ ہٹا دیا۔ اپنے ہاتھ گردن کے

پچھلے ایک دوسرے پر رکھ لئے اور کھڑکی کی طرف سر موڑ

کر بولا -

”بچاری بُری نہیں!“

ہیلی ڈے بستر پر دراز تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی چہرے

پر شمع کی روشنی پڑ رہی تھی۔ ایشرسٹ نے اپنے دوست پر نظر

ڈالی تو کپکپی سی جسم میں دوڑ گئی۔ اگر زندہ نہ ہوتا۔ تو سمندر کی تہ

میں پڑا ہوتا۔ چہرے پر مسکراہٹ نہ ہوتی۔ اور یہ بنناشت ہمیشہ

کے لئے غائب ہو جاتی۔ شاید لیٹنا بھی نہ ملتا۔ ریت ہی میں

دفن ہو گیا ہوتا۔ اور حشر کے لئے (نویں دن کا؟) منتظر

رہتا۔ دفعۃً ایشرسٹ کی مسکراہٹ ایک عجیب و غریب چیز

معلوم ہونے لگی۔ یہی زندگی کا شعلہ ہے۔ یہی سب کچھ ہے

اٹھ کھڑا ہوا اور دھیمی آواز میں بولا :-

”میرے خیال میں تمہیں سو جانا چاہیے۔ شمع بجھا دو!“

کے نیچے کھڑا میگن کو سینے سے چٹلئے اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کو چوم رہا تھا۔ یہ بات کیا یاد آئی جیسے کسی طوفان کے پھٹیرے سے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ ہانپنے لگا۔ آج رات ایک نئی زندگی کا آغاز ہونا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کے ساتھ جس کی تمنا صرف یہ تھی کہ وہ اس کے ساتھ رہے! اور یہ سب کچھ ملتوی ہو گیا۔ چوبیس گھنٹے آگے جا پڑا۔ محض اس لئے کہ اس نے اپنی گھڑی کو نہ دیکھا تھا۔ ان معصوم بچوں سے تعلقات کیوں پیدا کر لئے۔ جبکہ خود معصومیت ہی کو خیر باد کہنے والا تھا؛ لیکن پھر سوچا۔ میرا ارادہ تو اس سے شادی کرنے کا ہے۔ میں نے اسے کہ بھی دیا تھا۔

روشن شمع ہاتھ میں لئے سونے کے کمرے کی طرف چلا۔

ہیلی ڈے کا کمرہ رستے میں پڑتا تھا۔ اس کے پاس سے

گزرا تو ہیلی ڈے اندر سے پکارا :-

”تم ہو ایشرسٹ؟ اندر آ جاؤ“

ہیلی ڈے بستر پر بیٹھا پائپ منہ میں لئے پڑھ رہا تھا۔

”بیٹھ جاؤ۔“

ایشرسٹ کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔

ہیلی ڈے یکھت بول اٹھا۔ ”تمہیں معلوم ہے آج دن بھر

مجھے بار بار تمہارا ہی خیال آتا رہا۔ لوگ کہتے ہیں جب

انسان ڈوبنے لگتا ہے۔ تو گزشتہ زندگی آنکھوں کے

سامنے پھر جاتی ہے۔ لیکن میرے حافظے میں ماضی کا بیشتر

زمانہ جوں کا توں مدفون رہا۔ شاید میں موت سے ابھی

بہت دور تھا۔“

”تو پھر تمہیں خیال کس بات کا آیا؟“

ہیلی ڈے پہلے تو کچھ نہ بولا اور پھر کہنے لگا :-

”عجیب بات ہے۔ مجھے کیمرج کی ایک لڑکی کا خیال

آیا۔ جس سے میں ایک دفعہ — قریباً — اب میں

پہلی ڈسے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”تم جانتے ہو جو کچھ میرے دل میں ہے وہ ادا نہیں کر سکتا بہت بہت بری چیز ہے۔ گڈ نائٹ ایشرسٹ“

ایشرسٹ کا دل بھر آیا۔ پہلی ڈسے کے ہاتھ کو دبا کر نچلی منزل میں آگیا۔ ہال کا دروازہ ابھی کھلا تھا۔ اس میں سے گزر کر مکافوں کی قطار کے سامنے جو چمن تھا وہاں جا پہنچا۔ آسمان کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ تارے چمک رہے تھے اور ان کی روشنی میں لائٹ کے پھولوں کی رنگت کمیں کمیں ایسی پر اسرار دکھائی دیتی تھی جیسی رات کے وقت اکثر پھولوں کی دکھائی دیتی ہے اور جس کا بیان کرنا ناممکن ہے ایشرسٹ نے اپنا رخسار ایک ٹپنی پر رکھ دیا۔ آنکھیں بند کیں۔ تو میگن کتے کے بچے کو سینے سے جٹائے سامنے کھڑی دکھائی دی۔ ”مجھے کیمرج کی ایک لڑکی کا خیال آیا۔ جس سے میں ایک دفعہ — قریباً —

میں نے شکر کیا۔ کہ اس کے بارے میں میرا ضمیر صاف تھا۔“ بیکھت سر کو لائٹ کی شاخ سے ہٹا لیا اور گھاس پر ٹھلنے لگا۔ دو نو مردوں پر دو لمپ روشن تھے۔ ان کی روشنی میں تصور لمحے بھر کو پھر زندہ ہو گیا۔ ایشرسٹ اس کے ساتھ شگوفوں کی زندہ سانس لیتی ہوئی سفیدی کے نیچے کھڑا تھا۔ ندی ہنستی کھیلتی رہ رہی تھی۔ چاندنی کی نیلا ہٹ تالاب کے پانی پر چمک رہی تھی۔ وہ اوپر کو اٹھا ہوا چہرہ۔ اس پر معصومیت اور عشق نیاز مندی جھلک۔ وہ آگ لگا دینے والے بوسے۔ اس کا فرات کا وہ حسن اور دل کی وہ دھڑکن سب کچھ یاد آیا۔ لائٹ کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔ یہاں رات کے وقت ندی کی آواز نہ غنی یہاں سمندر کا شور تھا۔ اور سمندر سرسرا رہا تھا اور آپہں بھر رہا تھا۔ کوئی ننھا پرنڈ

کوئی الو۔ کوئی نائٹ جا رہیاں بولتا نہ اڑتا تھا۔ ان کی بجائے پیانو کی آواز آرہی تھی اور سفید مکانات نے آسمان کو جیسے قینچی سے کتر دیا تھا۔ اور لائٹ کی خوشبو سے فضا معمور تھی۔ کسی اونچی منزل پر پھول کی ایک کھڑکی میں روشنی نظر آرہی تھی۔ پردے کے سامنے ایک سایہ حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے دل میں عجیب و غریب احساسات

نے شورش بپا کر دی۔ جیسے کوئی ایک ہی جذبہ بیچ و تاب کھا رہا ہو بلویا جا رہا ہو۔ پیٹنا جا رہا ہو۔ جیسے ہمارا اور عشق پریشانی کے عالم میں ٹکریں مار رہے ہوں۔ رستہ ڈھونڈ رہے ہوں اور انہیں رستہ نہ ملتا ہو۔ یہ لڑکی جس نے اسے فرینک کہہ کر پکارا تھا۔ جس کے ہاتھ نے اس کے ہاتھ کو دفعتاً پھینچ لیا تھا۔ یہ شائستہ اور پاکیزہ لڑکی اس کے سرکش۔ خلاف شرع عشق کا حال سن لے تو کیا کہے۔ وہ مکان کی طرف پیٹھ موڑے گوتم بدھ کے مجسمے کی طرح جیس وحرت آلتی پالتی مار کر گھاس پر بیٹھ گیا۔ کیا واقعی معصومیت میں نقب لگا کر چوری کرنے کا ارادہ تھا؟ کیا واقعی اس کا یہ ارادہ تھا کہ جنگلی پھول کی خوشبو سونگھ لے۔ اور — شاید — پھر اسے پھینک دے؟ کیمرج میں ایک لڑکی تھی جس سے میں ایک دفعہ — تم خود ہی سمجھ لو — دو نو ہفتیلیاں دائیں بائیں گھاس پر رکھ کر دبا دیں۔ ابھی گھاس میں گرمی کچھ کچھ باقی تھی۔ ابھی اس میں نمی نہ آئی تھی۔ ابھی اس کا سہارا لے سکتا تھا۔ اپنے آپ سے پوچھا۔ ”میں کیا کروں؟“ شاید میگن کھڑکی کے پاس کھڑی شگوفوں کو دیکھ رہی ہے۔ اور اس کے خیال میں محو ہے! بیجاری میگن! پھر خیال آیا۔ ”کیا حرج ہے؟ میں تو اسے چاہتا ہوں! لیکن — لیکن — کیا مجھے اس سے واقعی محبت ہے؟ یا صرف اس لئے اس کو چاہتا ہوں۔ کہ وہ خوبصورت ہے اور مجھ سے محبت کرتی ہے؟ میں کیا کروں؟“ پیانو کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ تارے جگمگا رہے تھے۔ ایشرسٹ مبہوت ہو کر کالمے سمندر کو تنکٹا رہا۔ آخر اٹھا۔ اعضا جیسے جڑ گئے تھے اور جسم کو خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ کھڑکی میں اب روشنی نظر نہ آتی تھی۔ جاگ سو رہا +

(۸)

ایشرسٹ گہری نیند سو رہا تھا۔ کہ کسی نے دروازے پر دستک دی اور آٹھ کھل گئی۔ پھر کوئی گرجت آواز میں پکارا:۔
”اٹھو بھائی ناشتہ تیار ہے۔“

ایشرسٹ بیکھٹ اٹھ بیٹھا۔ میں کہاں ہوں —؟ ہاں ہاں یاد آگیا!



باقی لوگ مرتبہ کھا رہے تھے۔ سٹیلا اور سبینا کے درمیان ایک نشست خالی تھی۔ ایشرسٹ اس پر جا بیٹھا۔ سبینا کچھ دیر اسے بغور دیکھتی رہی۔ اور پھر بولی :-

”ذرا جلدی کیجئے۔ سارے نو بجے یہاں سے چل پڑنا ہے۔“

ایشرسٹ : ہم بیری ہیڈ کو جا رہے تھے۔ تمہیں بھی چلنا ہوگا۔ ایشرسٹ نے سوچا۔ ”میں ان کے ساتھ جاؤں۔ ناممکن اچھے تو چیزیں لے کر واپس جانا ہے۔“ اس نے سٹیلا کی طرف دیکھا۔ سٹیلا نے جلدی سے کہا :-

”ضرور چلئے!“

اور سبینا بولی :-

”آپ کے بغیر کیا خاک لطف آئیگا۔“

فریڈ اٹھ کر کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

”آپ چلئے۔ نہیں تو میں آپ کے بال کھینچوں گی۔“

ایشرسٹ نے سوچا۔ ”اچھا۔ ایک دن اور سہی۔ اس میں کچھ غور بھی کر لوں گا۔ ایک دن اور!“ اور پھر بولا :-

”اچھا اچھا میں چلتا ہوں۔ میری ایال کھینچنے کی ضرورت

نہیں۔“

”ہررا!“

سٹیشن پر پہنچ کر اس نے ایک اور تار بھیجنے کا ارادہ کیا۔ لیکن لکھ کر پھاڑ ڈالا۔ انہیں کیا بتائے کہ کیوں نہیں آسکتا؟ برکت سے ایک چھوٹی سی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ایشرسٹ۔ سبینا اور فریڈا کے بیچ میں چپکا ہوا بیٹھا تھا۔ گھٹنے سٹیلا کے گھٹنوں سے جا لگے تھے رستے میں آپ جینکمز کا کھیل کھیلتے رہے۔ دل بہل گیا۔ سوچا تو یہ تھا۔ کہ ایک دن مزید غور کرنے میں صرف کرونگا۔ لیکن اب غور کرنے کو دل ہی نہ چاہتا تھا۔ دن بھر دوڑتے رہے۔ کشتی لڑتے رہے۔ گھٹنے گھٹنے پانی میں بھاگتے پھرے (نہلنے کو کسی کا دل نہ چاہتا تھا) گیت گاتے رہے۔ کھیل کھیلتے رہے اور جس قدر سال

خورد و نوش ساتھ لائے تھے۔ سب چٹ کر گئے۔ واپسی میں چھوٹی لڑکیاں ایشرسٹ کے کندھے پر سر رکھ کر سو گئیں۔ ایشرسٹ کے گھٹنے سٹیلا کے گھٹنوں کو چھو رہے تھے۔ یقین نہ آتا تھا۔ کہ تیس گھٹنے پہلے وہ ان تین لڑکیوں میں سے (ان کے بال کس قدر ملائم تھے) کسی کو جانتا تک نہ تھا۔ ریل میں وہ سٹیلا سے شاعری کے متعلق تبادلہ خیالات کرتا رہا۔ سٹیلا نے ایشرسٹ کو اور ایشرسٹ نے سٹیلا کو (مگر ایک خوشگوار احساس برتری کے ساتھ) اپنی اپنی پسند کے شعرا کے نام بتائے۔ یکجہت لڑکی نے وہی آواز میں کہا :-

”فل کتنا ہے۔ آپ حیات بعد الموت کے قائل نہیں۔ یہ

تو بہت بری بات ہے فرینک!“

ایشرسٹ نے پریشان ہو کر کہا :-

”نہ قائل ہوں نہ منکر۔ میرا عقیدہ تو صرف یہ ہے۔ کہ ہم حیات بعد الموت کے متعلق کچھ جانتے ہی نہیں۔“

لڑکی نے جلدی سے کہا :-

”میرا تو یہ عقیدہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا بھلا پھر فائدہ ہی کیا؟“

ان خوبصورت ابروؤں کے شکنوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے

ایشرسٹ نے جواب دیا :-

”یہ کیا کہ جس چیز کے وجود کی تمنا ہو اس کے وجود پر انسان

ایمان ہی لے آئے۔“

”لیکن اگر اس کے بعد اور کوئی زندگی نہیں۔ تو انسان کو دوبارہ

زندہ ہونے کی تمنا ہی کیوں ہوتی ہے؟“

یہ کہا اور نظر بھر کر ایشرسٹ کی طرف دیکھنے لگی۔

ایشرسٹ اس کے جذبات کو مجروح تو نہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن

برتری کی خواہش غالب آگئی۔ بولا :-

”جب تک انسان زندہ ہے۔ اس وقت تک اس زندگی کو دائمی بنانے کا آرزو مند ہوتا ہے۔ یہ آرزو خود زندگی کا

ایک جزو ہے۔ مگر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔
”تو کیا تم انجیل کو نہیں ملتے؟“

ایشرسٹ نے سوچا۔ ”اب ضرور اسے صدمہ ہوگا!“ بولا:-
یسوع مسیح نے پہاڑی پر جو وعظ سنایا تھا۔ میں اس کو مانتا
ہوں۔ کیونکہ وہ بہت دلکش ہے۔ اور اس کے الفاظ
ہمیشہ سچے رہینگے۔“

”لیکن کیا تم یسوع مسیح کو خدا کا جزو نہیں سمجھتے؟“
ایشرسٹ نے سر ہلادیا۔

لڑکی نے اپنا چہرہ جلدی سے کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔ ایشرسٹ
کو بکھٹ میگن کی دعا یاد آئی۔ ”خدا یا ہم سب پر اپنا فضل کرا اور مسٹر
ایشرسٹ پر بھی۔“ اور کون ایسا ہوگا۔ جو اس لڑکی کی طرح یوں اس
کے لئے دعا مانگے۔ اس لڑکی کی طرح جو اس وقت ضرور اس کی نظر
ہوگی۔ اور سڑک پر کھڑی اس کی راہ تک رہی ہوگی۔ دل نے کہا۔
”تم کس قدر ذلیل ہو؟“

یہ خیال بار بار دل میں اٹھتا رہا۔ لیکن اس کی چہن رفتہ رفتہ کم
ہوتی گئی (اکثر یہی ہوتا ہے)۔ حتیٰ کہ ذلیل بننا ایک نہایت معمولی
بات معلوم ہونے لگی۔ اور (تعجب کی بات ہے!) اس کی سمجھ
میں یہ نہ آتا تھا۔ کہ واپس میگن کے پاس چلے جانا ذلیل بات ہے
یا اس سے ملنے کا خیال ترک کر دینا۔

شام کے وقت سب مل کر تاش کھیلتے رہے۔ اور حیب پوچوں
کے سونے کا وقت آن پہنچا اور وہ چلے گئے تو سیٹلا پیانو پر جا بیٹھی
ایشرسٹ کھڑکی کے پاس اندھیرے میں بیٹھا شمعوں کے بیچ میں
سے سیٹلا کو دیکھتا رہا دوسرے بال ہلکے رنگ کے ان کے نیچے وہ
لمبی گوری گردن جو ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ خم کھاتی تھی (تھی)
سیٹلا کے پیانو بجانے میں کوئی خاص رنگینی نہ تھی۔ لیکن بالائے تکلف بجاتی
تھی۔ ایشرسٹ کو وہ ایک دلکش صورت معلوم ہو رہی تھی۔ جس کے
ارد گرد ہلکے سنہری رنگ کا نور جھلکا رہا تھا۔ گویا انسان نہیں فرشتہ

ہے۔ اس لڑکی کی موجودگی میں جس کا لباس سفید جس کا سر فرشتوں کا
سا اور جس کا جسم موسیقی کے ساتھ لچک رہا تھا۔ کس کی جرات ہے
کہ بے عنان خواہشات یا گمراہ خیالات کا دل میں گزر بھی ہوئے
وہ شومان کا ایک گیت بجا رہی تھی جس کا نام ”و ارم“ تھا۔ اس
کے بعد پہلی ٹپے نے اپنی بانسری نکالی۔ اور طلسم ٹوٹ گیا۔ پھر لکھو
نے ایشرسٹ کا گانا سنا۔ اور سیٹلا شومان کی گیتوں کی ایک کتاب
کو سامنے رکھ کے اس کے ساتھ پیانو بجاتی رہی۔ ”راخ گردل نخت“
کا گیت ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا۔ کہ چھوٹی لڑکیوں نے (جو نیلے
رنگ کے ڈریسنگ گون پہنے تھیں) دبے پاؤں کمرے میں داخل
ہو کر پیانو کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی لیکن بیسود۔ اس کے
بعد کھلبلی مچ گئی۔ اور بقول سینا کے ”بڑا مزا آیا۔“

اس رات ایشرسٹ کو نیند نہ آئی۔ اس کے دماغ میں طرح
طرح کے خیالات چکر لگا رہے تھے اور وہ پچھنی کے عالم میں گردش
بدلتا رہا۔ دودن کے اندر اندر ان لوگوں سے اس قدر ربط پیدا
ہو گیا تھا۔ اور ان کی بے تکلفی اور اپنائیت نے اس کے دل پر
اس قدر احاطہ کر لیا تھا۔ کہ فارم اور میگن — خود میگن! خوب
و خیال ہو گئی۔ کیا سچ ہے اس سے اظہار عشق کیا تھا؟ کیا سچ ہے
اسے بھگالے جانے کا اور اس کے ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا؟
نہیں نہیں وہ مسحور ہو گیا تھا۔ اس پر جادو چل گیا تھا۔ بہار کا۔ رات
کا۔ سب کے شکوفوں کا! اس کو۔ اس کم سن بچی کو جس کی عمر ابھی
اٹھارہ سال بھی نہ ہونے پائی تھی۔ اپنی داشتہ بنانا۔ اس خیال کے
آتے ہی ایشرسٹ کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ لیکن پھر بھی
جسم میں گرمی اور خون میں تیزی پیدا ہو گئی۔ دل سے کہا۔ ”میں نے
بہت برا کیا۔ میں نے بہت برا کیا۔“ شومان کی موسیقی اس کے
پریشان خیالات کے ساتھ مل کر اس کے دل کے اندر جیسے دھڑکنے
لگی۔ اسے تصور میں سیٹلا کا چہرہ نظر آیا۔ پرسکون۔ مرمری ہلکے
رنگ کے بال۔ لچکدار گردن۔ ارد گرد فرشتوں کا سانور۔ اس

وہ سوفا پر بیٹھی رسی کے ایک ٹکڑے میں گانٹھیں دے رہی تھی۔ اس نے یکلخت نگاہ اٹھائی :-

”نہیں اس کی وجہ اور ہے۔ اور اس سے کہیں گری ہے“ ایشرسٹ کے دل میں پھر وہی تحکم کی خواہش پیدا ہوئی : بولا ”کیا واقعی آپ کا یہ خیال ہے ؛ لیکن میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ کسی بات کی وجہ دریافت کرنے کی خواہش ہی سب سے زیادہ عمیق ہے۔ اور اس کی تہ کو پہنچنا بہت مشکل ہے“ سیٹلانے ماتھے پہ تیوری ڈال لی ۔

”میں نہیں سمجھی“

ایشرسٹ اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ اور بولا :-
”ذرا غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ آخرت کے معتقد مبشر وہی لوگ ہوتے ہیں جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی تمام خواہشات اس دنیا میں پوری نہیں ہو سکتیں۔ برعکس اس کے میں نیکی کا قائل اس لئے ہوں۔ کہ نیکی ایک اچھی چیز ہے“
”تو آپ نیکی کے قائل تو ہیں؟“

وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی تھی اور اس کی صحبت میں نیکی کس قدر سہل ! ایشرسٹ نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا :-

”اس طرح کی گرہیں لگانا مجھے بھی سکھا دو“

جب گرہیں لگا رہے تھے۔ تو اس کی انگلیوں کے مس سے تسکین اور راحت ملتی تھی۔ سونے کو چلا تو بالارادہ اسی کے متعلق سوچتا رہا۔ اور اس کے درختوں پر سکون۔ خواہرانہ تصور کے انوار سے اپنا آپ یوں ڈھانپ لیا۔ جیسے اس لمبوس میں اب اسے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا +

اگلے دن معلوم ہوا۔ کہ وہ لوگ ریل میں سوار ہو کر ٹوٹنس جانا چاہتے ہیں۔ اور بیرری پورے کاسل کے مقام پر پکنک کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ماضی کو دل سے محو کر دینے کا جو مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ اسے نسخہ نہ کیا اور گھوڑوں کی طرف پیٹھ کر کے پہلی ڈے

نے سوچا۔ ”میرے حواس قائم نہ تھے۔ میں دیوانہ تھا۔ مجھے کیا ہو گیا تھا ؟ بد نصیب میگن !“ خدا یا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر ایشرسٹ پر بھی !“ میں صرف آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں ؛ اس نے اپنا چہرہ تنکے میں ڈھانپ لیا۔ ہچکی بندھ چلی تھی لیکن اس نے آپ کو سنبھالا۔ واپس چلا جائے تو مصیبت۔ نہ جائے تو اور بھی آفت !

جوان آدمی اگر اپنے دل کی بھڑاس نکال لے تو اس کی سچینی مٹ جاتی ہے۔ ایشرسٹ کی آنکھ لگ گئی۔ جب نیند آنے لگی تھی تو سوچ رہا تھا۔ ”آخر ہوا کیا۔۔۔ چند بو سے۔ مہینہ بھر میں بھول جائیگی !“ اگلے دن صبح کے وقت اس نے چاک کے روپے وصول کر لئے۔ لیکن کپڑوں کی دکان کے پاس بھی نہ پھٹکا۔ اس فاقہی رنگ کے لباس کی بجائے اپنی ضرورت کی چند چیزیں خرید لیں۔ دن بھر اس کے دل کی عجیب حالت رہی۔ جیسے اپنے آپ سے روٹھا ہوا ہے۔ دو دن سے دل میں امنگیں اٹھ رہی تھیں۔ لیکن اب جذبات سے یکسر خالی تھا۔ جیسے آنسوؤں کے طوفان سے دل کے شعلے سب بجھ گئے ہوں۔ چائے کے بعد سیٹلانے ایک کتاب اس کے پاس رکھ دی اور کچھ شرماسکر بولی :-

”فرینک تم نے یہ کتاب پڑھی ہے؟“

فریر کی ”سوانح یسوع“۔ ایشرسٹ مسکرا دیا۔ سیٹلا اس کے عقائد کے متعلق کس قدر فکر مند ہے۔ اس پر کچھ ہنسی آئی۔ کچھ پیار آیا۔ اپنی طبیعت کو بھی گدگدی ہوئی۔ کہ اسے اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرنے یا کم از کم اپنے عقائد کی حمایت میں کچھ لٹے شام کے وقت چھوٹی لڑکیاں اور پہلی ڈے اپنے اپنے جال کی مٹ کر رہے تھے۔ ایشرسٹ سیٹلا سے مخاطب ہوا :-

”مذہب اتمام اور صلے کا لالچ دلاتا ہے۔ کہ نیک زندگی بسر کی تو یہ کچھ ملے گا۔ گویا اتمام کے لئے ہمیں بھیک مانگنا سکھاتا ہے۔ یہ رہا درحقیقت ہم سے پیدا ہوتا ہے“

کے ساتھ لینڈ ویس بیٹھ گیا۔ سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔ اور سٹیشن کی طرف مڑنے ہی کو تھے کہ ایشرسٹ کا دل دھک سے رہ گیا۔ میگن — خود میگن! — پرلی ہنگڑنڈی پر چلی جا رہی تھی۔ وہی پھٹا پرانا سایہ اس نے پہن رکھا تھا۔ وہی جیکٹ۔ وہی ٹوپی اور راہگیروں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر ایشرسٹ نے یکجہت ہاتھ اٹھا کر چہرہ ڈھانپ لیا۔ اور ظاہر یہ کیا گویا آنکھیں سے مٹی کا کوئی ذرہ نکال رہا ہے۔ لیکن انگلیوں کے بیچ میں سے میگن پھر بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چال میں دہقانوں کی سی بے تکلفی نہ تھی۔ برعکس اس کے وہ کھوئی کھوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے قدم متماثل تھے۔ اور اس کی حالت رحم کی طالب جیسے کوئی کتا اپنے آقا سے جدا ہو گیا ہو۔ اور یہ نہ جانتا ہو کہ سیدھا دوڑنا چلا جائے یا واپس پلٹ جائے۔ اور جائے تو کہاں؟ یہ یہاں کیسے آگئی؟ بہانہ کیا بنایا ہوگا؟ یہ کس امید میں پھر رہی تھی؟ گاڑی کے پہلے گھومتے چلے گئے اور وہ میگن سے دور تر ہونا گیا لیکن اس کا دل اس پر لعنت بھیج رہا تھا اور چخیں مار مار کر اس سے کہہ رہا تھا۔ کہ ٹھہر جاؤ۔ گاڑی سے اتر جاؤ۔ اس کے پاس جاؤ۔ باجب گاڑی سٹیشن کی طرف مڑی۔ تو ایشرسٹ سے نہ رہا گیا۔ دروازہ کھول کر بولا۔ میں کچھ بھول آیا ہوں۔ تم چلو۔ میرا انتظار نہ کرو۔ میں اگلی گاڑی سے آؤنگا۔ اور تمہیں کاسل میں آلوں گا۔ یہ کہہ کر گاڑی سے کود پڑا۔ بھوکڑ کھائی۔ گھوم گیا۔ پھر سنبھلا اور چل پڑا۔ ہیلی ڈے اور اس کی بہنیں حیران تھیں کہ یہ کیا ہو گیا۔ لیکن ان کی گاڑی آگے نکل گئی۔

موٹر پر سے اُسے میگن بہت دور دکھائی دے رہی تھی ایشرسٹ چند قدم دوڑا۔ پھر رک گیا اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جوں جوں میگن سے قریب اور ہیلی ڈے اور اس کی بہنوں سے دور تر ہوتا گیا۔ قدم ڈھیلے پڑتے گئے۔ اسے دیکھ لیا تو پھر کیا ہوا؟ اس سے کیا فرق

پڑ گیا؟ اس سے جو ملاقات ہوگی۔ اور اس ملاقات کا جو نتیجہ ہوگا۔ اس کی گراہمت کو کیونکر کم کرے؟ اچھی طرح جان چکا تھا۔ کہ ہیلی ڈے کی بہنوں سے ملنے کے بعد دل اس نتیجے پر پہنچ چکا ہے۔ کہ میگن سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ چند دن اس سے عشق کر گیا۔ تکلیفیں سہیگا۔ پچھتاہیگا۔ اور پھر آکتا جائیگا۔ محض اس لئے کہ وہ اپنا سب کچھ دے ڈالے گی۔ اس لئے کہ وہ سادہ لوح ہے۔ بھولی ہے شبنم آلود ہے۔ لیکن شبنم جلد خشک ہو جاتی ہے۔ اس کی ٹوپی جو دور سے پھیکے رنگ کا ایک دھبہ سا معلوم ہوتی تھی۔ ہجوم میں نظر آ رہی تھی۔ جس سے میگن کی متماثل حرکات کا پتہ چلتا تھا۔ وہ ہر چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ ہر کھڑکی پر نگاہ ڈالتی تھی۔ کیا کسی مرد کو اس سے بھی زیادہ دکھ کا لمحہ کبھی نصیب ہوا ہوگا! جو ارادہ کرتا۔ دل سی پر ملامت کرتا تھا۔ اور اپنا آپ ذلیل معلوم ہوتا تھا۔ درد کی ایک ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکلی جسے سن کر ایک راہگیر ملازمہ مڑ کر اس کا منہ تکتے لگی۔ سامنے دیکھا۔ تو میگن ساحل سمندر کے پاس جو دیوار کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ سہارا لینے کو ٹھہر گئی۔ اور سمندر کی طرف دیکھتی رہی۔ ایشرسٹ بھی رک گیا شاید میگن نے سمندر اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ اس اضطراب کی حالت میں بھی وہ اس کے نظائے سے باز نہیں رہ سکتی۔ ایشرسٹ نے سوچا۔ اس بچاری نے ابھی کچھ بھی نہیں دیکھا۔ اس کا مستقبل ابھی خدا جانے کن کن نعمتوں کا سرمایہ دار ہے۔ چند ہفتوں کے عیش کی خاطر میں اس کی زندگی کے چھٹیڑے اڑا دوں؟ بیکھت تصویر میں سیٹیل کی پرسکون آنکھوں سے آنکھیں ملیں۔ اس کے ملائم بال ہوا سے اس کے ماتھے پر متحرک نظر آئے۔ یہ دیوانگی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ جن چیزوں کو قابل احترام سمجھتا ہے۔ ان سب سے اور خود احترام نفس سے ہاتھ دھو بیٹھنا پڑیگا۔ مڑ گیا اور جلد جلد سٹیشن کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ لیکن اس بے بس سرا سیمہ لڑکی کی یاد سے جس کی متفکر آنکھیں راہ چلتی

کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دل کو دھچکا لگا۔ اور وہ پھر سمندر کی طرف پلٹا۔ وہ ڈپٹی اب نظر سے اوجھل ہو گئی تھی۔ وہ دھبہ سیر بینوں کے جھوم میں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ دل میں ایک ہموک سی اٹھی۔ بیٹنے میں ایک خلا سا محسوس ہوا۔ (جب توقف و تامل کی وجہ سے کوئی چیز ہاتھ سے پھن جائے۔ تو یہی حال ہوتا ہے) وہ تیز تیز چلنے لگا۔ لیکن میگن کہیں دکھائی نہ دی۔ آدھ گھنٹے تک وہ اس کی تلاش میں پھرتا رہا اور پھر ساحل سمندر کی ریت پر پرہز کر اندھا لیٹ گیا۔ جاننا تھا۔ کہ اس سے ملنے کی سہل ترکیب یہ ہے۔ کہ سٹیشن پر جا کر اس کا انتظار کرے۔ حتیٰ کہ وہ مایوس ہو کر لوٹ آئے۔ یا ریل پر سوار ہو کر فارم کو چلا جائے۔ تاکہ وہ واپس آئے۔ تو یہاں پہلے ہی موجود ہو۔ لیکن پھر بھی جیس وحرت لیٹا رہا۔ اور اس کے ارد گرد بے پروانھے بچے بیلچے اور بالیاں لئے کھیلنے رہے۔ اس متلاشی سرگردان لڑکی پر رحم ضرور آتا تھا۔ لیکن یہ رحم بھی کم و بیش خون کی اس گرمی اور تیزی کا ایک جزو بن گیا۔ جو بہار نے جسم میں پیدا کر دی تھی۔ اب دل میں صرف ایک بے عمان جذبہ باقی رہ گیا تھا۔ تو قیر نسواں کے جذبات مفلوج ہو چکے تھے۔ دل میں پھر میگن کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کے بوسوں اس کے نازک اور گداز جسم۔ اس کی وارفتگی۔ اس کے کافرانہ عشق کی گرجوشی کے لئے دل پھر بقیار ہو گیا۔ منتاب سے روشن سبب کے درختوں کی شاخوں تلے اس رات کا لطف پھر اٹھانا چاہتا تھا۔ اور اس کا دل ان خواہشات کی تکمیل کے لئے یوں مضطرب تھا۔ جیسے کوئی جنگل کا دیوتا کسی بن دیوی کے لئے مضطرب ہوتا ہے۔ اس ندی کا پرکیف شور۔ بڑکپ کے پھولوں کی دھمک وہ پرانی تاریخی چٹانیں۔ کلو اور میفل کی کوک۔ آؤدوں کا ولنا سرخ چاند کا تخیل تاریکی میں سے شگوفوں کی زندہ سفیدی کو جھانکنا۔ وہ کھڑکی میں اس کے چہرے کا نظر آنا (ہاتھ دہانک

پہنچ کر رہ جاتا تھا) اس کی عشق میں ڈوبی ہوئی نگاہیں۔ سبب کے درخت تلے دو دھڑکتے ہوئے سینوں کا ملنا۔ اپنے ہونٹوں سے اس کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کا محسوس کرنا۔ ان تصورات نے اس کے دل کو محصور کر لیا۔ لیکن پھر بھی جیس وحرت لیٹا رہا۔ یہ کیا ہے جو رحم کے جذبات اور ان بقیار خواہشات کے ساتھ دست و گریبان ہے اور جس نے اسے مفلوج بنا کر اس گرم گرم ریت پر لٹا رکھا ہے؟ تین ملائم بالوں والی لڑکیاں۔ ایک دلفریب چہرہ۔ جس کی نیلی آنکھوں میں دوستی کا جذبہ جھلک رہا ہے۔ ایک نازک ہاتھ جو اس کے ہاتھ کو پھینچ رہا ہے۔ ایک آواز جو جلدی سے اس کا نام پکار کر کہتی ہے: "تو آپ نیکی کے قائل تو ہیں؟" یہ کچھ اور اس کے علاوہ ایک عجیب فضا جیسے چار دیواری کے اندر ایک باغیچہ ہو۔ قدیم انگریزی وضع کا (جس میں جاسجا گلابی رنگ کے پھول ہوں۔ کارن فلاورا اور گلاب کے پھول۔ اور لیونڈ اور لائلک کی خوشبو ہو) خنک اور دلفریب۔ انسانی مس سے غیر ملوث۔ مقدس۔ غرضیکہ ان تمام چیزوں کا پتھر جنہیں وہ بچپن سے پاکیزہ اور قابل احترام سمجھتا تھا۔ بیکخت اسے خیال آیا۔ ممکن ہے وہ ادھر ہی کو آنکھلے اور مجھے دیکھ پائے "اٹھ کھڑا ہوا۔ ساحل سمندر کے دوسرے سرے پر ایک چٹان تھی۔ اس پر جا بیٹھا۔ سمندر کی چھٹیٹیں اس کے چہرے کو کاٹ رہی تھیں اس سے ہوش دجو اس پھر بجا ہو گئے۔ فارم کو واپس چلے جانا اور وہاں جنگلوں میں اور چٹانوں کے درمیان رہ کر میگن سے عشق کرنا یعنی دوستائی ماحول میں اس دہقان لڑکی کو چاہتا۔ قطعاً ناممکن ہے اسے کسی بڑے شہر میں لے آنا اور کسی فلیٹ میں رکھنا۔ اس سے اس کی شاعرانہ طبیعت کو صدمہ ہوتا تھا۔ کیونکہ جانتا تھا۔ کہ وہ لڑکی تو قدرتی مناظر کا ایک جزو ہے۔ اسے شہر میں لا کر رکھا۔ تو محبت کا جذبہ ایک نفسانی خواہش بن کے رہ جائیگا اور دونوں ہی میں غائب بھی ہو جائیگا۔ لندن میں اس کی سادگی۔ اور اس کا گنوار پن

اس قدر نمایاں ہوگا۔ کہ اسے محض کھلونا سمجھ کر رکھنا پڑیگا جس سے چوری چھپے دل بہلا لیا جائے۔ وہ چٹان پر بیٹھا ایک سبزی ماہل تالاب کے اوپر ٹانگیں لٹکائے جس کا پانی اتر رہا تھا۔ ان خیالات میں محو تھا۔ اور یہ سب باتیں اس پر روشن تر ہوئی جا رہی تھیں۔ لیکن ایسے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے میگن کے بازو اور اس کا جسم ڈھبلا پڑ رہا ہے۔ آہستہ آہستہ نیچے سرکا جا رہا ہے اور پھر اس تالاب میں جا گرا ہے اور بہ کر سمندر میں جا پہنچا ہے۔ میگن کا چہرہ اوپر کوتاہ رہا ہے۔ اس کی کھوئی ہوئی نظروں میں ایک التجا ہے اور اس کے سیاہ بال بھیگے ہوئے ہیں۔ اس تصور نے دل میں پنجے گاڑ دیے۔ ہر چند اسے دل سے ہٹانے کی کوشش کی۔ لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ یہ خیال اسے رہ رہ کے ستاتا۔ آخر کار وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چٹان سے نیچے اترا اور پانی کے قریب ایک غار میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ شاید سمندر میں نہانے سے اس کا دل سنبھل جائے۔ اور یہ بخار اتر جائے۔ کپڑے اتار دئے اور تیر کر دور نکل گیا۔ چاہتا تھا تھک کر چو ہو جائے تاکہ حواس میں ہو جائیں اس لئے تیز تیز اور دور دور چکر کاٹے۔ پھر دفعۃً بغیر کسی وجہ کے اسے خوف سا معلوم ہوا فرض کر وہ واپس ساحل تک نہ جاسکا۔ اور سمندر کی روانے سے بہا کر لے گئی۔ یا ہیلی ڈے کی طرح اس کے پٹھے اینٹھ گئے۔ تو کیا ہوگا! یہ سوچ کر وہ واپس پلٹا۔ سرخ رنگ کی چٹانیں بہت دور معلوم ہوتی تھیں۔ اگر وہ ڈوب گیا۔ تو کسی کی نظر اس کے کپڑوں پر پڑیگی۔ یہی ڈے اور اس کی بہنوں کو تو خبر مل جائیگی لیکن میگن کو شاید کبھی علم نہ ہونے پایگا (فارم کے لوگ کوئی اخبار نہیں خریدتے) فل ہیلی ڈے کے الفاظ اسے پھر یاد آئے۔ "کمبرج میں ایک لڑکی تھی جس سے میں شاید بہر حال خدا کا شکر ہے کہ اس کی طرف سے میرا ضمیر صاف ہے۔" مجنونانہ خوف کے اس لمحے میں اس نے قسم کھائی کہ میں میگن کی طرف سے اپنا ضمیر

صاف رکھوں گا۔ لیکن خوف جاتا رہا۔ اطمینان سے تیرتا ہوا ساحل پر آن پہنچا۔ دھوپ میں جسم سکھایا اور کپڑے پہن لئے۔ اس کا دل زخمی تھا۔ لیکن درد محسوس نہ ہوتا تھا۔ جسم خنک اور تر و تازہ ہو گیا تھا +

ایشرسٹ کی عمر میں رحم کا جذبہ شدت کے ساتھ محسوس نہیں ہوا کرتا۔ جب واپس ہیلی ڈے کے کمرے میں پہنچا۔ اور چائے پر خوب پیٹ بھر کر کھایا تو ایسے معلوم ہوا جیسے ایک بخار آیا تھا۔ جواب از چکا ہے۔ ہر شے نئی نئی اور صاف ستھری معلوم ہوتی تھی۔ چائے۔ توس ان پر مکھن لگا ہوا۔ مگر باغرضینک ہر چیز میں اسے بہت مزا آیا۔ تبا کو کی خوشبو آج تک اتنی اچھی معلوم نہ ہوئی تھی۔ خالی کمرے میں ٹلٹلا ٹلٹلا رک جاتا۔ کبھی اس چیز کو دیکھنا کبھی اس کو بھوتا۔ پھر سیٹلا کی سینے پر رونے کی ٹو کڑی اٹھالی۔ ناگے کی گوٹوں اور خوش رنگ ریشم کی ایک گچھی کو مس کرتا رہا۔ ٹوکر میں ایک تھیلی تھی۔ جو کسی خوشبودار بوٹی سے بھری ہوئی تھی۔ اسے اٹھا کر سونگھا۔ پھر پیانو کے پاس جا بیٹھا۔ اور ایک انگلی سے مختلف سر بجاتا رہا۔ پھر سوچنے لگا۔ کل وہ پھر بجائیگی اور میں پاس بیٹھا اُسے دیکھتا رہوں گا۔ اسے دیکھتے رہنے سے دل کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ جو کتاب سیٹلانے اس کے پاس لاکر رکھ دی تھی۔ وہ وہیں پڑی تھی۔ اُسے اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ لیکن میگن کی اداس شکل پھر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کھڑکی میں سے باہر جھک کر باغیچے میں جو تھرش بول رہے تھے ان کو سنتا رہا۔ اور سمندر کا نظارہ کرتا رہا۔ جو درختوں کے نیچے نیلا نیلا اور خواب آلود نظر آتا تھا۔ ایک ملازمہ اندر آئی اور چائے کے برتن اٹھا کر لے گئی لیکن وہ وہیں کا وہیں کھڑا شام کی ہوا کا لطف اٹھاتا رہا۔ اس کوشش میں کہ اس کا دماغ کسی بات کو سوچنے نہ پائے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہیلی ڈے اور اس کی بہنیں پھاٹک میں سے

اندروں داخل ہوتی دکھائی دیں۔ سیٹلا آگے آگے تھی۔ اس کے پیچھے نل اور نل کے پیچھے چھوٹی لڑکیاں اپنی اپنی ٹوکری اٹھائے چلی آ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر ایشرسٹ اضطراباً پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا مجروح اور مایوس دل ان لوگوں کی ملاقات سے گھبراتا بھی تھا۔ او ان کی دوستانہ شفقت سے تسکین بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ان کے سر کو محسوس کر کے چڑھتا تھا۔ لیکن ان کی پرسکون معصومیت اور سیٹلا کی وید سے مسرت اندر بھی ہونا چاہتا تھا۔ پیانو کے پیچھے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ کہ سیٹلا اندر داخل ہوئی لیکن کچھ کھٹی سی گئی جیسے کوئی مایوسی ہوئی ہو۔ پھر ایشرسٹ پر نظر پڑی مسکرا دی۔ اس کا تبسم بھلی کی طرح سریع اور درخشاں تھا جس سے ایشرسٹ کو مسرت بھی ہوئی اور کھج بھی گیا۔

”فرینک۔ تم نہ آئے نا“

”ہاں آنا ہی نہ ہوسکا“

”دیکھو ہم کیسے خوبصورت بننے کے پھول چن کر لائے ہیں اب ان کا موسم ختم ہونے کو ہے۔“ سیٹلا نے پھول آگے بڑھا دیے۔ ایشرسٹ نے انہیں سونگھا۔ دل میں مہم سی خواہشات پیدا ہوئیں۔ لیکن پھر یکلخت مر بھی گئیں میگن کا متفکر چہرہ نظر آیا۔ وہ اوپر تک رہی تھی۔ راہگیروں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس نے مختصر سا جواب دیا ”بہت خوبصورت ہیں“ اور منہ موڑ لیا۔ چھوٹی بچی سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ ان سے بچتا ہوا اپنے کمرے میں چلا آیا اور بستر پر جا کر ا۔ اور دو نو بازوؤں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ قرعہ پھینک چکنے کے بعد میگن کو چھوڑ چکنے کے بعد اسے نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ کم و بیش پہلی ڈسے اور اس کی بہنوں اور ان کی انگریز گھرانوں کی سی خوش دلی سے بھی نفرت ہونے لگی۔ قسمت نے یہ کیا ظلم کیا کہ انہیں یہاں لے آئی اور اس کے اولین عشق کا گلا گھونٹ دیا اور اسے یہ سمجھا یا کہ یہ عشق

اوباشی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ سیٹلا کا کیا حق تھا۔ کہ اس کا دل فریب محبوب حسن اُسے یقین دلا دے کہ وہ میگن سے کبھی شادی نہ کرے گا اور اس کے عشق کو مذموم ثابت کر کے اس کا دل تاتفت اور حسرت اور رحم سے بھر دے۔ میگن بیچاری تلاش کے بعد مایوس ہو کر واپس چلی گئی ہوگی۔ اور شاید یہ امید دل میں لئے گھر کو جا رہی ہوگی۔ کہ ایشرسٹ پہلے سے پہنچ گیا ہوگا۔ تاتفت اور حسرت سے بیتاب ہو کر ایشرسٹ نے اپنی آستین کو کاٹ لیا۔ کھانے پر بیٹھا تو اداس اور چپ چاپ تھا۔ اس کی اداسی کو دیکھ کر بچے بھی پڑ مر رہے ہو گئے۔ سب کے سب تھکے ہوئے تھے۔ اس لئے ان کا مزاج برہم تھا۔ چنانچہ شام کا وقت بے لطفی میں گزرا۔ کئی بار ایشرسٹ کی سیٹلا سے آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ پریشان مجروح نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ ایشرسٹ بگڑا ہوا تھا۔ اس لئے اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ رات بھر بچپن رہا صبح بہت سویرے اٹھا۔ اور باہر نکل گیا۔ ساحل سمندر کے پاس پہنچا تو تنہائی کے عالم میں پرسکون۔ نیلے روشن سمندر کو دیکھ کر اس کا دل قدرے پیچا۔ مغرور احق۔ سمجھتا ہے میگن کو بہت ہی صدمہ ہوگا! ہفتے دو ہفتے میں وہ بھول بھی جائیگی! باقی رہا وہ خود۔ تو اُسے اپنی پاکبازی کا صلہ ملیگا! نیک لڑکا! سیٹلا کو اس کا علم ہو جائے تو وہ اس ضبط نفس کو کس قدر سراہے۔ وہ شیطان کی قائل ہے۔ سمجھے شیطان کو نیچا دکھایا یہ خیال آیا تو ایک کرخت تمغہ لگایا۔ لیکن رفتہ رفتہ سمندر اور آسمان کے سکون اور حسن اور سمندری پرندوں کی پرواز کے فطالے سے متاثر ہو کر اس کو شرم سی آنے لگی۔ نہایا اور گھر کو چلا +

سیٹلا مکان کے باہر باغیچے میں ایک سفری سٹول پڑھی تصویر بنا رہی تھی۔ چپکے سے اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ وہ کس قدر حسین ہے۔ جسم آگے جھکا لئے۔ موقلم ہاتھ میں تھامے۔ ہاتھ

پر ہلکی سی تیوری ڈالے وہ کتنی پیاری معلوم ہوتی ہے۔

بڑے ملائم لہجے میں بولا:-

”سٹیلا مجھے افسوس ہے کہ رات میں نے بہت ہی بدتمیزی کی۔“

سٹیلا چونک کر مڑی۔ چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ حسبِ عادت جلد جلد بولی:-

”اس کا ذکر مت کرو۔ میں سمجھ گئی تھی۔ کہ کچھ نہ کچھ بات ہوگی لیکن دوستوں میں ایسی باتوں کا تذکرہ ہی فضول ہے ہے نا؟“

ایشرسٹ نے جواب دیا۔

”ہاں دوستوں میں۔۔۔ تو ہم آپس میں دوست ہیں ہیں؟“

سٹیلا نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ بڑے زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ برقِ صفت سربِ اور درخشاں تبسم سے اس کے چمکتے دانت پھر دکھائی دئے۔

تین دن کے بعد ایشرسٹ ان لوگوں کے ساتھ واپس لندن چلا گیا۔ فارم کے لوگوں کو خط نہ لکھا۔ لکھنا تو کیا لکھنا؟

اگلے سال اپریل کے آخری دن سٹیلا سے اس کی شادی ہو گئی.....

یہی وہ واقعات تھے۔ جن کی یاد اب ایشرسٹ کے دل میں جبکہ وہ اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ کے دن گورس کے بیچ میں دیوار کا سہارا لگائے بیٹھا تھا۔ تازہ ہو رہی تھی۔ جہاں اب لٹچ چن رکھا تھا۔ یہی وہ مقام ہو گا جہاں میگن اُسے پہلی دفعہ آسمان کے بالمقابل کھڑی دکھائی دی تھی۔ انسان کو زندگی میں کیسے کیسے اتفاقات پیش آتے ہیں۔ دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ اس فارم اور باغیچے اور چسی ہونٹ سے دلے مرغزار کو پھر جا کر دیکھے۔ اس میں بہت وقت نہ لگے گا۔ سٹیلا بھی

شاید گھنٹے بھر تک نہ لوٹے۔

بلندی پر وہ چیر کے درختوں کا جھنڈ اور عقب میں وہ گھاس سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان اُسے اچھی طرح یاد تھی! فارم کے دروازہ تک پہنچ کر رک گیا۔ وہ پتھر کی نیچی عمارت۔ یو کے درختوں کا وہ محراب۔ وہ انگور کے تنگوفے۔ بالکل جوں کے توں تھے۔ وہ پرانی سبز رنگ کی چوکی بھی وہیں کھڑکی کے نیچے گھاس پر رکھی تھی جہاں کھڑے ہو کر اس نے میگن کے ہاتھ سے چابی لے لی تھی۔ پگڈنڈی پر چل کر باغیچے کے پھاٹک تک پہنچا۔ جو پہلے کی طرح اب بھی سیاہی مائل اور شکستہ تھا۔ درختوں میں ایک سیاہ رنگ کا سورا بھی پھرا دھرا دھرا پھر رہا تھا۔ کیا سچ چھبیس سال گزر چکے ہیں۔ یا محض کسی خواب سے بیدار ہوا ہے اور اس بڑے سبب کے درخت کے پاس میگن اس کا انتظار کر رہی ہے؟ خود فراموشی کے عالم میں اپنی بھوری ڈاڑھی کو ہاتھ لگایا اور واقعات کی دنیا میں واپس آ گیا۔ پھاٹک کھول کر باغیچے کے اندر داخل ہوا۔ اور خاردار جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا کناٹے تک جا پہنچا۔ جہاں وہ پرانا سبب کا درخت کھڑا تھا بالکل ویسے کا ویسا! ہلکے رنگ کی کائی پہلے سے قدرے زیادہ تھی۔ دو ایک شاخیں بھی خشک ہو چکی تھیں۔ لیکن ان کے سوا اس میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کل رات ہی کا واقعہ ہے جبکہ میگن کے بھاگ جانے کے بعد وہ اس درخت کے کائی دار تنے سے لپٹ گیا تھا۔ اور اس کی خوشبوئے چوبیس سے مشام کو لطف اندوز کیا تھا اور سر کے اوپر چاندنی میں شگوفے سانس لیتے ہوئے اور زندہ معلوم ہوتے تھے۔ اوائل بہار کا زمانہ تھا۔ کہیں کہیں کلیاں پھوٹ چکی تھیں۔ بلیک برڈ اپنے راگ الاپ رہے تھے۔ ایک ککڑی کوک سناؤں سے رہی تھی۔ دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ اور اس کی میٹھی میٹھی گرمی خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ مقام حیرت ہے کہ کہیں کوئی تبدیلی نظر نہ آتی تھی۔ وہی شور مچاتی ہوئی ندی تھی اور وہی تنگ ساتا لابل جس میں وہ ہر روز صبح کے وقت لیٹ جایا کرتا تھا۔ اور پانی



سنا چکا ہوں۔ کئی لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ ڈھیری کیسی ہے۔
ہم لوگ اسے دوشیزہ کی قبر کہتے ہیں۔“

ایشرسٹ نے مٹا کو کی ٹھیلی آگے بڑھا دی۔ ”پاپ بھرو۔“
بڑھے نے اپنی ٹوپی کو چھوڑا۔ اور آہستہ آہستہ اپنا مٹی کا
پاپ بھرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں جو بھریں اور بالوں
میں سے ادھر کو تک رہی تھیں۔ ابھی چاک باقی تھی۔
”جناب اجازت ہو تو میں بیٹھ جاؤں۔ آج ذرا ٹانگ دکھ
رہی ہے۔“ یہ کہ کر وہ اسی ڈھیری پر بیٹھ گیا۔

”اس قبر پر ہمیشہ ایک آدھ پھول پڑا رہتا ہے کچھ ایسی
تنہائی بھی نہیں یہاں۔ اب تو جب سے یہ موٹروں کا
جھمیل شروع ہوا ہے۔ اکثر لوگ ادھر سے گزرتے
ہیں۔ پچھلے زمانے کی ادبات تھی۔ اب تو یہاں چل
پہل رہتی ہے۔ اس بچاری نے خودکشی کر لی تھی۔“
ایشرسٹ نے کہا۔ ”سمجھ گیا۔ جی چوراسے میں دفن ہے
میرا خیال تھا۔ اب یہ دستور نہیں رہا۔“

”مگر یہ تو بڑے عرصے کی بات ہے۔ ان دنوں ہمارے
ہاں کا پادری ایک بہت ہی خدا ترس شخص تھا۔ اگلے
میکلس میں میری پنشن کو چھ سال ہو جائینگے۔ اور جب یہ
واقعہ ہوا۔ اس وقت میں پچاسویں برس میں تھا۔ اب
تو کوئی ایسا شخص زندہ نہیں۔ جسے اس کا حال مجھ سے
بڑھ کر معلوم ہو۔ وہ یہاں قریب ہی رہتی تھی۔ اسی
فارم میں جہاں میں سزنیرو کو مٹ کے ہاں کام کیا کرتا
تھا۔ اب وہ فارم یک نیرو کو مٹ کے پاس ہے۔ میں
کبھی کبھی اس کے ہاں بھی متفرق کام کر لیتا ہوں۔“
ایشرسٹ پھاٹک کے سہارے کھڑا پاپ سلگا رہا تھا
دیا سالنی سمجھ گئی۔ لیکن ایشرسٹ نے دیر تک خمیدہ ہاتھوں
کو چہرے کے سامنے سے نہ ہٹایا۔

اچھا! اچھا! کر اپنے پہلوؤں اور سینے پر ڈالا کرتا تھا۔ پیرا
مرغزار میں بیچ کے درختوں کا وہی جھنڈ تھا۔ اور ان کے پاس
وہی پتھر جہاں کہتے تھے۔ کہ جسی ہوا آن کر بیٹھتا ہے۔ گم کرڈ
شباب کا خیال آیا۔ عشق کی بربادی کا خیال آیا کہ کس بیدردی
سے اس کی شیرینیوں کو ضائع کر دیا تھا۔ دل میں ایک ٹیس
ایک ہوک ابھی جس نے ایشرسٹ کا گلا گھونٹ دیا۔ اس
غیر ملوث حسن سے بھری ہوئی دنیا میں انسان اسی لئے پیدا
کیا گیا ہے۔ کہ جو مسرت اسے حاصل ہو اسے دل سے جدا
نہ ہونے دے۔ جس طرح یہ زمین اور یہ آسمان جدا نہیں ہونے
دیتے! لیکن انسان بے بس ہے!

ندی کے کناکے پر پہنچا تو اس چھوٹے سے تالاب پر نظر
پڑی۔ سوچا۔ شباب اور بہار۔ کیا معلوم دونوں کہاں چلے گئے؟
پھر یکلاخت ڈر گیا۔ کہ کسی سے سامنا ہو گیا تو یہ خوشگوار تصویر
برہم ہو جائینگے۔ پگڈنڈی کی طرف پلٹا۔ اور کسی سوچ میں کھویا
ہوا پھر اس چوراسے پر جا پہنچا۔

موٹر کے پاس ایک کڑ بڑی ڈاڑھی والا بوڑھا شخص ایک
چھڑی کا سہارا لئے کھڑا شو فر سے باتیں کر رہا تھا۔ ایشرسٹ
کو دیکھ کر وہ یکلاخت رک گیا۔ گویا کوئی بے ادبی کر بیٹھا ہے اور
تعلیم ٹوپی کو چھو کر لنگڑاتا لنگڑاتا پگڈنڈی پر ہولیا۔

ایشرسٹ نے مٹی کی اس سبز ڈھیری کی طرف اشارہ
کیا اور پوچھا۔ ”تمہیں معلوم ہے یہ کیا ہے؟“
بوڑھا شخص ٹھہر گیا۔ چہرے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ دل
میں کہ رہا ہے۔ ”مجھ سے بہتر تمہیں بتانے والا اور کون مل
سکتا ہے۔“

بولتا۔ ”یہ ایک قبر ہے۔“

”لیکن یہاں کیوں؟“

بڑھا مسکرا دیا۔ ”یہ لمبی داستان ہے۔ میں اسے کئی دفعہ

اس نے کہا "اچھا؟" لیکن اپنی آواز خود اپنے کانوں کو عجیب معلوم ہوئی۔ جیسے بیٹھی ہوئی ہو۔

"وہ لڑکی لاکھوں میں ایک تھی! میں جب گزرتا ہوں۔ یہاں ایک آدھ پھول ڈال جاتا ہوں۔ خوبصورت اور نیک تھی۔ گو انہوں نے اسے گرجے میں دفن نہ کیا۔ نہ وہیں دفنایا جہاں وہ خود چاہتی تھی۔"

بڑھا مزدور ٹھہر گیا اور اپنا بالوں والا۔ مڑا تڑا ہاتھ کھول کر اس ڈھیری پر بلیو بل کے پھولوں کے پاس رکھ دیا۔
ایشرسٹ نے کہا "اچھا؟"

بڑھے نے کہا: "بس یوں سمجھے کسی سے عشق ہو گیا تھا اس لڑکی کو۔ گو یقین سے کوئی نہ کہہ سکتا تھا۔ کسی لڑکی کے دل کا حال اللہ ہی جانے۔ لیکن میرا خیال ہے۔ کہ اُسے عشق تھا۔" قیصر پر ہاتھ پھیرا۔ "مجھے اس لڑکی سے بہت محبت تھی۔ سبھی کو اس سے محبت تھی۔ لیکن وہ خود بھی بہت زیادہ محبت کرنے والی تھی۔ یہی اس میں خرابی تھی۔" اس نے نظریں اوپر اٹھائیں اور ایشرسٹ نے جس کے ہونٹ اس کی ڈاڑھی کے بالوں میں چپے ہوئے تھے لیکن پھر ٹک رہے تھے۔ کہا: "اچھا؟"

"یہ موسم بہار کا واقعہ ہے۔ بس یہی موسم تھا۔ جو اب ہے۔ یاد آ رہا ہے۔ چند دن بعد ہوگا۔ شگوفوں کے دن تھے۔ فارم میں ایک کالج کا لڑکا آکر ٹھہرا تھا۔ اچھا لڑکا تھا۔ اپنا ڈرا کھینچ کر رہتا تھا۔ مجھے بہت پسند تھا۔ میں نے تو صاحب کوئی ایسی بات نہیں دیکھی لیکن میرا خیال ہے۔ کہ اسی نے اس لڑکی کا سر پھرا دیا تھا۔" بڑھے نے پائپ منہ سے ہٹایا۔ زمین پر تھوک کا اور پھر بولا:-
"بات یہ توئی۔ کہ یہ لڑکا ایک دن ایک ایک یہاں سے چل دیا اور واپس کبھی نہ آیا۔ اس کا تھپکا اور چھوٹی موٹی چیزیں ابھی تک فارم میں پڑی ہیں۔ میں ہمیشہ یہی سوچتا رہا۔ کہ اس نے اپنی چیزیں منگو ایکوں نہ دیں۔ ایشر یا ایسا ہی کچھ نام

تھا اس لڑکے کا۔"

ایشرسٹ نے پھر کہا: "اچھا؟"

بڑھے نے مونٹوں پر زبان پھیری۔

"اس دن سے لڑکی کے ہونٹوں پر تو جیسے مہر لگ گئی۔ دن بھر یوں پھرتی رہتی تھی جیسے جو اس بچا نہ ہوں۔ وہ تو کچھ دیوانی سی ہو گئی۔ میں نے کبھی کسی کی حالت یوں بدلتے نہیں دیکھی۔ فارم میں ایک اور لڑکا تھا۔ جو نامی۔ وہ اُسے چاہتا تھا۔ میں جانوں لڑکی اس سے بہت ہی پریشان رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی حالت بگڑتی گئی۔ بعض اوقات شام کے وقت میں پتھر دلوں کو لے کر آتا۔ تو وہ لڑکی پیچھے میں بڑے سیب کے درخت کے پاس کھڑی ہوتی۔ اور بالکل سامنے تک رہی ہوتی۔ میں دل میں کہتا۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ لیکن تمہاری حالت زار ہے۔"

بڑھے نے اپنا پائپ پھر سلگایا اور سوچ کے انداز میں کش لگانے لگا۔

ایشرسٹ نے کہا۔ "اچھا؟"

"ایک دن مجھے یاد ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ میگن تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے (اس کا نام میگن ڈیوڈ تھا اور وہ اور اس کی خالہ بڑھی مسز نیرو کو سب دو نو دیلز سے آئی تھیں) میں نے کہا تمہیں ضرور کوئی دکھ ہے۔ کہنے لگی نہیں جم مجھے کسی چیز کا دکھ نہیں۔ میں نے کہا۔ دکھ کیسے نہیں۔ ہے اور ضرور ہے۔ کہنے لگی۔ نہیں تو۔ یہ کہا اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو پھلک پڑے۔ میں نے کہا۔ تو پھر تم روتی کیوں ہو؟ اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ یہاں دکھ ہوتا ہے۔ لیکن تھوڑے دنوں میں آپ ہی ہٹ جائیگا۔ پھر کہنے لگی۔ جم اگر مجھے کچھ ہو گیا تو مجھے اسی سیب کے درخت تلے

دفن کیجیو۔ میں ہنس دیا۔ میں نے کہا۔ تمہیں کیوں کچھ ہونے لگا
پنگلوں کی سی باتیں منہ سے مت نکالو۔ وہ بولی۔ نہیں۔ میں
پنگلوں کی سی بات نہ کروں گی۔ میں نے دل میں سوچا۔ لڑکیوں
کی باتوں کا کیا ہے۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائیگی۔ چنانچہ اس بات
کا خیال میں نے دل سے نکال دیا۔ لیکن دو دن بعد کوئی
شام کے چھ بجے میں پچھڑوں کو لئے آ رہا تھا۔ کہ میں نے ندی
میں سیب کے درخت کے پاس کالی سی چیز پڑی دیکھی میں سمجھا
سورہ ہے۔ پھر خیال آیا۔ یہ بھی کوئی سورہ کے لیٹنے کی جگہ ہے
قریب پہنچا۔ تب معلوم ہوا کہ کیا ہے۔

بڑھارک گیا۔ اس کی آنکھیں ادھر کو تک رہی تھیں۔ نظر
میں چمک تھی اور دکھ بھرا تھا۔
”ندی میں ایک چٹان ہے اس سے رک کر پانی کا ایک تالاب
سا بن گیا ہے۔ وہاں وہ لڑکی پڑی تھی۔ اسی مقام پر میں نے
اس لڑکے کو ایک دو مرتبہ نہاتے بھی دیکھا تھا۔ لڑکی پانی میں
اوندھی پڑی تھی۔ اور اس کے سر کے پاس ایک پتھر کے شگاف
میں سے سنہری پھولوں کا ایک پودا اُگ رہا تھا۔ چہرے کو دیکھا
تو اس پر ایسا حسن آگیا تھا کہ آپ سے کیا کہوں۔ ننھے بچے کی
طرح پر سکون اور خوبصورت تھا۔ جب ڈاکٹر نے اسے دیکھا۔ تو
بولا۔ اتنے پانی میں ڈوبنا تو ناممکن ہے۔ اور سچ پوچھے تو
اس کے چہرے سے بھی یہی معلوم ہوتا تھا۔ میں تو زار قطار
رودیا۔ وہ کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ جون کا مہینہ تھا
لیکن اُسے سیب کے تنگوفے کی ایک آدھ ٹہنی کہیں سے مل گئی
تھی۔ اُسے بالوں میں لگا رکھا تھا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں۔ کہ
اُسے شادی مرگ ہوئی تھی ورنہ اس بناؤ سنگھار سے کیوں مٹی
اور پھر پانی بھی تو فٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن یہ
میں آپ سے کہ دوں۔ کہ یہ جنگل بھاری ہے۔ مجھے بھی معلوم
ہے اُسے بھی معلوم تھا۔ اور کوئی کہے۔ کہ بھاری نہیں۔ تو

میں کبھی نہ مانوں۔ میں نے لوگوں سے کہ دیا۔ کہ وہ سیب کے
درخت تلے دفن ہونا چاہتی تھی۔ لیکن یہ سن کر لوگ اور بھی حلا
ہو گئے۔ انہیں یقین ہو گیا۔ کہ اگر یہ بات ہے۔ تو ضرور خود کشی
ہی کی ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے یہاں دفن دیا۔ ہمارے پادری
کو ایسی باتوں کا بہت خیال تھا۔
بڑھے نے پھر ڈھیری پر ہاتھ پھیرا۔
اور پھر رُک رُک کر بولا۔ لڑکیاں عشق کی خاطر کیا کچھ نہیں کر
گزرتیں۔ وہ بڑی محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ میرے خیال میں
اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن یقین سے کسی کو کچھ معلوم نہیں
داد لینے کے لئے اس نے نظر اُپر اٹھائی۔ لیکن ایشرسٹ
وہاں سے چل دیا تھا۔ اس طرح کہ گویا اس کے سوا اور کوئی وہاں
موجود ہی نہ تھا۔

پھاڑی کی چوٹی پر جہاں لہج چن رکھا تھا۔ اس سے پر۔ سے
نظروں سے اوجھل وہ زمین پر اوندھالیٹ گیا۔ تو اس کی
پاکبازی کا صلہ یہ تھا! یہ عشق کی دیوی سا پُترین کا انتقام!
اس کی پرئم آنکھوں کو میگن کا چہرہ دکھائی دیا۔ جن کے سیاہ
بھیکے ہوئے بالوں میں سیب کے شگوفے لگے تھے۔ اس نے دل
سے پوچھا۔ میں نے کیا گناہ کیا تھا؟ میں نے کیا کیا تھا؟ لیکن
اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ اس کے دل میں جذبات
خیز۔ گل ریز۔ مترنم بہار نے طوفان بپا کر دیا تھا۔ اس کے اور
میگن ددو کے دل میں۔ لیکن کیا دراصل عشق کو محض کسی کی جا
نینا مطلوب تھا! تو پھر وہ یونانی ہی راستی پر ہے۔ اور ہپارٹس
کے الفاظ آج بھی سچے ہیں۔

عشق کا دل دیوانہ ہے

اور اس کے پروں کی چمک سنہری ہے

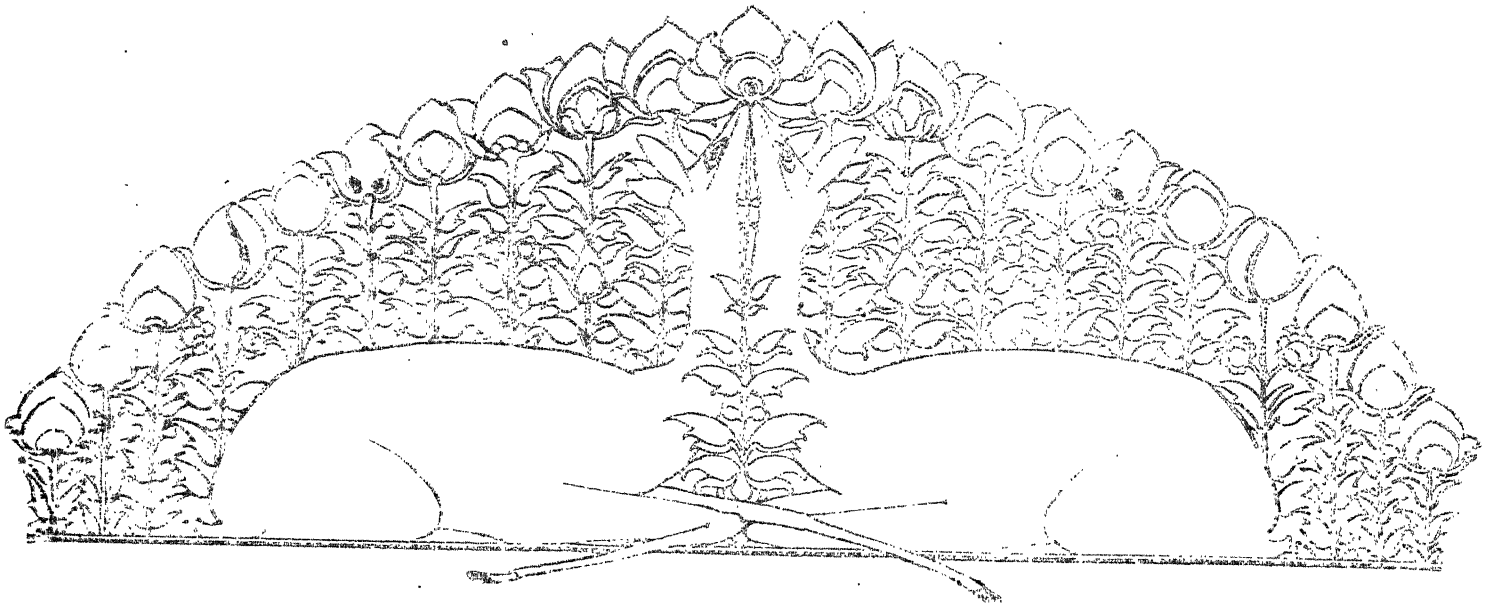
اور جب وہ جست بھر کر اڑتا ہے

تو کوئی اس کے جادو کی تاب نہیں لاسکتا۔

ایک آواز کانوں میں پڑی -
 ”وہاں ہو تم - لو آؤ دیکھو“
 ایشرسٹ اٹھا - پیوی نے جو تصویر کھینچی تھی - اُسے ہاتھ میں لیا
 اور چپ چاپ اسے دیکھتا رہا -
 ”فرینک اس کا پیش منظر ٹھیک ہے؟“
 ”ہاں“
 ”لیکن پھر بھی کچھ کمی رہ گئی ہے - چمے نا؟“
 ایشرسٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا - ”کمی؟ سیب کا درخت
 موسیقی اور سنہری پھول“

وہ تمام زندگی جو پہاڑ اور موج اور آب جو ہیں
 شباب اور خود سری سے مت ہے
 ہر وہ شے جو سینہ زمین سے پھوٹتی ہے
 یا سورج کی شہابی شٹاحول میں سانس لیتی ہے
 ہاں یہ سب کچھ اور ہر مرد اور ہر عورت
 سب کے اوپر اے ساپہرین - اے ساپہرین تو حکومت کرتی ہے
 صرف تو -
 یونانی سچ کتنا ہے - میگن ! حسرت زدہ میگن ! پہاڑی سے
 نیچے اترتی ہوئی ! میگن - پرانے سیب کے درخت کے نیچے راہ
 نکلتی ہوئی ! بیجان - مردہ میگن جس پر حسن کی مہر ثبت ہے !

مترجم سید احمد شاہ بخاری پطرس



فرمودہ پطرس

اے حسن تو زیاد تماشا کم تر
 عزم دراز باد تماشا کم تر
 برہم نظر مکن من ناکردہ کار را
 گرا التجائے بوسہ بے جا کم تر

تیرہم چہ تسلی بہ نگاہے چہ تدار
 شکر آرزوئے از لیم انگشتہ
 بر سر خاک من تشنہ بے ریختہ بادا
 قطرہ مے کہ توار لغزش پا بختہ

سید احمد شاہ بخاری پطرس



حسن آرزو

ان موتیوں سے بھر لوں

افریقہ کے صحرا سے۔ اور مصر کے دریا سے
بھارت کے پہاڑوں سے۔ کانگو کے اجاڑوں سے
ایران کے نظاروں سے۔ پر کیف بہاروں سے

میں پل میں گذر جاؤں

دم بھر نہ رکوں ان سے

ہرگز نہ بھکوں ان سے

میں اور یہ محفل ہو

یونہی میں گذر جاؤں

بستی سے بیاباں سے صحرا سے گلستاں سے

وادی سے کستاں سے

یونہی میں گذر جاؤں

یارب مجھے آزادی دے باد سحر کی سی

ممتاز حسن احسن

دلگیر سے غنچوں کو۔ چپکے سے ہنسا جاؤں
اور صبح کے آنے کا۔ پیغام سنا جاؤں
نغموں کے تلاطم سے

پُر ہو مری۔ حنا موٹی

دنیا کو میں سکھلا دوں

آلامِ فخرِ اموشی

آرامِ جوانی سے خوشیوں کی کہانی سے

الفت کے تکلم سے۔ شوخی کے تبسم سے

محبوب جفاؤں سے۔ مرغوب اداؤں سے

دامانِ نظرِ بھر لوں

نظاروں سے پُر کر لوں

مایوس نگاہوں سے حسرت بھری آہوں سے

دلسوز خیالوں سے۔ اور صبح کے نالوں سے

رنجور کی آنکھوں سے۔ ٹپکے ہوئے اشکوں سے

دامن کو میں پُر کر لوں

یارب مجھے آزادی دے باد سحر کی سی
بستی سے بیاباں سے صحرا سے گلستاں سے

وادی سے کستاں سے

یوں سن سے گذر جاؤں

جس طرح کسی دل میں۔ جو غم سے ہوا فسرہ

چپکے سے خیال آئے۔ گذری ہوئی راحت کا

اور ابر سا چھا جائے۔ اس دل پہ مسرت کا

یونہی میں گذر جاؤں

بستی سے بیاباں سے صحرا سے گلستاں سے

وادی سے کستاں سے

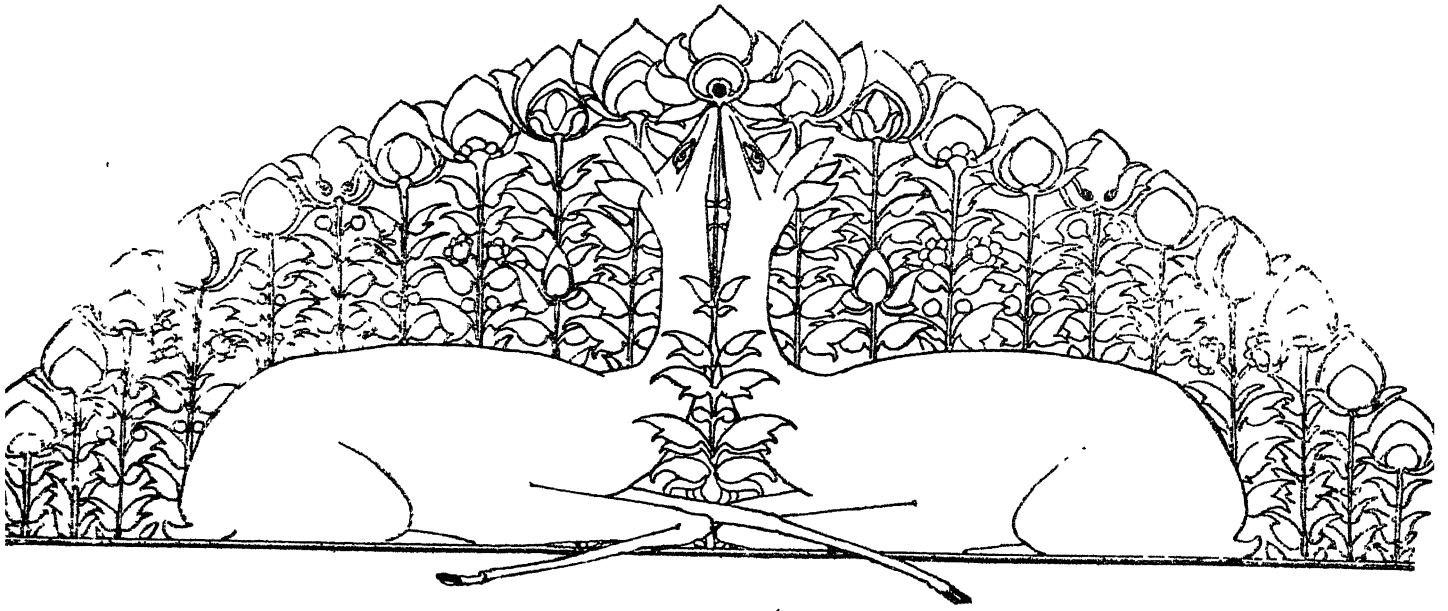
یونہی میں گذر جاؤں

بھولا کروں پھولوں میں۔ اور خشک بھولوں میں

خوشبو کو چرائوں۔ کانٹوں کو اڑاؤں

دیکھا کروں نہروں کو۔ چھیڑا کروں لہروں کو

سوتے ہوئے مہرے کو۔ چپکے سے جگا جاؤں



تقدیر

مجید ملک

کون تقدیر کے پردے میں عمل کرتا ہے
میری تدبیر میں جو رد و بدل کرتا ہے
عشق سے کیوں نہیں انساں کی رہائی ممکن
کوئی اس عصت زدہ دشوار کو حل کرتا ہے

میں گنہگار ہوں لیکن میں گنہگار نہیں
یعنی اندوہِ عقوبت کا سزاوار نہیں
اب وہ دو رخ میں مجھے بھیجتے ہیں بھیجنے دو
میں بہر حال ترسم کا طلب گار نہیں

مجید ملک

حیرت تغزل

مشوئے ہیں مے مٹانے کے حوصلے دیکھنا! زمانے کے
دستِ صیاد میں ملے، اکثر تنکے بلبل کے آشیلے کے
یہ زمیں اور آسماں دونوں دو ورق ہیں مے فسانے کے
آج بھی جو وفا پہ قائم ہیں وہ بھی ہیں لوگ کس زمانے کے
شوقِ پامال، آرزو رسوا یہ کرشمے ہیں دل لگانے کے
گل و گلزار ہی نہیں، ہم بھی منتظر ہیں بہار آنے کے
ہیں نظر میں نئے نئے عنوان دل سے افسردگی مٹانے کے
اس کو کیا کیجئے کہ باقی ہیں دن ابھی سختیاں اٹھانے کے
کچھ عجب دل کا حال ہے حیرت کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے

عبدالمجید حیرت

رحمن جغتائی تاجدار

سینا کا سب سے بڑا شہر بعلصور اہماں قوم عرم کو حکومت کرتے صدیاں گزر گئی تھیں تجلیوں کا گہوارہ تھا۔ بعلصور اکو قوم عرم نے بسایا تھا۔ وہ اس کی رونق تھے اور وہ ان کا فخر تھا۔ ابن حسام نے جو قوم عرم کا سب سے پہلا بادشاہ تھا اس کی بنیاد رکھی تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ اس نے اپنی قوم کے لئے چھوڑا اس کی بہترین یادگار بعلصور تھا۔ بعلصور کے رہنے والے زندگی کی حقیقی لذتوں سے آشنا تھے۔ ان کے نزدیک زندگی عمل کا دوسرا نام تھا۔ انہوں نے زندگی کو معراج کمال تک پہنچانے کے لئے ان گنت قربانیاں کی تھیں۔ وہ دل رکھتے تھے۔ انسانوں کا سادل۔ کون کہہ سکتا ہے انہیں زندگی کا معیار قائم کرنے میں کتنی جدوجہد کرنی پڑی؟ مورخین کا بیان ہے کہ انہوں نے قوم اسرائیل کو جب وہ انتہائی مصیبتوں میں سے گزر رہی تھی۔ آپے ملک میں پناہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور فقط اس لئے انکار کر دیا تھا کہ بنی اسرائیل کی حد سے بڑھی ہوئی غلامانہ ذہنیت میں وہ اپنے مستقبل کے لئے ایک خطرہ عظیم دیکھتے تھے۔

کہتے ہیں قوم عرم کا سب سے بڑا بادشاہ۔ بادشاہ نعمان بادشاہ کے بھیس میں خدا کا پیغام تھا۔ نعمان بادشاہ تھا۔ اس کا دل بادشاہوں کا دل تھا۔ اور سانپ کی طرح جب تک اس پر پادیں نہ پڑے وہ کسی کو نہ ڈستا تھا۔ نعمان کی عظمت اور جبروت کی تاریخ شاہرہ ہے۔ راجہ تک اس کا ملک اور اس کی قوم اس کے بنائے ہوئے قانون اور روایات کو احترام سے بھرے ہوئے دل اور نیاز سے جھکی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ وہ ایک صحیح قسم کا بادشاہ۔ صرف بادشاہ تھا۔

آض بن عاصم بعلصور کا سب سے بڑا مولخ لکھتا ہے کہ جب وہ تخت پر بیٹھا تو صحرا کی فضا میں ایک روشنی نمودار ہوئی اور ماؤں نے اس نیک ساعت کی یاد میں اپنے بچوں کے بازوؤں پر تنوید باندھے اس کا بیان ہے کہ جب نعمان تخت پر رونق افروز ہوتا تھا تو اس کی کشادہ پیشانی پر تجلیاں نمودار ہوتی تھیں۔ اور اس کے سرخ لبوں پر ایک مسرت آمیز بستم موج حیات بن کر دوڑ جاتا۔ اس کی آنکھیں جہان کی آئینہ دار تھیں۔ اور وہ خود انسان کا مستقل نظر آتا تھا۔ نعمان سے کبھی کوئی لغزش نہ ہوئی تھی۔ اس کے ہاں اولاد کی کمی نہ تھی۔ بچوں کی تربیت کا اسے غیر معمولی ذوق عطا ہوا تھا۔ خصوصیت سے اس کے عہد میں عورتوں نے علم و ادب مردوں کے دوش بدوش حاصل کیا تھا۔ اس کا سبب اس کی لڑکیاں تھیں۔

نعمان نے برسوں کی سوچ بچار کے بعد اپنے رہنے کے لئے ایک محل تیار کرایا تھا۔ فن تعمیر کا نمونہ۔ آہستہ آہستہ مشرق و مغرب میں آپ اپنی مثال بن کر رہ گیا۔ اس کے بڑے بڑے ستون نیلگوں گنبد اٹھائے ستاروں بھری رات میں یوں دکھائی دیتے گویا صحرا زادیاں محلوں کے نیچے کھجوروں کے جھنڈوں میں سے گزر رہی ہیں۔ یہ محل جس میں نعمان رہا کرتا تھا۔ بعلصور کی پشانی پر اس طرح روشن تھا جیسے فرمان شاہی پر مہر ثبت کر دی گئی ہو۔ صدیوں کی روایات اس کے پیچھے رحمت حق کی طرح پرکھوئے کھڑی تھیں۔ انجام کار یہ محل جسے نعمان نے اپنی ذات کے لئے بنایا تھا۔ مظلوموں کی داد رسی کے لئے وقف ہو گیا۔

اس نے بادشاہ کی نشست تیار کی تھی جس پر اس کا نام کندہ تھا۔ ایک مورخ لکھتا ہے صوفیا نعمان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ جو اس کی زندگی میں مر گیا تھا۔ وہ ایک ہسپانوی شہزادی کے بطن سے تھا جب یہ صحن تیار ہو چکا تو نعمان کو اس میں ایک کھوئی ہوئی خوشی چلتی پھرتی نظر آئی اس نے اپنے بیٹے کی یاد میں اسی کے نام سے منسوب کر دیا۔

محل کے باہر وہ دراز قد پہرہ دار جو حکومت کا وقار اور اس کے شکوہ کا ثبوت تھے بالکل چپ کھڑے رہتے تھے۔ ان کی خاموشی میں ہزاروں پر معنی الفاظ کی فصاحت تھی۔ وہ ایک ہی نظر میں بہت کچھ کہ جلتے۔ جب بادشاہ ان کے سامنے سے گزرتا تو ان کے آہنی بلم کچھ اس طرح جیسے خود بخود ان کے سامنے آکر رک گئے ہوں رک جاتے۔ وہ چلتے چلتے ٹھہر جاتے ان کے سر جھک جاتے۔ ایک نوبت بچی اور بادشاہ مع اپنے مصاحبوں کے کاروان انجم کی طرح محل میں داخل ہو جاتا بعلصورا کے بسنے والے یہ سب کچھ جانتے تھے کیونکہ یہ رسوم صدیوں سے چلی آتی تھیں۔

ایک شب بعلصورا بھولے بھٹکے خواہوں کی یاد میں محو تھا۔ لیکن صوفیا کے اندر ایک بزم طرب جو بادشاہوں کے شایان شان تھی جمی ہوئی تھی۔ نعمان کے اپنی راہ سے بھٹکے ہوئے وارث وقت اور زندگی کا لطف لے رہے تھے۔ اس وقت صوفیا سے دور دور تک کوئی آہٹ اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ صحن کے باہر دیواروں پر ستاروں کی دھیمی دھیمی روشنیاں نیند کی غنودگی میں اٹکتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ پہرہ دار سامنے، دائیں بائیں اور پیچھے نظریں جما کے دیکھ رہے تھے۔ معاً وہ اس ہرن کی طرح ہوشیار ہو گئے جو گھنے جنگل میں کسی آنے والے خطرے کی آہٹ سنتا ہے۔ ساتھ ہی وہ چیتے کی طرح مستعد اور حملہ کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے ایک سایہ دیکھا جو اس رات کی تاریکی میں کالے

وہ شان اور جاہ و جلال جو قوم عرم کی پر وقار زندگی کا ثبوت تھا اور جس کا بنیادی پتھر ابن حسام کی وسعت نظری نے رکھا تھا قوم عرم کی قدیم روایات بعلصورا کے وارثوں میں ابھی موجود تھیں لیکن رفتہ رفتہ زمانہ گذشتہ کی یاد ایک قدیم سکے کی طرح زنگ آلود ہو رہی تھی کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ آیا یہ تغیر محض بزرگ اور برگزیدہ ہستیوں کے چلے جانے کی وجہ سے ہے یا قوم کے اسخراط کے نشانات ہیں۔

نعمان کا محل صوفیا شہر سے دور تھا اور پشت کی جانب سے کچھ اس طرح پہاڑوں کے دامن اور چوٹیوں سے ملا دیا گیا تھا کہ آج تک کسی نے اس کی صحیح وسعت کا اندازہ نہیں لگایا۔ "صوفیا" طوبا کے صحراؤں میں مصر کے دیوتا ابوالہول کی طرح کھڑا قوم عرم کی تہذیب کا زندہ معجزہ کہلاتا تھا۔ بعلصورا کے اندر بادشاہ آئے اور گئے مگر وہ نقشہ جو نعمان نے اختراع کیا تھا ویسے کا ویسا موجود تھا اس میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی دو پہرہ دار ستونوں کی طرح مضبوط۔ سرخ آنکھوں والے ہاتھوں میں آہنی بلم لئے دن رات صوفیا کے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ محل کی بلندی میر عمارت کے کمال سے بادشاہ نعمان کی شبیہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کے گرد زرد۔ سرخ بھجوروں کے بھند اس طرح نظر آتے تھے گویا بڑھاپے کے غصے میں کسی کے بال ادھر ادھر بکھر گئے ہیں۔

صوفیا کوہ اودنا کے دامن میں استادہ لالہ صحرا کی طرح خود سنائی کی داستان کہ رہا تھا۔ اس کے وارث نہ جانتے تھے کہ اس نے کیا کیا دیکھا ہے۔ انسانی نظریں بلندی کی جانب اٹھتیں تو تندرلب ہلا کر کہتا کہ صوفیا کی تعمیر میں بادشاہوں کی دولت عقل کا سرمایہ۔ محبت اور عقیدت سب کچھ استعمال ہوا ہے۔ صوفیا درحقیقت ایک چھوٹے سے صحن کا نام تھا۔ جو سفید سنگ مرمر سے تیار کیا گیا تھا۔ عرب کے بڑے بڑے صناعتوں نے اس کی چھت اور دیواروں پر نشیے اور کاغذ کا کام کچھ اس طرح کیا تھا کہ بادشاہ آنے جانے والوں کو ہر زاویہ پر نگاہ سے دیکھ سکتا تھا۔ سمیع جو اس وقت سب سے بڑا صناعت تھا

بادلوں کی سرعت لیکن نسیم کی خاموشی کے ساتھ بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ انہوں نے اپنے آہنی لمبوں کو حرکت دی لیکن اس سے پیشتر کہ وہ اپنے شکار پر جھپٹے سایہ رک گیا۔

ایک آواز آئی ”بادشاہ کہاں ہے۔ مجھے بادشاہ سے ملنا ہے“
 پرہ دار ٹھٹھک کے رہ گئے۔ نوجوان پسمرہ دار نے
 نمکنت سے کہا ”دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اور بادشاہ آرام میں ہے“
 لیکن آنے والے نے نوجوان سردار کی ایک نہ سنی اور کہا ”مجھے
 بادشاہ سے ملنا ہے۔ نعمان اور ابن حسام کا وارث کہاں ہے۔“
 پرہ داروں نے اپنے لمبوں کو زمین پر زور سے مارا اور کہا یہ وقت
 بادشاہ کے آرام کا وقت ہے۔ پرانے قانون تبدیل کر دئے گئے ہیں
 نعمان اور ابن حسام کا وارث آرام کر رہا ہے۔ اور اس کے آرام
 میں کسی فریاد کی آواز خلل انداز نہیں ہو سکتی۔ تو عورت ہے اس
 لئے تجھے سزا سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ ورنہ — لیکن
 عورت نے کہا۔ میں ابن حسام کے وارث سے ملنا چاہتی ہوں
 میں سخاوت نہیں چاہتی۔ میں فریاد نہیں لائی۔ میں قوم عرم کے بادشاہ
 سے ملنا چاہتی ہوں۔ پھر اس نے بوڑھے سردار کو مخاطب کر کے کہا
 ”اے سردار میں تیرے بادشاہ سے ملنا چاہتی ہوں۔ یہ الفاظ کچھ اس
 نے اس طرح سے کہے کہ اس کی آنکھوں میں سے آنسو نکل آئے۔
 اس نے بوڑھے سردار کے بلم کو پکڑ لیا اور کہا۔ اے سردار تو دانشمند
 ہے تیرا ساتھی نوجوان ہے۔ تو نے عمر کی بہت سی منزلیں دیکھی ہیں
 میں کسی کے جذبات پر غلبہ حاصل کرنا نہیں چاہتی۔ مجھے کچھ مانگنا نہیں
 وہ بادشاہ ہے میں اس کی رعیت ہوں۔ اے سردار میں اپنے بادشاہ
 سے ملنا چاہتی ہوں۔“

بوڑھے سردار نے بلم کو زمین پر ٹیک دیا۔ نگاہیں دور ہوا میں
 پیوست کر دیں گویا اپنی گزشتہ زندگی کا جائزہ لے رہا ہے۔ پھر شایانہ
 کی طرح جو بلند فضاؤں میں اڑ رہا ہو عورت کے چہرے پر نظریں گاڑ
 دیں۔ آخر اس نے اپنا دایاں ہاتھ جو غالباً کانپ رہا تھا اس کے

سر پر رکھ دیا۔ شاید وہ ایسا کرنا نہ چاہتا تھا اس کے فرائض اسے
 اجازت نہ دیتے تھے۔ مگر جذبات کی شدت نے اس پر غلبہ حاصل کر
 لیا اور وہ بولا تیری آرزو میں موت کی مسکراہٹ اور تیرے جذبات
 میں زندگی کی جھلک نمایاں ہے۔ آہم بادشاہ کے حضور میں چلتے
 ہیں۔ میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں موت میرا انتظار کر رہی ہے۔ آ
 اے جذبات کی دنیا میں پہنچنے والی۔ آ ایوان شاہی کو یہ راستہ جاتا
 ہے۔

سردار سینے پر ہاتھ رکھے بادشاہ کے حضور کھڑا تھا۔ وہ زمین تک
 جھک گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کی زبان پر مہر لگ گئی۔
 بادشاہ نے سردار کی طرف بادشاہوں کی سی خشنماں نگاہ سے دیکھا
 پھر اس کے ساتھی پر نگاہیں گاڑ دیں۔ عورت سینے پر ہاتھ رکھے
 زمین تک جھک گئی۔ ”آداب محفل“ ”شاہی احترام“ وہ سب کچھ
 جانتی تھی۔ اس نے کہا۔ اے بادشاہ یہ بازو ابھی تک تیرے بچپن
 کی مسرتوں سے سرشار اور تیری محبت سے لرزاں ہیں۔ اے بلبلو
 کی قسمت کے مالک میں نے کئی برس اس چھت کے نیچے گزارے
 ہیں۔ یہاں کا ذرہ ذرہ میری آواز سے آشنا ہے۔ اے بادشاہ
 تو نہیں جانتا ان ایوانوں میں کیا کچھ ہو چکا ہے اور کیسے کیسے بالکل
 صناعوں نے اہل نظر سے اپنے کمال کی داد حاصل کی ہے۔ یہ
 جگہ بادشاہوں کی جگہ ہے ہاں زندگی اپنے مہراج پہچانتی ہے اور
 نکتہ چین نگاہیں حق کا اظہار کرنے میں ذرا بھی نہیں جھکتیں میں نے
 بھی ان لازوال مسرتوں میں اپنی زندگی کے بہت سے دن گزارے
 ہیں۔ اے بادشاہ تو دیکھتا ہے میری آواز تیرے محل کے کونے کونے
 میں سما گئی ہے۔ تیرے محل کے گنبدوں اور محرابوں نے میری آواز
 کو دل کے اندر جذب کر لیا ہے۔ اے بادشاہ تو بھی تو کھویا سا گیا
 ہے۔ بوڑھے سردار نے اطمینان کا ایک سانس لیا۔ اس کی جراثیم
 نے کروٹ لی۔ وہ عجز سے جھک گیا اور اس نے پہلے کی طرح پھر ایک
 بار عورت کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کے لبوں پر کسی شمع کے

جذبات کی جھلک نمایاں نہ تھی۔ نووار و عورت نے دنیا بدل دی تھی بادشاہ کی آنکھوں کے سامنے بادشاہت کا نیا باب کھل گیا۔ اس کی گردن جھک گئی۔ اسے ماضی اور مستقبل دونوں کے درمیان جہاں مجاہدوں کے قدم آچکے تھے یا آنے والے تھے ایک مضبوط دیوار حائل نظر آئی۔ طرح طرح کے خیالوں نے اسے بھنجھڑا کر عورت نے سلسلہ کلام جاری رکھا اور کہا میں دربار کی مطربہ ہوں میں مغنیہ ہوں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ میں ابن حسام کے وارثوں میں بیٹھی اپنا ربط ذانوں پر رکھے نغموں کا توجہ المامی روشنیوں کی طرح مشرق و مغرب کی بیداری کے لئے بچھا کر رہی ہوں۔

مدم دم روشنیاں جو صحن کے اندر باہر جالاکے ہوئے تھیں دیکھتے دیکھتے دھندلی پڑ گئیں۔ تھکا ہارا بادشاہ بدن ڈھیلا چھوٹے جیسے کوئی سستار ہا ہو عورت کا چہرہ تک رہا تھا۔ لذتوں کی اٹھتا پیدا کرنے والی ہر شے قرینے سے جنی ہوئی تھی۔ مینائیں نافوسوں کے نیچے رنگین لباس پہنے خواصوں کی طرح گویا سہمی ہوئی کھڑی تھیں بادشاہ کی شکل و صورت نے مطربہ کے ذہن پر کوئی ایسی کیفیت پیدا نہ کی جس سے وہ اپنی پہلی آزادی کھو بیٹھتی۔ کرب کی وہ کیفیت جس سے انسان جنون کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے مغنیہ اسی کیفیت میں کھڑی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس میں ابھی تک سحر کی طاقت موجود ہے۔ اور جس طرح پہلے بڑی بڑی شخصیتوں کو اس نے وقت کی بساط پر مات دی تھی اب بھی دے سکتی ہے۔

عورت کے پیش نظر صرف ایک پیغام تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ پیغام کی ایک تصویر بن جائے۔ تاکہ بادشاہ رنگوں اور خطوں کی خوبصورتی میں امتیاز پیدا کر سکے۔ وہ ایک لمحہ چپ رہی اور دھیمی آواز میں بولی۔ اہل کمال کو شاہوں کے قرب کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بیتاب سی تھی۔ شاید وہ کہنا چاہتی تھی کہ شہریار بھی اہل کمال کے محتاج ہیں۔ اس کی آنکھیں گزری ہوئی یادوں سے محو رہیں۔ بادشاہ بہت بنا بیٹھا تھا۔ گویا اس میں احساسِ کائنات

تک نہ تھا۔ اس میں اس بات کے اظہار کی بھی طاقت نہ تھی کہ یہ وقت اس کے آرام کا وقت تھا۔ مطربہ نے کسی بہت بڑے جذبہ کی یاد میں اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹپک دئے اور آنکھیں بادشاہ پر جمادیں۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتی ہے اگر وہ کہ سکی تو اس کا مقصد اسے حاصل ہو جائیگا۔ وہ بولی اے بادشاہ بخشش کا اظہار شخصیتوں پر ہے۔ حکومتوں کی دولت مزدور کا سرمایہ ہے وہ اسی سے دنیا کی ہر مادی شے پر قادر ہیں۔ تو خوش ہو کہ دنیا تیری ضیاء سے روشن ہے وہ تیرے خوش ہونے سے خوش ہے لیکن اے بادشاہ کسی کو شریکِ غم نہ بنا کیونکہ غم اور فکر نعمت ہیں جو انسان کو پختہ تر بناتے ہیں۔ میں ایک مطربہ ہوں۔ میں نے سوز و ساز کی تصویریں کھینچی ہیں۔ میں نے ان میں رنگ بھرے ہیں اور جب چاہا اور جس طرح چاہا ان کو بدل دیا ہے۔ میں نے دنیا کو ایک سرمدی سرور بخشا تھا میں مطمئن ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا بڑی دیانتداری سے کیا۔ اے بادشاہ میں ایک بہت بڑی طاقت ہوں۔ میں نے بڑے بڑے حکمرانوں اور بالکالوں کو ان آنکھوں کے سامنے اور کا اور ہوتے دیکھا ہے۔ ایک آرزو جو محبت کی صورت اختیار کر لیتی ہے کسی کی محکوم نہیں یہاں تک کہ جس کے اندر وہ پیدا ہوتی ہے اس پر بھی حکومت کرنے لگتی ہے۔ اے بادشاہ تو جانتا ہے محبت نے جنت کا راز بھی افشا کر دیا تھا۔ محبت کا حسین ترین لباس آنسو ہیں اور آنسو عورت کا شیوہ۔ تو یقین جان کہ عورت ہی محبت کرنا جانتی ہے۔ اے بادشاہ میں نے بھی محبت کی ہے۔ اور اپنے آپ کو کسی طاقت کے سامنے لڑنے اور بے دست و پا ہوتے دیکھا ہے۔ ”ضحا“ ملک کا بہترین سپاہی بلعصورا کی محفلوں کی رونق یہاں کا ذرہ ذرہ اس کی محبت کا دم بھرتا ہے۔ میری حیات و مہمات اس کی خوشنودی پر موقوف تھی۔ بلعصورا کی تہذیب نے جب دنیا بھر کو اپنے اثر میں لے لیا اور اس کے اخلاق اور ثروت نے دلوں پر تسلط حاصل کر لیا تو

زندگی کا انحصار تھا۔ مجھے تو صرف یہی کہنا ہے کہ میں مطرب ہوں اور آ بادشاہ تو بادشاہ ہے۔ موسیقی میری آنکھوں سے آنسوؤں کی صورت میں ظاہر نہ ہوگی۔ مجھ میں اب کچھ باقی نہیں۔ میرے نفسے میرے ساتھ نہیں۔ لیکن یاد رکھ میں بعلصورا کی سٹی سے بنائی گئی ہوں اگر جذبات کا اظہار انسان کی تصویر ہے تو وہ تصویر میں ہوں۔ کاش میری زبان کچھ کہ سکے اور میں کہوں کہ صفا ایک بہت بڑا مجاہد تھا اس نے اپنی بہادری سے ملک کے دشمنوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ خانوگی اس کی عادت تھی لیکن اس کے عمل اس کی طاقت تھے۔ جب اس نے دیکھا کہ بڑھا بادشاہ رحمتوں کا سرچشمہ دشمنوں کی یورش محسوس کرتا ہے تو اس کی رگوں میں جوش عقیدت اور ملک کی محبت بیدار ہوئی۔ اس نے اپنے آپ کو پیش کیا اور بادشاہ سے کہا اے بعلصورا کی قسمت کے مالک اس جنگ میں دشمن ذلیل ہو گئے اور پھر ان کی نسلوں میں سے کوئی اس طرف آنے کا نام بھی نہ لیگا۔ میں اور ملک کے سارے نوجوان تیرے قدموں پر نثار ہیں۔ بڑھے بادشاہ کا دل بھر آیا اس نے ان کی سلامتی کی دعا کی اور ان کی خدمات اور عقیدت کا اعتراف کیا اور کہا اے میرے بچو میں نغان کا وارث ہوں میں بادشاہت کے فرائض کو پہچانتا ہوں۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ تم سپاہی ہو میں بھی ایک سپاہی ہوں۔ بادشاہ کا دل جوانی کی سمی امنگوں سے سرشار وراثت کی ذمہ داریوں کی طرف کشا کشاں جا رہا تھا۔ اس نے نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہا میرے بالوں کی سفیدی میرے اندرونی جذبات پر پردہ ڈالنے کی انتہائی کوشش کر رہی ہے مگر میں تمہیں یقین دلانا ہوں کہ بادشاہ کے الفاظ قدرت کا فیصلہ ہوتے ہیں۔ یاد رکھو غالب اور فاتح قوموں کے ساتھ ہمیشہ نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مغلوب اور مفتوح قوموں کا شیوہ ہے کہ وہ زندہ قوموں کی برکات اور احسانوں کو اپنے کمزور اور دریدہ دامنوں سے چھپانے کی کوشش کریں۔ تہذیبوں اور قوموں کو بنانے کے لئے محض دفاعی نشو و نما ضروری نہیں یہاں بسا اوقات

بادشاہ ایک جفاکش سپاہی کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اپنے سپاہیوں کے ساتھ جنگ پر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ بادشاہ نے کہا ہم کو زندگی کے ان مراحل سے گزرنا ہے اور ان حوادث کا مقابلہ کرنا ہے جو ملک کو پہلے پیش نہ آئے تھے۔ پھر اس نے مجھ سے ایک گانا گانے کی فرمائش کی۔ میں نے ابوسعید کی ایک نظم پڑھی۔ مجھے یاد ہے میں نے نظم کا ایک ایک شعر کئی کئی بار دہرایا تھا۔ خصوصیت سے یہ الفاظ کہ ”جاؤ۔ سدھارو۔ فتوحات تمہارا انتظار کر رہی ہیں“۔ یہاں تک کہ برہم میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا یقیناً جاؤ اے بادشاہ تمام بعلصور ایک زبان ہو کر کہ رہا تھا۔ ”جاؤ سدھارو۔ فتوحات تمہارا انتظار کر رہی ہیں“

بادشاہ نے کہا میری تلوار لاؤ جو آج حق کی حمایت کے لئے کمر میں آویزاں کی جائیگی جس کو امانت کے طور پر میرے آباؤ اجداد نے مجھے سونپا تھا۔ بادشاہ کا چہرہ نور کی طرح روشن تھا اس نے کہا میں اپنا تاج اس وقت تک نہ پہنوں گا جب تک وہ بالکل محفوظ نہ ہو جائے اس کی آنکھوں میں استقلال اور مستقبل کی کھلبلی نمایاں تھی۔ پھر وہ تخت سے نیچے اتر آیا اور کماہی تخت فاتحوں کے لئے ہے۔ اس پر وہ بیٹھ سکتا ہے جو خلیفہ ہو۔ اس کا جسم جذبات کی شدت کی وجہ سے الہام کی نازک ساعتوں کی طرح سکڑ گیا۔ وہ لرز رہا تھا۔ انسانوں کا یہ عالم تھا کہ ہماری پُرتم آنکھوں کے سامنے ایک بحر بیکراں موجیں مار رہا تھا۔ پھر بادشاہ نے سب کو مخاطب کر کے کہا۔ ہم اپنی تلواروں کو حق کی راہ میں استعمال کریں گے ہم اپنے بچوں اور عورتوں کی حفاظت کریں گے۔ ہم قوانین قدرت کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں۔ نعموں کا توجہ اور ساحرانہ نگاہیں ہم پر راجہوں کے درمیان لرز رہی تھیں۔ صوفیہ کے نقش و نگار فالووسوں کی رنگ برنگ کی روشنیوں سے جگمگا رہے تھے ایوان میں جوش کی لہریں بلند ہو رہی تھیں۔ گلاب پاشوں کی جھنکار جل ترنگ کی ہم آہنگی پیدا کر رہی تھی نیچے اور بڑی بوڑھی عورتیں اور حنیناں ہلا ہلا کر اپنے ناموس کی حفاظت

دماغی توازن شکست کا مزاد ہوتا ہے۔ اس نے بہت سی لڑائیوں کا ذکر کیا جن میں وہ ایک سپاہی کی حیثیت سے لڑا تھا۔ اس نے کہا میدان جنگ بادشاہ کا طالب ہے وہ میدان جنگ نہیں جس میں بادشاہ اپنے جان نثاروں کے دوش بدوش نہ لڑے۔ اس نے حارث بن احمہ کا ذکر کیا جس نے اپنی قوم کو جنگ اور دشمنوں پر فتح حاصل کرنے کا سبق دیا تھا اور جس نے جان بوجھ کر اپنے سپاہیوں کو خطرات میں ڈال کر خطرات سے بچنے کا طریقہ سکھا دیا تھا۔ اس نے ابن حسام کا ذکر کیا جس نے اس سلطنت کی بنیاد رکھی تھی اس کے احکام پڑھ کر سنائے۔ اس نے کچھ اس طرح بادشاہوں اور مجاہدوں کے پیغام کی ترجمانی کی کہ دربار میں سب پر ایک سکنت کا عالم طاری تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ تہذیب نے ہمیشہ جہالت پر فتح حاصل کی ہے۔ تم اپنے اصول سے ہرگز ہرگز سرمو بخاؤ نہ کرو۔ کیونکہ انسانوں کی موت کی ہی ایک سیاہ وجہ ہے پھر اس نے صفحا اور اس کے نوجوانوں کو مخاطب کیا اور کہا گو تمہارا بادشاہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ خطرات میں ہے۔ مگر یاد رکھو وہ ابھی زندہ ہے۔ وہ ایک بادشاہ کا وارث بارشا ہے۔ وہ جنگ میں جائیگا اور ان لوگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے جو اس کی زندگی اور دنیا میں خطرہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان سے انتقام لینے کی کوشش کریگا۔ جنہوں نے اس کے بچوں اور ان بچوں کی ماؤں کے خون کو ارزاں کرنے کی ٹھان رکھی ہے تم دیکھو گے کہ جام شہادت ایک بوڑھے انسان کے لئے کس قدر خوشگوار شے ہے۔ جہانگیری و جہانداری زندگی سے نہیں نام سے ہے۔ سند پر بیٹھے ہوئے بوڑھے بادشاہ کو تمہارے پیغام کا انتظار زندہ درگور کر دیگا۔ ہم سب جنگ کو چلیں گے۔ جب میں تم جیسے خاداروں کی گود میں لڑتے لڑتے دم توڑ دوں گا۔ اس وقت میرا چہرہ لافانی نور کی روشنی سے چمک رہا ہو گا۔“

پھر اے بادشاہ اس سند سے جہاں تو بیٹھا ستار ہا ہے ہمارا بوڑھا

کانشان بلند کر رہی تھیں۔ بادشاہ نے کہا ہماری عورتیں سپاہیوں کی عورتیں ہیں۔ سپاہی جنگ پر جائینگے عورتیں ملک کی حفاظت کریں گی۔ پھر ہر مجاہد کمر میں تلوار لگا کر باری باری اپنے بادشاہ کے سامنے سے گزرا اور آخر کار۔ آہ میں کیسے بتاؤں کہ کس طرح بوڑھا بادشاہ ایک سپاہی کی حیثیت سے بے بصورتی وادیوں میں سے گزرا۔ اے بادشاہ اس سے پہلے بے بصورتی نے کبھی اپنے لبوں پر ایسی خاموشی نہ دیکھی تھی۔

ایک احساس ہے جس سے میں ایک شعلہ کی طرح جل رہی ہوں میں بارہ درمی میں گھڑی تھی۔ سیگمات اور شہزادیاں مجھے محبت سے دیکھ رہی تھیں۔ صوفیا عروس نو بنا ہوا تھا۔ بادشاہ نے میری پیشانی پر بوسہ دیا۔ وہ کس قدر ناقابل بیان گھڑی تھی جب وہ ٹپکوا بادشاہ اپنے نوجوانوں کے درمیان بلند حوصلگی اور شوکت شاہی کے ساتھ آہستہ آہستہ وادی سے دور پہاڑوں کے دامنوں میں ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ ملک میں فتح و نصرت کی خبریں پھیل گئیں۔ وقت اپنی یاد کس طرح چھوڑ جاتا ہے۔ ملک کے بچے اور ان کی مائیں اپنے فاتح سپاہیوں کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ اے بادشاہ وہ مجاہد جنہوں نے تیرے دشمنوں کو شکستیں دی تھیں بوڑھے بادشاہ کی سلامتی اور فتح و نصرت کی آوازیں بلند کرتے ہوئے اپنی روانگی کے وقت سے بھی زیادہ شان اور وقار سے واپس آئے۔ ہم نے انہیں اسی راہ سے آتے دیکھا تھا جس راہ سے وہ رخصت ہوئے تھے۔ اے بادشاہ ضحاکا غیر فانی نام سپاہیوں کی واپسی سے پہلے ہی ملک کے بچے بچے کی زبان پر تھا۔ اس وقت کی تصویر نہیں کھینچ سکتی جب ضحاک اپنے بادشاہ کی خوشنودی اور مبارکبادیں حاصل کر کے فتح و فوج کا مہربان کے واپس آیا۔ اگر میں اس وقت کی تصویر کھینچنے کی کوشش کروں تو مجھے ڈر ہے کہ میں خوشی سے مر جاؤنگی اور تو اس پیغام سے محروم رہ جاؤنگا جو

میں تجھے اس اڑے وقت میں پہنچانے کے لئے آئی ہوں۔ ہاں تو جب فتح مند بادشاہ اپنے فاتح سپاہیوں کے ساتھ بے بصورتی کو لٹا تو فتح و نصرت کی مسرتیں صوفیا کے ابو انوں میں ایک نئی زندگی کے ساتھ چل پھر رہی تھیں۔ اس وقت بادشاہ نے اس تلوار کو جسے تیرے آباؤ اجداد نے حق کے استحکام کی خاطر بار بار جنگوں میں استعمال کیا تھا تمام رعیت کے سامنے اپنی کمر سے اتار کر ضحاک کی کمر میں باندھ دیا اور کہا ”یہ تیرے لائق ہے اور تو اس کا اہل ہے“۔ بادشاہ کی طرف سے وہ نایاب تلوار ضحاک کے لئے اس کی شجاعت اور مردانگی کا تحفہ تھا۔

اے بادشاہ ایک راز جو میرے اور ضحاک کے سینے میں برسوں سے پوشیدہ چلا آتا تھا۔ بادشاہ اس راز سے باخبر تھا۔ اس دن اس نے بھری محفل میں ہمارے راز کو فاش کر دیا۔ اور مجھے ایک نعمت غیر مترقبہ کہ کر ضحاک کو دے ڈالا۔ اگرچہ بادشاہ مجھے ایک گھڑی کے لئے بھی اپنے دربار سے جدا نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اے بادشاہ وہ ہماری محبت سے باخبر ہمارے جذبات کے متعلق سب کچھ جانتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ محبت خود سر دولت کی طرح اندھی ہوتی ہے۔ اس کی آنکھیں بستہ سمندروں سے عمیق فقر اور شاہوں کی آنکھوں سے بھی روشن تر ہوتی ہیں۔ اے بادشاہ میں اور ضحاک چار دیواری کو اس صحن کو اس صوفیا کو جس کے اندر میں پھر ایک بار بیٹھی ہوئی نظر آ رہی ہوں ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئے۔ ہم نے اپنے رہنے کے لئے ایک نئی جنت آباد کی تھی۔ اس جنت ارضی میں ہم برسوں بے ہیں۔ اور اس میں ہم نے اپنی زندگی کے بہترین ایام گزارے ہیں۔

اے بادشاہ وہ تلوار میں آج اپنے ساتھ لائی ہوں۔ یہ سرخ لبادہ میں لپی ہوئی وہ تلوار ہے۔ جو مرحوم بادشاہ نے ضحاک کو اپنی بہترین یادگار کے طور پر دی تھی۔ آہ اس کا مالک! اے بادشاہ اس کا مالک ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا ہے۔ اے بادشاہ اب اسے وہ زندگی حاصل ہو گئی ہے جو کبھی ختم نہ ہوگی۔ وہ اس جگہ چلا گیا ہے جہاں سے وہ کبھی

واپس نہ آئیگا۔“

بادشاہ ابن خلدون ابن حسام کے وارث کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی روشنی چمکتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کی نظریں بڑھے سردار کی طرف اٹھ گئیں۔ بڑھے سردار کی آنکھوں میں ایک عنابی آنسو ہچکیاں لے رہا تھا۔ اس نے بڑھاپے کی دانائی اور مسرت کو نمایاں کرتے ہوئے بادشاہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ اے بادشاہ وہ میرا بیٹا تھا۔“

عورت کے آنسو بہ سکھے۔ وہ بالکل بدل گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کی طاقت بیان سلب ہو چکی ہے۔ وہ صرف اتنا کہہ سکی اے بادشاہ سب اوصاف کھوئے جا چکے ہیں۔ تمام امیدیں مٹ چکی ہیں۔ آنکھیں ابھی تک ترستی ہیں۔ اگرچہ قصہ بہت طویل ہے۔ مگر میں اپنے آپ کو اپنے جذبات کے اظہار کے ناقابل پاتی ہوں۔ ہاں یہ ایک امانت ہے۔ تجھے اس کی ضرورت ہے۔ تو ہی اس کا وارث اور مالک ہے۔ یہ لے۔ میں اسے تیرے حوالے کرتی ہوں۔

رحمن خجستانی

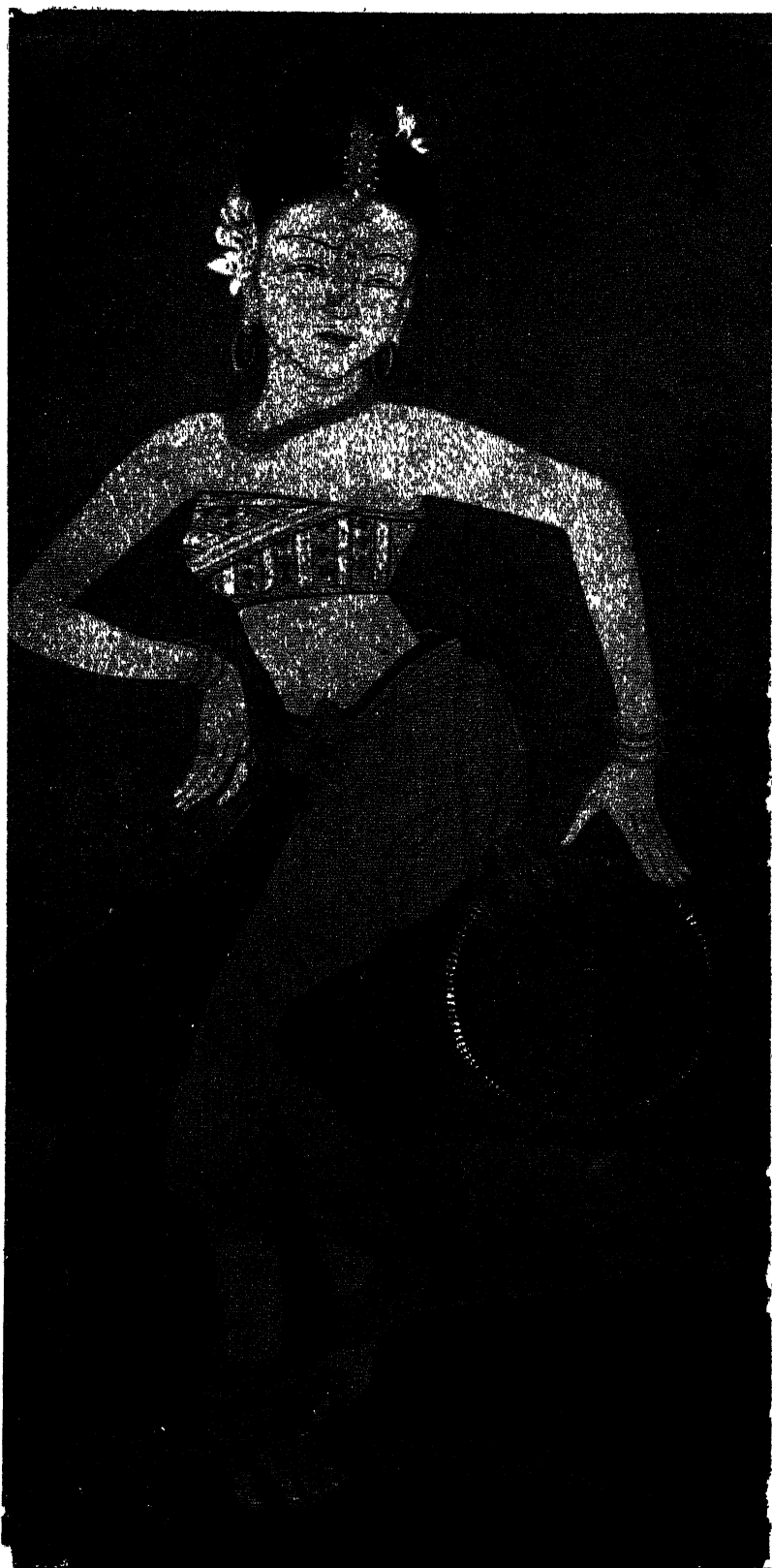
”نگار خانہ چین“

تین دوست

شراب کی صراحی لے کر میں باغ کے ایک الگ تھلک گوشے میں پینے جاتا ہوں۔ ہم ہمیشہ تین بس تین ہی ہوتے ہیں۔ میں۔ میرا سایہ۔ اور میرا دوست روپلی کر نوں والا چاند خوش قسمتی سے چاند کو پینے پلانے کے لطف کا کچھ علم نہیں۔ اور میرا سایہ کبھی تشنہ نہیں ہوا۔ جب میں گاتا ہوں۔ چاند خاموشی سے میرا گیت سنتا ہے۔ جب میں ناچتا ہوں۔ میرا سایہ بھی میرے ساتھ رقص کرتا ہے۔

مخل نشاط کے برخاست ہونے پر دوست کچھ طر جاتے ہیں۔ لیکن ایسا حسرت آگیاں نظارہ میرے دیکھنے میں نہیں آیا۔ جب میں مجھوتا جھامتا گھر لوٹتا ہوں۔ تو چاند میرے ہمراہ چلتا ہے۔ اور میرا سایہ بھی لڑکھڑاتا ہوا میرے پیچھے پیچھے آتا ہے۔

غلام عباس



طیور
چادی: قاصد



اسکر وائلڈ محبوبہ سے درخواست

(نجیام فرنگ کی شراب اردو کے شیشے میں)

مترجم عبدالحمید سالک

نہیں نہیں آ! ہم ایک آگ سے دوسری آگ میں جا پڑیں!
دردِ عاشقی کی اقلیم سے نکلیں اور مہلک تر عشرت کے دیار میں پہنچ
جائیں!
میں ابھی فوجوان ہوں۔ آرزو کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تو ابھی خیر
ہے۔ موسمِ گرما کی اس رات کو رانگیاں نہ جانے دے۔ اور وہ فضول
سوالات نہ پوچھ۔ جو پرانے زمانے میں لوگ پیغمبروں اور کاہنوں سے
پوچھا کرتے تھے۔ اور جن کا کوئی جواب نہ ملتا تھا!

کیونکہ اے میری جان! محسوس کرنا جاننے سے بہتر ہے۔ اور دانش
ایک لاوارث ترکہ ہے!
بنفِ آرزو کی ایک حرکت — شعلہٴ شباب کی پہلی لپک واناؤں
کی تمام جمع کی ہوئی کماؤتوں سے بھی زیادہ بیش بہا ہے۔
اپنی روح کو مردہ فلسفے سے گرا نبار نہ کر۔ جب تک ہمارے پاس چومنے
کے لئے لبِ محبت کرنے کے لئے دل اور دیکھنے کے لئے آنکھیں
موجود ہیں!

اے میری پیاری۔ کیا تو نہیں سنتی۔ کہ بلبلیوں نے زمزمہ پیرا ہے جس طرح

کسی نقرئی مرتبان سے پانی اچھل اچھل کر بہ رہا ہو۔ بلبل کا نغمہ نہایت
دھیما ہے !

چاند آسمان پر بیٹھا ہوا اپنی دوری اور بلندی پر زہر کھا رہا ہے۔ وہ
عندلیب کا عشق افزو نغمہ نہیں سن سکتا۔ اور پیچ و تاب کے عالم میں
گہرے کے نقاب کے اندر منہ چھپا رہا ہے !

یہ سوسن کے پھول جن کی کٹوریوں میں شہد کی سنہری مکھیاں خواب دیکھ
رہی ہیں !
تیز ہوا بلوط کے شگوفوں کو بکھیر کر ان کی پتیوں کو برف کی طح گرا رہی
ہے۔

پانی میں نوجوانی کے اعضا کا عکس نظر افروزی کر رہا ہے۔ کیا یہ منظر
تیرے لئے کافی نہیں ہیں۔ کیا تو کچھ ان سے بھی زیادہ چاہتی ہے ؟
افسوس ! اس سے زیادہ تو ہمارے خدا بھی تجھے اپنے جاودانی خزانوں
سے کچھ عطا نہیں کر سکتے

کیونکہ ہمارے بلند مرتبت خدا اب ہمارے مسلسل اور پیہم گناہوں سے
تھک چکے ہیں۔ ہم تکلیفوں۔ دعاؤں اور دینی پیشواؤں کی مدد سے
جوانی کے رائیگاں ایام کا کفارہ ادا کرنے کی بے سود کوشش کرتے
ہیں۔ ہمارے خدا ہماری ان کوششوں سے بھی بیزار ہو چکے ہیں !
اب وہ نیکی اور بدی کی طرف بالکل التفات نہیں کرتے۔ اور جب چاہتے
ہیں۔ انصاف پسند اور بے انصاف دونوں پر اپنی بارانِ رحمت برسا
دیتے ہیں۔

اب ہمارے خدا چین سے بیٹھے ہیں۔ وہ اپنی معطر شراب میں گلاب
کی پتیاں بکھیرے آرام کر رہے ہیں۔ وہ لہلہاتے ہوئے درختوں
کے نیچے محو خواب ہیں۔ جہاں گلاب اور زرد کنول ایک دوسرے
سے بغلیںز ہو رہے ہیں۔

ہمارے خدا ان مسرت آمیز ایام کا ماتم کر رہے ہیں۔ جب وہ نہیں جانتے تھے کہ انسان کا دل کیسی کیسی برائیوں کے خواب دیکھ سکتا ہے!

اے ہم گنگاری کے احساس سے تھک چکے ہیں ہم عشرت کے یاس آفرین انجام سے تھک چکے ہیں۔ ہم ہر اس عبادت گاہ سے بیزار ہو چکے ہیں جو ہم نے بنائی ہم ان دعاؤں سے تھک چکے ہیں۔ جو جائز تھیں۔ لیکن ان کا کوئی جواب نہ ملا۔

کیونکہ انسان کمزور ہے! خدا سوراہا ہے! اور آسمان دور ہے! اب کیا مطلوب ہے؟ ایک لمحہ آتش رنگ! ایک عظیم الشان عشق! اور بس۔ پھر موت اور صرف موت!

یہ گرم اور تابناک شعلہ جس سے ہمارے جسم جل رہے ہیں۔ کسی نہ کسی مرغزار کو زنگس کے پھولوں سے لالہ زار بنا دیگا۔ اور ہاں تیری تقریٰ چھاتیاں کنول کے پھول بن جائیں گی۔ جن کھیتوں میں کسان کا شت کر رہے ہیں۔ وہ ہماری آج رات کی مہبت کے باعث زیادہ سیر حاصل اور زرخیز ہو جائیں گے۔ فطرت کے کارخانے میں کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ بلکہ ہر شے موت کے علی الرغم زندہ رہتی ہے!

نوجوان کا پہلا بوسہ! سنبل کی پہلی کوئیل! انسان کی آخری آرزو! اور وہ آخری سرج "بیزہ" جو سوسن کے پھول سے نکلتا ہے۔ فسترن کا پھول جو اپنے غنچوں کو محض اس خوف سے کھلنے نہیں دیتا۔ کہ وہ حد سے زیادہ حسین ہونگے۔ اور عاشقہ کی نگاہوں کے سامنے دولہا کا شرم و حجاب

یہ سب ایک ہی مقدس بندھن میں گرفتار ہیں۔ تمنائیں صرف ہم ہی کو نہیں دی گئیں۔ بلکہ ساری دھرتی انہیں سے معمور ہے۔ وہ زرد پھول جو نور کے ترانے کے گوش سرور میں جھومنا ہے اسی حقیقی مسرت سے سرشار ہوتا ہے۔ جو ہمیں اُس وقت نصیب ہوتی ہے۔ جب ہم کسی نظر فریب گلزار میں چشموں کی روانی سے محو ہو جاتے ہیں۔ اور ہمیں زندگی حسین تر نظر آنے لگتی ہے۔

پس جب لوگ ہمیں بید مجنوں کے نیچے دفن کر دیں گے۔ تو میری جان! تیرے سرخی آلود ہونٹ گلاب کا پھول بن جائیں گے۔ تیری لہوا لکھیں گل نافرمان بن جائیں گے۔ جن پر شبنم کے قطرے بھلک رہے ہوں گے۔ اور جب سفید نرگس شوخی سے اپنی ہجولی نسیم کے بوسے لے گی۔ تو ہماری خاک کے ذروں میں پھر محبت کی لسنسی پیدا ہوگی۔ اور ہم پھر ساجن اور موہنی بن جائیں گے۔

اور پھر اس طح زندگی کے کرب آفرین احساس درد سے آزاد رہ کر ہم کسی پیارے پھول کے اندر آفتاب کی تمازت کو محسوس کریں گے۔ خوش گلو قری کی آواز میں پھر گائیں گے۔ پھر دو چنگبرے سانپوں کی طح اپنی قبروں پر لہراتے پھرین گے۔ یا دو چیتوں کی طح اس گرم جنگل میں سے رینگتے ہوئے گزریں گے۔ جس میں زرد آنکھوں والے ہولناک شیر برسوا ہے ہونگے۔

اور پھر ان میں اور ہم میں جنگ ہوگی! آہ! میرا دل موت کے بعد اس شاندار زندگی کے تصور سے جو درندوں۔ پرندوں اور پھولوں میں بسر کی جائیگی۔ کس قدر اچھل رہا ہے اور جب یہ پیانہ شراب سے اس قدر لبریز ہو جائیگا۔ کہ سانس لینے کے لئے پھٹ پڑیگا۔ اور فصل خزاں کے کسی دن زرد پتوں کے درمیان توج جو اس دھرتی کی پہلی فاتح تھی اس کا آخری شکار بن جائیگی۔

ہاں ! اگر ہم دونوں کے درمیان محبت نہ ہوئی ہوتی۔ تو کون جانتا ہے۔
 کہ سو بج کھی کا پھول بھونرے کو مسو کر کے اپنے سنہری شکم میں چھپا لیتا۔ یا
 گلاب کا کوئی پھول اپنے چھوٹے سے پونے میں آتشیں چراغ آویزاں کر سکتا
 میرا تو یہ خیال ہے۔ کہ اگر عشاق کے بوسہ دینے والے لب اور شاعروں
 کے گانے والے ہونٹ نہ ہوتے۔ تو فصل بہار میں کسی درخت پر کوئی
 کونسل تک نہ پھوٹی۔

اگر ہم فطرت کی دولت کے وارث ہیں اور ہمارے دل نبض حیات کی ہر حرکت
 کے ساتھ دھڑک رہے ہیں۔ تو کیا اس سے ہمارے طلائی آفتاب کا نور مضم
 ہو جائے گا؟ یا یہ پُر اسرار زمین کچھ پہلے سے کم خوبصورت ہو جائیگی۔
 نہیں ! بلکہ آسمان پر سے نئے آفتاب گزریں گے۔ پھول کوئی شان و
 شوکت دی جائیگی اور سبزہ نئی آن بان سے لہرائیگا۔

اور ہم دونوں عاشق و معشوق دور بیٹھ کر فطرت پر نکتہ چینی نہیں کریں گے بلکہ
 مسرور و سرشار سمندر ہماری پوشاک بنے گا۔ اور دمدار تارے ہماری مضمی
 کے مطابق ناولک افگنی کیا کریں گے اور پھر ہم اس عظیم اشان آفاق کا ایک
 جزو بن جائیں گے۔ اور ہزار ہا صدیوں تک "روح کائنات" سے ہمارا اختلاط
 رہیگا۔

ہم اُس عالمگیر راگ کی تانیں بن جائیں گے۔ جس کے زیر و بم نے اجرام
 آسمانی کے سرود و رفتار پر احاطہ کر رکھا ہے۔ اور ساری دنیائے حیات
 کے دل کی دھڑکن ہمارے دلوں کی حرکت سے ہم آہنگ ہو جائیگی۔
 وہاں گزرتے ہوئے سالوں اور مہینوں کی دہشت انگیزی بے نشان
 ہو چکی ہوگی۔ ہم موت کی دستبرد سے آزاد ہونگے۔ اور یہ کائنات خود
 ہی ہماری جاودانی حیات بن جائیگی۔

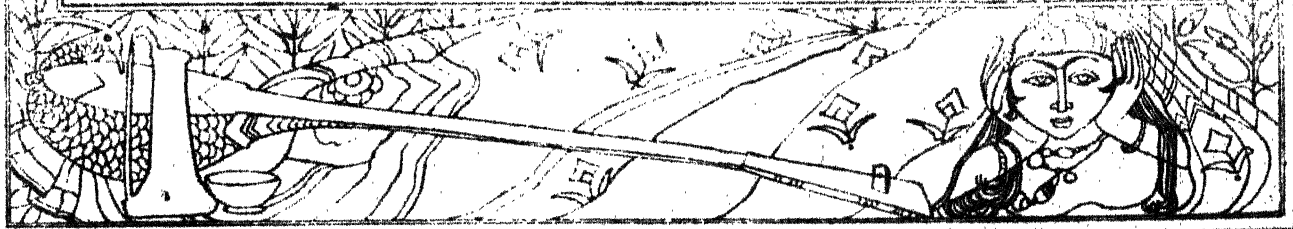
عبد المجید سالک

تاثیر عورت کی محبت

تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میسے لئے
مجھ سے الفت تو نہ کر میرے تنہم کے لئے
چار دن کی چاندنی ہے یہ جوانی کچھ نہیں
یہ مرا جو بن تو رفتہ رفتہ ڈھلتا جائے گا
وقف کر دے اپنا دل اپنا جگر میرے لئے
لرزش لب کے لئے طرز تکلم کے لئے
کچھ نہیں ہے کچھ نہیں ہے حسن فانی کچھ نہیں
تیرا دل بھی ساتھ ساتھ اس کے بدلتا جائیگا
تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میسے لئے

وقف کر دے اپنا دل اپنا جگر میرے لئے
مجھ سے الفت غمگساری کے لئے بھی تو نہ کر
آنسوؤں کو میسے رخساروں پر ڈھلتا تو نہ دیکھ
برگ گل پر قطرہ شبنم رہے گا کب تک
خشک ہو جائیگا میرا دیدہ پر آب جب
جب تری الفت کا سرچشمہ فنا ہو جائے گا
در دمندی سو گزاری کے لئے بھی تو نہ کر
سوزش غم سے مے سینے کو جلتا تو نہ دیکھ
آکے پہلو میں تھلے غم رہیگا کب تک
پُر سکوں ہو جائیگا میرا دل بیتاب جب
آنسوؤں کی طرح تو بھی بے وفا ہو جائے گا
تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میسے لئے
وقف کر دے اپنا دل اپنا جگر میرے لئے

محمد دین تاثیر



کلام پیش

تمہارا منتظر ہوں موت کا پیغام آنے تک
 بہارِ گل ہوئے آشتیاں نغماتِ آزادی
 جمودِ گم شدہ کی جستجو اچھی نہیں سدم!
 نہ دی اشکوں نے مشیخاک کو پرواز کی رخصت
 کریں گے نرگس مجھ کو ساتی سے اٹارے بھی!
 تمہاری خود نمائی اللہ اللہ اک تماشا ہے
 جھائیں ان کا شیوہ میں وفاؤں کا ہوں میں غم گرا
 بدل جائیگی کیفیت جو وضعِ زندگی بدلی!
 لبِ خاموش کا اپنے تحیر ہم بھی دیکھینگے!
 کہاں ملتی ہے فرصت شکوہ لبریز کی ساتی!
 تری محفل سے آواز صلائے عالم آنے تک

پیش رہنے دے مجھ کو بے نیازِ سجدِ طاعت

جبیں میں میری نورِ فطرتِ اسلام آنے تک

شیخ عبد اللطیف پیش

وحشت کلمتوی

غزل

دل جگر جب تنگ آکر نالہ وزاری کریں عشق میں ہم کیسے پھر دعوائے خود داری کریں
کیوں نصیب دشمنانِ دل اپنا وہ بھاری کریں دوستوں پر شوق سے مشقِ جفا کاری کریں
دیر سے ہوں منتظر مشقِ نگاہِ یار کا تاب کے اندوہ و غمِ دل پر گرا نباری کریں
وضع پر رہتا ہے قائم کون دیکھا چاہئے تم جفا کاری کرو اور ہم وفاداری کریں
یہ سمجھ رکھئے نہیں ہوگی دل آزاری می آپ چاہیں جس قدر میری دل آزاری کریں
کیا یہ ممکن ہے کہ غمخواری سے غم کا علاج کہ دو اباجا بسے میری نہ غمخواری کریں
جو طریقہ آپ کا ہو گا وہ ہو گا دل نواز آپ ولداری کریں یا خاطر آزاری کریں

وحشت اس محفل میں کیا انصاف اپنا ہو جہاں

سب انہیں کی سی کہیں اُن کی طرف داری کریں

خان بہادر رضا علی وحشت

منتخب اشعار

(۱) سر عبدالقادر

(۲) خلیفہ عبدالحکیم

(۳) عبدالمجید سالک

(۴) غلام رسول محسن

(۵) سید سلیمان ندوی

منتخب اشعار کا یہ مجموعہ یقیناً قارئین کا روان کی دلچسپی کا موجب ہو گا۔ لیکن یہ امر واضح کرنا ضروری ہے کہ یہ منتخب اشعار اردو زبان کے بہترین اشعار کے طور پر پیش نہیں کئے جا رہے۔ یہ وہ ”اچھے“ اشعار ہیں جو ان حضرات کو بہت پسند ہیں اور جو عام طور پر ان کی زبان پر رہتے ہیں یا بغیر کسی خاص کاوش کے ان کے ذہن میں آگئے ہیں۔ اسی سلسلے میں سخنائے گفتنی بھی ملاحظہ فرمائیے

سر عبد القادر پانچ پسندیدہ شعر

میرے دوست مجید ملک صاحب کی فرمائش ہے کہ رسالہ کاروان میں اشاعت کے لئے اردو کے صرف پانچ شعر لکھ بیجوں۔ جو مجھے بہت پسند ہوں۔ اساتذہ اردو کے کلام میں دلچسپ اشعار کی تعداد میٹھا رہے۔ اور ان میں سے صرف پانچ شعر پیش کرنا بہت مشکل کام ہے۔ سوائے اس کے کیا کر سکتا ہوں۔ کہ اچھے اشعار میں سے جو پہلے یاد آجائیں۔ پیش کر دوں۔

سب سے پہلے تبرکاً میر کا ایک شعر لکھتا ہوں۔ کیونکہ وہ مسلہ طور پر غزل اردو کے استاد مانے جاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں سہ

پھر نہ دیکھا کچھ بجز یک شعلہ پر بیچ و تاب شمع تک تو ہم نے بھی دیکھا کہ پڑا نہ گیا

شمع اور پروانے کے مضمون پر بہت لوگوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ مگر ایسا نازک اور واقعیت سے بھرا ہوا خیال پیدا نہیں ہو سکا۔ پروانے کے جل کر فنا ہونے کی تصویر اس سے بہتر کیا کھینچی جاسکتی ہے۔ کہ وہ خود شعلہ پر بیچ و تاب بن جائے۔ اور سوائے اس کے کچھ نظر نہ آئے۔ کہ پروانہ ابھی تھا اور ابھی گم ہو گیا۔ میں نے جب یہ شعر پہلی مرتبہ پڑھا تو مجھ پر اس کا بہت اثر ہوا۔ میں نے اپنے دوست مرزا اعجاز حسین مرحوم کو سنایا۔ وہ خود شاعر تھے اور اعلیٰ درجے کے سخن فہم۔ دیر تک اسے دہراتے رہے۔ اور وجد کرتے رہے۔

اردو شاعری کے عروج کا دوسرا دور وہ ہے جس میں غالب اور مومن اور ذوق دہلی میں اور ناسخ اور آتش لکھنؤ میں مصروف غزل گوئی تھے۔ اب ان میں سے کس کے کلام کو بطور نمونہ پیش کیا جائے۔ ایک کا رنگ ایک سے الگ اور سب اپنی اپنی جگہ لاجواب۔ چونکہ آج کل غالب کی طرف زیادہ ترمیلان طابع ہے۔ اس لئے غالب کا شعر ہدیہ ناظرین ہے سہ

آتنا ہے داغ حسرتِ دل کا شمار یاد مجھ سے مے گنہ کا حساب کھذا نہ مانا

دیکھئے کیسے پر لطف پیرائے میں حساب گنہ سے چھٹکارا پانے کی راہ نکالی ہے۔ اور قلب انسانی کی اندرونی کیفیات کی کیا خوب تر جانی کی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جہاں میں اپنی آرزوؤں کو پورا کرنے کے لئے کسی حکم کی خلاف ورزی کر کے کسی گناہ کا مرتکب ہوا ہوں۔ وہاں اس سے زیادہ آرزوئیں ہیں جو پوری نہیں ہوئیں اور ان کی حسرت ہی رہ گئی ہے۔ اور جب مجھ سے گناہوں کا حساب لیا جائے تو مجھے اپنی حسرتیں یاد آتی ہیں اور اگر یہ ملحوظ ہے کہ میں نے کہاں کہاں اپنے جذبات کو روکا ہے تو بھلے باز پرس کے میری حالت قابل رحم سمجھی جائیگی۔

غالب کے زمانے کے بعد جن شعر اکو فروغ حاصل ہوا۔ ان میں داغ دہلوی اور آسیر مینائی نے سب سے زیادہ شہرت پائی ہے۔ اور اصلاحی اور جدید رنگ میں مولانا حالی اور اکبر الہ آبادی درجہ اول کے سخنور ہوئے ہیں۔ سب کے کلام کے نمونے تو درج نہیں ہو سکتے۔ اس دور کے شعرا میں سے جسے ختم ہوئے ابھی تھوڑا عرصہ گزرا ہے۔ ایک شعر داغ کا اور ایک شعر اکبر کا یہاں درج کرتا ہوں۔ داغ کی ایک مشہور غزل کا یہ مطلع

مجھے بچہ پسند ہے سہ

بھوین تفتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں کسی سے آج گڑی ہے کہ وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں
زبان کی خوبی الفاظ کی بندش اور محاورہ کی چستی ملاحظہ ہو۔ الفاظ میں تصویر کھینچنا اسی کو کہتے ہیں۔ مصور اگر ان لفظوں کو تصویر میں منتقل کرنا چاہے تو
پورے نقش موجود ہیں۔ صرف رنگ بھرنے کی ضرورت ہے۔ امیر مینائی مرحوم نے خود اس زمین میں غزل لکھی اور اس کے مقطع میں بے اختصار داد
دینے پر مجبور ہو گئے۔ فرماتے ہیں سہ

آمیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے بھوین تفتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

جدید رنگ میں اکبر کا کلام بہت نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے بہت سے شعر اکثر پڑھتا ہوں اور ہر دفعہ ان کے پڑھنے سے نیا لطف حاصل
ہوتا ہے۔ یہ شعر جو نیچے درج ہے خاص طور پر دلچسپ ہے۔ اس میں ایک بڑی حقیقت کا اظہار ہے اور ان قوموں کے لئے جو اوج بلندی سے ہستی
کی طرف جا چکی ہوں یہ شعر ایک حوصلہ افزا پیام امید ہے۔ حضرت اکبر لکھتے ہیں سہ
اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے

یہ سب ادیبان بلند پایہ جن کے نام اوپر درج کئے گئے ہیں۔ ملک شاعری پر حکمرانی کے بعد اس دنیا سے رحلت کر گئے ہیں۔ جو قابلِ قدر
سخن و خداد کے فضل سے اب تک ہمارے ملک میں موجود ہیں۔ ان میں حضرت اقبال (ڈاکٹر سر محمد اقبال بالقبیلہ) کا کلام مقبول خاص و عام
ہے۔ ان کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔ جو غالباً ان کے اردو کلام کے مطبوعہ مجموعہ میں درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ مگر اپنے رنگ میں بے مثل
ہے۔ وہ شعر یہ ہے سہ

شبِ فرقتِ تصور تھا مرا۔ اعجاز تھا کیا تھا تری تصویر کو میں نے بلایا ہے تو بولی ہے

مدت ہوئی یہ غزل لکھی گئی تھی۔ میں اس وقت موجود تھا۔ سیالکوٹ میں ایک تقریب میں ہم لوگ جمع تھے۔ مصرع طح اسی وقت دیا گیا۔ اور جو
شعر اس زمین میں نکلے وہ اسی وقت بعض دوستوں نے نقل کر لئے۔ یہ شعر مجھے بہت ہی دلچسپ معلوم ہوا تھا اور اس وقت سے میرے
حافظے میں محفوظ ہے۔ تصویر سے باتیں تو بہت سے شاعروں نے کی ہیں۔ مگر خود تصویر کے بولنے کا ایسا اچھا ثبوت اور جگہ میری نظر
سے نہیں گزرا۔

عبد القادر

خلیفہ عبدالحکیم

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
 غائب
 ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب ہم نے دشت امکان کو ایک نقش پا پایا
 غائب
 آہستہ سے چل میساں کسار ہر سنگ دکانِ شیشہ گر ہے
 درد
 بے خطر کو پڑا آتشِ فرد میں عشق عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
 اقبال
 بارہا دیکھا ہے اس دارِ مکافات میں تیر اینٹ اٹھانے بھی نہ پائے تھے کہ پتھر آیا
 میر

عبدالمجید سالک

بھائی مجید! آپ نے چند روز سے عجیب گورکھ دھندے میں ڈال رکھا ہے۔ عمر بھر میں ہزاروں اشعار سنے۔ سیکڑوں اچھے معلوم ہوئے۔ بسیوں نے ترپا پایا۔ بعض دماغ میں ایسے جمے۔ کہ ہستی کا جزو بن کر رہ گئے۔ اب آپ نے فرما دیا کہ پانچ ایسے اشعار لکھ دو۔ جو تمہیں بہت زیادہ پسند ہوں۔ پسند ہونے کو تو مجھے کسی زمانے میں یہ شعر بھی بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ کہ
 سالہا سال ہوئے ہیں تیرے پیچھے پھرتے جنوری تو ہے تو لے ماہ دسمبر میں تیں
 جب سمجھ ذرا جوان ہوئی۔ طبیعت میں شباب کی شوخیاں آئیں۔ تو اکبر کے اس قسم کے اشعار پسند آنے لگے
 عاشقی قیدِ شریعت میں جم آجاتی ہے جلوہ کثرتِ اولاد دکھا جاتی ہے
 لیکن اردو میں ایسے اشعار بہت ہی کم نظر آتے۔ جو ہزار دفعہ دہرانے پر بھی باسی معلوم نہ ہوں۔ بہر حال حسب فرمائش پانچ ایسے اشعار لکھتا ہوں۔ خدا جانے ارباب ذوقِ سلیم ان کو پڑھ کر میرے متعلق کیا رائے قائم کریں۔ لیکن اب "پھنسنے پر پھر کنا کیا"۔ جو ہوگا

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے	ٹائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے
عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر	دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچے
سرپا رہن عشق و ناگزیر الفتِ مستی	عبادِ برق کی کوتاہیوں اور افسوسِ حاصل کا
رہبر نے راہِ عشق میں برسوں دئے چکر مجھے	عالم سے جتن چھانکنا اب آگئے منزل کے پاس
تھی وہ اک در ماندہ رہبر کی صدائے دردناک	جس کو آوازِ رحیل کا رواں سمجھا تھا میں

حفیظ جونپوری
غالب
غالب
داغ
اقبال

غلام رسول مہر

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد	مجھ سے مے گناہ کا حسناے خدا نہ مانگ
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کتنے نہ ڈوبدم	گری ہے صبحِ کل بجلی وہ میرا آشیانہ کیوں ہو
فریاد کی کوئی لے نہیں ہے	نالہ پاسند نے نہیں ہے
بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائیگی	یہ جو اک لذت ہماری سی بیجا مل میں ہے
عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر	دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچے

غالب
غالب
غالب
غالب
غالب

سید سلیمان ندوی

اشعار کی پسندیدگی کا یہ حال ہے کہ وہ بھی زبان و مکان کی قید سے آزاد نہیں۔ ایک شعر ایک وقت میں پسند ہوتا ہے، دوسرے وقت میں ڈر جاتا ہے اور دوسرا زبان پر آ جاتا ہے۔ اس لئے شعر کی مطلق اور بے قید پسندیدگی تقریباً محال ہے۔ غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ عمل بھی احوال و مقامات و جذبات کے ماتحت ہوتا ہے۔ آپ کا خط جس وقت آیا۔ اس وقت بلا تامل مزید جو شعر زبان پر آئے وہ حوالہ قلم ہیں:-

سفر ہے شرط۔ مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں
آتش

قید حیات بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے بچا پائے کیوں
غالب

اک ہوک جگر سے اٹھتی ہے اک دوسا دل میں ہوتا، میں چکے چکے لڑتا ہوں جب سارا عالم سوتا ہے
میر

ہوگا کسی دیوار کے سایہ میں پڑا میسر کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو
میر

کیونکر یہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے
لا اعلم

ڈاکٹر جمیز کزنز

چغتائی کا آرٹ

مترجمہ - رشیدہ ذکار اللہ

بعض حضرات کا تیرہ ہوتا ہے کہ جب کسی نو عصر مصور کی تصویر دیکھتے ہیں تو ان دو چار چھپی ہوئی تصاویر کو جو کبھی ان کی نگاہ سے گزری ہوئی ہیں۔ ذہن میں لا کر ایک مبصرانہ اور بیش و کم حقارت آمیز انداز سے فرماتے ہیں۔ ”اس مصور اور اس کی تصویروں پر جاپانی مصوری کا اثر ہے۔“ اہل فہم خوب جانتے ہیں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ بالکل برعکس۔ ”اتامارو“ کی خواتین ہندوستان کی ”شکتی“ کی اولاد ہیں ایسی اولاد جو جاپانی لہجہ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ جاپانی طریقے سے بال سنواری ہے۔ اور جس کے اعضا میں جاپان کا طبعی سبک پن ہوتا ہے۔ اندریں حالات کیا یہ ہندوستانی آرٹسٹوں کا قصور ہے کہ جاپانی مصوری میں اور ان کی مصوری میں مشابہت ہے؟ اگر کسی کی صورت اپنے مورث اعلیٰ کی صورت سے ملے تو یہ مورث اعلیٰ کا قصور کیونکر ہو سکتا ہے؟

اسی قسم کے حضرات جب چغتائی کی تصاویر دیکھتے ہیں تو فرماتے ہیں۔ ”چغتائی ایرانی مصوری سے متاثر ہے“ نادان یہ نہیں سمجھتے کہ یہ کوئی عیب کی بات نہیں۔ اور آخر چغتائی پر ایرانی اثر کیوں نہ ہو۔ چغتائی ایرانی النسل ہے۔ اس کا سلسلہ نسب ان تاریخی مغلوں سے ملتا ہے جنہوں نے ایران کو اپنا مسکن بنایا اور جنہوں نے انجام کار موتی مسجد اور تاج محل جیسی رفیع الشان عمارتیں برپا کیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ چونکہ چغتائی ایرانی النسل ہے اس لئے اس کی مصوری میں ایرانی رنگ کی موجودگی لازمی ہے۔ سولہویں اور سترہویں صدی کے مغل آرٹ کے بعض ماہرین کے ہندو تھے۔ اور آج کل کے بعض ہندوستانی مصور جو غیر ملکی آرٹ کی نقالیاں کرتے ہیں ”کچے“ کچھ بھی نہیں۔ لیکن چغتائی چغتائی کی بات بالکل مختلف ہے ہے۔ اس کے دم سے ایرانی مصوری از سر نو زندہ ہو گئی ہے۔ اس مصوری میں اور اس مصوری میں فرق ہے تو صرف اتنا جو چغتائی کی عظیم شخصیت اور صدیوں کی آمد و شد کی وجہ سے لازمی تھا۔

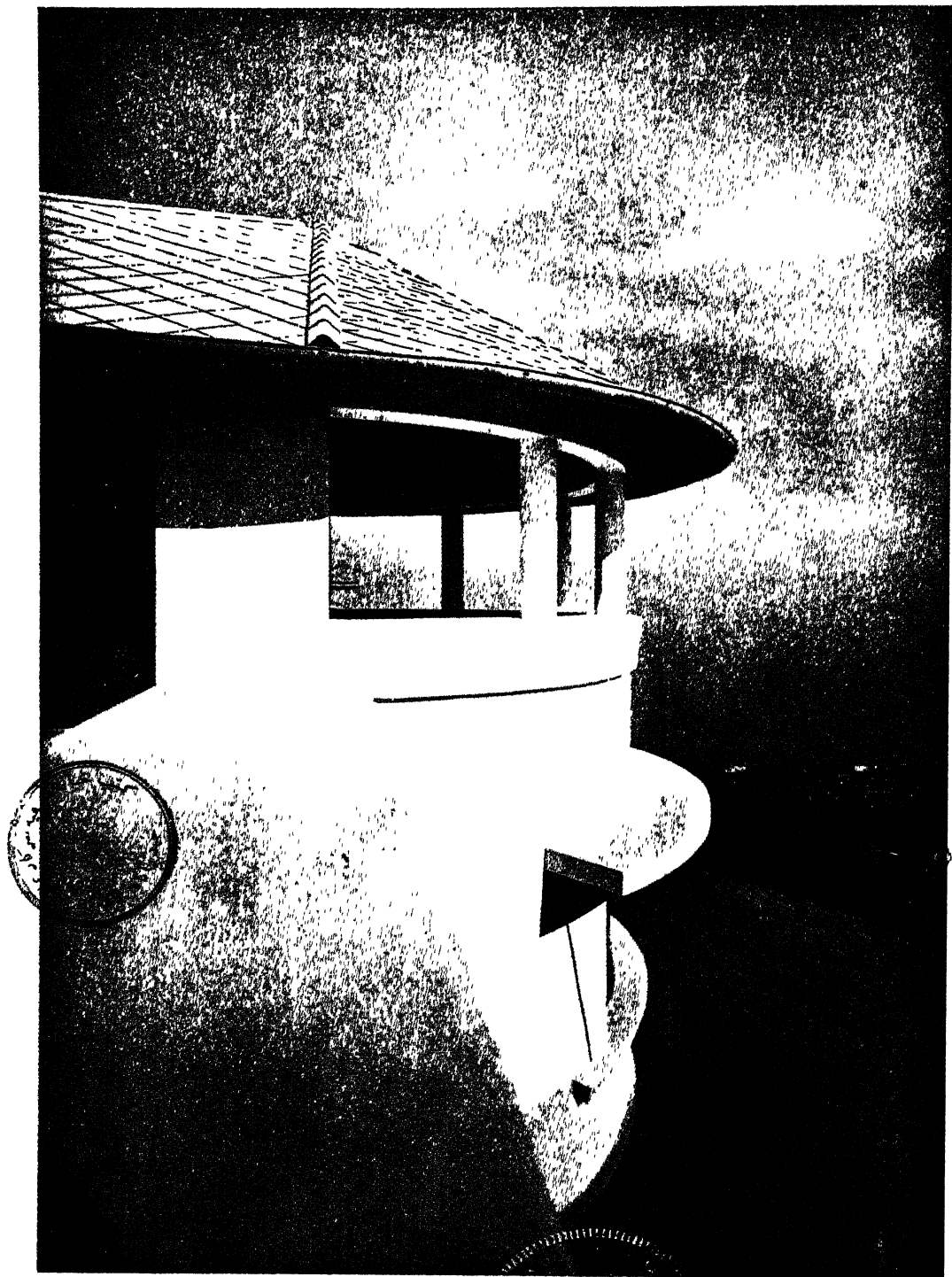
یوں معلوم ہوتا ہے کہ چغتائی کے تصور میں آج بھی اکبر کے پر شکوہ زمانے کا ہندوستان بستا ہے۔ جہاں تک آرٹ کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں چغتائی کا یہ تصور ہمارے ہی لئے کار آمد ثابت ہوا ہے۔ اگر آج ہندوستان واقعی اکبر کے زمانے کا ہندوستان ہوتا تو یقینی طور پر

چغتائی کوئی اور دنیا تخلیق کرتا۔ اور یہ بات دعوے سے کون کہہ سکتا ہے کہ وہ نئی دنیا بھی اسی قدر حسین ہوتی جیسی خوابوں کی یہ خوبصورت دنیا ہے جو چغتائی کے تخیل نے اب آباد کی ہے۔ یقینی بات صرف اس قدر ہے کہ وہ ایک نئی اور مختلف دنیا بنانا ضرور کیونکہ اس کا تعلق اس پر از رومان گروہ سے ہے جن کا کاروان ہمیشہ ساحل دوش یا کنار فردا پر خیمہ زن ہوتا ہے۔ اس گروہ کا ایک رکن انگریز شاعر کیٹس تھا۔ جو اپنے گروہ و پیش کی دنیا سے بھاگ کر اپنے تخیل کی مخلوق یونانی دنیا میں پناہ گزین ہوا تھا۔

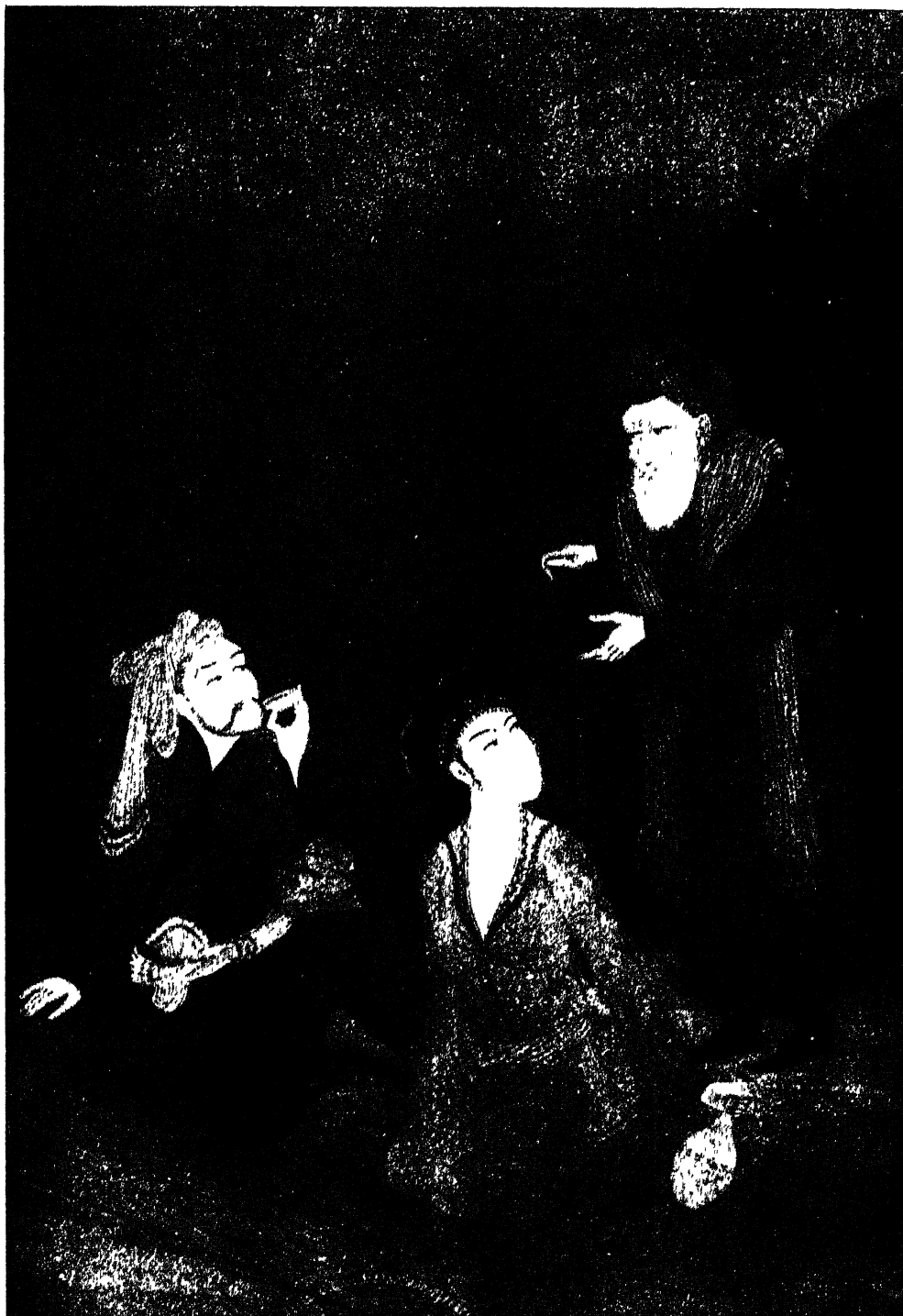
بیردن ایشیا جو چیز چغتائی کے مداح پیدا کرتی ہے وہ اس کی تصاویر کا مشرقی تخیل ہے۔ اس کی تصاویر میں جو حیرت انگیز فنی کمال ہے وہ ہر صاحب فہم کا دل بھاتا ہے۔ لیکن ریلزم سے وہ بعد جو چغتائی نے اراداً اختیار کیا ہے۔ ان لوگوں کے لئے باعث تشکر ہے جو اُس چیز سے جس کو مرنی حقیقت کہتے ہیں اکتا چکے ہیں اور تخیلی حقیقت کے متلاشی ہیں۔ اس تخیلی حقیقت کو واضح کرنا صدیوں سے مشرقی آرٹ کا مقصد اور مطمح نظر رہا ہے۔ اگر پرانے ایرانی شاہکاروں اور چغتائی کی تصویروں کو سامنے رکھ کر موازنہ و مقابلہ کیا جائے تو واضح طور پر معلوم ہو جائیگا کہ ان میں یکسانیت کس حد تک ہے۔ اور کس حد تک چغتائی نے اس جوش طبیعت سے جو ایک ایسے خلاق آرٹ کا نشان امتیاز ہوتا ہے جو اپنی روایات سے کما حقہ آگاہ ہو۔ اپنا ذاتی کمال ایزاد کیا ہے۔ قدیم ایرانی شاہکاروں میں اور چغتائی کی تصاویر میں تغزل اور ایک نازک۔ پرسکوت توازن مشترک ہیں۔ لیکن رنگوں کا خوبصورت امتزاج۔ خطوط کی ہم آہنگی جس کی بدولت خطوط تصویر کے خطوط نہیں لہتے بلکہ ان شاعرانہ جذبات کے جو الفاظ کی گراں باری کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ نقوش بن کر نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ لباس کی تزئین و ترتیب جس کا مقصد محض انسانی جسم کو مستور یا عریاں کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ جو بجائے خود ایک جمالیاتی کارنامہ ہے۔ او ساسانی عمارات کا سہن سہر جو انسانی تخیل کو اس دنیا سے دور رومان اور حسن کی دنیا میں لے جاتی ہے۔ یہ تمام صفات چغتائی کی خصوصیت ہیں اور اس کی تصاویر میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

مترجمہ مس شیدہ ذکار اللہ

(سٹوڈیو۔ لنڈن)



24



ایم۔اسلم شکائے والی

پچھلا پہر تھا اور ڈل کا کنارہ۔ میں سبزے کے زمر دیں فرش پر ہاتھ کا سرمانہ بنائے ڈل کے سینہ پر شعل آفتاب کی کرشمہ سازیاں دیکھ رہا تھا۔ ڈل کا منظر یوں بھی کچھ کم پر لطف نہیں ہوتا۔ لیکن مختلف اوقات میں آفتاب کی شعاعیں جس انداز سے اس کے آبی سینے پر ملمع کاریاں کرتی ہیں وہ نہایت دلآویز ہوتا ہے۔ مشرق کی جانب اونچے اونچے پہاڑ تھے جن پر مشاطہ قدرت نے گویا سبزے کی چادر ڈال دی تھی۔ اور کہیں کہیں سنگلاخ چٹانیں کچھ اس طرح کھڑی تھیں جیسے کوئی گدائے بے نوا راہ سے الگ ہو کر اپنی بکیسی پر غور کر رہا ہو۔

مجھ سے ذرا فاصلے پر ایک ہوس بوٹ اور دو چار خوبصورت شکائے لنگر ڈالے کھڑے تھے۔ ان شکاروں میں چند ایک سیاح بیٹھے تھے۔ کھیل رہے تھے۔ ہوس بوٹ کی چھت پر دو چار انگریز چائے پی رہے تھے اور ہوس بوٹ کے پاس کناے پر ایک شکستہ حال نوجوان صورت سوال بنا بیٹھا تھا۔

ایک شکائے پر سے کسی نے کہا :-
”جاؤ! کیا دیکھتے ہو؟“

وہ خستہ حال نوجوان وہاں سے اٹھا۔ دونوں ہاتھ مکر کے پیچھے رکھے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا میری طرف آیا اور پاس پہنچ کر بولا:-
”کیوں حضرت! کوئی خدمت!“
میں نے انکار کے طور پر سر ہلا دیا۔
”کوئی کام ہو تو میں کروں حضرت!“

اس نوجوان کے لب و لہجہ سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ کشمیر کا رہنے والا نہیں۔ معاً میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ آواز میں نے پہلے بھی کہیں سنی ہے۔ میں غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھٹے پرانے کپڑے تھے۔ بے ڈھنگی سی ڈاڑھی تھی۔ سر کے بال ہاتھ پر گر رہے تھے اور گریبان کھلا تھا۔ میں نے مزید غور سے اس کی طرف دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے اُسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ لیکن اس حال میں نہیں۔ وہ بھی مجھے ایک خاص انداز سے دیکھ رہا تھا۔ بلکہ زیر لب ہنس رہا تھا۔ پھر وہ آنکھیں جھپک کر بولا:-

”کما دیکھتے ہیں حضرت؟“
اس کے اس طرح آنکھیں جھپکنے کے انداز سے میرے دل و دماغ پر ایک بجلی سی کوند گئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور تعجب سے کہا:-

ہارون؟

وہ سن کر بولا :-

”ہاں ہارون۔ شکر ہے تم نے پہچان تو لیا۔“

ہارون میرا کالج کے وقتوں کا دوست تھا۔ ہم ایف۔ آے کلاس میں تھے کہ وہ کالج چھوڑ کر چلا گیا۔ میرا دوست بڑا منطقی تھا۔ ضد کا پورا اور ہٹ کا پٹکا۔ اور بہت غیور۔ جب بھی ہم سینما یا رستوران میں جاتے تھے۔ دام وہ ادا کرتا تھا۔ لیکن کالج چھوڑنے کے بعد اس نے کبھی اطلاع نہ دی کہ وہ کہاں ہے اور کیا کرتا ہے۔ آج تقریباً پندرہ سولہ سال کے بعد اس سے پھر ملاقات ہوئی تھی *
وہ میرے پاس خاموش بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ میں نے کہا :-

”ہارون ! بھی تم تو ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینک۔ کہاں ہے؟“
غیبت ہے ! آج ملاقات تو ہو گئی۔ یہی بات کہ میں کہاں رہا تو بھائی۔ ملک خدا تنگ نیست۔ پائے گدا تنگ نیست *
”لیکن یہ حال کیا بنا رکھا ہے تم نے؟“

”جو دل کو پسند ہے۔“

”یہاں کب سے ہو؟“

”ایک مدت سے!“

”کہاں رہتے ہو؟“

”شریں“ اور پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے۔ ”چلو گے؟ چائے پلاؤنگا۔“
میں دل میں سوچنے لگا کہ ابھی تو یہ شخص خود صورت سوال بنا بیٹھا تھا اور اب مجھے چائے کی دعوت دے رہا ہے۔ ہارون غالباً میری خاموشی کا مطلب بھانپ گیا۔ اور ہنس کر کہنے لگا۔

”بہت خرابی نہ چائے لیگی۔“

”چلو ! ہارون جیسے دوست کی دشمنی مجھے کب گوارا تھی۔“

”لیکن میرا گھر یہاں سے دور ہے!“

”تو شکائے میں کیوں نہ چلیں؟“

”ہاں لیکن کراہیہ تمہیں دینا ہوگا۔“ ہارون نے ہنس کر کہا۔

ہمارا شکار ابھی ڈل گیٹ سے کچھ فاصلہ پر تھا کہ راستے میں سیاہوں کے اور بہت سے شکائے مل گئے۔ اگر کبھی بیشکارے پاس آ جاتے تھے تو ہانچی ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لئے زور زور سے چوچلاتے۔ ڈل گیٹ کے قریب ایک اور شکارا ریشی پردوں سے آراستہ ہمارے پاس سے گذرا۔ اس میں ایک نوجوان عورت چہرے پر ایک باریک سا نقاب ڈالے بیٹھی تھی۔ کچھ دور

تک دونوں شکالے ایک دوسرے کے دوش بدوش چلتے رہے۔ معاً اس عورت نے چہرے پر سے نقاب اٹھا کے ہماری طرف دیکھا۔
 بہت خوبصورت عورت تھی۔ اور اس کا نقاب پلٹ کر یوں یک بیک دیکھنا گویا جھٹک برق تھا۔
 ہارون سر جھکائے بیٹھا تھا۔ خوبصورت عورت نے جھک کر اپنے ہانچی سے کچھ کہا۔ لیکن اس اثنا میں ہمارا شکار آگے بڑھ چکا
 تھا۔ ہم اس سمت جا رہے تھے جہاں زیادہ تر مزدوری پیشہ لوگوں کے گھر ہیں۔ میں نے پوچھا :-

”کشمیر کی سیر تو تم نے خوب کی ہوگی؟“

”بہت گھوما۔ چپہ چپہ دیکھ ڈالا۔“

”سری نگر میں کب سے ہو؟“

”یہی کوئی دو تین مہینے سے۔“

”لیکن یہ تم نے حال کیا بنا رکھا ہے؟“

”حال! ہارون نے اپنے لباس پر ایک نگاہ ڈال کر کہا۔ ”وہی جو غریبوں کا ہوتا ہے۔“ پھر تھوڑی سی خاموشی کے بعد
 ”جو مزا اس غربت میں ہے وہ آسودگی میں میسر نہ تھا۔ اب نہ فکر نہ غم۔ روکھی سوکھی مل گئی تو کھالی۔ ورنہ یوں ہی پڑ رہے لیکن
 ایک بات ہے۔ پیدا کرنے والے کو اپنے بندوں کی فکر بھی ضرور ہے۔ حال تو تم میرا دیکھ ہی رہے ہو۔ لیکن فاقہ آج تک نہیں
 آیا۔“

پھر حجب میں ہاتھ ڈال کر اور ایک دوٹی نکال کر:

”ایک وقت کی روٹی کے دام اس وقت بھی میرے پاس ہیں۔“

میں خاموش بیٹھا ہارون کی باتیں سنتا رہا۔ اس وقت ہمارا شکار ایک چھوٹے سے نالے میں سے گذر رہا تھا۔ دونوں طرف کچے مکان
 تھے اور مکینوں کی شکل و صورت سے غربت اور افلاس ظاہر تھا۔ جب ہم اس نالے کے موڑ کے قریب پہنچے تو وہی شکار جس میں نقاب
 پوش عورت بیٹھی تھی دوسرے موڑ کی طرف سے پھر ہمارے سامنے آگیا۔ اس جگہ پاٹ بہت تھوڑا تھا۔ عورت کے شکالے والا ہانچی آگے
 نکلتا چاہتا تھا۔ لیکن ہمارے شکالے والے نے اُسے ڈانٹا۔ اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں میں کچھ جھگڑا
 ہو رہا ہے۔ آخر نقاب پوش عورت کی آواز آئی :-

”آہستہ چلو تم۔“

یہ آواز سن کر ہارون نے سراٹھایا۔ لیکن ہمارا شکار آگے نکل چکا تھا۔ شہر کا یہ حصہ بہت بدبودار تھا۔ ہارون ایک دو تنگ
 کوچوں میں سے ہوتا ہوا ایک مکان کے سامنے رکا۔ مکان نہیں بالآخر نہ سمجھے۔ ہم اوپر پہنچے۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ ہارون نے ایک
 موم بتی روشن کی۔ ایک چھوٹا سا چوبی کمرہ تھا۔ وسط میں تین ٹانگوں والی ایک بھدی سی میز رکھی تھی۔ ایک جانب لکڑی کی دو
 اونچی اونچی چوکیاں تھیں اور ایک مفضل الماری۔ میز پر روغنی مٹی کی چلنے والی۔ ایک کونے میں ایک چھوٹا سا سماوار تھا۔ پاس ہی
 ایک ٹٹکا اور مین کا آفتابہ۔ گلی کی جانب دیوار میں دو کھڑکیاں تھیں۔ دونوں کے کوڑا بند تھے۔ ان کھڑکیوں کے ساتھ ایک چارپائی

تھی اور چار پائی پر سیاہ رنگ کی ایک لونی اور ایک بوسیدہ سا کمبل۔ یہ تھی اس کمرے کی کل کائنات

”بیٹھ جاؤ!“ ہارون نے سماوار اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میں ذرا گرم پانی لے آؤں۔“

میں دل میں سوچنے لگا کہ کسی طرح ہارون کی کچھ امداد کروں۔ یہ کمرہ اور اس کا سامان ہارون کی مفلسی اور پریشانی کا بین ثبوت تھا۔ لیکن میں اپنے دوست کو خوب جانتا تھا۔ وہ کبھی کسی کا شرمندہ احسان نہیں ہوا تھا۔ اس کو اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ کچھ مالی امداد قبول کرے سخت مشکل تھا۔

وہ کوئی پانچ ایک سنٹ میں گرم پانی لے کر آگیا۔ سماوار میز پر رکھ کر اس نے الماری کا قفل کھولا۔ اور اس میں سے کاغذ کی دو پٹیاں اور نصف کے قریب ایک کشمیری نان نکال کر میرے سامنے رکھ دیا اور کہا :-

”ایک پٹیا میں چلے ہے دوسری میں شکر۔ تم سماوار میں چلے ڈال دو میں پیالیاں صاف کرتا ہوں۔“
اتنے میں کسی کے سیڑھیوں پر چڑھنے کی آواز آئی۔ ہارون نے بیٹھے بیٹھے پوچھا۔ ”کون ہے بھائی؟“ اور پھر خود ہی ”کمبخت مکان والا کرایہ مانگنے آیا ہوگا۔“

دروازہ کھلا اور ایک عورت ہمارے سامنے آکھڑی ہوئی۔ یہ وہی شکالے والی عورت تھی۔ شمع کی دھندلی دھندلی روشنی میں بھی آنے والی کی شمع حسن کی تابش خوب نمایاں تھی۔ ہارون نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ میں نے انگریزی میں پوچھا :-

”یہ کون ہے؟“

ہارون نے انگریزی میں جواب دیا۔ ”ناگن“ !

”ناگن“ !

”ناگن نہ سہی۔ جادو گرنی سہی۔“

اس کے چہرے پر انتہا درجے کا کرب تھا۔ آخر وہ نووارد کی طرف مخاطب ہوا۔ ”کیا میری رہائی نامکن ہے۔ آخر کب

تک اور کہاں تک میرا بیچا کیا جائیگا؟“

”میں تو معافی مانگنے آئی ہوں۔ آپ کے دل میں کچھ رحم نہیں؟“

”خدا کے واسطے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میرے دل میں نہ رحم کی جا ہے نہ محبت کی۔“

”لیکن میرا قصور؟“

”اس کا جواب قیامت کے دن ملیگا۔“ اس کے چہرہ پر ہلکی ہلکی سرخی آگئی۔ ”قیامت کے دن انصاف ہوگا۔ اس دنیا میں

انصاف نہیں! اس دنیا میں انصاف نہیں اور میں بزدل ہوں!“ اب وہ غصہ سے تنہا اٹھا ”میں بزدل ہوں ورنہ تو آج

اس دنیا میں نہ ہوتی۔“

”کاش مرحومہ۔۔۔“

ہارون تڑپ کے اٹھا۔ ”خبردار۔ اپنی ناپاک زبان سے اس کا نام نہ لینا۔“ اور پھر دیوانہ وار۔ ”میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جا۔ ملعونہ۔ قاتلہ۔“

اس عورت نے بھرائی ہوئی آوازیں کہا۔ ”میں جانتی ہوں۔ ہارون! خدا انصاف کرنے والا ہے۔“
ہارون کچھ دیر تک خاموش رہا۔ آہستہ آہستہ اس کا غصہ فرو ہو گیا۔ اور اس نے گویا بات کی اہمیت کم کرنے کے لئے کہا:-
”اسے کہتے ہیں کھیل میں کھیل۔ کیوں؟ کیسا پارٹ ادا کیا؟ کچھ داد تو دو۔“
”یہ تھی کون؟“ میں نے پوچھا۔

”رقاصہ! فاحشہ! اور کون؟“
”خوب! تو گویا یہ سب گل اسی کے کھلائے ہوئے ہیں؟“

”جی ہاں!“

”وہ کیسے؟“

”یہ داستان سنو گے؟“

”ہاں! ہاں! کیوں نہیں؟“

”تو سنو!“ ہارون بولا۔ ”کوئی لمبا قصہ نہیں۔ چند ایک خانگی مجبوریوں کے باعث مجھے کالج چھوڑنا پڑا تھا۔ ادھر کالج چھوڑا ادھر شادی ہو گئی۔ اور پھر ایک دفتر میں ملازمت کا سلسلہ بھی ہو گیا۔ اس ملازمت کے سلسلہ میں جگہ جگہ میری تبدیلی ہوتی رہی۔ جہاں جاتا بیوی کو ساتھ لے جاتا۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والی میں۔ خدا کی قسم کوئی چراغ لے کر بھی ڈھونڈے تو ایسی بیوی نہ ملے۔ شادی ہوئے کوئی پانچ سال ہو چکے تھے۔ ان دنوں میں ایک ایسے مقام پر تھا جو ایک بارونق شہر ہونے کے علاوہ ایک مشہور چھانوٹی بھی تھا۔ اس جگہ میرے ایک دوست تھے انہیں گانا سننے کا بہت شوق تھا شہر میں کئی اچھی گانے والیاں تھیں۔ یہ سب سے اچھا گاتی تھی.....“

”یہ کون؟“ میں نے بات کاٹ کر پوچھا۔

”یہی خورشید جو ابھی یہاں آئی تھی۔“

”تو اس کا نام خورشید ہے اور طوائف ہے؟“

”جی ہاں اور دعا باز چھوٹی۔ میرا دل کچھ خود بخود اس کی طرف کھینچنے لگا۔ مجھے اس کے گانے کی نسبت اس کی باتوں میں زیادہ لطف آتا تھا۔ اچھی خاصی تعلیم یافتہ عورت تھی۔ بڑے بڑے استادوں کا اردو اور فارسی کلام یاد تھا۔ پانچ چھ مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر اس آمد و رفت کا وہی نتیجہ نکلا جو نکلنا چاہئے تھا۔ قول و اقرار، عہد و پیمان سب یکے ہو گئے اور خورشید ”میری“ ہو کر رہنے لگی۔ بہت سے لیل و نہار بڑے لطف اور پیار سے گزریے۔ اس عورت نے اپنے طرز عمل سے یہ بتایا کہ اس میں کسی کی ہو کر رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اور ادھر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ اگر یہ راہ گم کردہ میری کوشش اور توسل سے راہ راست پر آجائے تو ثواب کا کام ہو گا +

الغرض دنت خوب مئے سے گذر رہا تھا۔ کہ میری بیوی سخت بیمار ہو گئی۔ میرے گھر والوں میں سے اس وقت ایک بوڑھی نانی اماں زندہ تھیں۔ لیکن وہ مجھ سے کالے کوسوں دور تھیں۔ میری بیوی کے ماں باپ برسوں سے مر چکے تھے۔ دور کے رشتہ داروں میں سے جو دو ایک زندہ تھے ان سے ہمارا میل ملاپ نہ تھا۔ میری بیوی کا مرض شروع تو معیہ کی بخار سے ہوا۔ لیکن بعد میں پیدیاں پیدا ہو گئیں۔ میں نے ایک ہوشیار ڈاکٹر کو علاج پر لگا رکھا تھا۔ مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مجھے خود رخصت لینے کی تیاری کرنی پڑی۔ اور رخصت لینے سے پیشتر میں نے خورشید سے بھی اپنی بیوی کی بیماری کا ذکر کر دیا۔

خورشید بولی۔

”ماؤ تو ایک بات کہوں؟“

”ہاں کہو نا۔“

”نہیں! پہلے اقرار کیجئے پھر عرض کر دوں گی۔“

”تم کہو توسی!“

”اگر آپ پسند کریں۔ تو میں بیگم صاحبہ کی خدمت خود چل کر کروں۔“

میں نے تعجب سے پوچھا۔

”خورشید! کیا کہہ رہی ہو؟ تم میری بیوی کی خدمت کر دوں گی؟“

”ہاں کیوں نہیں!“ اس نے کہا۔ ”دو چار روز آزما دیکھئے۔ میں پیشہ ور سی۔ لیکن عورت ہوں اور پھر ایک شریف آدمی

کی خدمت کر دوں گی تو شاید یہی خدمت میرے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ آپ مجھے ایک موقعہ تو دیں۔“

قصہ مختصر میں اُسے گھر لے آیا۔ میرے ہاں آتے ہی خورشید وہ پہلی سی چنچل اور طر حدار خورشید نہ رہی۔ بلکہ چال سے ڈھنگ سے گفتگو سے پوری شریف زادی معلوم ہونے لگی۔ اور میری بیوی کی تیاری داری ایسی دلسوزی اور محبت سے کرنے لگی کہ میں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا تھا۔ لیکن قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔ کوئی چار پونے چار مہینے کی مسلسل علالت کے بعد میری بیوی ملک عدم میں جا بسی۔

لیکن اس سے تم یہ نہ سمجھنا کہ میری بیوی بیماری کی وجہ سے قدرتی موت مر گئی۔ بالکل نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی بیوی کا قاتل ہوں۔

”تم! وہ کیسے؟“

سنو۔ سنو۔ ٹھنڈے دل سے سنو۔ اس کی قاتل خورشید ہے۔ لیکن چونکہ اس مکان میں خورشید کی موجودگی کا ذمہ دار میں تھا۔ اس لئے میں قاتل ہوں۔ یہ تراز مجھے ماما سے معلوم ہوا۔

”سنئے میاں!“ ماما نے کہا۔ ”ایک روز رات کے وقت یہ چڑیل بیگم صاحبہ کا سر سہلا رہی تھی۔ میں کمبل اوڑھے پاس ہی پڑی تھی۔ یہ سمجھی ہو گی کہ میں سوتی ہوں۔ لیکن میں جاگتی تھی۔ بیگم صاحبہ اس سے کچھ ہوئے ہوئے باپ

کچھ دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے قہوہ پیتے رہے۔ پھر میں نے پوچھا :-

”تو اب ارادہ کیا ہے؟“

”ارادہ کچھ بھی نہیں۔“ یکایک ہارون کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ”میں نے تمہیں یہاں لا کر خواہ مخواہ بے مزا کیا!“

”وہ کیسے؟ تم سے مل کر جو مسرت مجھے ہے۔ تم کیا جانو۔ اب چلو میرے ساتھ۔“

”کہاں؟ کہاں چلوں؟“

”میرے ساتھ چل کر رہو۔ میں یہاں اکیلا ہوں۔“

”تم کہاں رہتے ہو؟“

”میرا ہاؤس بوٹ ڈاکخانہ کے قرب وجوار میں ہے۔“

”اس وقت معاف کرو۔ کل چلوں گا۔“

”ہارون! کبھی کسی کا کہا بھی مان لیا کرو۔“

”کہ تو رہا ہوں کل چلوں گا۔“

”سچ کہتے ہو؟“

”کبھی تم نے مجھے جھوٹ بولتے بھی سنا؟“

”کہاں ملاقات ہوگی؟“

”اسی جگہ!“

”کل صبح؟“

”نہیں! کل شام!“

ہارون سے رخصت ہو کر جب میں نیچے آیا تو خورشید گلی میں کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگی۔

”مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔“

”فرمائیے!“

”یہاں نہیں۔“ اس نے ہارون کے مکان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ دیکھ لینگے تو اور بھی بگڑینگے۔ آپ کا شکار تو کھڑا ہے۔“

”ہاں ہے تو سہی!“

”تو بس اسی میں چل بیٹھے۔“

جب ہم شکارے میں بیٹھ چکے تو خورشید نے کہا :-

”آپ میری جرات معاف فرمادیں۔“

اصغر
شب شیراز



125
126
127

میں نے ہنس کر کہا - "ہاں! مرتے کو مارنا واقعی جرأت کا کام ہے۔"

"آپ بھی ہارون صاحب کے ہم خیال معلوم ہوتے ہیں۔"

پھر ایک آہ بھر کر - "کم از کم آپ کو ہارون سے اتنا تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں کون ہوں؟"

"جی ہاں! میں نے مسکرا کر کہا - "خوبصورت بلا۔"

"نام تو اچھا ہے لیکن آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"کس بات کا؟"

"میرے اور ہارون صاحب کے تعلقات کا تو آپ کو کچھ علم ہو گیا ہو گا؟"

"تعلقات یعنی تمہاری جفاکاریوں کی داستان؟"

"جفاکاریاں؟ خورشید کے ماتھے پر بل تھے۔"

"جفاکاریاں! میری؟"

"خورشید! میں نے جواب دیا - "سب کچھ جانتے بوجھتے بھی انجان نہ تو اس کا کیا علاج۔"

"میں انجان بنتی ہوں؟ وہ سر ہلا کر کہنے لگی - "یا کہنے سننے والے دیدہ و دانستہ انجان بن رہے ہیں۔"

"کہنے سننے والے کون؟ میں نے پوچھا -

"معاف فرمائیے! خورشید بولی - "آپ نے ان کی تو سن لی - گو مجھے یہ معلوم نہیں کہ آپ کے اور ان کے -

میں نے بات کاٹ کر کہا - "پہلے تم یہ سنو - ہارون میرا بہت پرانا دوست ہے۔"

"یہ تو میں نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا - "خورشید بولی - "ورنہ آپ سے یوں بے تکلفی سے باتیں کرنے نہ بیٹھ جاتی۔"

"لیکن تم ذرا دل میں سوچو تو سہی - میں نے کہا - "کہ ہارون کو تم نے کس کس طرح پریشان کیا - غریب کا گھر برباد ہوا -

پھر ملازمت بھی گئی اور آب و ہوا بھی گئی۔"

"تو گویا ان سب باتوں کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔"

"اور کس پر؟ وہ تمہاری چکنی چپڑی باتوں پر پھسل کر تمہیں اپنے گھر لے گیا اور اس کے گھر آ کر جو گل تم نے کھلائے وہ

تم جانتی ہو۔"

"تو کیا میں نے ان کی بیگم صاحبہ کو زہر دے دیا یا گلا گھونٹ کر مار دیا - یہ تو وہی بات ہوئی کہ نیکی برباد گناہ لازم -

آخر میرا قصور بھی تو مجھے معلوم ہو۔"

"سنو خورشید! میں نے کہا - "تمہارا یہ ظلم کیا کم ہے کہ تم نے مرحومہ سے اپنے اور ہارون کے تعلقات کا ذکر کر دیا - اور وہ

غریب اسی غم میں گھل گھل کر مر گئی۔"

خورشید تصویر حیرت بن گئی - "کیا کہا؟" اور پھر بکرم غصہ میں آ کر - "کیا ہارون اب اس قدر گر گیا ہے کہ مجھ پہ جھوٹی

تہمتیں دھرتا ہے - کیا -

”نہیں یہ تہمت نہیں۔ اسے یقین ہے کہ تم نے اس کا راز فاش کر دیا۔“
 خورشید کا چہرہ جوش اور غصہ سے تمٹما اٹھا۔ ”میرا خدا جانتا ہے کہ یہ الزام محض جھوٹ ہے۔ افترا ہے۔ مرحومہ جانتی ہے۔
 مرحومہ کی روح جانتی ہے کہ یہ الزام جھوٹا ہے۔ بلکہ مرحومہ نے مرنے سے پہلے وصیت کی تھی۔ کہ ہارون سے محبت
 کرنا۔“

میں نے پوچھا ”وہ کیسے؟“

خورشید نے کہا۔ ”آپ کو اتنا تو معلوم ہے کہ بیگم صاحبہ بیمار تھیں۔ تیمارداری کرنے کے لئے خدمتگاروں کے سوا اور
 کوئی نہ تھا۔ میں نے خدمت کے لئے آمادگی ظاہر کی۔ ہارون مجھے گھر لے گیا۔ اور اس کا دل جانتا ہے کہ میں نے کس
 محبت سے مرحومہ کی خدمت کی۔ وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ اور اکثر ”بہن خورشید“ کہا کرتی تھی۔ ایک رات باتوں
 باتوں میں اس نے مجھ سے کہا۔

”بہن خورشید! کس محبت سے تم میری خدمت کر رہی ہو۔ خدا کی قسم میں تمہارے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔“
 پھر کچھ سوچ کے بولی :-

”خورشید! تم نے مجھ سے اپنے گھر کی بات کبھی نہیں کی۔“
 میں نے کہا :-

”کوئی گھر ہوتا تو آپ کو کچھ سناتی۔“

”آخر بال بچے بھی تو ہونگے۔“ مرینہ نے مسکرا کر پوچھا۔

”نہ گھر نہ گھاٹ۔ نہ بچے نہ خاوند۔“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔

”تو کیا تم نے ابھی تک شادی نہیں کی؟“

”کی تو تھی لیکن بن نہ آئی۔“

”کیوں؟“ مرینہ نے پوچھا۔ ”تم ایسی خوبصورت با سلیقہ بی بی سے کیوں بن نہ آئی؟“
 ”الشر جانے!“

”تم کو اپنے میاں سے محبت تو ہوگی؟“

”بہت!“ میں نے ہنس کر کہا۔

”کتنا عرصہ ہوا علیحدہ ہوئے؟“

”کوئی دو تین سال!“

”تب سے یتیم خانے ہی میں کام کرتی ہو؟“ (مرحومہ سے یہی کہا گیا تھا کہ خورشید لڑکیوں کے یتیم خانے میں ملازم ہے)

”اور کیا کرتی؟ آخر پیٹ جی تو بھرنا تھا کسی طرح۔“

”پھر اندر شادی کیوں نہ کر لی؟“

”پہلی شادی سے کیا پھل پایا تھا جو پھر اس خجال میں پڑتی!“
 ”ہن خورشید! مریضہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔“ تمہیں میرے سر کی قسم سچ کہنا۔ میاں کو کب سے جانتی ہو؟“
 ”کوئی دو تین سال سے۔“
 ”کیسے؟“

”میرے شوہر سے ان سے بہت مراسم تھے۔“
 ”اور پردہ؟“

”نہیں! میں نے کہا۔“ میرا شوہر پردہ سے منع کیا کرتا تھا۔“
 مریضہ یہ سن کر کچھ دیر خاموش رہی اور پھر کہا:-
 ”خورشید! مجھے زندگی کی آس نہیں۔ لیکن.....“
 ”ایسا مت کہئے! میں نے ٹوک کر کہا۔“ انشاء اللہ موسم بہار میں صحت ہو جائیگی۔“
 ”لیکن تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔“
 ”فرمائیے!“

”یوں نہیں۔“ مرحومہ نے کہا۔ ”پہلے قسم کھاؤ کہ اپنا وعدہ پورا کر دگی۔“
 ”لیکن کچھ معلوم بھی تو ہو!“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”پھر قسم میں کھا لوں گی۔“
 ”نہیں میرے سر کی قسم کھاؤ!“ مریضہ نے بھی ہنس کر کہا۔ ”کہ جو کچھ میں کہوں گی تم ضرور مان لو گی۔“
 ”اچھا جیسے آپ کی مرضی!“
 ”سنو! اگر میں مر گئی تو میاں کو نہ پھوڑنا.....“
 میں نے یہ سن کر سر جھکا لیا۔ اور مریضہ میرا ہاتھ پکڑ کر بولی:-
 ”خورشید! اب اپنے وعدہ سے نہ پھرنا ورنہ روز محشر تمہارا دامن پکڑ لگی۔“

”تو جناب! خورشید نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔“ یہ وہ سرگزشت ہے جو آج میں نے پہلی مرتبہ آپ سے بیان کی ہے۔ اگر ایک لفظ بھی جھوٹ کہا ہو تو پھر خدا کا عذاب مجھ پر نازل ہو اور حشر کے دن تک میری قبر جلتی رہے۔“
 بیگم صاحبہ کے مرنے کے چند روز بعد بے تفصیل، بے سبب، بغیر کچھ اتہ پتہ بتائے انہوں نے مجھ سے ملنا جلنا ترک کر دیا اور کوئی دو ماہ کے بعد ایسے غائب ہوئے کہ ہزار تلاش کیا کچھ پتہ نہ چلا۔ مجھے یہاں آئے آج اکیسواں دن ہے۔ خیال بھی نہ تھا کہ حضرت یہاں ہوں گے۔ لیکن یہ بھی میری محبت کی صداقت کا ثبوت ہے کہ پچھڑے مل گئے۔ یہ ہے کل سرگزشت۔“
 میرا ہاؤس بوٹ خورشید کے ہاؤس بوٹ سے کوئی میل بھر کے فاصلہ پر تھا۔ جب میں اپنی منزل پر پہنچا تو میرے دل میں یہ خیال آیا کہ میں نے اس بد نصیب عورت کو نہ کچھ تسلی دی ہے اور نہ امید دلائی ہے۔ جانے دل میں کیا سمجھتی ہو گی۔ ساتھ

ہی یہ سن کر بھی دامنگیر ہوئی کہ مبادا ہارون جو اس عورت سے بھاگا پھرنا ہے۔ راتوں رات ہی کہیں غائب ہو جائے۔
میں اپنے دوست کی غلطی پر سخت متاسف تھا۔ میرے نزدیک خورشید ان عورتوں میں سے تھی جو اپنی وفا اور محبت اور ایثار سے
اپنے محبوب کی زندگی کو جنت بنا دیتی ہیں۔ ایسی عورت کی قدر نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ وہ عورت جو فطرتاً ناز برداریاں کرنے کی عادت
ہو اگر خود کسی کے ناز اٹھانے لگے اور کسی کی خاطر اپنی دنیا بدلنے پر آمادہ ہو جائے تو اس کی گزشتہ زندگی کتنی ہی ناپاک کیوں نہ ہو
وہ عورت قابلِ احترام ہے اور ہر شخص کا فرض ہے کہ اس کی مدد کرے تاکہ وہ اپنے عزم پر قائم رہ کر اپنی راہ سے بھٹکی ہوئی
بہنوں کے لئے قابلِ تقلید بن جائے۔

ان خیالات کے زیر اثر میں علی الصباح پھر ہارون کے مکان پر پہنچا۔ رستہ میں دریا کی سیر بہت پر لطف تھی۔ آسمان سوسنی
رنگ میں رنگا ہوا تھا اور کوہسار کی ہوا گویا افسون بیداری پڑھ پڑھ کر کائنات پر پھونک رہی تھی۔ شمال مغرب کی جانب ستارہ سحر
کسی سینے کے آویزہ گوش کی طرح چمک رہا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ ”سن مرگ“ کی فلک پیا برف پوش چوٹیاں اس سے کچھ راز کی
بات کہ رہی ہیں۔ رودبار جہلم کا آئینہ ناپانی بڑی سبک رفتاری کے ساتھ چل رہا تھا۔ شکالے کے ساتھ ساتھ چاندی
کے ننھے ننھے جانور کلیلیں کرتے جاتے تھے اور ذرا سا غیر مانوس کھٹکا ہونے پر پائے کی طرح تلملا کر پانی میں غائب ہو جاتے
آہستہ آہستہ مغرب کی جانب سے سوسنی رنگ کے آسمان پر ہلکی ہلکی سرخی پھیلنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے آفتاب کی فصد
کھول دی ہے۔ اور اس خون کی لالی انسان کے لئے پیغامِ عمل بن گئی ہے۔

میں نے ہارون کے مکان پر پہنچ کر اسکا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے مجھے دیکھا تو کہا:-
”آ جاؤ! بہت سویرے آ گئے۔ خیر تو ہے؟“

میں نے ہنس کر کہا:-

”تم ایسے سیلابی آدمی کا کیا اعتبار۔ کون جانے کہیں نکل جاؤ تو پھر شاید قیامت تک نہ ملو۔“
”بیٹھو!“ ہارون نے ایک چوکی چارپائی کے پاس کھینچ کر کہا۔ ”میں چائے لاتا ہوں۔“
”ابھی نہیں۔ ٹھہر کر چائے پیئیں۔“

”تم جانو!“ یہ کہہ کر وہ چارپائی پر بیٹھ گیا اور ہنس کر بولا۔ ”تم تو صبح قرتی کرنے والوں کی طرح آدھکے۔“

”ہارون!“ میں نے کہا۔ ”رات میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ تمہاری اس مصیبت کا اصلی باعث کیا ہے۔“
”تو پھر تم کس نتیجے پر پہنچے؟“

”میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم نے خدا کے ایک بندے سے بہت برا سلوک کیا ہے۔ ایک ایسے بندے سے
جس نے نجات کے لئے تمہارا دامن کپڑا لیکن تم نے اسے دھتکار دیا۔“

”سمجھ گیا!“ ہارون نے مسکرا کر کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ تم پر بھی خورشید کا جادو چل گیا۔“

”مجھ پر جادو کیا چلیگا!“ میں نے کہا۔ ”لیکن تم خوش قسمت ہو کہ مجھے اس سے بات چیت کرنے کا موقع ملا۔“
”پھر اس نے کیا کہا تم سے؟“

میں نے جو کچھ خورشید سے سنا تھا ہارون سے کہ دیا۔ وہ خاموش بیٹھا سنتا رہا اور پھر بولا :-

”لیکن اس ظالم نے مرنے والی سے میرے اور اپنے تعلقات کا ذکر کیا۔“

”نہض لو کرانی کی بکواس تھی! میں نے کہا۔“ افسوس! تم اتنا تو سوچتے کہ اگر اس کے دل میں کچھ شرارت ہوتی تو رنڈی ہو کر مرحومہ کی خدمت کیوں کرتی اور خدمت بھی ایسی کہ خود تم کو اعتراف ہے۔“

یہ سن کر ہارون نے سر جھکا لیا۔ میں نے پھر کہا۔

”ہارون! خدا کی قسم! چراغ لے کر بھی ڈھونڈو تو خورشید ایسی عورت نہ ملیگی۔“

وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

”اور پھر عیب سے پاک تو صرف خدا کی ذات ہے۔ اگر مان بھی لیا جائے کہ اس کی زبان سے کوئی لفظ اس قسم کا نکل بھی گیا تو

کیا۔ کیا تمہارے دل میں اس کے ایشا اور اس کی خدمتوں کی کچھ قدر نہیں۔ ہارون! تم احسان فراموش تو کبھی نہ تھے۔ ذرا ٹھنڈے

دل سے خورشید کے ایشا اور خدمتوں پر غور کرو اور پھر خدا لگتی کہنا کیا اس کی محبت کا صلہ ہی ہونا چاہئے تھا؟“

ہارون نے پھر ایک لمبا سانس لیا اور میری طرف دیکھ کر آنکھیں جھکا لیں۔ میں نے کہا :-

”خدا کی قسم! اس تمام وبال کا اصلی باعث صرف یہ ہے کہ تم نے“

ہارون بات کاٹ کر بولا۔ ”لیکن دل نہیں مانتا۔“

”کیا نہیں مانتا؟“ میں نے پوچھا۔ ”ذرا دل میں سوچو کیا کہ رہے ہو۔ اور کس کے متعلق کہ رہے ہو؟ معاف رکھنا! کل شام

جو سلوک تم نے خورشید سے کیا۔ اور اس کے بعد جو حالات میں نے اس کی زبان سے سنے اب حوصلہ نہیں پڑتا کہ اُسے منہ دکھاؤ۔“

”پھر میں کیا کروں؟“ ہارون نے پوچھا۔ ”ہاتھ جوڑ کر معافی مانگوں۔ یا“

”کون کتنا ہے۔“ میں نے بات کاٹ کر کہا۔ ”کہ تم ہاتھ جوڑ کر معافی مانگو۔ عورت کی طرف اگر ایک بار محبت کی نگاہ سے

دیکھ لو تو وہ سب کچھ بھول جاتی ہے۔ پیار کا ایک لفظ کہ دو تو وہ دنیا بھر کی خطائیں معاف کر دیتی ہے اور پھر خورشید

ایسی عورت! بیشک مرحومہ فرشتہ سیرت عورت تھی۔ لیکن شکر کرو کہ خدا نے اس کا نعم البدل بھی تم کو ایسا ہی عطا کیا ہے

کس قدر حماقت ہے کہ تم نے سنی سنائی بات پر تو اعتبار کر لیا۔ لیکن جس نے تمہاری خاطر دنیا بھر کی خاک چھانی اس کی

سے بغیر اس سے ایسے روٹھے کہ شہر چھوڑ دیا۔“

”قسمت“ ہارون نے ایک آہ بھر کر کہا۔ ”قسمت!“

”کیوں پھر اب کیا ارادہ ہے تمہارا؟“

ہارون نے میری طرف دیکھا اور کہا :-

”میں جس کے چنگل سے نکلا ہوں تم پھر اس کے چنگل میں مجھے بھسنا چاہتے ہو۔ جو زنجیر میں توڑ چکا ہوں تم چاہتے ہو کہ پھر

انہی میں جکڑا جاؤں۔“

”نہ تو میں تمہیں کسی کے چنگل میں بھسنا چاہتا ہوں نہ تم کو زنجیروں میں جکڑا دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم انصاف

کر دو۔ اور خدا کے خوف سے ڈرو۔“

”میں انصاف کروں! خدا کے خوف سے ڈروں!“

”ہاں! ہاں! میں نے کہا۔“ سنا نہیں خدا کی لافٹی بے آواز ہوتی ہے۔“

ہارون دیر تک کسی گہری سوچ میں رہا۔ آخر میری طرف دیکھ کر بولا :-

”تم سچ کہتے ہو۔ مجھے خورشید کا احسا مند ہونا چاہیے۔ میں اس کے پاس جاؤنگا۔ اور اس سے معافی مانگوں گا۔ لیکن خدا کی قسم اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کر سکتا۔“

”کہو تو میں اسے لے آؤں؟“

”نہیں! میں خود اس کے پاس جاؤنگا۔۔۔۔۔ اس کا مجرم جو بھڑا۔“

میں نے ہارون کو اس کے ہاؤس بوٹ کا نمبر وغیرہ بتایا اور پوچھا۔

”کب جاؤ گے؟“

”آج شام کے بعد۔ تم بھی میرے ساتھ چلو گے؟“

”نہیں! میں وہیں تم سے آؤنگا۔“

رات ہو چکی تھی۔ نیلے نیلے آسمان پر تاروں نے اپنی محفل جمارکھی تھی۔ ہوا میں خنکی تھی اور ”میراں کدل“ میں ایک عجیب قسم کی لونی ”فٹ برج“ پر بہت سے خوش فکرے کھڑے تھے۔ میں نے ایک شکارا لیا اور اس سے پوسٹ آتش کی طرف چلنے کو کہا۔ دریا میں، ادھر ادھر جو ہوس بوٹ کھڑے تھے۔ ان میں بجلی کے لیمپ روشن ہو چکے تھے۔ اکثر لوگ شکاروں میں بیٹھے دریا کی سیر کا لطف اٹھا رہے تھے۔ جب ہم پوسٹ آتش کے قریب پہنچے تو میں نے شکاے والے سے کہا کہ وہ ذرا کناہے کے ساتھ چلے اور دھیرے دھیرے شکارا چلائے۔ تھوڑی دیر کے بعد خورشید کا ہوس بوٹ نظر آیا۔ میں نے شکاے والے سے کہا کہ وہ ہوس بوٹ کے پاس سے ہو کر گزے۔ خورشید کے ہوس بوٹ میں بجلی جل رہی تھی۔ کھڑکیاں کھلی تھیں اور ان کے سامنے ارغوانی رنگ کے ریشمی پردے پڑے تھے۔ جب میں نزدیک پہنچا تو ستار بجنے کی آواز سنائی دی۔ ستار کے نغموں میں سوز نہ تھا۔ خوشی اور مسرت کے نغمے تاروں سے نکل نکل کر فضا میں پھیل رہے تھے۔ جب میرا شکارا ہوس بوٹ کے مقابل آیا تو میں نے ذرا اٹھ کر اندر کی جانب دیکھا۔

خورشید صوفے پر بیٹھی ستار بجا رہی تھی اور اس کے زانوؤں پر سر رکھے ہارون لیٹا تھا۔ اس خوشی اور مسرت کے وقت میں نے محل ہونا مناسب نہ سمجھا اور اتنی دیر میں میرا شکارا ہوس بوٹ سے آگے نکل چکا تھا۔

ایم۔ اسلم

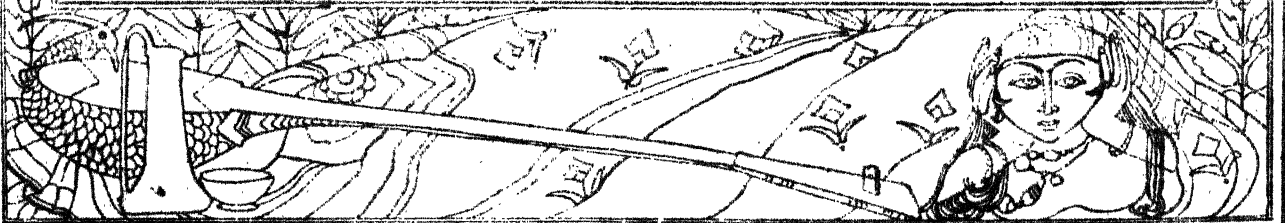
ناطق جام باقی

لبوں پر زندوں کے میکہ کی شکایتیں ہیں ام باقی
ہوا کا جھونکا ہے یہ زمانہ جدھر کیا رخ اکھاڑ بھینکا
گرے تو ہیں لڑکھڑاکے لیکن اسی طرف رخ کئے پڑے ہیں
جو آئے کعبہ سے میکہ میں تو ہم نے بدلانہ اپنا شہر
یہ سوچ کر خوش نہوا بھی سے کہ جسم کا بوجھ ڈھوپکے ہم
یہی ہے ساقی جو کال مے کا توں لے میں غمش مرا خدا خوش
چلے جو صبا دکی ہمیشہ تو باغ عالم ہودم میں دیراں
بدل گیا رنگ میکہ کا یہی ہے دور اخیر ساقی
جہاں میں ساقی ہے ہمیشہ رجا پچا تیرا بادہ حسانہ

نہ بیٹھ ناطق تو ہو کے غافل اٹھو اٹھو دور کا سفر ہے

بہت سے ساماں ہیں جمع کرنے ابھی بہت ہیں کام باقی

ابوالعلماء ناطق لکھنوی



فیض سرودِ شبانہ

نیم شب - چاند - خود سہرا موٹی
محفل ہست و بود ویراں ہے
پیکرِ القبا ہے حساموٹی
بزمِ انجسم فردہ سماں ہے
آبشارِ سکوت جاری ہے چار سو بیخودی سی طاری ہے
زندگی جزوِ خواب ہے گویا ساری دنیا سہرا ہے گویا

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
نمکشانِ نیم و انگاہوں سے
کہ رہی ہے حدیثِ شوق نیاز
سازِ دل کے خموش تاروں سے چھن رہا ہے خارِ کیف آگیاں
آرزو - خواب تیرا روئے حیاں

فیض احمد فیض



غلام عباس محبت کا گیت

شاہی باغ کے مالی کے نوجوان بیٹے چندر نے راجکمار کی پدموتی کے حسین چہرے کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ نہ راجکمار نے اس کی زبان سے کبھی کوئی بات سنی۔ اس پر بھی اسے پورا یقین ہے۔ کہ چندر مجھ سے محبت کرتا ہے۔
رات کو پچھلے پرکے سناٹے میں راجہ کے محل سے کچھ دور ایک ویران ٹیلے سے بانسری کی ایک پرسوز صدا نالہ و فریاد کرتی ہوئی آتی اور راجہ کے محل کی دیواروں سے دیوانہ وار ٹکراتی اور راجکمار کی پدموتی کی خوابگاہ تک پہنچ کر اُسے بیدار کر دیتی۔ پدموتی اپنی سیج پر تڑپتی۔
نملاتی۔ غصے سے پیچ و تاب کھاتی۔ مگر بانسری کا یہ فسوں کا رنغمہ اس کی مرضی کے خلاف اس کے کانوں سے اتر کر دل و دماغ اور بدن کے روٹے روٹے ٹنگے میں سرایت کر جاتا۔ وہ کروٹیں بدل بدل کر آخر اٹھ بیٹھتی۔ اس کی رگوں میں شاہی خون کھولنے لگتا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا۔ گویا چندر بانسری کی نے میں اسے محبت کا گیت سنا رہا ہے۔ راجکمار کی محبت کا گیت! اور اس کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی۔ غیرت مند راجکمار ایک لمحہ کو بھی یہ گوارا نہ کر سکتی تھی۔ کہ چندر جیسا بیچ اس کی محبت کا دم پھرے۔ مائے غصے کے چند اُس کی آنکھوں سے اڑ جاتی اور وہ چندر کو اس کی گستاخی کی سزا دینے کی تجویزیں سوچنے لگتی۔ ننگے بدن پر بید لگائے جائیں۔ بید جو اس کے گوتست کے ٹکڑے اڑا دیں۔ لوہے کی تپتی ہوئی سلاخوں سے آنکھیں پھوڑ ڈالی جائیں۔ ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں تاکہ وہ پھر کبھی بانسری نہ پکڑ سکے۔ یا پھر مست ہاتھی کے سامنے ڈال دیا جائے جو اپنی سونڈ اور پاؤں سے اسے چیر کر رکھ دے۔

کئی بار اس کے جی میں آیا کہ راجہ سے کہہ کر اس گستاخ کو کیفر کردار تک پہنچائے۔ مگر بانسری بجانا کوئی جرم نہ تھا۔ وہ منظر تھی کہ چندر سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جو اس کی محبت کا راز آشکار کر دے۔ ایک دزدیدہ نگاہ۔ ایک حسرت بھری آد۔ ایک آنسو کی بوند۔ اور وہ اس کا سزیم کروا دے۔ مگر چندر کی محبت بظاہر ان باتوں سے بے نیاز معلوم ہوتی تھی۔ وہ اول تو اپنے باپ کے ہاں آتا ہی کم تھا اور جب آتا بھی تھا۔ تو ہمیشہ نظریں نیچی کئے رہتا تھا۔ ہاں بانسری۔ مگر بانسری بجانا کوئی جرم نہ تھا۔

کبھی کبھی خوشدلی کی حالت میں وہ چندر کی ذہانت کی داد بھی دیا کرتی تھی۔ بے شک اپنے جذبات کے اظہار کے لئے موسیقی سے بڑھ کر اور کوئی ذریعہ نہیں۔ یہ وہ زبان ہے۔ جس میں ہم ادنیٰ و اعلیٰ دوست و دشمن ہر ایک سے ہر قسم کی باتیں بے جھجک کہہ لیتے ہیں مگر کوئی گرفت نہیں کر سکتا۔ حالانکہ وہ یہ باتیں خوب سمجھ لیتے ہیں لیکن پھر یہ احساس کہ وہ اس گستاخ کو سزا دلانے سے عاجز رہے اسے برہم کر دیتا۔ اور وہ بے قراری سے ادھر ادھر ٹھلنے لگتی ہے۔

کی نے نوازی کا کمال ہے جو بانسری کی لئے کو مختلف آوازوں میں تبدیل کر سکتا ہے۔
وہ نیم دیوانگی کے عالم میں اٹھ کر سیج پر بیٹھ جاتی ہے اور سوچتی ہے کہ اس گستاخ کو سزا دلانے کی اب صرف یہی صورت ہے کہ اسے یہاں
بلوا کر سب کے سامنے بانسری بجانے کو کہا جائے۔ ممکن ہے پتاجی یا ماتاجی بانسری کا گیت سن کر اس کے دل کا بھید جان لیں۔ چنانچہ پہلی مرتبہ
اپنی نسوانی جیا پر غالب آکر پردہ دہاتی راجہ سے کہتی ہے۔

”پتاجی آپ نے آواز سنی؟“

”کیسی آواز؟“

”جیسے کوئی بانسری بجا رہا ہے۔“

”نہیں بیٹی..... ہاں ہاں آ تو رہی ہے لیکن بہت ہی دھیمی آواز ہے۔“

”پتاجی میرا جی چاہتا ہے۔ کہ اس بانسری بجانے والے کو یہاں بلاؤں۔ اور اُسے اپنے سامنے بانسری بجاتے سُنوں۔“

راجہ خوشی خوشی ایک خادم کو بلا کر کہتا ہے کہ سامنے کے ٹیلے پر جو شخص بانسری بجا رہا ہے اُسے بلا لاؤ۔ خادم چلا جاتا ہے۔ راجہ کھاری بھر
بستر پر لیٹ جاتی ہے۔ آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ اور کان بانسری کی آواز پر لگا دیتی ہے۔ تھوڑی دیر میں آواز ختم جاتی ہے۔ راجہ کھاری
جان لیتی ہے کہ خادم چندر کے پاس پہنچ گیا۔

سائے کی طرح آہستہ آہستہ چلتا ہوا۔ پھٹی سی دھوٹی باندھے۔ نحیف و نزار چندر بانسری لئے راجہ کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ سیج پر
پڑی ہوئی راجہ کھاری کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اٹھ کر بیٹھ جائے۔ مگر وہ اس جذبے کو دبا لیتی ہے۔ اور
لیٹے لیٹے اس کی طرف منہ پھیر کر اُسے دیکھتی ہے۔ مگر وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔

راجہ پوچھتا ہے۔ ”اے نوجوان تم کون ہو؟“

چندر کہتا ہے۔ ”میں شاہی باغ کے مالی کا بیٹا چندر ہوں۔“

راجہ پوچھتا ہے۔ ”اس سامنے کے ٹیلے پر بانسری تم ہی بجا رہے تھے؟“

چندر کہتا ہے۔ ”ہاں۔“

”روز بجا یا کرتے ہو؟“

”ہاں۔“

”آدھی رات کو؟“

”ہاں۔“

”کیوں بجاتے ہو؟“

چندر اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ اور وہ نظریں زمین پر گاڑ دیتا ہے۔ راجہ کی نظر پداوتی پر پڑتی ہے۔ جو نہایت عجیبی سے
ان دونوں کی طرف دیکھ رہی ہے۔ راجہ گھبرا کر چندر سے کہتا ہے۔ ”میری بیٹی تمہاری بانسری سننا چاہتی ہے۔ اُسے سناؤ۔“

راجکماری کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگتا ہے۔ مگر چندر اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھتا۔ اور بانسری ہونٹوں کے پاس لے جاتا ہے۔ اور وہی نغمہ الاپنا شروع کرتا ہے جس سے شہزادی کے کان مدت کے آشنا ہو چکے ہیں۔

”راجکماری میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔۔۔۔ دیکھا میرا سچا پریم مجھے تیرے قدموں میں لے آیا۔ لیکن کیا اس سے میری محبت کی آگ ٹھنڈی ہو جائیگی؟ آہ نہیں۔ وہ تو صرف اس وقت بجھسکی جب تو۔۔۔“

راجکماری ہاتھ سے اشارہ کرتی ہے۔ کہ بس ٹھہر جاؤ۔ وہ حیران ہے۔ کہ بانسری کی یہ صاف صاف باتیں۔ محبت کا یہ کھلا ہوا اظہار یہ بیٹیاں۔ یہ دلوں کے راجہ اور رانی کیوں نہیں سمجھ سکے۔

راجہ پھر چندر سے پوچھتا ہے۔ ”نوجوان۔ تم نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ میں نے پوچھا تھا۔ کہ تم یوں آدھی رات کو ٹیلے پر چڑھ کر بانسری کیوں بجاتے ہو؟“

چندر پھر خاموش رہتا ہے۔

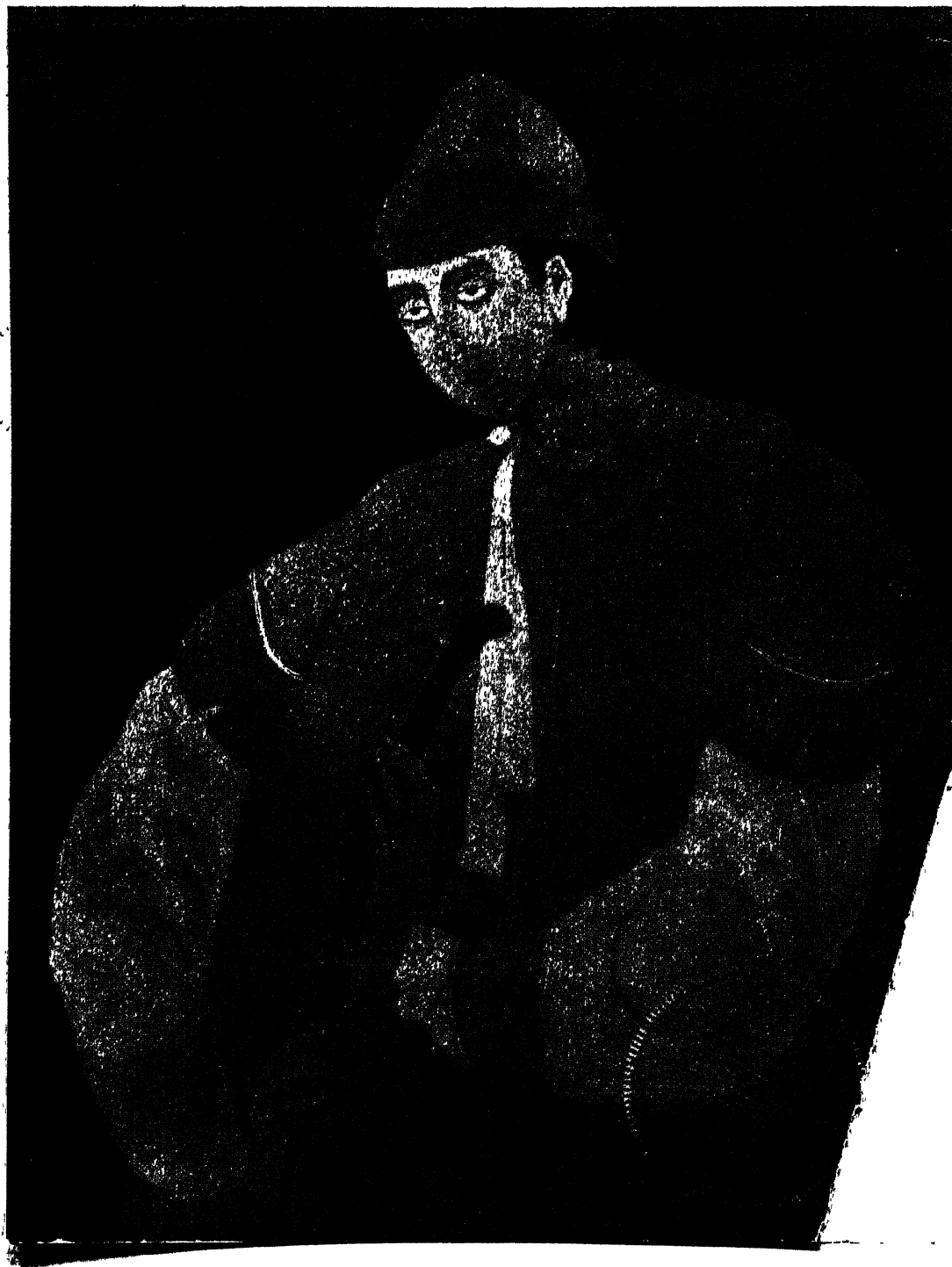
راجہ تیسری مرتبہ پوچھتا ہے۔ اور اس دفعہ اس کا لہجہ ٹھکانا ہے۔ ”نوجوان بولو۔ جواب کیوں نہیں دیتے؟“

چندر آہستہ آہستہ سر اٹھا کر راجہ کی طرف دیکھتا ہے۔ راجہ کو چاندنی میں اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چندر اب راجہ سے اپنا دلی راز کہہ دینے پر آمادہ ہے۔ راجکماری بیچ پر اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ اس دفعہ وہ اس جذبہ کو دبا نہیں سکتی۔ چندر راجہ کے قریب آ جاتا ہے اور ایک ایسی آواز میں جو سانس سے ذرا ہی اونچی ہے کہنا شروع کرتا ہے :-

”بچپن میں میرا چھوٹا بھائی گوپال دبا میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ میں اس کی تتلی باتوں کا شیدائی تھا اور وہ میری بانسری کا عاشق۔ کئی برس گزر گئے۔ مگر اس کی باتوں کی یاد دل سے نہیں مٹتی۔ اور میں آدھی رات کو جبکہ ہر طرف سناٹا ہوتا ہے ٹیلے پر چڑھ کر کرشن ہمارا ج سے بانسری کے ذریعے اس ظلم کی شکایت کرتا ہوں جو میرا بھائی چھین کر مجھ پر کیا گیا ہے۔۔۔۔ اور بس۔“

راجکماری اپنے اعصاف کو بیچ پر اس طرح پٹک دیتی ہے۔ جس طرح موتیوں کی مالا ٹوٹ جائے۔ اور دانے بکھر جائیں۔ ایک آنسو آنکھ سے پھوٹتا ہے۔ اور پلکوں میں آکر اٹک جاتا ہے۔ پداوٹی اسے پونچھنے کی کوشش نہیں کرتی۔ اور وہ آنسو کا قطرہ پٹک پٹک پھرتا اس کی جھولی میں آگرتا ہے۔ آج اس پر پہلی مرتبہ اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ کہ اس تمام دوران میں چندر اس سے نہیں۔ بلکہ وہ خود چندر سے محبت کرتی رہی ہے۔

غلام عباس



چسائی
تقد



بجاری

ہندوستان میں بدھ مت کے زمانے میں دستور تھا اور جاپان میں اب بھی دستور ہے۔ کہ
 افلاس زدہ والدین اپنی لڑکیوں کو امیر لوگوں کی خدمت گزاری کیلئے مندروں اور اجارہ داروں
 کے پاس پھوڑ دیتے ہیں۔ یہ لڑکیاں "گیشا" کہلاتی ہیں۔ گیشا کی تربیت ایک اجارہ دار گیشا
 کے گھر میں ہوتی ہے۔ اسے خاطر مدارات، معاشرتی تہذیب، شیریں سخی، موسیقی اور رقص کی تعلیم دی
 جاتی ہے مختلف شاعروں کے گیت اور اشعار یاد کر لے جاتے ہیں۔ خوبصورت اور حسین بننے کا فن سکھایا
 جاتا ہے۔ بارہ تیرہ سال کی عمر تک اس کی انتہائی سختی سے نگہداشت کی جاتی ہے۔ سترہ اٹھارہ سال
 کی عمر میں وہ اپنے فن میں کمال حاصل کر کے پہلی مرتبہ لوگوں کے سامنے آتی ہے۔ اور اگر خوبصورت
 اور ہوشیار ہو تو ہر جگہ اس کی مانگ ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ اپنے شہر کے تمام ممتاز افراد سے رشتہ
 ہو جاتی ہے۔ اس کی زندگی صرف رات کی زندگی ہے۔ وہ جو اس کھونے کے بغیر ساکی پینا جاتی
 ہے۔ اس کے متعدد شیدائی ہوتے ہیں۔ ایک حد تک اسے اظہار محبت کے لئے آزادی بھی حاصل ہوتی ہے
 "گیشا" لڑکیاں عیاں شانہ قسم کا رقص و سرود بھی جانتی ہیں لیکن معمولی تقریبوں اور مذہب
 حلقوں میں وہ قدیم مقدس جاپانی تلج ناچتی ہیں۔ وہ ہلکی سے ہلکی آواز پیدا کئے بغیر پیالوں میں ساکی
 انڈیلنا جانتی ہیں۔ ان کا لباس نہایت خوش وضع اور قیمتی ہوتا ہے۔ ان کی کمر کے گرد شہزادوں
 کی طرح چمکے ہوتے ہیں۔ ان کے گندھے ہوئے بال خوبصورت اور خوش رنگ پھولوں سے
 آراستہ ہوتے ہیں۔ گیشا کی زندگی ظاہراً نہایت شیریں معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں نہایت
 تلخ ہوتی ہے۔ اور سنسان کمروں کی تنہائی میں بسر ہوتی ہے۔ قدیم زمانے کی گیشائیں بالکل
 کی گیشاؤں جیسی نہ تھیں۔ انہیں میں سے ایک کے متعلق یہ کہانی ہے۔

یشازاکی ٹوسون

پجاری

(جاپانی افسانہ)

دوست اگر ہا اس کو ملا۔

”ٹوزیو تم یہاں؟“ اگر ہا نے کہا۔ کیا تم اس گلی کو گناہ اور حماقت کا سرچشمہ نہیں کہہ کرتے۔ کیا تم لوگوں کو اس میں جانے سے منع نہیں کرتے۔ پھر تم خود یہاں کیسے پھر رہے ہو۔ اسے دیناؤں کے پجاری تمہیں تو اپنے مندر میں ہونا چاہئے تھا۔ جہاں لوگ رات کی خاموشی میں صدیوں کے بوسیدہ منتر پڑھتے پڑھتے اگلے جنم کے خیال میں ادبگئے ہوئے گہری نیند سو جاتے ہیں۔ ٹوزیو مسکایا ”میرے دوست“ اس نے کہا۔ ”کیا اس محتاج رحم گلی میں کسی کا بھول کر آجانا ہتھری یا تمہاری طرح ارادنا اور کسی مطلب کو لے کر آنا؟“ مہربان من! تم یقین جانو کہ تمام دنیا کی کھفتیں ان عورتوں کے دروازے پر دھری رہتی ہیں۔ جب وہ اشاروں سے تم کو بلائیں تو ان کے اشاروں کی پرواہ نہ کرو۔ ان کی چمکیلی آنکھوں اور دلکش باتوں سے، ان کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے جو ہر وقت ”ساکی“ انڈیلتے رہتے ہیں۔ اور ان کے دلفریب ناچ سے دور بھاگو کیونکہ یہ سب چیزیں تنہا ہی اور آگ کی طرف لے جانے والی ہیں۔ ان کے برف کی طرح سفید بازو جو ریشمی آستینوں کے اندر سے بلور کی مانند نظر آتے ہیں اور ان کے گلاب کی طرح رنگین رخسار دیکھ کر مرعوب نہ ہو جاؤ۔ یہ سب ایون کی طرح مہلک اور نقصان دہ ہیں۔ گیشا دیکھنے میں شوخ اور حسین لطیف اور نوحیز نظر آتی ہے۔ لیکن حقیقت میں ایک عیارہ ہے نوجوانوں کو تباہ کرنے والی۔ خاندانوں کا نام مٹانے والی۔

بوڑھا ٹوزیو بدھ مت کا پجاری اپنی دھن میں مست، چلتے چلتے گیشاؤں کی گلی میں جانکلا۔ گیشاؤں کے محلات ٹلی میں دور وہ چلے گئے تھے۔ ان کی ظاہری زیب و زینت اور آرائش کو دیکھ کر اس نے کہا ”گیشاؤں کے عشرت کدوں اور خدائے بدھ کے مندر میں کس قدر فرق ہے۔“

یہ ایک تنگ سی گلی تھی۔ چھوٹی چھوٹی رنگ رنگ کی جاپانی قندیلوں کی روشنی سے منور۔ ٹوزیو نے ایک جگہ لکھا ہوا دیکھا۔ ”سنہری گھر جس میں ادب رہتی ہے۔“ ایک دوسرے مکان پر لکھا تھا۔ ”یہاں ساریشا اپنی دلفریب رعنائی کے ساتھ مقیم ہے۔“ آہ! ٹوزیو نے کہا۔ ”گناہوں میں پھنسے ہوئے لوگوں کے لئے کوئی نجات نہیں۔ یہ ناچنے والی لڑکیاں اس چیز پر کیوں کر غور کر سکتی ہیں جو غور کرنے کے قابل ہے۔ وہ گلی میں سے گزر رہا تھا۔ ایک گھر سے قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اور اس سے ذرا آگے رقص کی بھنگار اور سازوں کی سریلی صدائیں۔ ٹوزیو نے جوش میں آکر کہا۔ ”او غفلت کیشو۔ ایک پل کی خوشی چاہنے والو خدا سے دعا کرو کہ وہ تمہیں چپ رہنے کے فوائد اور زیادہ بولنے کی خرابیوں سے آگاہ کرے۔“ ٹوزیو تیزی سے چل رہا تھا کیونکہ وہ بیتاب تھا کہ وہ شرفا کے بازاروں میں پہنچ جائے۔

قندیلیں ہوا سے ہل رہی تھیں۔ ان کی روشنی میں بوڑھا ٹوزیو اپنی مالا پھیرنا۔ پرار تھا کے منتر گنگنا تا چلا جا رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس گلی سے بہت دور نکل جائے۔ وہ چلا جا رہا تھا کہ اس کا

تمہیں چاہئے کہ ہمارا بدھ کے احکام پر غور کرو۔ ان پر عمل کرنے کی کوشش کرو۔“

اگر ہانے بوڑھے پجاری کے جسم کو چھو کر کما دیکھو کتنا خشک جسم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خون نام کو بھی نہیں۔ بیشک تم ایک بلند مرتبہ پجاری ہو لیکن میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ تم عورتوں کے معاملے میں اپنے آقا کا سا استقلال اور انکسالت نہیں رکھتے تم ان کے معاملے میں ہمیشہ سے سخت اور تنگ دل واقع ہوئے ہو۔ یہ سب اس لئے ہے کہ تمہارا دل دنیا کی لذتوں سے ناآشکارا ہے۔ تمہارا جسم اس مردہ کی طرح ہے جو جڑ سے دفنایا نہ گیا ہو۔

ٹوئیو نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اوگیشاؤں کی گلی میں خوش و خرم پھرنے والے۔ جب تو حد سے بڑھی ہوئی خواہشات سے اکتا جائے اور تیرا دل دنیا کی لذات سے بیزار ہو جائے اور سب سے زیادہ یہ کہ جب تیرے دل کو کوئی عورت اپنی جفا سے توڑ ڈالے تو اس وقت تو میرے پاس آئیو۔ میں تجھے اطمینان قلب اور ابدی زندگی حاصل کرنے کا راستہ بتاؤں گا۔“ پجاری یہ کہہ کر چلا گیا۔

اگر ہا پجاری کو جلتے ہوئے دیر تک دیکھتا رہا۔ اسے اس کی حالت پر رحم آ رہا تھا۔ وہ بولا۔ دنیا کی لذتوں سے محروم۔ کس قدر قابل رحم ہستی ہے۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے خوشگوار زندگی کو ایک مبہوم دنیا کے تصور میں تیاگ رکھا ہے!

اگر ہانے خوش ہو کر کہا یہ خوش قسمتی ہے کہ تمام دنیا پجاریوں کی نہیں کیونکہ پھر گیشاؤں کے لئے کوئی جگہ نہ رہتی۔

پجاری گلی سے جا چکا تھا۔ اگر ہا چلتے چلتے ایک مکان کے آگے آکر رک گیا۔ دروازے پر لکھا تھا۔ خوشبوؤں سے معطر گلی۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔

گھر کی منتظر نے آکر دروازہ کھولا۔ اگر ہا کو پہچان کر بولی۔ میں تمہارا اس ٹوٹے پھوٹے گھر میں آنا باعثِ عزت سمجھتی ہوں مگر تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمام لڑکیاں کسی قریب کے سلسلہ میں باہر جا چکی ہیں۔“

”سب جا چکی ہیں؟“ اگر ہانے یابوس ہو کر پوچھا۔
”ہاں صرف کوہانہ گھر میں موجود ہے۔“ یوشیا گھر کی منتظر نے ہنس کر کہا۔ ”تم کوہانہ سے ملنا چاہتے ہو؟“
اگر ہانے کہا۔ ”یوشیا یہ تمہاری مہربانی اور عنایت ہے کہ تم مجھ سے کوہانہ سے ملنے کو کہتی ہو۔“

یوشیا بولی۔ ”بہت سے آدمی یہاں اسی مطلب کے لئے آتے ہیں۔ بیشتر اس سے شادی کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ وہ سب کے سب اسے بڑی بڑی رقمیں دینے کو تیار ہیں۔ مگر کوہانہ صرف مسکرا دیتی ہے۔ وہ زندگی کو مذاق تصور کرتی ہے۔ کوئی بتا نہیں سکتا کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ وہ انسان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔“

یوشیا نے ایک چھوٹے سے کمرے کے آگے سے ایک خوبصورت اور نقش و نگار سے مزین پرے کو ہٹا کر اگر ہا کو داخل ہونے کی دعوت دی۔ اور خود واپس چلی گئی۔ کمرے میں روشنی بالکل مدہم تھی۔ اگر ہا کو خیال ہوا۔ کہ اکیلا ہے لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس نے دیکھا کہ کوہانہ ایک کونے میں زرنگار فرش پر بیٹھی، چہرے پر چا پانی ساخت کا پنکھا رکھے اس کے پیچھے سے جھانک رہی ہے۔ وہ فاختی رنگ کا خوبصورت لباس جس پر سفید ریشم کے پھول کڑھے ہوئے تھے پہنے بیٹھی تھی۔ ”کوہانہ۔“ اگر ہانے پر اشتیاق لہجے میں کہا۔ ”یوشیا نے میرے دل کو مجروح کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی۔ تم جانو میں تمہارے بغیر زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتا جس دن سے تمہیں خدائے بدھ کے تیوہار پر ناپختہ دیکھا ہے میں تم سے

محبت کرتا ہوں۔

کوہانہ نے ہنس کے کہا۔ ”میں نہیں سمجھتی کہ میں کس کس کی محبت کا جواب دے سکتی ہوں۔ کل رات شہزاد بیباں تھا۔ اس نے مجھ سے محبت کی میٹھی میٹھی اور دلکش باتیں کیں۔“ وہ اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ ”میرا دل ایک خشک جھیل کی مانند تھا۔ لیکن اب ایک انگنا جھیل ہے۔ جو چاند اور تاروں کی روشنی سے نورانی ہے۔“ کیا یہ سوز اور درد سے لبریز تقریر نہیں؟

اکرہانہ نے آزدہ دل ہو کے کہا۔ ”میں ایسی باتوں کی پروا نہیں کرتا۔“

کوہانہ نے کہا۔ ”تو کیا میں آپ کو وہ باتیں بھی سناؤں جو اور لوگ کرتے ہیں؟“

”نہیں ہرگز نہیں۔“

”آپ ناراض ہیں۔ میں آپ کی پیشانی پر غصے کی علامات دیکھتی ہوں۔ اگر ایسا ہی ہے تو میں آپ کے لئے گیت گاسکتی ہوں۔ اور ناچ ناچ سکتی ہوں۔ اکرہانہ میں چاہتی ہوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ تم مجھے کسی کام کا حکم دو۔“

”نہیں کوہانہ۔“

”نہیں کوہانہ! کوہانہ نے اکرہانہ کے الفاظ کو دہرا کے کہا۔“

”اچھا تو میں تمہارے لئے ارغوانی ساکی کا جام بھر سکتی ہوں۔ میں تمہاری خوشی کے لئے سب کچھ کر سکتی ہوں۔ اکرہانہ آج تمہاری صحبت کس قدر خشک ہے شاید میرے لفظوں سے تمہارے نازک دل کو رنج پہنچا ہے۔ میں شام سے اکیلی۔ دھندلے تصورات لئے مغموم بیٹھی تھی۔ تمہاری آمد سے میرے دل کو بیدار مسرت حاصل ہوئی۔ لیکن غلطی سے میں نے تمہارے سامنے دوسروں کا ذکر کر کے تمہیں افسردہ کر دیا۔ اکرہانہ اب میری خاطر مسکرا دو۔ تمام باتوں کو بھول جاؤ۔ تمہارا آنا میرے لئے باعث عزت ہے۔“

”نہیں کوہانہ میں افسردہ نہیں۔“ اکرہانہ کی آواز خطرناک رہی تھی۔ ”تم ایک دلکش اور چمکیلے پروں والی تیتری کی مانند ہو جو گلشن میں خوش رنگ پھولوں کا رس چوستی رہتی ہے۔“

”اکرہانہ یہ کس قدر بلند خیالی ہے۔ تم شاعروں کے سے جذبات رکھتے ہو۔“

مگر اکرہانہ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”کوہانہ محبت کے چمن میں ایک پھول ہے جو چاہتا ہے کہ خوبصورت پروں والی تیتری ہر وقت اس کے ارد گرد منڈلاتی رہے۔ اس کی خواہش ہے کہ وہ کسی دوسرے پھول کے پاس نہ جائے۔“

”کچھ سمجھتی ہو کوہانہ؟“

”شاید۔“ کوہانہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور ایک مرصع آئینہ اٹھا کر زنگار سنگار دان سے سنگار کی اشیائیں نکالیں۔ اپنے بالوں کو درست کیا۔ لبوں پر مسی کی ایک اور تہ جلائی اور خوش رنگ غازہ سے اپنے رخساروں کو جلادی۔ اور عرصے تک آئینہ میں اپنا منہ دیکھتی رہی۔

آخر کوہانہ نے اپنی خوبصورت آنکھوں کو آئینہ سے اٹھایا اور ایک دلکش انداز سے کہا۔ ”اکرہانہ تمہاری تیتری کے بازو ہمیشہ خوبصورت نہیں رہیں گے۔ وقت قریب ہے کہ تیتری شکستہ پر ہو جائیگی۔ تم اپنی تیتری کے حسن اور اس کی زندگی کو سمجھنے میں غلطی کر رہے ہو۔“

”کچھ بھی ہو لیکن میں نہیں چاہتا کہ میری تیتری کسی اور پھول کو پسند کرے۔ میری ہی تمنا ہے کہ وہ میری ہو کر رہے۔“

کوہانہ نے کہا۔ ”لیکن جب تیتری ایک پھول سے اڑ کر دوسرے پھول تک نہ جاسکے گی تو اس کی خوبصورتی مٹ جائیگی۔ کس قدر دردناک انجام ہے۔“

”نہیں میں اسے ایک شاندار انجام سمجھتا ہوں۔ کوہانہ میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔“

”اگر ہا میں تمہارے مصائب کو اچھی طرح جانتی ہوں ان سب سے زیادہ جو یہاں آتے ہیں اور جنہوں نے آج تک مجھے چاہا ہے میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔ مگر اگر ہا یہ ہرگز نہ بھولو کہ میں دیوتاؤں کے آگے اور امرا کے سامنے بیاہ شادی یا تیوہار کے موقع پر نلچنے والی گیشا ہوں۔ ہم نے دیوتاؤں کے روبرو زندگی کو یونہی بسر کرنے کی قسم کھائی ہے۔ ہمیں اس زندگی سے آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ گو ہم میں سے بعض اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر شادی کر لیتی ہیں۔ مگر میں کبھی ایسا نہ کرونگی۔ میں اپنی قسم کو ہرگز نہ توڑ دوں گی“

اگر ہا نے اس کی طرف رحم بھری نظروں سے دیکھا۔ اور کہا ”جب ہم محبت کرتے ہیں تو صاحب عقل نہیں ہوتے۔ محبت ایک سمندر ہے۔ جب جوش میں آتا ہے تو ہر ایک چیز کو ہمارے دل سے امید منقطع نہیں ہوگی۔ میں متواتر آتا رہوں گا۔“

”اگر ہا تمہارا آنا کچھ مفید نہ ہوگا۔ تمہیں سب کچھ بھول جانا چاہئے۔“

کوہانہ کے خوبصورت ہاتھ کو جو ہلکے خاکی رنگ کی آستین سے باہر نکل آیا تھا اگر ہا نے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ پھر یکایک اسے اپنے ہونٹوں تک لے گیا۔ اور کچھ کے بغیر چلا گیا۔

اگر ہا ہفتوں کوہانہ کو دیکھنے اور ملنے کے لئے آتا رہا۔ کوہانہ ہمیشہ خندہ پیشانی اور نپاک سے اس کا استقبال کرتی تھی۔ لیکن بار بار واپس چلے جانے کو کتنی تھی۔ ایک رات کوہانہ نے کہا اگر تم کو مجھ سے سچی محبت ہے تو اس محبت کا واسطہ دے کر میں تم سے کتنی ہوں کہ تم میری یاد اور الفت کو شہر کے ہنگاموں سے دور سمندر کے ساحل پر انسان کی نظر سے پوشیدہ دفن کر آؤ تمہارا رنج و غم بیسود ہے اور میرے لئے تکلیف دہ۔ تمہارا چہرہ

اور اس کی یاد میری راتوں کے پر مسرت لمحوں میں آکر حائل ہوتی ہے۔ تم میری روح میں آہستہ آہستہ غم بن کر سمائے جا چکے ہو۔ راحت کے خواب دیکھنے والی تیری۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور خوش رنگ بادلوں میں رہنا چاہتی ہے“ میں تادم مرگ ہمیں رہا کرونگی اگر ہا۔ تادم مرگ“ کوہانہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اگر ہا نے آج تک اس کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھے تھے۔ اس نے ایک آہ بھر کر کہا۔ ”کوہانہ کیا واقعی تمہارا دل یہی چاہتا ہے کہ میں ہمیشہ کے لئے چلا جاؤں۔ میں اپنے خوابوں کی تعبیر نہ دیکھوں اور اپنی محبت کے شجر کو پھلنے پھولنے سے پہلے اپنے ہاتھوں آپ ہی تباہ و برباد کر دوں۔ اگر تمہاری یہی مرضی ہے اور تم دل سے یہی چاہتی ہو تو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اپنی محبت کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دوں گا۔ تم مجھے کبھی نہ دیکھو گی“

کوہانہ بالکل چپ تھی۔

”خدا حافظ“ اگر ہا نے کہا۔ اب تم بھی مجھے ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ۔“

اس نے اپنی زندگی میں آخری بار کوہانہ کے ہاتھ کو چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ اور کہا۔ ”کوہانہ اپنی آنکھیں بند کر لو میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے جانتے ہوئے نہ دیکھو۔ یہ بات میرے لئے رنج دہ ہے کہ خوش رنگ تیری کوئی پردہ نہ نظارہ دیکھے“

کوہانہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جب اس نے انہیں کھولا تو اگر ہا جا چکا تھا۔ اس نے کہا۔ ”یہی بہتر ہے“۔ اور آہستہ سے سر اٹھایا۔ مگر —

اکر باگیشاؤں کے کوچہ سے ہمیشہ کے لئے جا رہا تھا اسے علم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ وہ چلتے چلتے اس مندر کی طرف جا نکلا جہاں بڑھا پجاری ٹوڑیو رہتا تھا۔

بڑھے ٹوڑیو نے اپنے دوست کو پہچان لیا۔ اس نے کہا۔ ”میرے دوست معلوم ہوتا ہے کہ تم مجھے ملامت کرنے آئے ہو۔ تم مجھے بیوقوف کہنے آئے ہو۔ اس کے علاوہ شاید تم یہ بھی کہو گے کہ گیشا اس دنیا پر ایک حور آسمانی ہے۔ اس کے عشرت کدوں میں جنت سے بڑھ کر لطف ہے۔ اس کی محبت حاصل کچھینی باغ حیات ہے۔

اکر باتکان سی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”نہیں میں اطمینان قلب حاصل کرنے آیا ہوں۔ میں دنیا کی آلائشوں سے بچ کر خدائے بدھ کے نروان تک پہنچنے کا صحیح راستہ معلوم کرنے کے لئے آیا ہوں۔ اے دوست میری مدد کر۔“

پجاری اگر دنیا سے نفرت کا سبق دے سکتا تھا تو اس کا دل دنیا داروں کو خدا کی طرف بھی بلا سکتا تھا۔ اگر وہ کسی سے نفرت کرنا جانتا تھا تو شفقت کرنا بھی جانتا تھا۔ خدائے بدھ کا پجاری لوگوں کا بھردار اور مہربان باپ تھا۔ اس نے اکر ہا کے محبت کے میدان میں ہزیمت خوردہ دل کو تسلی دی اور کہا۔ ”کوئی غم نہ کرو۔ تمہارے دل کا زخم بہت جلد مندمل ہو جائیگا۔ اور تمہارے ٹوٹے ہوئے دل کو راحت میسر ہوگی۔ خدائے بدھ کی برکت سے تم لافانی اطمینان حاصل کرو گے۔ گیشا کی فانی الفت کی یاد تمہارے دل و دماغ سے جاتی رہیگی۔ میرے دوست تم یقین رکھو کہ حد سے بڑھی ہوئی خواہشات سے بچ کر تم آخری نروان حاصل کر لو گے۔“

دیوتاؤں کے استغنان پر رہنے والے اکر ہا کو آخر کار ایک غیر فانی اطمینان حاصل ہو گیا۔ اس کے دل سے کوہا کی یاد بالکل جاتی رہی۔ کا ما کو رو کے مندر میں بدھ مت کا

پجاری شکتی حاصل کرنے کی دھن میں دن رات سداہی لگائے بیٹھا رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ امیدہ بدھ کے بت کے سامنے اس کے حلیم اور خاموش چہرے سے نروان حاصل کرنے کی فکر میں چپ چاپ اپنا جیون سپین کرنے کو بیٹھتا۔ شام اور صبح کی مدھم روشنی میں وہ یوں محسوس کرتا کہ خدائے بدھ خود وہاں تشریف رکھتے ہیں۔ اس پتھر کی مورت کے آگے اس کا دل خود بخود جھک جاتا تھا۔ اور وہ سمجھتا تھا کہ وہ راحتوں سے بھرپوری دنیا کی طرف پرواز کر رہا ہے۔ اس کی مسرت اور خوشی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ اس کی فقط ایک ہی خواہش تھی اور وہ دن رات دعائیں کرتا تھا۔ کہ دنیا کی آلائشوں سے پاک ہو کر ابدی نجات حاصل کر لے۔

ایک دن امیدہ بدھ کی مورت کے سامنے ایک لڑکا ایک پرندے کو مانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پرندے کا بازو زخمی ہو چکا تھا اس نے کمال شفقت سے اسے اٹھایا اور لڑکے سے کہا۔ ”کسی جاندار کے مانے کی کوشش نہ کرو کیونکہ ہر جاندار چیز خدائے بدھ کو پیاری ہے۔“ اکر ہا پرندے کو اپنے ساتھ لے گیا اور جب ایک دو دن کی تیمارداری کے بعد اس کو مکمل آرام ہو گیا تو اکر ہا نے اسے آزاد کر دیا۔ پرندے کی آزادی پر اس کی خوشی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ بیکس پرندے نے خوشی کے ساتھ نیلے اور وسیع آسمان کی طرف اڑان لی اور پھر ایک درخت پر بیٹھ کر نہایت خوش الحانی کے ساتھ خدا کی تعریف میں ایک گیت گایا۔ پجاری نے اس سے پہلے کبھی اتنی خوشی محسوس نہ کی تھی۔ اس کی روح انتہائی مسرت سے لبریز تھی۔

ایک دن موسم بہار کی صبح کو مندر کے باہر خوش رنگ اور خوبصورت پھول کھلے ہوئے تھے۔ خوشگوار فضا میں چھوٹے چھوٹے پتے کھیل رہے تھے۔ اکر ہا مندر کے صحن میں بیٹھا تھا۔ اس نے دور کر میں ایک عورت کو اپنی طرف آنے دیکھا۔ وہ حیران ہوا۔

کیونکہ کاما کو روکے مندر میں آج تک اس نے عورت کی صورت نہ دیکھی تھی۔ عورت مندر کی طرف آہی تھی۔ اس نے اپنے چہرے پر ایک موٹا سا نقاب ڈال رکھا تھا۔

”اکرہا“ عورت نے نہایت آہستہ سے کہا۔

”تم ہو؟“ پجاری بولا۔ اس نے کوہانہ کی آواز کو پہچان لیا تھا۔ کوہانہ کی آواز میں اب کوئی شیرینی باقی نہ تھی۔ ”تم کیوں آئی ہو؟“

کوہانہ نے نقاب اٹھا کر کہا۔ ”اکرہا جب سے تو نے مجھے چھوڑا ہے میرا دل بادشمال کے تیز اور تند جھونکوں کی طرح آوارہ بھٹکتا رہتا ہے۔ میں محبت کی آگ میں پھنس کر رہی تھی۔ میں نے اُسے سمجھانے کی بجد کوشش کی۔ لیکن جذبات کی آگ کچھ نہ سکی۔ تیری محبت روز بروز بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ میں تیری تلاش میں چل نکلی اور آخر کار میں نے تجھے ڈھونڈ لیا۔ مجھے لگاؤں والوں نے بتایا تھا۔ کہ تم پجاری بن چکے ہو۔ میرے لئے لازم تھا۔ کہ میں اس بات کے معلوم ہونے پر واپس لوٹ جاتی۔ مگر میں واپس نہیں گئی۔ ایک ٹنگستہ پر تیری تیری الفت کی یاد میں مر رہی ہے۔“

اکرہانے جواب دیا۔ ”بیسود ہے۔ کوہانہ تم بہت دیر سے آئی ہو۔ میں نے اپنا تن من سب کچھ خدائے بدھ کی نذر کر دیا ہے تیرے لئے اب کچھ باقی نہیں رہا۔ تو واپس لوٹ جا۔ لیکن گیشاؤں کی گلی کی طرف نہیں بلکہ اس راستے کو اختیار کر جو نجات کا راستہ ہے۔“ کوہانہ کے دل پر ایک چوٹ لگی۔ وہ کیسے یقین کر لیتی کہ اکرہا جو پجاری بنا اس کے سامنے بالکل جیس دھرتی بیٹھا تھا۔ اب اس کا دلدادہ نہیں رہا۔ وہ کیسے مان لیتی کہ وہ لب جنہوں نے ایک دن اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا تھا۔ اب اسے ہمیشہ کے لئے دھتکار دیں گے۔

اس نے کہا۔ ”اکرہا تمہاری محبت کیا ہوئی؟“

اکرہانے ایک ہلکا سا سانس لے کر کہا۔ ”وہ ایک خواب تھا۔ کوہانہ تمہاری ہر بات کو اگر تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ۔“

کوہانہ نے جواب دیا۔ ”ابھی نہیں۔ اکرہا میں تمہارے منہ سے محبت کا ایک لفظ سن کر جاؤنگی۔ فقط ایک لفظ۔ کیا تیرے نبچھے ہوئے دل میں محبت کی کوئی چنگاری باقی نہیں؟“

”میں جواب دینے سے معذور ہوں۔“

”میں ضرور جواب لے کر جاؤنگی۔“

”اگر تمہیں میرا جواب سننے کی ایسی ہی ضد ہے تو آج رات نہیں میرا جواب مل جائیگا۔ اکرہا کی آواز میں درد تھا۔ اس نے کہا لیکن کوہانہ تجھے یاد ہوگا کہ ایک وقت تھا۔ جب میری محبت تجھے خوشی دینے کے بجائے رنج دیتی تھی۔“

”ہاں مجھے یاد ہے۔ میں نے تجھے ہمیشہ کے لئے رخصت کر دیا تھا۔“

”نہیں تو نے مجھے فقط چلے جانے کو نہیں کہا تھا بلکہ اپنی محبت کو دور سمندر کے ساحل پر دفن کر دینے کو کہا تھا۔ کوہانہ اگر تجھے کو مجھ سے اب محبت ہے۔ تو مجھے بھی اس وقت تجھ سے محبت تھی اس لئے میری حالت پر رحم کر اور جواب سننے سے پہلے واپس لوٹ جا۔“

کوہانہ پجاری کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ محبت کی بھوکی تھی۔ اس نے کہا۔ ”میں نہیں جانتی تیرا کیا مطلب ہے۔ مگر آج میں جواب سننے کے لئے ضرور آؤنگی۔“

اکرہانے کہا۔ ”اگر تیری ہی مرضی ہے تو آج آدھی رات کے وقت تو جواب سن لیگی۔ اس کے چہرے پر غم اور رنج کے آثار تھے۔ کوہانہ اس کی عظمت کی تاب نہ لاسکی۔“

آدھی رات سے پیشتر کوہانہ مندر کی طرف لوٹ آئی۔ اس نے دیکھا۔ اکرہا باہر صحن میں چاند کی روشنی میں سادھی لگا کے

معطر تھی۔ سمندر سے دور سمندر کی موجیں میٹھے راگ الاپ رہی تھیں۔

اکر ہا عبادت میں مشغول تھا۔

”کیا میں آنکھیں کھول دوں اکر ہا۔ میں تمہاری پرارتھنا سننا چاہتی ہوں۔“

لیکن اکر ہا کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔

سمندر کی لہروں کی آوازیں اور ہوا کی سرسراہٹ۔ اس کے سوا کو ہانہ کے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

وہ بہت دیر تک انتظار کرتی رہی۔ اس نے تنگ آکر نقاب اتار ڈالا۔ اور آنکھیں کھول دیں۔

فضا میں ایک چیخ گونجی — پجاری کی پر نور لاش امید بھ کی گود میں جیس وحرت پڑی تھی۔

”آہ تیرا جواب“! اس نے روکے کہا۔ ”میں نہ سمجھتی تھی کہ تیرا جواب اس قدر خوفناک ہو گا۔“ پھر وہ امیدہ بدھ کے

بت کے سامنے جھک گئی اور ایک فاتحانہ انداز میں بولی۔ ”اے خدائے بدھ اکر ہا میرا ہے وہ میرا ہی ہو کر رہیگا۔۔۔۔۔“

امیدہ بدھ کا بت روح پرور چاندنی سے پر نور یوں معلوم ہوتا تھا کہ خدائے بدھ خود یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ پجاری کی پر نور

لاش پر کو ہانہ کا جیس وحرت جسم پڑا تھا۔

مترجم فضل حسین

بیٹھا ہے۔ اس کے چہرے پر مسرت کھیل رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسافر اپنی منزل تک پہنچ گیا ہے۔

”تو بہت جلد آگئی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے تو جواب لئے بغیر نہ جائیگی۔“

کو ہانہ بولی۔ ”ہرگز نہیں۔“

”اگر تیری یہی مرضی ہے تو اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں لے۔ تیرا ہاتھ کانپ رہا ہے کو ہانہ! اکر ہا نے کہا۔ ”ہم ٹھوڑی دور تک سفر کریں گے۔“

وہ مندر کے صحن میں سے گذر رہے تھے۔ کو ہانہ نے اس پر بہت سے سوال کئے۔ مگر پجاری نے کسی کا جواب نہ دیا جب وہ ”یشو“ کے بت کے پاس سے گزرے تو اکر ہا نے مشتاق نگاہوں سے اس کے سنجیدہ اور پروقاہ چہرے کی طرف دیکھا۔

اکر ہا نے دہلی زبان سے کہا۔ ”معاف کرو۔“ ان لفظوں کو کو ہانہ سن نہ سکی۔ اکر ہا کا چہرہ فوراً طینان سے چمک رہا تھا۔

چاندنی امیدہ بدھ کے بت پر مندر کے صحن میں، باہر سڑک پر، سنہری بادلوں پر، آسمان پر پھیلی ہوئی تھی۔ اکر ہا نے کو ہانہ سے

کہا ”مجھ کو، جواب دینے سے پہلے میں آج رات امیدہ بدھ کی پرارتھنا کرنی چاہتا ہوں۔ میں تجھ سے ملتی ہوں کہ ٹھوڑی دیر کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لے اور منہ پر نقاب ڈال لے۔“

کو ہانہ نے ایسا ہی کیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور

چہرے پر نقاب ڈال لیا۔ ہوا سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی۔ اور کف

بوس پلنیاک لومر دیوتا

مصنف کی یاد میرے دل میں تازہ ہو گئی۔

اس رات میں نے 'صوفیہ نگاکی' سے متعلق وہ سارے حالات پڑھے جو اس نے روس کو واپس جانے کے لئے پاسپورٹ حاصل کرنے کی غرض سے اپنی درخواست میں قلمبند کئے تھے۔ بات یوں ہوئی کہ جو روسی باشندہ غیر ملک سے اپنے وطن کو مراجعت کرنے کا آرزو مند ہوا اسے عرضداشت میں اپنے "مختصر سوانح حیات" درج کرنا پڑتے ہیں۔ اس نفاذہ کے تحت میں 'صوفیہ نگاکی' نے اپنی زندگی کے واقعات لکھنے میں اختصار کے بدلے تفصیل سے کام لیا۔ اور ایک اچھی خاصی خود نوشت سوانح عمری تیار کر ڈالی اور اسے اپنی درخواست کے ساتھ منسلک کر دیا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے صوفیہ کی زندگی کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب اس کا ہماز جاپانی بندرگاہ 'سروگا' میں داخل ہوا۔

اس کے حالات اپنی نوعیت میں غیر معمولی اور ان لاکھوں روسی عورتوں سے مختلف ہیں۔ جن کی زندگی کی تفسیر پہلی محبت شادمانی، خاموند، بچہ، اور سویٹ روس میں مضمر ہے اور بس۔

اس کہانی میں ایک مرد ہے اور ایک عورت۔ گذشتہ ماہ اگست کے آخری ہفتے میں مجھے 'ویڈی ڈاسک' جانا پڑا۔ اس شہر کا اثر میرے دل پر ایک تیز و تند شراب کی مانند ہوا۔ یہاں صاف ہوا کے طوفان نیلے سمندر سے آتے ہیں۔ آفتاب کی کرنیں طلائی آبشار کی طرح لاجوردی آسمان سے گرتی ہیں۔ بڑی

مجھے جاپانی مصنف نگاکی سے پہلی مرتبہ ملنے کا اتفاق ٹوکیو میں ہوا یہی ہماری آخری ملاقات تھی۔ ایک ادبی مجلس میں متعارف ہونے کے بعد ہم نے جو باتیں کیں وہ میرے ذہن سے اتر چکی ہیں مجھے صرف اس قدر یاد ہے۔ کہ اس کی بیوی روسی تھی۔

سانو لارنگ میاں قد چاق چوندا اور خوب رو یعنی اتنا خوب و جتنا ایک جاپانی ایک یورپین کی نظر میں ہو سکتا ہے۔

مجھے معلوم ہوا کہ دنیائے ادب میں اس کی شہرت کا ذریعہ ایک ناول تھا جس میں اس نے ایک یورپین عورت کا نفسیاتی تجزیہ کیا تھا وہ میری یاد سے ان ہزار ہا لوگوں کی طرح جو مجھے اتفاقیہ ملے بالکل محو ہو جاتا۔ اگر —... لیکن جاپانی شہر 'کو بے' میں روسی فضل جزل کا سکرٹری میرا دوست کامریڈ ژور با مجھے ایک شام شہر کے باہر پہاڑی پر لے گیا۔ جہاں وہ معبد ہے جسے 'لومر کا مندر' کہتے ہیں جاپانی علم الامناسم میں لومر مکاری اور عیاری کا دیوتا ہے۔ اور اگر کہیں اس کی روح کسی شخص کے جسم میں حلول کر جائے تو اس کے سارے خاندان کا ناش ہو جاتا ہے۔

مندر کے قریب ایک سرائے ہے۔ جہاں ٹھنڈی بیر ملتی ہے ٹھنڈی بیر ہوشمشاد کے درختوں میں ہوا سرسرا رہی ہو سامنے سمندر کی نیلگوں موجیں رقص کر رہی ہوں۔ تو غیر سرزمین میں دو ہوطن خوب باتیں کر سکتے ہیں۔

یہاں کامریڈ ژور بانے مجھے وہ واقعہ سنایا جس سے 'نگاکی'

بڑی ناہوار اور مہیب چٹائیں دور تک پانی میں چلی گئی ہیں۔ جن پر سمندر کی لہریں سرنگراتی ہیں۔ سفیدہ کی خوشبو فضا میں طاری و ساری ہے۔

’صوفیہ ویسویا‘ اسی شہر میں پئی تھی۔ ثانوی سکول کا نصاب ختم کرنے کے بعد وہ معلمہ ہو گئی۔ اور پرانے روس کی دوسری لاکھوں لڑکیوں کی طرح شادی ہونے تک پنشن کے ناول پڑھتی رہی۔ اس نے چیخوف کے انسان بھی پڑھے جو نیوا میگرن میں صنیہ کے طور پر چھپتے تھے۔ پنشن کے الفاظ میں یہ لڑکی ”خدا ہمیں معاف کرے کس قدر بے وقوف واقع ہوئی تھی“ اٹھارہ سال کی عمر میں اس نے اپنے قلبی میاں کی روشنی میں اپنے گرد و پیش کے حالات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ جاپان کے ریشمی کونو جسے خود جاپانی نہیں پہنتے بلکہ غیر ملکوں کے پاس فروخت کی غرض سے تیار کرتے ہیں بہت خوبصورت ہیں۔ دنیا بھر کا انصاف سٹی مجسٹریٹ پر ختم ہے جو سلام کا جواب منہں کر دیتا ہے۔ ”رومان کی دنیا“ ایوان ساٹ لالچ تک محدود ہے جو اس سے چھپ چھپ کر پیار کرتا تھا۔ ادب کی کائنات اس طاق میں ہے۔ جہاں پنشن اور چیخوف کی کتابیں قریب سے پڑی تھیں۔

پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے اس لڑکی نے جو حالات اپنی درخواست میں منضبط کئے۔ انہیں پڑھنے کے بعد مجھے اور میرے دوست کامریڈ ژوربا کو تعجب ہوا۔ کہ اس نے اپنے سوانح حیات میں ان ہنگامہ خیز واقعات کی طرف اشارہ تک نہیں کیا جو اس زمانہ میں ہماری زندگی کا لازمی جزو بن چکے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں جاپان کی شاہی فوج مشرق بعید کے روسی حصے میں مقیم تھی۔ تاکہ وہ حصہ جاپان کے زیر نگین آجائے۔ اور یہ عام بات ہے کہ روس نے اس فوج کو اپنے یہاں سے نکال دیا۔ صوفیا گاکا کی کی خود نوشت سوانح عمری میں اس کشمکش کے متعلق ایک لفظ بھی موجود نہیں۔ کیا وہ ان واقعات سے غیر متاثر رہی؟

تنگا کی جاپانی فوج متصرفہ کے جنرل سٹاف کا افسر تھا۔ ویلڈی واسک میں اس کی اقامت اس مکان میں تھی جس کے ایک چھوٹے سے کمرے میں صوفیہ رہتی تھی۔ صوفیہ اپنی سوانح عمری میں اس کے متعلق لکھتی ہے :-

”ہر شخص حیران تھا کہ تنگا کی ہر روز دو مرتبہ نہاتا ہے۔ رات کو ریشم کی قمیص اور پاجامہ پہنتا ہے۔ وہ اس کا احترام کرنے لگے شام کو وہ ہمیشہ گھر ہی میں رہتا تھا۔ اور ان روسی شعر اور افسانہ نگاروں کے شعر اور افسانے بلند آواز سے پڑھا کرتا تھا جن سے میں واقف تک نہ تھی۔ وہ روسی زبان میں بخوبی باتیں کر سکتا تھا۔ گو اس کا روسی تلفظ کچھ ایسا عجیب و غریب تھا کہ میں اسے سن کر بے اختیار ہنس پڑتی تھی۔ ایک شام اس نے کہا :-

”ممکن ہے مادام کو دعوت دینا خلاف آداب ہو۔ لہذا میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔“

میں گھبرا گئی۔ اور ”معاف فرمائیے“ کہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دوسرے دن وہ میرے کمرے میں آیا اور اس نے مجھے چاکولیٹ کا کبس دیا۔ تکلف اور دضعداری کو مد نظر رکھ کر۔ جاپانی افسر کے اخلاق سے صوفیہ بہت متاثر ہوئی۔ وہ ایوان ساٹ لالچ سے کتنا مختلف تھا۔ جو تاریک گوشوں میں اس سے پیٹنے کی کوشش کرتا اور بوسہ لینے پر اصرار کرتا۔ تنگا کی تھیسٹر میں صوفیہ کے لئے بہترین نشست منتخب کرتا۔ اور تماٹھے ختم ہونے پر اس نے کبھی صوفیہ کو کسی ہوٹل میں جانے کے لئے نہیں کہا۔

صوفیہ نے اس جاپانی افسر کے اوصاف حمیدہ کے متعلق اپنی ماں کو طویل چٹھی لکھی۔ اور اپنے اعترافات میں اس نے شرح و بسط سے بیان کیا ہے کہ کس طرح ایک رات وہ معمول سے زیادہ دیر تک میرے کمرے میں بیٹھا رہا۔ اور پھر یکایک اٹھ کر چلا گیا۔ وہ اس کا سبب سمجھ گئی۔ کہ محبت کا بے پناہ طوفان جاپانی کے دل

میں اٹھ رہا ہے۔ اور وہ اس کا اظہار کرنا نہیں چاہتا۔ وہ کتنی رات گزرے تک سو نہ سکی۔ اور تکیہ اس کے آفتاب سے تریتر ہو گیا۔ اُسے احساس ہوا۔ کہ یہ اجنبی میرے لئے ایک عجیب اور پر از اسرار شخصیت ہے۔ صوفیا کے اپنے الفاظ میں :-

کچھ مدت بعد "عشق کی وہ آگ جسے یسوع مسکون کے ساتھ چھپا سکتا تھا میرے دل میں بھی مشتعل ہونے لگی۔ جاپانی افسر نے اپنا اظہار محبت 'ٹرجینیف' کے ہیرو کے انداز پر کیا۔ فوجی وردی میں لمبوس سفید دستاں پہنے ہوئے چھٹی کے دن صبح کے وقت مالک مکان کی موجودگی میں اس نے اپنا سب کچھ صوفیہ کے قدموں پر ڈال دیا۔

ایک ہفتے کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ سرخ فوج غفریب شہر میں داخل ہونے والی ہے۔ اور اب میرے لئے جاپان کو جانا ناگزیر ہو گا۔ تم میرے بعد آ جانا۔ جاپان کے فوجی ضابطے کی رو سے کوئی جاپانی افسر کسی غیر ملکی عورت کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔ اور پھر جنرل سٹاف کے افسر مقررہ وقت سے پیشتر شادی کرنے کے مجاز نہیں۔

اندریں حالات اس نے تاکید کر دی۔ کہ میں اس وقت تک سارے معاملے کو صیغہ راز میں رکھوں جب تک وہ ملازمت سے سبکدوش نہ ہو لے۔ یہ قرار پایا کہ میں اس اثنا میں اس کے والدین کے پاس رہوں جو ایک جاپانی گاؤں میں رہتے تھے۔ اس نے پاسپورٹ کے علاوہ ڈیڑھ ہزارین متفرق اخراجات کے لئے میرے حوالے کر دیے۔۔۔۔۔

مجھے جاپانی بندرگاہ مروگا میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہاں کے جاپانی بھی جاپانی پولیس کو "انو" کے بہتک آمیز خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ انوکے معنی ہیں کتا پولیس والوں نے نہ صرف صوفیا کے اسباب کی تلاشی لی بلکہ اس

کے راز ہائے اندرون پر وہ کو معلوم کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ وہ اسے پولیس سٹیشن میں لے گئے۔ اور وہاں جو کچھ ہوا وہ اس کے اپنے بیان سے ظاہر ہے :-

"میں سارا دن حوالات میں رہی۔ وہ مجھ سے بار بار پوچھتے تمہارا یہاں آنے سے کیا مطلب ہے۔ تنگائی سے تمہارا کیا تعلق ہے۔ اس نے نہیں سفارش کی چھٹی کیوں دی۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ مجھے کہنا پڑا کہ میں تنگائی سے منسوب ہوں اس اعتراف کے بعد وہ میرے لئے کچھ چاول اور لکڑی کے دو چھپے لائے۔ جن کا استعمال میرے لئے معتمہ تھا۔"

اسی شام کو تنگائی پولیس سٹیشن میں اس کے پاس پہنچ گیا اس کے ہمراہ پولیس کمشنر تھا۔ جب اس سے صوفیہ کے متعلق سوالات کئے گئے تو اس نے مردانہ وار ساری حقیقت بیان کر دی۔ پولیس کمشنر نے اسے بار بار جاپانی فوجی ضابطہ کی سخت گیری کا حوالہ دیا اور کہا اس لڑکی کو واپس بھیج دو لیکن تنگائی نہ مانا۔ تنگائی اپنی منسوبہ کو لئے ریلوے سٹیشن پر آیا۔ اور ٹرجینیف کے ہیرو کی طرح اس کا بوسہ لے کر اسے ٹرین پر سوار کر دیا۔ اس نے صوفیہ سے کہا :- "اوسا کا میں میرا بھائی تھا اے استقبال کے لئے سٹیشن پر موجود ہو گا۔ مجھے فی الحال کچھ کام ہے۔"

تنگائی رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔ اور ٹرین کا لے پہاڑوں میں پیچ کھاتی چلی گئی۔ صوفیہ کے دل و دماغ پر گہری افسردگی طاری ہوئی۔ وہ بار بار تنگائی کی محبت کے جذبہ سے پر اضطراب تنہائی کے احساس کو دور کرنے کی کوشش کرتی۔ گاڑی کی محدود روشنی کے سوا کھڑکیوں کے باہر ہر چیز تاریکی میں جذب ہو رہی تھی۔ ہر چیز اس کے فہم و درک سے بالاتر تھی۔ وہ گھبرا گئی دہشت زدہ ہو گئی۔ گاڑی میں جاپانی مردعوں اور بچے سونے سے پہلے ایک دوسرے کے سامنے کپڑے

اتار رہے تھے۔ سٹیشنوں پر چھوٹی بوتلوں میں گرم چائے اور لکڑی کے ڈبوں میں چاول مچھلی مولیاں ایک چھوٹا سا کاغذی رومال ایک خلال اور لکڑی کے دو چھچھے لینے کے لئے مسافر کھڑکیوں میں سے ہاتھ پھیلاتے تھے۔ پھر گاڑی میں روشنی بجھ گئی۔ لوگ سو گئے۔ وہ ساری رات سو نہ سکی۔ اداسی تنہائی اور خوف کے مارے سو نہ سکی۔ وہ کچھ سمجھ نہ سکی کہ کیا بات ہوگی۔

اوسا کا میں پلیٹ فارم خالی ہونے پر وہ سٹیشن سے باہر نکلی۔ دو دنوں سے پر ایک شخص بھورے رنگ کا دھاری دار کمونو پہنے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ تنظیماً جھکا۔ اس نے اپنا کارڈ پیش کیا۔ اور صوفیہ کے بازو کو چھوتے ہوئے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ روسی کا ایک لفظ نہیں جانتا تھا۔ جب ان کی موٹر کار شہر میں داخل ہوئی۔ تو شہر کی روشنیوں بلند عمارتوں اور شور سے صوفیہ کے ہوش اڑ گئے۔ ولید ڈی واسٹک اس عظیم شہر کے مقابلہ میں ایک گاؤں تھا۔ ایک رسٹوران میں اس نے انگریزی طرز کا ناشتہ کھایا۔ تنگائی کا بھائی اس اثنا میں مسکراتے ہوئے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر وہ ایک اور ٹرین میں سوار ہوئے گری شام کے وقت وہ اترے۔ اس کی قوت ارادی مسلوب ہو چکی تھی۔ وہ رکشا میں بیٹھ گئی۔ شہر کی آبادی میں سے گزرتے ہوئے جہاں گھر سبزہ زاروں میں چھپے تھے وہ پہاڑی کی بلندی پر آگئے۔ جہاں سمندر کی لہریں گونجتی تھیں۔ رکشا ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ مکان میں سے ایک بوڑھا ایک بڑھیا بچے اور ایک نوجوان عورت باہر نکلی۔ سب نے کمونو پہن رکھے تھے۔ ان کے پاؤں میں لکڑی کی کھڑاویں تھیں ان میں سے کسی نے صوفیہ کے ساتھ مصافحہ نہ کیا۔ بلکہ انھوں نے اس کے پاؤں کی طرف اشارہ کیا۔ پھر اس کے منسوب کے بھائی نے اسے بچہ پر بٹھا دیا۔ اور اس کے بوٹ کے تسمے کھول لئے۔ وہ مکان میں ننگے پاؤں داخل ہوئی۔ مکان ایک کھلونے

کی طرح تھا۔ آخری کمرے کی دیوار ہٹا دینے سے سمندر کا کشادہ منظر پہاڑ کی شاداب چوٹیاں اور صاف آسمان دکھائی دیتا تھا۔ اس نے زمین پر بیٹھ کر ان کے ساتھ کھانا کھایا۔

دوسرے دن تنگائی پہنچ گیا۔ وہ سب سے پہلے اپنے باپ اور بھائی اور پھر اپنی ماں کے سامنے ازراہ ادب جھکا۔ اس کے بعد وہ صوفیہ کے قریب آیا۔ جو اس سے بغلیں ہونے کو بے قرار تھی۔ وہ ایک لمحہ تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے سوچ کر اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

اس نے بتایا کہ میں سیدھا ٹوکیو سے آیا ہوں۔ فوجی حکام نے منابطہ کی خلاف ورزی کے جرم میں اسے ملازمت سے برطرف کر دیا تھا۔ اور اسے دو سال تک جلاوطنی کی سزا دی تھی لیکن اس کی گذشتہ خدمات کو مد نظر رکھ کر اسے اپنے گاؤں میں نظر بند رہنے کا حکم دیا۔ صوفیہ بہت خوش تھی۔ تنگائی اپنے ساتھ بہت سے ریشمی کمونو لایا تھا۔ وہ اسی دن پولیس کے دفتر میں اپنی شادی کا اندراج رجسٹر میں درج کرانے کے لئے آئے۔ صوفیہ نے نیلے رنگ کا کمونو پہنا۔ اپنے بالوں کو جاپانی وضع پر آراستہ کیا۔ جاپانی سیلپر پہنے اور پولیس افسر کے سامنے تنگائی کی بیوی قرار دی گئی۔

موسم خزاں کی آمد پر تنگائی اور اس کی بیوی کے سوا گھر کے سب آدمی چلے گئے۔ ٹوکیو سے روسی جاپانی اور انگریزی کتابوں کے پارسل تنگائی کے نام باقاعدہ آتے رہے۔ صوفیہ نے اپنے اعتراضات میں یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ اس دوران میں فرصت کا وقت کیونکر کاٹی تھی۔ سمندر سے زہریر ہواؤں کے طوفان اٹھتے تھے۔ اور پہاڑیوں میں گونج پیدا کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی نئے روسی افسانوں سے دل بہلاتی تھی اس نے چاول اور مچھلی پکانے کے نئے نئے ڈھنگ سیکھ لئے۔ صبح کے وقت اس کا خاوند فرش پر بیٹھ کر کتابوں میں غرق رہتا

اور وہ ناشتہ تیار کرتی۔ وہ دونوں مل کر چائے پیتے۔ نگلیں چل اور بغیر نمک کے چاول کھاتے۔ بعض اوقات وہ اپنے لئے روسی کھانا بناتی۔ ناشتے کے بعد نگا کی پھر کتب بینی میں مصروف ہو جاتا۔ اور وہ تین میل سیدل چل کر شہر میں آتی۔ اور سودا سلف خرید کر لے جاتی۔ شام کو وہ دونوں سیر کو نکلتے۔ کبھی سمندر کے کنارے پر کبھی پہاڑ کی چوٹیوں پر گھومتے۔ رات کو وہ دیر تک مطالعہ کرتے صوفیہ اپنے خاوند کو محبت عزت اور خوف کی نظروں سے دیکھتی تھی۔ وہ ایک خلیق طاقتور اور خاموش آدمی تھا۔ اسے اس دوران میں پتہ لگا کہ اس کے خاوند کا باب ٹوکیو میں رشیم کے کارخانے کا مالک ہے۔ بعض اوقات ٹوکیو اور کیوٹو سے نگا کی کے دوست ان کے یہاں آتے۔ وہ اپنی بیوی کو یورپین لباس پہننے کی تاکید کرتا۔ یہ لوگ ان محفلوں میں جاپانی شراب پیتے۔ صوفیہ بھی ان کی خاطر سے ان کے ساتھ شریک ہو جاتی۔ دوسرے دور کے بعد ان کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو جاتیں۔ وہ لگاتار باتیں کئے چلے جاتے تھے۔ پھر سب مل کر گاتے تھے اور صبح ہونے سے پیشتر شہر کو چلے جاتے تھے۔

موسم سرما گزر گیا۔ گرمیوں میں سمندر کے مد و بخذر سے ایک شور سا برپا رہتا تھا۔ ان کی زندگی کی ایک رنگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ تسبیح کے دانوں کی طرح دن گزرتے گئے۔

ہم اس مقام پر اس افسانہ کو ختم کر سکتے تھے۔

ایک سال گزر گیا۔ اور پھر ایک اور سال کے منقضي ہونے پر نگا کی کی جلا وطنی کی میعاد ختم ہو گئی۔ لیکن وہ بدستور اسی جگہ ہے۔ اسی طرح تیسرا سال بیت گیا۔ اور پھر یکا یک ان کی خاموش زندگی میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ لوگ انہیں ملنے کے لئے دور دور سے آنے شروع ہوئے۔ فوٹو گرافروں نے ان کے گاؤں ان کے مکان اور ان کی تصویریں اتاریں۔ اخباری نمایندگان نے ان سے خاص ملاقاتیں کیں۔ صوفیہ سے پوچھا گیا۔ کہ جاپان اور

جاپانیوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ صوفیہ کو معلوم ہوا کہ اس کے خاوند نے ایک کتاب لکھی ہے۔ جب اس کا تذکرہ اپنے خاوند سے کرتی تو وہ اسے ٹال دیتا۔ ان کے فوٹو بے شمار میگزینوں میں پھپھتے۔ انہیں مضامین لکھنے کی فرمائشیں موصول ہونے لگیں۔ اس اثنا میں صوفیہ نے جاپانی زبان میں کسی قدر مہارت پیدا کر لی تھی۔ اب وہ ایک مشہور مصنف کی بیوی تھی۔ لیکن اس سے اس کی نفسیات میں کوئی خاص تغیر واقع نہ ہوا ہاں اتنا ضرور ہوا۔ کہ اسے ان اجنبی لوگوں سے جو وحشت ہوتی تھی وہ یکسر دور ہو گئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے خاوند سے اس کے مشہور شاہکار کے متعلق دریافت کیا۔ اور اس کے خاوند نے متبسم نفی میں جواب دیا۔ اس کے بعد صوفیہ نے اسے نہایت معیولی بات سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ جب نگا کی کا باب انہیں ملنے کے لئے آیا۔ تو وہ صوفیہ کے ساتھ خاص احترام سے پیش آیا اب ایک لڑکا ان کا کھانا تیار کرتا تھا۔ جن ممکن ہے۔ کہ صوفیہ ایک نہایت اچھی بیوی ثابت ہوتی۔ لیکن آخر کار اسے اپنے خاوند کے مشہور ناول کے موضوع کا پتہ لگ گیا۔ ٹوکیو سے ایک اخباری نمائندہ ان سے ملاقات کے لئے آیا۔ اور وہ روسی زبان سے واقف تھا۔ وہ نگا کی کی غیر حاضری میں ان کے گھر پہنچا۔ صوفیہ اسے سیر کے لئے باہر لے گئی۔ دوران گفتگو میں اس نے نمائندہ مذکور سے پوچھا۔ کہ میرے خاوند کے ناول کی حیرت انگیز مقبولیت کا کیا راز ہے۔

آخر یہ راز کھل گیا۔

صوفیہ کی خود نوشت سوانح عمری پڑھنے کے بعد میں نے دوسرے دن نگا کی کا ناول باز اسے خریدا۔ ژوربانے میری خاطر سے اس کا ترجمہ پڑھ کر سنایا۔ یہ جاپانی کتاب اس وقت بھی میری میز پر میسے سامنے پڑھی ہے۔

نگا کی نے جلا وطنی کے ایام میں اپنی روسی بیوی کے حالات

صوفیہ نے ان تمام واقعات کو اپنے سوانح حیات میں کمال سادگی اور صاف گوئی کے ساتھ درج کر دیا۔ وہ آخر جاپان کی شاہی فوج کے سابق افسر اعلیٰ اور مشہور ناول نویس کے تاریخی گاوں سے نکل کر ولید ڈی واسٹک کے پرائمری سکول میں واپس آ گئی۔ لوگوں کے اخلاق کے متعلق رائے زنی کرنا میرا کام نہیں۔ ”جاپانی علم الاصنام میں لومڑ مکاری اور عیاری کا دیوتا ہے اور اگر کہیں اس کی روح کسی شخص کے جسم میں حلول کر جائے تو اس کے سارے خاندان کا ناش ہو جاتا ہے۔“

مترجم غیر معروف جرنلسٹ

ایک ناول کی صورت میں قلمبند کر دئے تھے۔ صوفیہ کی معمولی سے معمولی بات کو بھی اس نے نظر انداز نہ کیا۔ جب ٹوکیو کے اخباری نمائندہ نے اس سے ناول کا موضوع تفصیل وار بیان کیا۔ تو صوفیہ کو اجساس ہوا۔ کہ گویا وہ اس ناول میں اپنے جسم و روح کا عکس بھی رہی ہے۔ صوفیہ کے جذبات عشق تک کو اس کے خاوند نے ایک کتاب کی صورت میں منضبط کر ڈالا تھا۔ صوفیہ کی ساری زندگی اس کے خاوند کی نظروں میں ایک ناول کے لئے مواد سے زیادہ حقیقت بنتا رکھتی تھی۔ وہ محض ایک جاسوس کی طرح اس کی ہر حرکت کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ تاکہ اس کے ناول کی دلچسپی میں اضافہ ہو سکے۔

تاثیر خرزاں

جب سارنگی سسکیاں بھر بھر کر خزاں کے گیت گاتی ہے میرا دل ڈوبتا جاتا ہے۔ غم کی اٹھتی ہوئی لہریں مجھے سمیٹ لیتی ہیں۔ میرا سر میرے سینے پر آگرتا ہے۔ اور میری باہیں لٹک کر زمین سے لگ جاتی ہیں۔ جب سارنگی بہار کے غم میں فریاد کرتی ہے میں بیدار ہو جاتا ہوں۔ پرانی یادیں مجھے اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں۔ مردہ مسرتوں کے خون سے میری آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ اور میرے بدن میں پرانی یادوں کی شراب اگلڑائیاں لینے لگتی ہے۔

خرزاں کی ہوا کے جھونکے مجھے ایک زرد پتے کی طرح کہاں سے کہاں اٹھا کر لے جاتے ہیں! —

محمد دین تاثیر

ثاقب جذبات ثاقب

تو نے کتنا فرق اے بیتابی دل کر دیا
پوچھتا کیا ہے تو مجھ سے اسکی الفت کا مال
اے فریب زسیت اے امید دینا ہے خیال
یہ ہوا آخر مال انتہائے جستجو
زندگی کی ابتدا تو غرق ہو جانے میں تھی
کاش مجھ سے چھین لیتا میری تخیل وسیع
کتنا آگے بڑھ گیا ہوں منزل مقصد سے
میں تو قائل ہوں ترا اے مالک سود و گداز
اب غرورِ حسن سے وہ ملتفت ہوتے نہیں

سانس لینا بھی مرا اب غم سے مشکل کر دیا
جس نے مجھ کو بے نیاز فکر منزل کر دیا
تو نے مجھ کو مبتلائے سعی ساحل کر دیا
میری خاک شوق کو منزل بہنزل کر دیا
دل نے کیوں منت کش دامن ساحل کر دیا
دل کے خلوت خانے کو جب شکبہ محفل کر دیا
تو نے مجھ کو اور بھی گم شوق منزل کر دیا
کچھ نہ تھا دل عشق نے لیکن ادا کر دیا
کیا کیا تو نے کہ ذکرِ حسرت دل کر دیا

اس کے اعجازِ محبت پر ہوں آثاقبِ ثاقب
عشق کی بیجا صلی کو جس نے حاصل کر دیا

سید ابو محمد ثاقب

میرزا یگانہ کلام یگانہ

تو کہاں اور کہاں وہ جلوہ پاک
دل بیباک تیری نگہ میں خاک
کھا گیا کتنے جاں نثاروں کو
پرے پرے میں شعلہ بیباک
دیکھئے کیا خدا دکھاتا ہے
آپ نازک مزاج - ہم بیباک !
گھل گئے جیسے موم کی مریم
کیون ٹھایا تھا دل جلوں سے پاک ؟
بدگمانوں کی مہربانی سے
پاک دامن پہچنے نہ دامن چاک
ذات میں اپنی کیا نہیں موجود ؟
عشق ساز ہر عقل ساز ناک
آسمان کی فراسی گردش میں
کوئی ہلکان اور کوئی ہلاک !

میں کہاں اور کہاں کے پست بلند
ایک ٹھوکر میں تھا بھیرا پاک !

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی



دیاسلانی

ہنری لیف ٹینگ سوئزرلینڈ کی طرف جا رہا تھا۔ دوران سفر میں وہ ایک شام کو زیورچ میں پہنچا۔ وہاں اس کو اچانک ایک ایسا ہوش رہا واقعہ پیش آگیا۔ کہ بایدوشاید ہنری صاحب ثروت آدمی ہونے کی وجہ سے سفر میں بھی آرام و آسائش کا متمنی تھا۔ شام کی گاڑی سے زیورچ پہنچا۔ سوار ہو کر ایک ہوٹل میں آیا۔ گائیڈ بک میں اس ہوٹل کے انتظام و اہتمام کی بے حد تعریف کی گئی تھی۔ اس میں کھانا تھا۔ کہ ہوٹل میں کھانا اچھا ملتا ہے۔ ہمان عموماً معقول طبقہ کے لوگ رہتے ہیں۔ ہنری نے ہوٹل میں پہنچ کر پچھلے کمرے میں ہی کھانا کھایا۔ سفر کی تھکان محسوس کر رہا تھا۔ اٹھا اور اپنے کمرے میں جو بالائی منزل پر تھا۔ چلا گیا۔ بستر آرام وہ اور پر تکلف تھا۔ اور گو اس کو نیند نہ آئی تھی۔ مگر وہ بستر پر دراز ہو گیا۔

ہنری لیف ٹینگ معمولی دل و دماغ کا آدمی تھا۔ وہ زیورچ کی سیر کو آیا تھا۔ اور جب تک وہ زیورچ نہ پہنچا۔ شہر کو دیکھنے کی خواہش اس کے دل میں برابر موجود رہی۔ مگر تجربے کی بات ہے۔ کہ جو نہی شام کے وقت انسان کسی شہر میں پہنچتا ہے۔ تو شہر کو دیکھنے کی خواہش قدرے کند ہو جاتی ہے۔ یا یوں کہئے۔ کہ جو نہی آدمی کسی نئے شہر میں پہنچتا ہے۔ اس شہر کو دیکھنے کی خواہش قریب قریب پوری ہو جاتی ہے۔ اور انسانی دماغ اس بات پر اکتفا کر لیتا ہے۔ ”میں اس شہر میں ہوں اور شہر اپنے محل وقوع پر موجود ہے“ اور بس۔ چنانچہ ہنری لیف ٹینگ بھی زیورچ میں تھا۔ زیورچ کے ایک معقول ہوٹل کے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ اور بجلی کا لیپ جس سے کمرہ منور تھا۔ شہر زیورچ کے ایک ہوٹل کے کمرے کا لیپ تھا۔ اس نے جیب سے اپنا سگریٹ کیس نکال کر نزدیک کی میز پر رکھ دیا۔ پھر اس میں سے ایک سگریٹ نکالا۔ اور ہونٹوں میں رکھ لیا۔ وہ زیورچ کے ایک پرنٹنگ ہونٹل کے کمرے میں سگریٹ پی رہا تھا۔ اور یہ تمام باتیں اس کے دل کی تسلی کے لئے بہت کافی تھیں۔

جب وہ سگریٹ سلگا چکا۔ تو اس نے دیاسلانی فرس پریچینک دی۔ اور ساتھ ہی ایک وہم یا دوراندیشی میں مبتلا ہو گیا۔ اسے خیال آیا۔ کہ سلگتی ہوئی دیاسلانی کہیں ہوٹل میں آگ لگ جانے کا باعث نہ ہو جائے۔ یہ سوچ کر وہ اٹھا۔ اور دیاسلانی کو فرش پر سے اٹھانے کے لئے جھکا۔ اس کا یہ فعل قابل فہم تھا۔ کیونکہ دیاسلانی ابھی سلگ رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ سلپ پر نہ کر لے۔ اور سلگتی ہوئی دیاسلانی کو پاؤں سے مل ڈالے۔ کہ درحقیقت خوف کے مارے اسے اپنے ارادے سے باز رہنا پڑا کیونکہ عین اس وقت پلنگ کے نیچے سے ایک ہاتھ نکلا۔ اور اس نے صاف طور پر چار انگلیوں اور ایک انگوٹھے کو اکٹھا ہوتے اور دیاسلانی کو مل کر بھجواتے دیکھا۔ دیاسلانی بچھ گئی۔ اور ہاتھ پھر بستر کے نیچے غائب ہو گیا۔

قاعدہ ہے۔ کہ جب آنکھیں کسی چیز کو دیکھتی ہیں۔ تو انسانی دماغ بھی اس سے متاثر ہو کر اس چیز کا جائزہ لیتا ہے۔ ہنری کے دماغ پر جو اثرات مسلط

ہو چکے تھے۔ وہ اس واقعہ کے متعلق تھے۔ جو اس نے ابھی ابھی بچشم خود دیکھا تھا۔ جس وقت کسی جلتی چیز کو ہاتھ سے مس کیا جاتا ہے۔ تو ہاتھ کے جل جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ مگر ہاتھ کے مالک نے کیوں اس خطرے کو محسوس نہ کیا۔ اور کس طرح بے باکانہ جلتی دیا سلائی کو بجھا دیا۔ ہنری کو خیال آیا۔ کہ شاید ہاتھ کے مالک نے اپنی انگلیوں کو لعاب دہن سے ترک کر لیا ہوگا۔ لیکن اس صغریٰ کبریٰ سے نتیجہ اخذ کرنے میں جو تھوڑا سا وقت صرف ہوا۔ اس کے فوراً بعد ہنری نے کہا: ”اوہو۔ میرے ہتھک کے نیچے کوئی آدمی ہے۔“ اور پھر اس خیال سے ایک اور خیال آہستہ آہستہ اور لفظ لفظ ہو کے اس کے دماغ میں آیا۔ ”وہ اس بات کے منتظر میں ہے۔ کہ میں سو جاؤں۔ تو مجھے مار ڈالے۔“

جب اس نے یہ سمجھ لیا۔ اور اس خیال کو ابھی طرح دماغ میں تول لیا۔ اور اس بھیانک خیال کے ایک ایک لفظ کو محسوس بھی کر لیا۔ تو ہنری کے دماغ میں اور کسی خیال کا اسکان نہ رہا۔ اس کے تمام خیالات کی جگہ ایک مہیب سکوت نے لے لی۔ اور یہ سکوت اچانک کمرے میں داخل ہو کر چاروں طرف چھا گیا۔ کمرے میں اس سکوت کی موجودگی۔ ہاتھ کے مالک کی موجودگی سے جو قتل کے ارادے سے چھپا ہوا تھا۔ کہیں زیادہ مہیب اور خوفناک معلوم ہونے لگی یہ خوفناک سکوت ایک ضرب کی طرح ہنری کے سر پر پڑا۔ اور اس کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ ابھی ابھی گری نیند سے بیدار ہوا ہے۔ گویا اس کو ایک ایسی چیز یاد آگئی۔ جس کو وہ کافی دیر سے فراموش کئے ہوئے تھا۔ اس نے دل میں کہا: ”ہاں اب وقت آگیا ہے۔ مجھے خیال ہی نہ رہا تھا۔ کہ ایک دن مجھے مرنے پڑے۔“ اس کا لعاب دہن اس قدر تلخ تھا۔ گویا اس کا ذائقہ ہمیشہ اس کے حلق میں رہے گا۔ ”ہاں تو آج رات میں قتل کیا جاؤں گا۔“ اس کو یوں معلوم ہونے لگا۔ کہ گویا اس کے مردہ ہونے کا احساس بھی اس کے حلق میں موجود ہے۔ وہ اس حالت کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔

پھر انتہائی احتیاط کے خیال سے اور کسی گمنام شے کے ڈر سے اس نے اپنی گردن ادھر ادھر پھیر کر کمرے میں چاروں طرف ترچھی نظروں سے ہر ایک شے کو دیکھا۔ ایک برتن رکھنے کی میز تھی۔ جس کو وہ شناخت بھی نہ کر سکا۔ ایک کپڑوں کی الماری تھی۔ اور ایک معمولی میز۔ کچھ کرسیاں تھیں۔ جو اس نے گئیں تعداد میں چار تھیں۔ ایک سو فٹ تھا۔ جو قریب اس کی نظر سے اوجھل تھا۔ ان تمام اشیاء میں سے کسی نے اس کو کوئی مدد نہ کی۔ دس منٹ کا عرصہ گزر گیا۔ اور ”نوشتہ تقدیر“ کا خیال آہستہ آہستہ پرلے درجے کی یاس اور ناامیدی میں تبدیل ہو گیا۔

”اوہ خدا! یہ تمام حادثہ مجھے کیوں پیش آ رہا ہے۔ میں اس وقت زیورچ میں کیوں موجود ہوں۔ میں اس وقت کسی اور شہر مثلاً بیسل۔ جنیوا یا شٹاٹن میں کیوں نہ ہوں۔ تاکہ اس خطرے سے بچ جاتا۔ زندگی بھی کیا احمقانہ شے ہے۔ میں آخر اس کمرے میں آیا کیوں۔ ساتھ والے کمرے میں کیوں نہ ہوں۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ بستر پر دراز ہونے سے پیشتر میں نے چار پائی کے نیچے کیوں نہ دیکھ لیا۔ پھر دل میں کہا: ”میں نے اپنے لئے آپ ایک جال بنالیا ہے۔“ اس نے اپنی طبیعت پر پورا زور ڈال کر پہلے تو اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیا۔ ”ناں بعد اس کو جو کچھ بھی یاد آیا وہ پر حسرت و یاس خیالات کا ہجوم تھا۔ جو ایک ایسے آدمی کو آتے ہیں۔ جو بغیر اپنی کسی غلطی کے اس دنیا کو خیر باد کہنے والا ہو۔“

ہنری کے دماغ میں موت کا خیال ہمیشہ مزا اور عقوبت کے ساتھ وابستہ رہا تھا۔ اس لئے وہ باواز بلند پکارا چاہتا تھا۔ آخر میں نے کیا کیا ہے۔ پھر خیال آیا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ اور میں بالکل بے گناہ ہوں۔ ایک مرنے والا آدمی ہوں۔“

فی الحقیقت وہ ایک ایسا شریف طبیعت انسان تھا۔ کہ اس کو چور سے بھی کوئی شکوہ نہ تھا۔ جو اس وقت اس کے ہتھک کے نیچے چھپا ہوا تھا اور دل میں اس کی ذات کے متعلق ایسے وحشت انگیز ارادے کئے ہوئے تھا۔ حالانکہ اگر ہنری قزاق کے ساتھ رنجیدہ ہوتا بھی۔ تو اس میں وہ حق بجانب تھا۔ مگر قزاق تو ہنری کا واقف بھی نہ تھا۔ اس کو جانتا بھی نہ تھا۔ اس کے دل میں آیا۔ کہ وہ باواز بلند قزاق کو مخاطب کرے۔ اور کہے: ”میں ہنری لیف ٹینگ ہوں۔ جس کو تم مارنا چاہتے ہو۔ اور تم غلطی پر ہو۔ کیونکہ مجھ ایسے لوگوں کو کبھی کوئی قتل نہیں کرتا۔“

کلامِ رسا

دن ہو یا ہورات کسی دم پہنیں دیوانوں کو بھاڑ میں جائے جوش و حرشت لگے میرانوں کو
 شمع کو تنہا جلتا دیکھیں تاب کہاں دیوانوں کو اپنے بس کا روگ نہیں کیا کہئے ان دیوانوں کو
 بڑھتی ہیں لمحوں حواث جتنا انسان ڈرتا ہے میں نے اک بیخوف ہنسی میں غرق کیا طوفانوں کو
 رہتے ہیں حج اُسکے در پر دھڑکے دونوں پاتے ہیں قمر کا شکوہ کرنے والے بھول گیا احسانوں کو
 ساغرے کی اس میں گردش نشہ کی اس میں ساقی کی پُر کیف نظر نے لوٹ لیا مستانوں کو
 واعظ کی تقریر کا جادو رہ گیا چلتے چلتے کیا مسجد کا رخ کر کے میکش پھر پلٹے میخانوں کو
 تیشے کی بھی جھکوترت دار کا بھی ارمان مجھے کوئی ہے جو کر دے یکجا عبرت کے افسانوں کو

ہو چکے جب لہجائے عالم آپس میں مربوط رسا

فطرت نے تخریب کا منصب سونپ دیا انسانوں کو

محمد کبیر خاں رسا جالندھری

مجید ملک

مد و حزر

جو مل گیا -
 کہاں؟
 جہاں مل گیا -
 پوچھنا کوئی گناہ ہے؟
 ثواب بھی نہیں -
 پہلے تو تم ایسے نہ تھے
 کون؟
 تم -
 مجھے کیا ہو گیا ہے؟
 اپنے دل سے پوچھو -
 کیا پوچھو؟
 اپنے دل کا حال -
 میں تو وہی ہوں -
 تو میں بدل گئی ہوئی -
 بے شک -

کیا خبر تھی کہ ایک دن یہ حال ہوگا -
 کسی کو بھی خبر نہیں ہوتی -
 میں راتوں کو تین تین بجے تک جاگا کروں -
 کیوں جاگا کرو؟
 لیکن تمہاری سیریں ختم نہ ہونگی -
 سیریں کیسی؟

آج پھر دیر میں آئے -
 ہاں -
 کل بھی دیر میں آئے تھے
 ہاں -
 اب دو بجے ہونگے -
 ہاں اب دو بجے ہونگے -
 بلکہ تین -
 بلکہ تین -
 کہاں لپے؟
 ادھر ادھر
 اتنی دیر میں کیوں آئے؟
 کچھ ایسی ہی بات تھی
 میں انتظار کرتی رہی -
 نہ کیا ہوتا -
 اب نہیں کیا کرونگی -
 مہربانی -

کھانا کھالیا؟
 ہاں کھالیا -
 کب؟
 دیر ہوئی -
 کیا کھالیا؟

میں کیا جانوں کیسی سیریں ۔

گویا میں اب سیر سے واپس آیا ہوں ۔

اور کیا ؟

ہاں ۔ میں رات کے تین بجے تک سیر کرتا ہوں ۔ میں بہت برا ہوں ۔

نہیں تم بہت اچھے ہو ۔

نہیں ۔ میں بہت برا ہوں ۔ مجھ میں دنیا بھر کے عیب ہیں ۔

نہیں تم بہت اچھے ہو ۔ نیک اور فرض شناس ۔ میں بری ہوں ۔

نہیں تم بیچارے ۔ صابر ۔ شاکر ۔

اور تم مردت کیش ۔ بی بی بچوں کا حق پہچاننے والے ۔ کبھی کسی

کا دل نہ دکھانے والے ۔

اور تم ستم زدہ ۔ راضی بہ رضا رہنے والی ۔ پلٹ کر بات نہ کرنے

والی شوہر کی فرمانبرداری اطاعت گزار ۔

مجھ سے یہ دکھ نہیں سے جاتے ۔

کیا دکھ ؟

یہی دکھ

نہ سہو ۔

جب تک زندگی ہے سہو لگی ۔

جب تک زندگی ہے میں بھی سہو لگا ۔

تمہیں کیا دکھ ہے ؟

اور تمہیں کیا دکھ ہے ؟

میرے دکھ میرا خدا جانتا ہے

میرے دکھ بھی میرا خدا جانتا ہے ۔

خدا سے ڈرو ۔

میں خدا سے زیادہ تم سے ڈرتا ہوں ۔

میرے اللہ ۔ میں کہاں جاؤں ۔ مجھے موت بھی نہیں آتی ۔

خدا کے لئے شور نہ مچاؤ ۔

میں شور مچاتی ہوں کہ تم ؟

میں کہتا ہوں بچہ بے آرام ہو گا ۔

تمہیں بچے کی بہت پروا ہے ۔

تم سے کم بھی نہیں ۔

خبر بھی نہیں کس حال میں ہے ۔ کس حال میں نہیں ۔

کیا خبر نہیں ؟

پروا نہیں صحت کیسی ہے ۔ کیسی نہیں ۔

صحت ۔ کیوں خیریت تو ہے ؟

تمہیں کیا ؟

میں کیا پوچھ رہا ہوں ؟

تم اپنے کھیل تماشوں میں رہو ۔

میری بات کا جواب دو ۔

کس بات کا ؟

بچہ کیسا ہے ؟

تمہیں رات کے تین بجے بچے کی محبت کیوں ستانے لگی ۔

میں پوچھتا ہوں ۔

جیسے بڑی محبت ہے ۔

جتنی تم کو ہے اس سے کم نہیں ۔

جھی رات بھر سیریں کرتے ہو ۔

سیریں کہاں کرتا ہوں ؟

مجھے کیا خبر کہاں سیریں کرتے ہو ۔

میں سیریں نہیں کرتا ۔

اور رات کے تین بجے تک کیا کرتے ہو ؟

کون کتنا ہے اب تین بچے ہیں ؟
تین نہیں بچے تو اور کیا بچا ہے ؟
ابھی تو دو بھی نہیں بچے -

کون کتنا ہے ؟
میں کتنا ہوں -

جھوٹ -

میں جھوٹ کیوں بولتا -

شور نہ مچاؤ۔ آہستہ بولو۔

بچے کی صحت تو بالکل ٹھیک ہے نا ؟

بالکل۔ کیوں ؟

تمہاری بات سے مجھے خدشہ سا پیدا ہوا تھا -

خدا کرے بچے ہی سے تمہارا پیار قائم رہے -

میرا پیار ہمیشہ قائم رہتا ہے -

بڑے آئے ثابت قدم -

بے شک -

دکھ دینے میں ثابت قدم -

دکھ سہنے میں ثابت قدم -

تمہیں کیا دکھ پہنچے ہیں ؟

کوئی بھی نہیں -

پھر شکایت کیسی ؟

میں نے کب شکایت کی ؟

کیا کہا - شکایت نہیں کی ؟

کب کی ؟

تو بہ -

اور تمہیں کیا دکھ پہنچے ہیں ؟

تم سن کے کیا کرو گے -

آخر ؟

بڑے آئے رات کے تین بچے ہمدردی جتانے والے -

میں کتنا ہوں تین نہیں بچے -

دوسری -

ہاں دو -

بڑے آئے رات کے دو بچے ہمدردی جتانے کے لئے -

میں تنویر کے ساتھ تھا -

تنویر کے ساتھ !

ہاں -

جھوٹ -

تمہاری قسم -

جیسے میری بڑی پروا ہے -

یہ تم اپنے دل سے پوچھو -

کس سے پوچھوں ؟

اپنے دل سے -

کیا پوچھوں ؟

کہ میرے دل میں محبت ہے کہ نہیں -

آہستہ بولو بچے کی آنکھ نہ کھل جائے -

کیسی پیاری نیند سو رہا ہے -

ہاتھ سر کے نیچے رکھ کے -

نٹھسا سا ہاتھ -

اور ہونٹ لٹکا کے -

بال ملتے پر گر رہے ہیں -

بالکل تمہاری طرح -

بالکل میری طرح

نیند میں مسکرا رہا ہے -

میری جان -

میری جان -

مجید ملک

مس حجاب اسماعیل حسن اور رومان کی دنیا

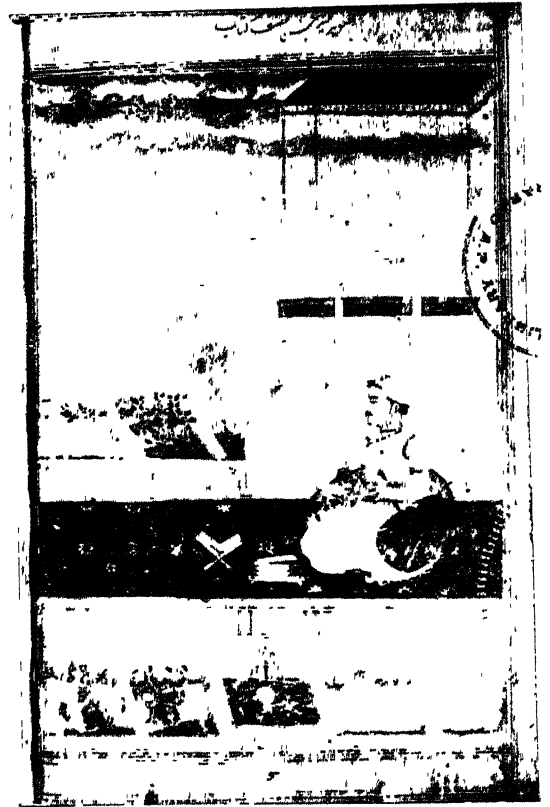
گرمیوں کی لمبی اور سنسان دوپہروں میں —
جبکہ شہر کے کارخانوں کی آواز بند ہو جاتی ہے۔
مزدوروں کے ہاتھ ناتوان نظر آنے لگتے ہیں
پرندے سبز پتوں میں منہ دئے ساکت ہو جاتے ہیں
اور عشق پیچاں کی بیلوں میں بھونرے غائب ہو جاتے ہیں
اور جب میں سخنِ باغ میں نارنگی کے اک پرانے پیڑ اور نوخیز پتوں کے کانپتے ہوئے سیالوں کے درمیان اک بید کی کرسی پر بیٹھ جاتی ہوں —
تو میری نظر دور — بہت دور، نیلے نیلے گرجنے والے شاندار سمندر اور اونچے اونچے باوقار نیلے آسمان کے درمیان افق پر پڑتی ہے
اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بچھڑے ہوئے دنوں کی یاد۔ اس حسن اور رومان کی دنیا میں اب تک زندہ اور موجود ہے۔

پھر شام کے دھندلکے میں —
جبکہ دنیا اک ٹھکے ماندے مسافر کی طرح اک جگہ بیٹھ جاتی ہے
اور درخت، شام کے سکوت میں، سحر زدہ شہزادوں کی طرح چپ چاپ کھڑے ہو جاتے ہیں
اور جنوب کے سریلے نرم نرم جھونکوں کے زندگی بخش بوسوں سے یاسمین کی کلیاں آنکھیں کھول دیتی ہیں —
تو میری نظر دور — بہت دور ڈوبنے والے دن اور زمین کے درمیان کسی نامعلوم سرزمین پر پڑ جاتی ہے۔
آہ — شاید وہی حسن اور رومان کی دنیا ہے
اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمہاری یاد، بلکہ تمہارا موہوم سایہ وہاں کھڑا ہے۔
جیسے کوئی خواب کی مخلوق!!

حجاب اسماعیل



STATE CENTRAL LIBRARY



محمود شیرانی پنجاب میں اردو کی سرگذشت

(ایک فراموش شدہ ورق)

بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں ہمارے اسلاف نے جو لٹریچر طیار کیا تھا۔ اس کا ایک شعبہ کتب نصاب کے نام سے موسوم ہے۔ نصابی لٹریچر سے مراد ایسی منظوم مگر مختصر فرہنگیں ہیں۔ جن میں ضروریات زندگی اور عام معلومات کے الفاظ اور معانی نوآموزوں کی تعلیم کی غرض سے آسان اور عام فہم زبان میں کئے جاتے ہیں۔ ان میں اختصار کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک نصاب کی طوالت بالعموم دو سو اشعار تک محدود ہوا کرتی ہے۔ بلکہ یہ دو سو کی تعداد ہے۔ جن کی بنا پر اس لٹریچر کا نام بالآخر نصاب قرار پایا۔ فقہی اعتبار سے دو سو درہم وہ رقم ہے جس پر حول گزر جانے کی صورت میں زکوٰۃ لازم آیا کرتی ہے۔ چنانچہ یہ رقم نصاب اور اس کا مالک صاحب نصاب کہلاتا ہے۔ ابونصر فراہی نے جو فارسی نصابی ادب کے ابوالبشر مانے جاتے ہیں۔ اپنی مشہور عالم تصنیف نصاب الصبیان کا اسی رعایت سے نصاب الصبیان نام رکھا۔ کیونکہ اس کے اشعار کی تعداد فقہی نصاب کے مساوی ہے۔ ابونصر کے مقلدوں نے بھی عام طور پر اپنے پیش رو کی سنت پر عمل جاری رکھا۔ چنانچہ اکثر ایسی تالیفات کا نام نصاب کے لفظ سے شروع ہونے لگا۔ مثلاً نصاب خسرو۔ نصاب بدیع۔ نصاب ضیائی۔ نصاب کمال الدین۔ نصاب مقلوب و نصاب میراب وغیرہ۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اس شاخ کا نام ہی نصاب ہو گیا۔

نصاب الصبیان کی تکمیل کے بعد جس کا سال تالیف ۱۱۷۵ھ بیان کیا جاتا ہے۔ نصابی لٹریچر نے بیدار ترقی کی ہے۔ اور کتب نصاب ایسے

ممالک میں جہاں عربی مدعا کی تحصیل اور فارسی ذریعہ تعلیم رہی ہے بکثرت لکھی گئی ہیں۔ لیکن یہاں ان کی تاریخ و تفصیل قلمبند کرنا مقصود نہیں ہے۔ عہد مغلیہ سے پیشتر ہندوستان میں جہاں فارسی بھی عربی زبان کی طرح اکتسابی زبان رہی ہے۔ یہ نصاب حسب رواج وقت فارسی میں لکھے جاتے تھے۔ اور دیگر ممالک کے نصاب بھی شامل درس تھے لیکن عہد اکبری میں جدید تعلیمی تنظیم کے ماتحت عربی زبان سرکاری طور پر تعلیمات سے خارج کر دی گئی۔ اس کی جگہ فارسی کو دے دی گئی۔ یعنی فارسی کی تحصیل مقصد خاص مانی گئی۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ اگرچہ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ تاریخ اس بارہ میں خاموش ہے۔ کہ یہ کسی ایسی زبردست تحریک کا اثر ہے۔ کہ ہندوستان میں دیرینہ نصابوں کے علاوہ ایسے جدید نصاب طیار ہونے لگے۔ جن میں فارسی کے ساتھ دیسی زبانوں کو بھی ذریعہ تعلیم تسلیم کر لیا گیا۔ ان جدید نصابوں میں سب سے اہم نصاب مطبوع الصبیان ہے۔ جو خاق باری کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس کی تصنیف عام طور پر امیر خسرو دہلوی کی طرف منسوب کی جاتی ہے لیکن تنقیدی نقطہ نظر سے یہ عقیدہ ناقابل قبول ہے۔ خود اس نسخہ میں جو قرآنی شہادت موجود ہے۔ وہ ہمیں دسویں صدی ہجری سے آگے نہیں بڑھاتی۔ مگر اس میں بھی شک نہیں۔ کہ خاق باری اردو کا سب سے قدیم نصاب ہے جس سے ہم واقف ہیں۔ علیٰ ہذا دیگر دیسی زبانوں کے نصابوں میں بھی اسے اولیت کا فخر حاصل ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ دیسی زبانوں میں نصاب لکھے جانے کی تحریک

نسل کے لئے باعث حیرت ہو۔ مگر مجھ کو اس صداقت کے اظہار میں کوئی تامل نہیں ہے۔ کہ اور صوبوں سے قطع نظر اردو زبان پنجاب میں قدیم سے ملکی زبان مان لی گئی ہے۔ ہمارے اسلاف کا رویہ اس مسئلہ کے متعلق بالکل واضح اور قطعی تھا۔ انہوں نے پنجاب میں پنجابی کے ساتھ اردو کو فراموش نہیں کیا تھا۔ گویا پنجاب میں دونوں ذریعہ تعلیم نہی رہیں۔ اس نقطہ نظر سے انہوں نے ابتدا ہی سے بچوں کو دونوں زبانوں سے واقف کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اور ان کی تعلیم میں دونوں قسم کے نصاب شامل کر لئے تھے۔ چنانچہ پنجابی زبان کے مشہور نصاب واعدباری اور رازق باری کے ساتھ ساتھ اردو کے نصاب خالق باری اور حمد باری بھی درس میں پڑھائے جاتے تھے۔

خالق باری پنجاب میں بے حد مقبول رہی ہے۔ اور مکتبوں میں کثرت کے ساتھ پڑھائی گئی ہے۔ چنانچہ وارث شاہ بھی اپنی تالیف ”ہیرا انجھا“ میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ ۱۔

اک نظم دے درس ہر کرن پڑھ دے نام حق تے خالق باریاں فی گلستاں بوستاں نال بہار دانش طوطی نامہ تے رازق باریاں فی ہیرا انجھا ۱۱۸۸ء میں نظم ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ خالق باری وارث شاہ کے عہد میں پنجاب کے مکاتب میں عام طور پر پڑھائی جا رہی ہے۔ خالق باری کے متعدد نسخے نوشتہ پنجاب میری نظر سے گزرے ہیں۔ جو سو ڈیڑھ سو سال پہلے کے نوشتہ ہیں۔ اس صوبہ میں خالق باری کی مقبولیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ پنجاب کے نصابی لٹریچر پر اس کا بے حد اثر ہے۔ اس کی تقلید میں نصاب لکھے جاتے ہیں۔ بلکہ نام بھی اسی طرز کے اختیار کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ ذیل کی کتب کے نام بہ تقلید خالق باری رکھے گئے ہیں۔ ۱۔

- (۱) واعدباری (۲) رازق باری (۳) ایزد باری (۴) اللہ باری (۵) ناصر باری (۶) صنعت باری (۷) قادر باری (۸) واسع باری۔ (۹) رحمت باری (۱۰) اعظم باری (۱۱) صادق باری (۱۲) اللہ باری (دیگر) (۱۳) رازق باری (دیگر)

تقریباً ایک ہی زمانہ میں نمودار ہوتی ہے۔ سب سے پہلے یہ نصاب اردو زبان میں شروع ہوئے۔ اس کے بعد ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی زبانوں میں لکھے جانے لگے۔ پنجاب نے اس تحریک کو بھی فروغ دیا۔ اور ایسے نصاب جن میں ذریعہ تعلیم پنجابی تھی۔ کثرت کے ساتھ لکھے گئے۔ ان میں سب سے قدیم واعدباری ہے۔ جو ۱۶۴۹ء یا ۱۶۸۳ء بکرمی میں جو ۱۰۳۰ھ و ۱۰۳۱ھ کے مطابق ہے۔ تالیف ہوتی ہے۔ اللہ بادی کے بعد ایک لمبا سلسلہ ان نصابوں کا چلتا ہے۔ جن میں ایسے نصابوں کے نام جن تک میری رسائی ہوئی ہے۔ حسب ذیل ہیں۔ ۲۔

- (۱) رازق باری از اسمعیل۔ تالیف ۱۰۳۰ھ (۲) رازق باری از مصطفیٰ ۱۰۵۵ھ (۳) ایزد باری از کھڑل ۱۰۷۰ھ (۴) اللہ باری از امید ۱۱۹۶ھ (۵) ناصر باری از مفتی شمس الدین ۱۲۰۵ھ (۶) صنعت باری از کنیش داس بڈہرا قانون گوئی ۱۲۲۱ھ (۷) قادر باری از مظفر ۱۲۳۳ھ (۸) واسع باری از یکدل ۱۲۳۱ھ (۹) رحمت باری از مولوی رحمت اللہ ۱۲۳۲ھ۔

(۱۰) فارسی نامہ از عبدالرحمن قصوری (۱۱) نصاب ضروری۔ از خدا بخش (۱۲) اللہ باری (دیگر) (۱۳) بادسل (۱۴) اعظم باری (۱۵) صادق باری (۱۶) فارسی نامہ از شیخ محمد اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ جن کے زمانہ تالیف سے ہم ناواقف ہیں۔

بہر حال یہ فرست ہے اس نصاب کی جو فارسی کے اکتساب کے خیال سے بربان پنجابی طیار کیا گیا ہے۔ اور یہ امر ظاہر ہے کہ میری فرست مکمل نہیں ہے۔ خدا دہ دن جلد لائے۔ جب اہل وطن اسلاف کے ان بقیۃ الصالحات کی تلاش اور حفاظت کے واسطے کوئی جنبش کریں۔ آدم ہر سر قصہ۔ پنجابی زبان کے نصابی لٹریچر کا جائزہ لیتے وقت ہم ایک نہایت غیر متوقع صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ جہاں بچوں کے لئے پنجابی زبان ذریعہ تعلیم ہے۔ وہاں اردو بھی یہی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد کے بعد کے زمانے کا ذکر نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ سکھا شاہی اور مغلیہ دور کا۔ یہ امر موجودہ

پنجابی زبان کے سب سے پہلے نصاب یعنی واحد باری میں ایسے آثار موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب خالق باری کی ممدون ہے۔ حتیٰ کہ خالق باری کے مصرع اور شعر تک اس میں داخل کر لئے گئے ہیں۔ میں ایک دو مثالیں دیتا ہوں:-

خالق باری - ہے

آتش آگ آب ہے پانی

فاک وصول جو بادا اورانی

واحد باری - ہے

عمہ بھو بھی نتوہ نانی

آتش آگ آب ہے پانی

خالق باری - ہے

دیگ ہانڈی کھنڈوئی سخیٹا

تابہ کزگان است کڑا ہی دتوا

واحد باری - ہے

دیگ ہانڈی کھنڈوئی سخیٹا

تاب و کڑاں ہے کڑا ہی دتوا

خالق باری - ہے

چالنی غریال چاکی آسیا

دیگداں چولھا وکندو کوٹھیا

واحد باری - ہے

چھانٹی غریال چاکی آسیا

چپنی سرپوش پتھادیا

خالق باری کے مخطوطات میں جو نوشتہ پنجاب ہیں۔ ایک امر اور دیکھا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس کے ہندوستانی تلفظ کو پنجابی رنگ کے تلفظ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب عرصہ دراز تک اس صوبہ میں داخل درس رہی ہے۔

خالق باری کے بعد مجھے نصاب سر زبان عرف صمد باری یا جان بھپان

کا ذکر کرنا چاہئے۔ جو زبان ہریانی لکھا گیا ہے۔ یہ زبان بعض امور میں اردو سے کسی قدر مختلف ہے۔ ورنہ دونوں ایک ہی ہیں۔ بلکہ جن ایام میں یہ نصاب تالیف ہوا ہے۔ اس وقت کی اردو اور ہریانی میں کوئی فرق نہیں ہے۔

عبدالواسع عہد عالمگیر کے بزرگ ہیں اور کئی تالیفات مثلاً شرح ہوتاں و

شرح زلیخا۔ رسالہ عبدالواسع اور غرائب اللغات کے مصنف ہیں۔ ان

کا نصاب پنجاب کے کتبوں میں بڑے شوق و ذوق کے ساتھ پڑھایا جاتا تھا۔

اس نصاب کے متعدد نسخے نوشتہ پنجاب میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ اور

اس قدر مقبول ہے کہ پنجابی زبان کے مجموعہ نصاب یعنی فارسی نامہ۔ واحد

باری اور اللہ باری کے ساتھ میسوں مرتبہ لاہور کے مطبعوں میں چھپ

چکے۔

اردو زبان اس صوبہ میں اس قدر مقبول رہی ہے کہ خود اہل پنجاب نے

اس زبان میں نصاب طیار کئے ہیں۔ ان میں سب سے قدیم مولوی سہتی

لاہوری کا ایک ہے۔ جو بعد شاہجہان عہد کے قریب تالیف ہوتا ہے

مولوی سہتی نے دو نصاب لکھے ہیں۔ اور دونوں فرح الصبہان کے نام

سے موسوم ہیں۔ ان رسالوں میں اگرچہ پنجابی زبان کا چھینٹا بعض قوموں

پر نظر آتا ہے لیکن اردو الفاظ کی کثرت ہے۔ اور شریخی زبان فارسی ہے

میں بعض مثالیں دیتا ہوں:-

جراح رگزن آمد مجروح بداں تو گھائل

حق راستی تجھ تر در ہندوی است مائل

طاؤس تہ زنفک کوئل سیاہ کائی

جنت بہشت مرگ است داں نخل بندالی

برگستوان پاکھر زریں بداں سوہن سری

شق پارہ موش پراں در ہندوی گہ سری

زاغ و کلاغ کو یا گو سپند شاط بک سری

چوں دیوچہ است اجی جوک عنکبوت مکر سری

خمیانہ فازہ باشد در ہندوی او با سری

کہکھک فواق ہر کی تھک است خندہ ہاسی

اشخار وان تو سخی خف موزہ موز کیلا
بعرہ چہ پشک میکن مدور کورخ ڈھیسلا
سمسار میخ آہن ہمسار سنان بر جہی؟
کفگیر کچہ ڈوئی چوں یںظواست کر جہی؟

ذیل میں اسی تالیف سے بعض الفاظ درج کئے جاتے ہیں جن سے ناظرین اس کی زبان اور اردو پنجابی الفاظ کا تناسب معلوم کر سکیں گے۔
(۱) اٹی (۲) اٹیرن (۳) چوری (چوڑی) (۴) مچھ (۵) مہیڈا
(مہینڈھا) (۶) اٹکل (۷) ناو (ناقوس) (۸) گولا (۹) کولا (کوئلہ) (۱۰)
انگلیٹھی (۱۱) بجلی (۱۲) سونڈ (۱۳) منگنا (مانگنا) (۱۴) چچھا (۱۵) کچھا (کچھا)
(۱۶) کانچی (۱۷) پھٹکری (۱۸) ہولان (ہولے) (۱۹) ستو (۲۰) دھوپ
(۲۱) چان (۲۲) چھکا (چھینکا) (۲۳) ٹیکا (۲۴) اوگالی (جنگالی) (۲۵) کنوار
(۲۶) کال کنگنی (۲۷) کوٹھی (۲۸) السی (۲۹) بیٹھی (۳۰) سرسوں (۳۱)
ڈوئی (۳۲) ہنگ (ہینگ) (۳۳) سنگ (سینگ) (۳۴) جوار (۳۵)
مسر (مسور) (۳۶) باڑی (۳۷) اٹی (۳۸) تالیر (تاریل) (۳۹) پنڈ
(کھجور) (۴۰) سپاری (۴۱) اکھروٹ (خروٹ) (۴۲) ہدکی (ہدکی) (۴۳)
ڈیکار (ڈکار) (۴۴) گکری (۴۵) کھیر (۴۶) پھٹ (پھوٹ) (۴۷) خیار بر
شکالی (۴۸) بیگن (۴۹) توری (ترئی) (۵۰) توہر (تھوہر) (۵۱) پھلسا
(۵۲) کسنبہ (۵۳) جواہ (جواسا) (۵۴) گھٹلی (گھٹلی) (۵۵) سکر (۵۶) پتیل
(۵۷) لوہا (۵۸) کھان (۵۹) کھوٹا (۶۰) دیور (۶۱) منس (۶۲) بانجھ
(۶۳) سالہ (۶۴) پھوچی (۶۵) جڑا (۶۶) ہانسی (۶۷) پالک (۶۸) لے
پالک (۶۹) ساندھو (ساٹھو) (۷۰) سسرا (۷۱) ماکھی (کھی) (۷۲)
جالی (جال) (۷۳) سوکن (۷۴) ماموں (۷۵) چاچا (چچا) (۷۶) کاچا
(کچا) (۷۷) سمڈھن (۷۸) گنگا (گنگا) (۷۹) دہی (۸۰) سکر (۸۱) کھن
(۸۲) رائی (۸۳) ملائی (۸۴) چھاچھ (۸۵) مصانی (۸۶) رائی (۸۷) سرملانی
(سرمدانی) (۸۸) تیل (۸۹) پٹی (۹۰) کھو (۹۱) کھل (۹۲) آٹا (۹۳)
گالا (۹۴) گاڈی (گاڈی) (۹۵) بھڈیا (بھڈیا) (۹۶) پتیا (۹۷) سہا
(خروگوش) (۹۸) مینا (۹۹) سندلیہ (۱۰۰) گوہ (۱۰۱) کوئل (۱۰۲) تیترا

تیترا (۱۰۳) جک (جونک) (۱۰۴) گھڑا (۱۰۵) نیول (نیولا) (۱۰۶) کچھو
(۱۰۷) کچھو (کچھو) (۱۰۸) چھپکلی (۱۰۹) ڈھکی (مخنیق)
یہ کل ایک سو چھ الفاظ ہیں جن میں الفاظ ذیل بر تفاوت لہجہ
پنجابی مانے جاسکتے ہیں:-

(۱) بھیدھا (مہینڈھا) (۲) کولا (کوئلہ) (۳) منگنا (مانگنا) (۴)
کچھا (کچھا) (۵) ہولان (ہولہ) (۶) چھکا (چھینکا) (۷) ہنگ (ہینگ)
(۸) سنگ (سینگ) (۹) مسر (مسور) (۱۰) اوگالی (جنگالی) (۱۱) ہدکی
(۱۲) پھٹ (پھوٹ) (۱۳) جواہ (جواسا) (۱۴) ساندھو (ساٹھو)
(۱۵) گنگا (گنگا) (۱۶) کچھو (کچھو)

ان سولہ لفظوں میں اکثر ایسے ہیں جن کو صرف لہجہ کے فرق نے پنجابی
بنادیا ہے مثلاً ہینگ - سینگ - پھوٹ اور گونگا وغیرہ - اور میں سمجھتا ہوں
کہ مصنف کے مقابلہ میں کاتب اس ترمیم کا زیادہ ذمہ دار ہے۔

کئی ایسے نصاب ملتے ہیں جن میں آدمی اردو اور آدمی پنجابی ہے
لیکن میں ان سب سے قطع نظر کر کے اللہ باری یا ذوق الصبیان کا ذکر
کرتا ہوں۔ جو شاعر کی تالیف ہے۔ اس کے مصنف حافظ احسن اللہ
بن حلقہ ہدایت اللہ بن حافظ عنایت اللہ لاہوری ہیں۔ حافظ صاحب
کا پیشہ معلیٰ ہے۔ اس کے ساتھ کتابت اور مہر کنی بھی کرتے ہیں۔ نہایت
زود نویس ہیں۔ اور کتابیں کثرت کے ساتھ نقل کی ہیں۔ اس کے علاوہ
صفحوں کی تعداد (۹۰۳) اور فی صفحہ (۱۹) سطریں ہیں۔ اس حساب
سے اشعار کی تعداد سترہ ہزار کے قریب ہوگی۔ مفتاح الافواہ کی زبان
فارسی ہے۔ مصنف کی توجہ عربی الفاظ کی طرف تمام تر مبذول ہے
لیکن ایک دلچسپ پہلو اس تالیف کا یہ ہے کہ اس میں اردو الفاظ
بھی کثرت سے لائے گئے ہیں۔ مگر مفتاح الافواہ پر تبصرہ کا یہ موقد
نہیں ہے۔ اس لئے میں اس ضخیم تالیف سے دستکش ہو کر حافظ صاحب
کی دوسری تالیف ذوق الصبیان کے متعلق چند الفاظ کہنے چاہتا
ہوں۔

ایک معلم سب سے زیادہ بچوں کی ضروریات سمجھنے کا اہل ہے

جب لاہور میں بیٹھ کر حافظ احسن اشرار دوکان صاب طیار کرتے ہیں۔
 تو ہم سمجھ سکتے ہیں۔ کہ اس کی از حد ضرورت ہوگی۔ ذوق الصبیان کی
 تشریحی زبان اردو ہے۔ حافظ صاحب اپنے دیا چپس لکھتے ہیں۔
 کہ اس سے قبل میں نے اس مضمون پر ایک بڑی کتاب طیار کی ہے۔
 لیکن وہ بچوں کیلئے دقیق و دشوار ہے۔ اس لئے نصاب ہذا کو آسان
 ہندی زبان میں طیار کیا ہے۔ سال تصنیف ۱۳۳۷ء ہے۔ اردو زبان
 کے متعلق حافظ صاحب فرماتے ہیں۔ یہ ہندی زبان بہت آسان ہے۔
 بچے بڑی خوشی کے ساتھ اسے پڑھتے ہیں۔ اور پسند کرتے ہیں۔ اب
 میں نمونہ کلام دکھانے کے لئے ذوق الصبیان کے دیا چپس سے ایک
 اقتباس دیتا ہوں۔

احسن نام اک عاجز بندہ
 احسن اللہ کی ہے یہ رعایت
 اس کا وطن لاہور نگر ہے
 اس کی دانا خطا کو بخشے
 کیاں ہیں یہ کیتیاں بیتیاں
 لڑکے میرے پاس میں پڑھتے
 اگے ایک کتاب لکھی ہے
 پروہ بہت دراز وکلاں ہے
 یہ آسان اور ہندی بولی
 خوشی خوشی وہ پڑھتے ہیں اسکو
 ذوق الصبیان نام رکھا ہے
 جو کوئی اسکو پڑھے پھڑکے
 دے اصلاح جو ہو بھلائی
 بھڑو غ تعارب میسران
 ذیل کا اقتباس اصل نصاب سے دیا جاتا ہے۔

دل و مگر ہے ہیبا کیجیہ
 امر کینز ہے لٹری باندی
 کاا سر ہے مغز ہے بھیجا
 جیل نسترہ فعدہ چاندی

زپا سونا سیم دزر ہے
 عاشق مزا بندہ چسیرا
 حلقہ دورہ گر وہ گھیسرا
 بھار پوجہ انبار ہے تو وہ
 لوہو خون سیاہی سودا
 پتہ زہرہ تلخ صفرا
 گھیا کدو گونگوشلغم
 بیچ ہے اندر بیروں باہر
 مصنف کا طرزیان شگفتہ اور زبان نہایت صاف ہے بعض
 بعض موقعوں پر پنجابی لہجہ نظر آتا ہے۔ میں چند شعرا کی اور مقام سے
 نقل کرتا ہوں۔

سجن دوست ہے یار غلیل
 ہوتا پیش بس و بسیار
 فیل اور پیل اور مکنا ہتھی
 سنگ سنگت قافلہ کارواں
 پتھر سنگ رتن ہے جو ہر
 مریچ چورس گرد ہے گول
 اجر و اجرت مزد و مزدوری
 مرجاں پتہ کلی اور مونگا
 غریب مافرماندہ فقہا
 سگ ہے کتا گربہ بلی
 باگھ بھید شیر اسد ہے
 ماہی پھلی سینسار سنگ
 آہو ہرن سہا خرگوش
 دے و پری جو گدرا کھل پرپ
 کھل پرپوں آئندہ جو آوے
 فردا اور پس فروا بھادے

اوپر کے اقتباسوں میں آنتر رانت، مکمل (کل)، گونگوشلغم،

گھیر گئی، چوری (ملیدہ)۔ کلی (مونگا)، دوڑا (بہرا)، وغیرہ پنجابی زبان کے
ذخیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آنت جھاگ اور کلی وغیرہ کا صحیح ترجمہ یہی ہو
سکتا ہے۔ گو نگلو آجکل پنجابی مانا جاتا ہے۔ اور اردو میں غیر مستعمل ہے لیکن
مغلیہ عہد سے قبل کے اہل لغات اس لفظ سے واقف ہیں۔ اور قدیم
ملفوظ دی ہے۔ جو آج پنجاب میں رائج ہے چنانچہ ادوات الفضل تا لیل
۸۲۲ھ میں چقندر کا مرادف گو نگلو دیا گیا ہے۔ شرف نامہ احمد نیرری
۸۷۷ھ میں گانگلو اور مرید الفضل ۹۲۵ھ میں گنگلو لکھا ہے۔ قائمہ۔
ختم مرتبہ یو اسارا آخر اوڑک عجیب نیارا تنکا خن ہر پیچھے پس ہے
پورا سارا قانع بس ہے تو بھی بس اب بس کر احسن پھر درود اور حمد و المن
مانگ خدا سی ہو امی بخشے رب گناہ تمہا می بندہ منگتا کرے تمہا میں
مولیٰ صاحب آنا ساتیں

صرف و نخوان زبانوں کے اتحاد اور قرابت کی طرف دلالت کرتی ہے۔ اردو کا سب سے قدیم فقرہ جو میں معلوم ہے پنجاب ہی کے ایک شیخ حضرت فرید الدین گنج شکر کی یادگار ہے۔ مسلمانوں میں سب سے اول جس شاعر نے ہندی دیوان لکھا۔ وہ لاہور کے مشہور شاعر خواجہ مسعود مسلمان ہیں۔ سب سے پہلے جس شخص نے دوبہ لکھا۔ وہ یہی شیخ فرید الدین مذکورہ بالا ہیں۔

رحمنِ حقباتی وارث

بادشاہ مایوس ہو چکا تھا۔

ملکہ چاہتی تھی کہ بادشاہ دوسری شادی کر لے۔

ان کا کوئی وارث نہ تھا۔

رعیت کا غمخوار نیک دل بادشاہ ملکہ کو دل سے چاہتا تھا۔

ایک دن بادشاہ نے بوڑھے وزیر سے کہا میں چاہتا ہوں کہ تخت کا وارث انتخاب کروں۔ سلطنت اور حکومت

کو وارث کی سخت ضرورت ہے۔

دانشمند وزیر بادشاہ کا چہرہ تک رہا تھا۔ ایک آنسو اس کی آنکھوں میں چمکا اور زمین پر گر گیا۔

بادشاہ اپنے وزیر سے بڑی بڑی امیدیں رکھتا تھا۔ بہت جلد اس نے اندازہ کر لیا۔ کہ وزیر کے ذہن میں کن جذبات نے کڑٹ

لی ہے۔ اور وہ اپنے بادشاہ سے کس قدر محبت رکھتا ہے۔

بادشاہ نے کہا ایک جشن کیا جائیگا جس میں ملک کے تمام بچے زریں لباس پہنے قومی نشان لگا کر آئینگے۔ جشن کے روز میں اپنا ہیرو

کی سی چمکتی ہوئی آنکھوں والا بازار اڑاؤنگا۔ وہ جس پر جا بیٹھیں گے اس سے اپنا جانشین تسلیم کر لوں گا۔

چند لمحوں تک وزیر اور بادشاہ بالکل چپ رہے۔

وزیر کا سر جھک گیا۔ شاید اس نے بادشاہ کی تجویز کو درست تسلیم کر لیا تھا۔ یا اپنی خاموشی سے اس عقیدت کا اظہار کر رہا تھا۔ جو اسے

اپنے بادشاہ سے تھی۔

آخر جشن کا دن آپہنچا۔ خوبصورت بچے زریں لباس پہنے قومی نشان لگائے ماؤں سے نصحت ہو کر اپنے بادشاہ کی آرزو پوری

کرنے آئے جشن اپنی مثل آپ تھا۔ اس سے پہلے ملک نے ایسا جشن نہ دیکھا تھا اور نہ سنا تھا۔

بادشاہ اپنی ملکہ اور مصاحبوں کے ساتھ اس شاندار چہو ترے پر جا بیٹھا جو بادشاہ کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ یہ جگہ قدرتی پھولوں

دریں پرندوں اور فالینوں سے سجائی گئی تھی۔ جہاں بیٹھ کر بادشاہ اپنے ملک کے مستقبل کا فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اٹھا اور اپنے بازو کو جو اس کے ہاتھ پر بیٹھا ہوا تھا فضا میں چھوڑ دیا۔ باز بلندی کی طرف اڑا اور پھر اس تیزی سے نیچے کی طرف آیا گویا کسی پر پھپھٹ پڑ گیا لیکن آخر کار آہستہ آہستہ اترتے ہوئے بوڑھے وزیر کے اکلوتے بیٹے کے سر پر جا بیٹھا۔ رعیت کے سامنے زندگی کا ایک نیا باب کھل گیا۔

بادشاہ نے دانشمند وزیر سے کہا اے خیر خواہ سلطنت جو کچھ ظہور میں آیا ہے۔ اگر اسی پر عمل کیا جائے تو رعیت ضرور بدظن ہو جائیگی۔ چنانچہ بہتر یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس اہم فیصلے کے لئے ملک کو ایک اور موقع دیا جائے۔ آخر دوسرا جشن بھی آگیا۔ بادشاہ نے پھر باز چھوڑا اور وہ پہلے کی طرح پھر بوڑھے وزیر کے لڑکے پر جا بیٹھا۔ بادشاہ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے کہا میں ایک بار پھر آزمائش کرونگا۔ لیکن تیسری مرتبہ بھی وہی کچھ ظہور میں آیا جو پہلے ہو چکا تھا۔

بادشاہ کا رنگ زرد پڑ گیا اس کی آنکھوں میں رنج اور خوف جھلک رہے تھے۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد سراٹھایا اور کہا اس سلطنت میں اس بچے سے بڑھ کر میرا کوئی دشمن نہیں! دانشمند وزیر خاموش رہا۔

بادشاہ کی آنکھیں شاہین کی طرح چمک اٹھیں۔ انجام کار بادشاہ کی سالگرہ کا دن آیا۔ تمام ملک خوش و خرم تھا۔ بادشاہ کی سلامتی کے گیت گائے جا رہے تھے۔

بادشاہ نے درشن بھرد کے میں کھڑے ہو کر کہا میں آج آخری مرتبہ اپنا وارث منتخب کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے ہوا میں اپنا باز چھوڑ دیا۔

ملکہ غیر معمولی طور پر خوش تھی وہ بالکل بدل چکی تھی۔ اس کی نگاہیں بار بار بادشاہ پر پڑ رہی تھیں۔ باز نیچے اتر رہا تھا۔ اس دفعہ خلاف معمول وہ ملکہ کے سر پر جا بیٹھا۔

ملکہ کے سر کے پیچھے باز کے پھیلے ہوئے پروں کے درمیان ایک روشنی چمک رہی تھی۔ بادشاہ نے ملکہ کی طرف تعجب کی نگاہوں سے دیکھا۔

ملکہ مسکرائی اور اس کا سر جھک گیا۔

رحمن چغتائی

محمد عبد اللہ حقباتی مسلمانوں میں مصوری کا ارتقاء

فنون قبل اسلام

قدیم روایات

جدید تاریخی تحریکات اور آثار عتیقہ کے اہم اکتشافات نے ہماری معلومات اور ذہنی نشو و ارتقاء میں بہت بڑا اضافہ کیا ہے۔ اور ان کو منصفہ شہود پر لانے کی غرض سے محققین اور ماہرین نے ہر قسم کے ذرائع اور مآخذ کی تلاش میں کمی نہیں کی ہے جدید معلومات سے قطع نظر اگر مصوری کے صحیح آغاز کا کھوج لگایا جائے یونانی تو ہم اس کے رواج اور دریافت کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے بلکہ اس کی ترویج کا عہد بھی متعین کرنے سے قاصر ہیں۔ مگر موجود تحقیقات اور اکتشافات کی روشنی میں جب اس موضوع پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ قبل ولادت مسیح تک کے آثار دریافت ہو چکے ہیں۔ جیسا کہ حال ہی کے مصری اکتشافات نے قدیم تاریخ مصر کو کافی زندہ کر دیا ہے۔ اس زمانے کے مصریوں کے اعتقادات، رسوم، عادات و اوضاع زندگی ان نقوش جاریہ سے واضح ہیں جو ان کے رسم الخط و تحریر سے ملے ہوئے ہیں۔ ان نقوش اور تحریروں سے اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ مصوری ایک قسم کی تحریر ہے۔ اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ فن مصر میں اس وقت کس اعلیٰ پیمانہ پر تھا یعنی ان نقوش کی بدولت آج ان کی قریب قریب تمام قدیم تاریخ محفوظ ہے۔ ہمارے سامنے برٹش میوزیم کا (ROSETTA STONE) حجر رشید اس کی بہترین مثال ہے۔ جسے مصری مفتاح اللغۃ ہیرو

مصری

غلطیہ کہتے ہیں۔ اس پتھر میں ایک مصری فرمان دوطرز کی کتابت میں محفوظ ہے۔ ایک تو کتابت ہیرو غلیفہ (قدیم مصری تحریر) ہے۔ اور دوسری کتابت یونانی زبان میں ہے جو ۱۹۵۰ ق م میں رائج تھی۔ یہ پتھر ۱۸۹۸ء میں مصر میں برآمد ہوا اور ۱۸۸۰ء میں انگلستان لایا گیا۔ اس پتھر سے اس امر پر پوری روشنی پڑتی ہے کہ یونانی زبان کے ذریعہ کس طرح مصری زبان کو پڑھا جاسکتا ہے۔ اگر مصوری کے متعلق یہ تحقیقات کی جائے کہ اسکا آغاز اولاً کس ملک سے ہوا اور مشرق و مغرب میں اسکی ایجاد و رواج کا سہرا اولاً کس کے سر ہے۔ اور ممالک عالم کی مختلف تہذیبوں میں کون سی تہذیب سب سے پیشتر اس کی علمبردار ہوئی ہے تو ایسے سوالات کا جواب آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ یہاں صرف یہی کہنا کافی ہوگا کہ اس کی ابتدا محض مذہبی فرائض کی بنا پر ہوئی ہے۔ فن کی حیثیت سے نہیں جیسا کہ آج وہ شمار ہوتی ہے۔ اگر اہل یونان سنگتراشی میں تمام دنیا پر سبقت لے گئے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے تو یہ تمام تحریک ان کے مذہبی جذبات کی ممنون احسان ہے کیونکہ یونانیوں نے جس چیز یا شخص کو مافوق العادت دیکھا اسے قابل پرستش تسلیم کر لیا۔ یہ معبود خواہ جمادات سے ہو خواہ نباتات سے خواہ حیوانات سے۔ یہ پرستش ان میں اس قدر راسخ ہو گئی کہ مختلف معبودوں کی تمثیل کو گھر گھر ان کی عبادت شروع کر دی۔ اور ان کی خصوصیات کے مطابق ان کے مختلف نام رکھ دئے۔ چنانچہ محض مذہب کی بنا پر

کے حسن و شباب کی منقہا طبیعت کشش نے غریب مصور کے دل کے ساتھ کی وہ ہزار دل و جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اس کے جذبات و خیالات اس قدر مسحور ہوئے کہ وارفتگی کے عالم میں مصور خود پتھر کا نمونہ بن کر رہ گیا۔ سکندر اعظم یونانی النسل اور ارسطو کا تلمیذ تھا اور تسخیر اقبالیم و فتح ممالک اس کی غایت تھی۔ حسن و عشق کے جذبات لطیف سے بالکل مستغنی تھا۔ وہ اپنے مصور کو مغلوب جذبات دیکھ کر کپکپا سہ کو اس کی رفیقہ حیات بنا دیتا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ فنون لطیفہ کے لحاظ سے وہ زمانہ بھی اور ج کمال پر تھا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جب سکندر اعظم فارس میں آیا تو اس وقت وہاں کے فنونِ ظریف کی کیا حالت تھی۔ وہاں کے قدیم ایوان طیسفون - طاق بستان - قصر شیریں وغیرہ عمارات کے نقوش جس سے ایرانیوں کے مذہب و عقائد و دیگر پر پوری روشنی پڑنے کے علاوہ فنونِ لطیفہ ایران کے اعلیٰ معیار کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان کے ساتھ عراق کے جدید کشفیات جہن عراق و عجم کے فن میں مماثلت بتلاتے ہیں۔ عراق کے ورے اشور کے کھنڈرات بھی کسی حد تک یہی روایات پیش کرتے ہیں غرض کہ مشرق کے یہ تمام ممالک موہ مصر جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اپنا الگ الگ فن اپنی روایات کے مطابق رکھتے تھے۔

اگر ہم یونان عراق و عجم کو مغربی و مشرقی حیثیت سے دیکھیں تو فن کی فوراً دو حیثیتیں مغربی و مشرقی ہو جاتی ہیں۔ جو اپنی اپنی خصوصیات میں بالکل متضاد ہیں ایک کو دوسرے پر تقدم رہا نہیں دیا جاسکتا۔ بعض محققین نے لکھا ہے "کہ یونانی علوم و فنون اگرچہ مشرقی ہی ہیں۔ لیکن ان کی نشو و نما مشرقی روایات پر نہیں ہوئی بلکہ یورپی اور یونانی روایات پر ہوئی ہے جس کی

یونانیوں نے اس فن میں تمام دنیا سے خراجِ تحسین وصول کیا تھا۔ اس فن نے سکندر اعظم کی فتوحات کے دور میں ممالکِ غیر پر بھی اثر ڈالا۔ جب سکندر اعظم ہند میں آیا تو اس کے ہمراہ ہیشمار حکماء فضلہ ادر صنائع تھے۔ انہوں نے ہند کی فضا کو دیکھ کر اپنے فن کو ہندی دیوتاؤں کی خدمت گزار کی بھی آہ بنا دیا۔ اس کا سراغ ٹیکسلا و بامیان وغیرہ کے قدیم احصنام میں ملتا ہے۔ اس عہد کے یونانیوں کے مذہب کو جمالیاتی مذہب کے نام سے یاد کرنا بیجا نہ ہوگا جو بالخصوص فنونِ لطیفہ کے فروغ کا باعث ہوا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ جب سکندر نے ممالکِ مشرق میں قدم رکھا تو اس کا درباری مصور آپلاس بھی اس کے ہمراہ تھا جس نے ابھی محض سکندر کی جنگوں کے مناظر کو اپنے مشاہدہ کے مطابق حوالہ "قلم و رنگ کیا تھا مگر اس کے دل میں یہ امنگ تھی کہ کبھی بزم کی لکھ صنفِ نازک کے ساتھ بھی اس کی تصویر اتارے۔ سکندر نے اس کے مہرِ رانہ جذبات کا اندازہ و احترام کرتے ہوئے وعدہ کیا تھا مگر ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ وہ فاتح اور جنگجو ہونے کی حیثیت سے قدرتاً مجالسِ نشاط اور صنفِ نازک کی صحبتوں سے چنداں دلچسپی نہیں رکھتا۔ چنانچہ جب ایرانیوں کو شکستِ ناک ہوئی تو نازنینانِ حرم دارا میں سے ایک کپکپا ہامی نازنین کو انتخاب کر کے سکندر کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ سکندر نے حسب وعدہ آپلاس مصور کو اس کی تصویر بنانے کا حکم دیا اس نے نہایت مسرت سے یونانی دستور کے مطابق نازک حسین کپکپا سہ کو اپنے سلمے عریان بٹھا کر تصویر کھینچی شروع کی۔ اب ایک مصور کے موقلم کو جنگی مناظر کی مشغولیتوں سے کبھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ اس تبدیلی سے اس پر ایسی وجدانی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ اپنے فن کے مبادیات بھول گیا جس طرح ایک ماہرِ موسیقی دان اپنی دلکش آواز اور نوازوں اور نغموں سے سامع کا قلب موہ لیا کرتا ہے یہی حالت اس دورِ شیر

معنی - موتیں برباد کرتی رہتی ہیں۔ حالانکہ نو شیردان درفش کاویانی کے نیچے پرورش کیا جاتا موصور کیا گیا ہے۔

متبنی متونی ۳۵۷ھ نے جہاں سیف الدولہ کی تعریف کی ہے وہاں اس کے محلات وغیرہ کی بھی خوب طرح سرائی کی ہے اور بہت لمبے قصبے میں وہاں کے نقوش کی تفصیل بیان کی ہے۔ جن میں سے دو شعر ملاحظہ ہوں۔ ان سے اسی طرح معلوم ہوگا کہ شعراے عرب کا کلام بجائے ایرانی فنون کے رومی (بازنطینی) فنون کو ضرور بیان کرتا ہے۔

نری حیوان السرمصطاجا بها
یحارب ضد ضد یسالمہ
وفی صورة الرومی والتاج ذلیہ
لا بلج لا یتجان الاعماصہ

معنی خشکی کے حیوانات نے اس سے صلح کر لی ہے برخلاف جانور اپنے مخالف سے لڑتے اور صلح کرتے ہوئے مصور کئے گئے ہیں۔ اور بادشاہ روم صاحب تاج و تخت کی تصویر جو اس خمیہ پر دکھائی گئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ روم اس سفید پیشانی والے (سیف الدولہ) کے آگے کوئی ہستی نہیں رکھتا حالانکہ سیف الدولہ کے عمامے ہی اس کے تاج کا کام جیتے ہیں۔

اسی طرح متبنی نے سیف الدولہ کے منقوش خمیوں کی تعریف کی ہے جن کے لئے بہت سے ایسے ہی الفاظ تھے جیسا کہ کپڑوں کے لئے ہیں۔

کتاب البلدان ہمدانی میں وضاحت سے ملتا ہے کہ بازنطینی فن سے مقصود رومی ہے۔ مشرقی رومی سلطنت کے نہایت کاگیر مصورین دنیا میں شمار ہوتے تھے۔ خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں بغداد و دیگر شہروں میں گرجے تعمیر ہوئے جن میں رومی روایات پر مسیحی لوگوں نے کام کیا اور اسی طرح سے ان کا اثر بھی ان پر ہوا۔

تاریخ بھی موید ہے۔ ۵۲۱ ق م دارا اول کے عہد حکومت میں جب ایرانیوں نے یونانیوں کو تاخت و تاراج کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصر، فلسطین، شام، ایشیائے کوچک اور قبرص تک اور بحیرہ روم کا مشرقی ساحل ایرانیوں کے قبضہ میں آچکا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قدیم بازنطینی و ایرانی نقش و نگار بہت مشابہ ہیں۔ ایک قدیم کوزہ نقشین کے اکتشاف نے اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی ہے جو اٹلی کے ایک پرگنہ کا توزہ میں برآمد ہوا ہے جس میں کسی قدیم مصور نے دارا شاہ ایران کو یونانیوں سے خراج وصول کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ نقاش اس وقت کی بود و باش کے مطابق دونوں قوموں کو متمیز طور پر اظہار کرنے میں کامیاب ہے۔

ایران کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ایک قلیل عرصہ کے لئے بھی ایرانی فنون لطیفہ کی ترویج میں باوجود حوادث زمانہ کے کوئی ظہور حائل نہیں ہوئی۔ یورپین محققین فن نے بازنطینی فن کو بہت ترجیح دی ہے لیکن یاد رہنا چاہئے کہ ظہور اسلام کے وقت وہاں کے مدارس بند ہو گئے تھے جو دراصل وہاں کا خاتمہ تھا۔ ایرانی فن کے تسلسل کے متعلق اور شواہد بھی ملتے ہیں جیسا کہ شعراے اسلام نے ابتداء ہی سے اپنے کلام میں بعض جگہ اس فن کی خوبیوں کو بطور تشبیہات پیش کیا ہے۔ چنانچہ ابولواس متونی ۳۱۹ھ نے جام شراب کی تعریف میں کہا ہے

قرارتھا کسوی و فی جنباتھا
مہاند ربھا بالقسمین الفوارس

معنی - اس کے پیندے میں کسریٰ کی تصویر ہے اور اس کے پہلوؤں میں نیل گائے کی تصویریں ہیں جن کے شہسوار کمانوں کے ذریعے شکار کرتے ہیں۔

بکتری متونی ۳۲۵ھ ایوان مدائن کے متعلق کہتا ہے
والمنا یا مواشل و انوشر
وان یربی تحت الدرفش

اس ملک میں آئے۔ البتہ غار ہائے الورہ کا ذکر علاؤ الدین طنجی اور اورنگ زیب کے کارناموں میں ملتا ہے۔ ان کے متعلق آئندہ آگے چل کر مفصل عرض کرنا ہوگا۔

عرب قریب اسلام

عربوں کی کمال خوشی کا معیار اس میں ہے کہ تیز رفتار عہد بن گھوڑا ہو۔ حسین خیمہ نشین عورت ہو۔ عمدہ آبدار دھار والی تلوار ہو۔ سنہری انگوری شراب کا جام ہو۔ خصوصیت سے جبکہ فلک پر کالی گھٹا چھائی ہو۔ ان کی یہ سب خاصیتیں ان کے شاہکار سبع مملکت سے عیاں ہیں۔ جن کا ایک ایک لفظ ان کے فنون لطیفہ کا صحیح آئینہ ہے اور ان کی طبع موزوں۔ ملکہ منظومیت۔ شاعری کا فیضان اتم درجہ ان سے واضح ہے۔

موسیقیان نے تمدن عرب میں تحریر کیا ہے کہ فنون لطیفہ میں عموماً مصوری، بت تراشی، تعمیرات اور موسیقی شامل ہیں۔ چنانچہ اگر ہم عربوں کے قدیم فنون کو بغور دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یمن میں قدیم زمانہ ہی سے قریباً تمام فنون مذہبی طور پر ادا کئے جاتے تھے کیونکہ ابھی تک وہاں ایسے دیواری نقوش ملتے ہیں جو قدیم عرب باشندوں کے اعتقادات، عادات اور دیگر واقعات پیش کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں آیا ہے :-

وَقَالُوا لَا تَنْزِّلْ عَلَيْنَا مَاءً غَيْرًا
يَعُوْثُ وَيَعُوْثُ وَنَشْرُوْهُ وَقَدْ اَصْلَوْا كَيْتًا (نوح)

ترجمہ۔ انہوں نے کہا اپنے مہبودوں کو مت چھوڑو اور نہ (بت) دو نہ سولہ، نہ یغوث، نہ یعوق، نہ نسر حالانکہ انہوں نے بہتوں کو گمراہ کر ڈالا۔

اس کی تفسیر میں مفسرین لکھتے ہیں کہ مختلف قبائل کے مختلف اصنام مختلف مقام پر تھے جن کی وہ پرستش کرتے تھے۔ سب قبائل مل کر سال بھر میں ایک دفعہ بیت اللہ شریف کا حج کرتے جس کے

ماہرین صنائع چین و ماچین کا خیال ہے کہ چینی مصوری کے ماخذ چینی رسم الخط کے ساتھ ہی ملے ہوئے ہیں جو دراصل تصاویر و نقوش سے اخذ کیا گیا ہے۔ یعنی قدیم نقوش کی شکل اختیار کر لی ہے باوجودیکہ

اس کے بہت قدیم سے نشان ملتے ہیں مگر صحیح معنوں میں قدیم چینی مصوری کے ضمن میں ختن کے اکتشافات دیواری مصوری قدیم بدھ مذہب نے بہت مدد کی ہے جس پر ڈاکٹر سرارل شائین نے اپنی انگلیک مساعی جیلہ سے روشنی ڈالی ہے اور ایک ضخیم کتاب "ہزار بدھ" کے نام سے شائع کی ہے جس کو تیسری صدی عیسوی سے لیکر آٹھویں صدی تک منسوب کیا جاتا ہے۔ ختن کے متعلق بھی قدیم حالات مشہور بدھ مذہب کے چینی سیاح فاہن کی اپنی تحریر میں ملتے ہیں جو ۶۳۹-۶۴۵ء میں براستہ مغربی ختن سفر کر کے ہندوستان میں داخل ہوئے اور گدھ کا سفر کر کے براستہ لنکا اپنے ملک کو روانہ ہوئے اور

یہی راستہ تھا جس سے بدھ مذہب نے چین تک رسائی کی۔ آثار و ختن سے قدیم فن بلا ترکستان پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج بھی یورپ اپنے اعلیٰ مصوری کے نمونے پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ان میں بدھ مت کی مکمل سرگزشت مع رسومات و اعتقادات کے رنگین نقوش میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یا قوت حموی ختن کے متعلق معجم البلدان میں لکھتا ہے :- "کاشغر سے الگ یا رکند کے عقب میں بلاد ترکستان کا حصہ وادی جبال کے درمیان بلاد ترک کے وسط

میں واقع ہے۔ سلیمان بن داؤد بن سلیمان ابو داؤد المعروف بحجاج الختئی کے نام سے مشہور ہے۔ مقام بامیان کے ذکر کے علاوہ وہاں دو عظیم بول سرخید و ختکبڈ کا بھی ذکر ملتا ہے۔ جہاں تمام پرندوں کی تصاویر منقوش تھیں جو اللہ نے زمین پر پیدا کئے (یا قوت ۱۸۴) اسی طرح اجنٹا و دیگر ہندوستانی غاروں کا ذکر بھی لازمی معلوم ہوتا ہے جن کی تاریخ بھی قریب قریب یہی بتائی جاتی ہے اور جو دنیا بھر میں شہرت بھی حاصل کر چکے ہیں۔ مگر قدیم کتب تاریخ میں ہمیں اجنٹا کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ یہ حال کی دریافت ہے جبکہ انگریز

طواف میں رقص و موسیقی کو دخل دیتے جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے
وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً
ترجمہ - ان کی غار حراء کعبہ کے پاس صرف تالی اور سٹی بجانا ہوتا تھا۔

پھر یہ بھی کہا گیا - "وَادْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِ آبَائِكُمْ أَوْ أَشَدُّ ذِكْرًا"
یہ مسلمانوں سے خطاب حج کے موقع پر ہے کہ اللہ کی اس طرح عبادت
کرد جس طرح قدیم زمانے میں تم اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کیا کرتے تھے
یہ ان کی شاعری کی طرف اشارہ ہے جو اپنے آباؤ اجداد کے ذکر میں
فخریہ تصانید پڑھا کرتے تھے۔ یہ سب چیزیں مذہب کی بنا پر نہیں آج
ان کے آثار نہ ملنے کی وجہ محض اسلام ہے۔ جس نے ان کے فروغ
کو ایک دم روک دیا اور مردِ ایمان سے وہ خود بخود ہی مٹ گئے۔

اسلام کے ابتدائی زمانہ میں یہ ممبر ۳۶۰ بتوں سے معمور تھا۔
کعبہ کی دیواروں پر حضرت ابراہیمؑ، اسمعیلؑ، عیسیٰؑ اور مریمؑ کی رنگین
تصاویر تھیں جو فتح مکہ کے موقع پر صاف کی گئیں اور بتوں کو توڑ دیا
گیا اور ان کی بیع و شرا کو حرام قرار دیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس
پر خطبہ بھی دیا۔ بعض بعض موقعوں پر بعض علمبرداران اسلام کو بعض
قبائل کے اصرام شکنی کے لئے بھیجا گیا۔ امرأ القیس کا یہ شعر ملاحظہ ہو
كَانَ دَهْلِي اسْقَفَ عَلَيَّ ظَهْرَ مَرْمَرٍ
کسا مزید الساجور و شيا مصورا

ترجمہ - گویا مقامِ صفا کے بت سنگِ مرمر کے سینڈ پر ہیں جن پر وادیِ سابو
کے نقش کئے ہوئے کپڑے ہیں۔

اگر KEATS نے (ODE TO GRECIAN URN)
لکھ کر غیر فانی شہرت حاصل کی ہے تو یہ ایک شعر اس کے سامنے
کسی صورت میں بھی کم نہیں ہے جس میں امرأ القیس نے یہ زیادتی
کی ہے کہ اس آرٹ کے نمونہ کو پھر ایک ایسی آرٹ کی چیز یعنی نقش
کپڑے سے ڈھانپ کر اس کو مزید مقتدر اس صورت میں بنا دیا ہے
کہ دیکھنے والی آنکھ کو ہمیشہ کے لئے اس حسین نمونہ فن کو دیکھنے کی
غرض سے آرزو مند کر دیا ہے جو اس کے غایت الفاظ سے ظاہر ہے

امرا القیس کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو :-

خرجتُ بهما تمشي تجرورا ونا

علی اثربنا ذیل مرط مرحل

ترجمہ - مرط مرحل یعنی ایسی چادر جس پر محل کی تصاویر بنی ہوں
اگر مرحل کو مرحل پڑھا جائے تو معنی ہونگے کہ اس پر آدمیوں
کی تصاویر منقوش تھیں

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسی چادر کا استعمال کرنا بعض احادیث سے
ثابت ہے :-

۱- ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج ذات غدا
وعليه مرط مرحل

۲- کان یصلی وعلیه من هذال المرحلات

(المروط)

اسی طرح جب کسی کپڑے پر تیروں کے نقش ہوتے اسے مسہم
کہتے تھے جن پر پرندوں کی تصاویر ہوتی تھیں انہیں مطیل جن
پر گھوڑے کی تصاویر تھیں محیل جن پر درخت منقوش ہوتے
انہیں مشجر کہتے تھے۔ غرض کہ بہت سے ایسے نام وضع کئے
جاتے تھے۔ مثلاً مسیّف، مکعب، معرض، مسعد
معصد جن پر انگوٹیاں ہوتیں اسے سبحلاط۔

میں نے ظہور اسلام کے پہلے جو حالت فنون لطیفہ کی تھی کسی
حد تک اس غرض سے پیش کر دی ہے کہ اس مختصر سی کیفیت سے
کم سے کم یہ ضرور اندازہ ہو جائے کہ ان قدما کی فنون لطیفہ سے
کیا اغراض وابستہ تھیں۔ جو محض مذہب تھا۔ اور اسی جذبہ میں سب
کچھ کیا گیا۔ جو بعد میں جا کر بہت بڑا جزو فنون لطیفہ کا بن گیا۔ اسلام
نے جو کچھ اس ضمن میں پیش کیا وہ بالکل اس کے برعکس تھا۔ جس نے
قبائل کی تمام روایات کو ایک ایسے عقیدے سے توڑ دیا اور ایسے
طریق زندگی کی طرف مائل کیا جو ان کے لئے بالکل بیگانہ تھا یعنی تمدن
عرب قبل بعثت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بعد بعثت بالکل متضاد تھے۔ ان

میں کوئی مماثلت قائم نہیں ہو سکتی۔ مگر وہ فنون جو متمیز اسلامی فنون کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں سب کے سب فتوحات اسلامیہ کی پیداوار ہیں۔ ان کو دراصل غایت مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ محض ایسے متذکرہ بالاماحول میں مسلمانوں کی منفرد طبع کی وجہ سے پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنے اپنے ماحول میں وہ خاص متمیز صورت اختیار کی جو اسلامی کہلائی۔ ڈاکٹر مارٹن، ہابین، کونل، سٹری زگوو سکی کا خیال ہے کہ مسلمانوں نے مذہبی فن تصویر کشی پیدا کئے۔ مگر سر آرلڈ موڈ ہیں کہ اسلام نے کبھی کوئی اپنا خاص مذہبی فن مصوری پیدا نہیں کیا جن سے مذہبی شعار و اطوار نظر آئیں۔

آغازِ اسلام

یہ قدرت کا تقاضا رہا ہے کہ جب کبھی دنیا میں انحطاط اپنی غایت کو پہنچ جاتا ہے تو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کسی مصلح یا مجدد کو بھیج کر اپنی نیابت کا کام لے یا دوسرے الفاظ میں بہت بڑی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ اور آنحضرت صلیم کے دنیا (فترۃ) کا ایسا زمانہ تھا کہ لوگ لہو و لعب اور فسق و فجور کے دلدادہ اور یاد الہی سے بیگانہ ہو چکے تھے۔ دنیا میں کوئی مذہب نہ تھا۔ فنون لطیفہ جذبات کو براہ گنجہ کرنے والے تھے اور مذہب حق و عشق تصور کیا جاتا تھا۔ بازنطینی فنون لطیفہ نے تمام دنیا پر تسلط کر رکھا تھا اور عوام اندھا دھند اس کے مطیع ہو رہے تھے۔ اصنام پرستی نہیں بلکہ اصنام تراشی اعلیٰ عبادت و فن شمار ہوتے تھے۔ آنحضرت صلیم کی بعثت جو توحید الہی کا کلمہ کھلا اعلان تھا اور تمام غیر اللہ معبودوں کے عابدوں کو چیلنج تھا جس کا یہاں تک اثر ہوا کہ جہنمیں شاہ روم جیسے مدبر نے ایتھنز کے مدارس بند کر کے صنایع و فضائل کو سلطنت سے نکال دیا۔ یہ خاص کردہ ایام تھے جبکہ گریجری پادری اعظم نے فلسطین کا کتب خانہ جلا دیا تھا اور شاہ خسرو نوشیروان ایران نے ان تمام جلا وطن لوگوں کو پناہ دی تھی۔ مگر ایران میں بذاتِ خود ان

کی آگ جو صدیوں سے شعلہ زن تھی ٹھنڈی ہو گئی۔ غرض کہ دنیا میں بہت سے ایسے عجیب و غریب واقعات پیش آئے اور سب کائنات آفتاب رسالت کے استضاء کے لئے منتظر تھی۔ اور قدرت کا کافۃ الناس کے قلوب کو ضلالت و گمراہی سے نجات دلانا مقصد و حید تھا۔ چنانچہ طرفۃ العین میں ان نور کی شعاعوں نے بجلی کی رو کی طرح اثر کیا۔ لوگ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے شروع ہوئے اور ان کو لہو و لعب، فسق و فجور جو ان کے ہاں فنون لطیفہ شمار ہوتے تھے اور جن سے جذبات مشتعل ہوتے تھے۔ بجائے ان کا قلع مع کر دیا گیا۔ بلکہ ان کو حرام و واجب التکرار دانا گیا۔ اگرچہ ان سے ایک دم روک تھام مشکل کام تھا۔ کیونکہ یہ وہ وقت تھا کہ امرأ القیس اور لبید وغیرہ کے قصائد ان کی نوک زبان تھے۔

جب لبید مشرف باسلام ہوئے اور وفد بنی کلاب میں آنحضرت صلیم کے سامنے آئے تو یہ شعر پڑھا :-

الْحَمْدُ لِلّٰہِ اِذْ لَمْ یَاْتَنِیْ اَجْلٰی
حَتّٰی کَسَانِیْ مِنْ الْاِسْلَامِ سِرًّا

ترجمہ۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس وقت موت نہیں آئی جب تک میں نے اللہ کے فضل سے اسلام کا جامہ نہیں پہن لیا۔

حضرت عمرؓ نے مزید شعر سننے کی درخواست کی تو سورہ بقرہ پڑھ کر سنائی اور کہا جب میں نے سورہ بقرہ سیکھ لی ہے تو کیا ضرورت ہے جس پر حضرت عمرؓ نے آپ کو پانستھ دوہم عطا کئے۔ لبیدؓ کے اس شعر میں تمام فلسفہ اسلام پنہاں ہے اور اس سے بہت سے امور پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلام نے سب جذبات برٹھانے والی باتوں سے ایک دم روک دیا تھا۔ کیونکہ اسلام کافۃ الناس کے لئے آیا تھا نہ محض خطِ عرب کے لئے۔ چنانچہ اسلام نے بہت تھوڑی مدت میں شرق و غرب میں وہ مقبولیت حاصل کی جو صدیوں میں کسی اور مذہب کو حاصل نہیں ہوئی تھی یہ سب کچھ منجانب اللہ اور اسلام کی سیدھی سادی تعلیم کا اثر تھا۔ جو مساویانہ اصول پر قائم تھی۔

لہ۔ شعر الشعرا ابن قتیبہ ص ۵۵۔ مطبوعہ مصر

لہ۔ تاریخ فنون لطیفہ قرون وسطیٰ ص ۲۳۲ مصنف علی قاری

فنون لطیفہ نے ہمیشہ اپنا الگ اور محدود ماحول قائم کیا ہے جو ان مقاصد اور اصولوں کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ہمہ گیری ان امور کی طرف نہیں آتی۔ توراه کے مطالعہ سے متعدد مقامات پر معلوم ہوتا ہے کہ محض تصاویر کی وجہ سے بعض اقوام پر غضب الہی نازل ہوا۔ چنانچہ جب حضرت سلیمانؑ نے ایوان بیت المقدس کی تعمیر کرائی تو دروازوں اور دیگر مقامات پر نقوش تھے اس واقعہ کی قرآن کریم میں یوں تفصیل آئی ہے :-

”يَعْمَلُونَ لَهَا مَا يَشَاءُونَ مِنْ مَّحَارِبٍ وَتَمَاثِيلَ“

(۱۱۳) سورہ سبا

باوجود اس کے انجیل میں تصاویر یا مجسموں کے لئے کوئی امتناعی حکم نہیں ہے۔ جب مسلمانوں نے حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جہاد کیا تو اولین فاتحین شام و مصر اپنے آپ کو بازنطینی یا قبطی معبدوں میں مسند نشین کیا جن پر وہ اپنی فتوحات پر قابض ہوئے اور ان کو ان کی حالت پر بعد ازاں حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ نے دیا۔ کسی قسم کا کوئی تخیل واقع نہیں کیا۔ اپنی الگ قیامگاہیں اور مسجدیں قائم کیں۔ یہ قدیم نشانات آج برآمد ہو رہے ہیں اور ان اطراف میں قدیم صناعی کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ عرب صحرائین افریقہ، اندلس، فارس وغیرہ کے میدانوں کو عبور کر کے آگے بڑھتے چلے گئے۔

یہ مسلمانوں کا خاصہ رہا ہے کہ جہاں بھی رہے تنہا بغیر شرکت غیر سے اپنی جدت طبع سے ہر امر میں خاص تنوع پیدا کیا۔ مصر میں قبطی، اندلس میں بربر، فارس میں ایرانی، ہند میں ہندی تھے مگر اسلام نے ان فوار دین اسلام کو اپنی فطرت کے مطابق ایک نئے جذبہ کی اجازت دی جسے شائع اسلام خوب جانتا تھا کہ ان میں کس طرح سرایت کر سکتا ہے۔ غرض کہ اسلام جہاں بھی گیا لوگوں کے قلوب پر حاوی رہا اور اس نے فنون لطیفہ میں ایک خاص تغیر پیدا کیا جو اوائل زمانے میں فن تعمیر میں زیادہ تر نظر آتا ہے جس میں ایک خاص ہی نوعیت پیدا کی۔ چنانچہ آنحضرت صلعم سے

لے کر عمر بن عبد العزیز کے زمانہ تک بارہا مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی مگر حضرت عمر بن عبد العزیز اموی کے زمانے میں جب مسجد نبوی کی تعمیر کی تجدید ہوئی تو روم وغیرہ کے معمار بلائے گئے ایک رومی معمار نے اپنے حسب عادت مسجد کی عقیقہ دیوار پر بجائے نقش و نگار کرنے کے خزیرہ کی تصویر بنا دی جسے خلیفہ کے حکم سے قتل کیا گیا۔ اور دیگر معماروں نے یہود و نصاریٰ کے معبد کی طرح تعمیر کرنے سے گریز کیا اور خلیفہ کے فرمان کے مطابق تعمیر کی جس سے بہت سے امور پر روشنی پڑتی ہے۔ اول ابتدا میں مسلمانوں نے واقعی غیر مسلم صناعوں سے اپنی تعمیرات میں مدد لی جس کی اور بیشمار مثالیں ملتی ہیں۔ دوم مسلمان ایک خاص قیامگاہ طرز اپنے سامنے رکھتے تھے۔ سوم۔ جائزہ نقوش سے اعراض کر کے مسلمانوں نے ان نقوش و پیل بوٹوں کا اختراع کیا جو اس سے قبل آج نہ تھے ان کے دیکھنے سے ایک مسرت ہوتی ہے اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور کہاں ختم ہوتے ہیں جن پر آنکھ تک نہیں ٹھہر سکتی اور ان میں وہ توازن و تناسب (SYMMETRY) قائم کیا جو واقعی اس سے قبل نہیں تھا اس سے ان کے توازن ذہن اور اعلا مذاق و کمال علم ہندسہ کا ثبوت ملتا ہے۔ جو اصول علم ہندسہ پر مبنی ہے۔ یہ ان جائزہ نقوش کا بدل تھا جو ان صحرائینوں نے اختیار کیا۔ اور یہی آج دنیا کے فن تعمیر میں متمیز نظر آتا ہے۔ انہوں نے قرآن کی آیات و احادیث کو اس کمال سے نقش کیا جس کی وجہ سے الگ الگ رسم الخط کی بنا رکھی گئی اور ان کے مختلف نام پڑ گئے۔ جو آج کوئی نسخہ ظہر تعلیق وغیرہ سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے فنون کی تقسیم میں بت تراشی کی بجائے خطاطی کو دخل دینا ہوگا بعض معترضین ہم سے سوال کریں گے کہ باوجود شائع اسلام نے تصاویر کو اپنے کلمات طیبات میں سراسر ممنوع قرار دیا ہے بعد میں کیوں تصویر کشی کو اختیار کیا۔

قال رسول الله صلعم ان اشد الناس عذابا
يوم القيامة المصورون (بخاری)

قریب قریب تمام کتب احادیث میں یہ حدیث مختلف طریق سے
متداول ہے اور مطلب سب کا ایک ہی ہے بلکہ یہاں تک کہ دیا کہ
جس گھر میں تصویر ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے بعض روایات
میں آیا ہے کہ غیر ذی روح کی تصویر منع نہیں ہے پھر بعد میں کیوں
اس سے تجاوز کیا گیا۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ حضور سرور عالم
کا فرمان اسی طرح اٹل ہے لیکن ماہرین نے ان کو کسی حد تک
ان مضرات سے پاک پایا جو قرون اولیٰ یا اس کے قریب زمانہ
میں سمجھے گئے تھے اور وہ محض مذہبی حالت ملک اور ابتداء
اسلام کے امتیاز سے تھے۔ ان کے قلع قمع کرنے کا مقصد محض
شُرک سے روکنا اور جذبات کو اعتدال میں رکھنا تھا کیونکہ
ملک کی فضا شُرک سے لبریز تھی اور فنون لطیفہ سے جذبات
کے مشتعل ہونے کا اندیشہ تھا۔ بہت سے فقہانے بھی یہی
مطلب اخذ کیا ہے چنانچہ علامہ بدر الدین عینی نے شرح بخاری
میں اس حدیث کے تحت میں کسی حد تک ایسی ہی شرح کی ہے
اور امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں بھی اس کی تائید کی ہے
آنحضرت صلعم جب غزوہ تبوک سے واپس تشریف لائے۔ تو
آپ نے گھر میں چند گڑیاں دیکھیں جن سے حضرت عائشہؓ اپنی
سہیلیوں سے کھیل کر تھیں ان میں سے ایک گھوڑا بھی تھا
آپ نے دریافت کیا اے عائشہ یہ کیا ہے جواب دیا یا رسول
اللہ گھوڑا ہے۔ آپ نے پھر پوچھا کہ گھوڑے کے پر بھی ہوتے
ہیں۔ عرض کی یا رسول اللہ آپ نے سنا نہیں کہ حضرت سلیمانؑ
کے گھوڑے کے پر تھے۔ آپ نے مسکرا دیا۔ یہ واقعہ ۸ یا ۹
ہجری کا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تصاویر غیر مشرکانہ
کا آغاز آنحضرت صلعم کے زمانہ سے ہی ہو گیا تھا جس پر
فقہانے گڑیوں کو جائز کہا ہے جو پرستش کی صورت میں نہیں

لے۔ معارف اعظم گڑھ۔ مضمون سید سلیمان ندوی صاحب
۳۰۰

آسکتیں۔ آپ نے مصورین کے لئے اشد عذاب کی قید اس لئے
لگائی تھی کہ وہ پرستش کے لئے تصاویر یا مجسمے بناتے تھے۔ مگر
مرور ایام نے آہستہ آہستہ ان کے قلوب کو ان مضمرات سے محفوظ
کر دیا اور شرک کا اندیشہ جاتا رہا۔ سعید بن عامر روایت کرتے
ہیں کہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ہمارے پاس ایک کپڑا تھا جن پر تصاویر
تھیں ان کو میں نے آنحضرت صلعم کے سامنے لٹکا دیا۔ آپ
نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ نے مجھے منع کیا اور کراہت کا اظہار
کیا۔ میں نے اس کے دو ٹکے بنا دئے یہ عرب میں اس طرح کپڑے
کو پردے کے طور پر لٹکانے کو حانطمہ کہتے ہیں۔ صاحب
فتح الطیب نے ان کی بہت سی اقسام مع نقوش بیان کی ہیں
میرا خیال ہے کہ اب جو یورپ میں پردے آویزاں کرنے
کا دستور ہے وہ ہسپانی عربوں کے ذریعہ دہاں پہنچا ہے۔ یہاں
یہ کہنا مناسب ہوگا کہ حرمت خمر کے وقت ان برتنوں کے
استعمال سے بھی روکا گیا جن میں شراب بنائی جاتی تھی اور ان
کے مختلف نام بھی تھے۔ جب مسلمان اس سے رک گئے تو ان
برتنوں کے استعمال کی اجازت دی گئی۔ اسی طرح زیارت قبور
سے بھی ابتداء میں روکا گیا جو عرب میں اصنام پرستی کے مشابہ
تھا لیکن جب آپ کو ان خطرات کا اندیشہ جاتا رہا اور لوگ
بھی سمجھ گئے تو آپ نے بعد میں اجازت دی اور فضائل زیارت
قبور بھی بیان فرمائے۔ یہی بات سونے چاندی کے زیورات
سے متعلق ہے۔ غرض کہ بہت سے ایسے امور ہیں جن میں ایسا
ہوا۔ انہی دلائل کو مد نظر رکھ کر محققین آج کل کے مفہوم تصاویر
سے متاثر ہو کر نوٹ و غیرہ کے جوازیں فتوے بھی دئے ہیں۔
خیر ہمیں ان سے کوئی سروکار نہیں ایسے امور میں تو غایت فن
اور غایت مقصد کو ضرور دخل ہے۔ مذہب اور چیز ہے۔ جب
مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایران کو فتح کیا اور جب
آپ ایوان میں داخل ہوئے تو جا بجا تصاویر نظر پڑیں۔ ان کو

لے تذکرۃ الحفاظ ص ۳۲

جو زیادہ تر ایرانی و بازنطینی تھا۔ اس کی تقلید میں ابتداً ایسا سکہ جاری کیا جس پر اس کی خود اپنی تصویر ہو ا کرتی تھی۔ یہ سکہ برآمد ہو چکا ہے۔ سیف الدولہ کے متعلق بھی ملتا ہے کہ جو اس نے دینار مسکوک کرایا اس پر اس کا نام اور اس کی تصویر تھی۔ سلطان یسیرس نے اپنے سکہ پر بشر کی تصویر منقوش کرائی تھی۔ اسی طرح مسلمانوں کے ہاں دیوان میں ہر بھی تحریر وغیرہ کو ثبت کرنے کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ قاہنی شرح کی شخصیت دینائے اسلام میں حضرت علیؑ کے خلاف فیصلہ صادر کرنے کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ آپ کی ہر میں دوشیر اور درمیان میں ایک درخت تھا۔ غرض کہ آج جو شیلڈ وغیرہ کا تصور ہے قدیم زمانہ میں بھی تھا۔ مگر تذکرہ بالا سکہ عبد الملک کے متعلق عرض ہے کہ وقتی مصلحت کے لحاظ سے جاری کیا گیا تھا۔ جب لوگ سکہ کے عادی ہو گئے تھے تو خالص اسلامی سکہ میں جاری کیا گیا۔

لیکن بنی عباس کا زمانہ ایسا ہے جبکہ فنون و علوم کی طرف زیادہ توجہ ہوئی جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے تعلقات دنیا کے دیگر ممالک اور سلطنتوں سے قائم ہو چکے تھے خصوصیت سے قابل ذکر ان کا تعلق اہل فارس سے جو ہے ان کے ہاں براہ کھ کے ذریعہ سے ہوا پھر اہل یونان سے بھی ہوا جو ان کے دربار میں اہل علم کی صورت میں آئے۔ غرض کہ یہی دور اسلام میں ہے جب سے یہ فنون متمیز طور پر سامنے آئے اور ان کو فنون اسلامی کے طور پر فروغ شروع ہوا۔ اور بطور فنون لطیفہ اسلامیہ ان کا شہا ہوا۔ اسی لئے مصوری کو مد نظر رکھ کر اختصاراً ان شعبوں کو بیان کیا گیا ہے جن میں مصوری کو ضرور دخل ہے۔

قدیم زمانے سے فن ظروف سازی مصر، عراق اور عجم میں مروج تھا۔ جسے ظہور اسلام ہی سے مسلمانوں نے ضرور اپنی روایا کے مطابق سنبھالا اور بغیر نقش و نگار کے یہ کام قدیم سے کم حیثیت نکلتا ہے۔ چنانچہ ہزاروں نمونے ایسے یورپ کے عجائب خانوں میں

دیکھ کر کسی قسم کا ایذا نہیں پہنچایا بلکہ غار شکرانہ وہیں ادا کی گئی۔ اس کے برعکس جب فتح شام کے موقع پر عیسائیوں نے آپ کو اپنے کنیسہ میں دعوت دی تو بوجہ تصاویر کنیسہ میں داخل ہونے سے انکار کر دیا جس سے استدلال ہوتا ہے کہ ایک طرف تو تصاویر مشرکانہ حیثیت رکھتی تھیں اور دوسری طرف اس کے خلاف جہاں تسامح اختیار کیا گیا۔ اس سے ہماری تائید ہوتی ہے کہ نیت کو ضرور دخل ہے۔ ابن سعد نے اپنی طبقات میں قبضہ بن ذویب کے تحت میں درج کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں مدینہ منورہ میں تمایین کے محلہ میں نقاشوں کے کوچہ میں بستے تھے۔ اگرچہ مدینہ منورہ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں زیادہ تر آباد ہوا مگر اس سے صاف پتہ ملتا ہے کہ یہ فن بالکل مفقود نہ تھا۔

خلفاء کا زمانہ

اموی خلفاء جو خلفائے اربعہ راشدینؓ کے بعد آئے اور ان کے بعد خلفائے عباسیہ جنہوں نے بغداد کو دار الخلافہ قرار دیا ان سب نے بہت جلد محسوس کیا کہ اسلام کا یہ پھرائے شہر اس عزت میں نہیں سائیگا ایک وسیع سلطنت ایک خانہ بدیش خاندان کی طرح سنبھالی نہیں جاسکتی۔ خلیفہ اپنا گھر اونٹ کی کھال کے خیمہ میں قائم نہیں رکھ سکتا اس کے لئے ضروری تھا کہ علوم و فنون پیدا کئے جائیں۔ جس سے حضرات کو فروغ ہو تا کہ قرآن حکیم اور پیام رسول کے ارشاداً کو دنیا میں پھیلا دیا جائے۔ چنانچہ ایسے فاضل لوگ پیدا ہوئے جن کو دربار خلافت سے تعلق تھا۔ اور فنون و علوم جو آج اسلامی فنونِ علوم کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں وہ اسی طبقہ کے منت پذیر ہیں۔

خلفائے بنی امیہ کا زمانہ زیادہ تر بیرونی فتوحات میں گزرا ہے۔ اس لئے ان کی توجہ نشر و اشاعتِ علوم کی طرف کم نظر آتی ہے۔ لیکن عبد الملک نے اپنے زمانہ میں عمارات کو بہت فروغ دیا اور اس کے علاوہ اس نے اسلامی سکہ کی بنا رکھی اور سکہ رائج الوقت

دیکھنے میں آئے ہیں جن کے نقش و نگار بالکل اسلامی ہیں۔ اور بہت قدیم ہیں۔ اس سے ایک امر پر ضرور روشنی پڑتی ہے کہ ابتدائی سے مسلمانوں کا مذاق ہر ضروری اشیاء میں ایک متمیز صورت رکھتا تھا اور ان پر نقش و نگار بعض اوقات حسب واقعات و حالات ہوتے تھے کبھی کوئی فوجی سوار یا نظارہ یا کوئی پالتو جانور کبھی قرآنی آیات یا انشاء ان پر نقش ہوتے تھے۔ اور یہ فن ایک ایسی الگ حیثیت رکھتا ہے کہ بیشمار کتب بالخصوص اسلامی ظروف و ظروف سازی یا کاشی کاری وغیرہ پر تصنیف ہو چکی ہیں جو اسلامی مصوری کے ارتقا میں ضرور دخل رکھتی ہیں۔ بعض اہم قدیم نمونے برٹش موزیم میں سامرہ اور مصر کے ملتے ہیں۔ جو غالباً خلیفہ معتمد (۳۲۵ھ) کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان پر نقوش اور جانوروں کی تصاویر بھی ملتے ہیں۔ بغداد کے بھی بہترین نمونے ملتے ہیں۔ ایک طشت پر بران کی تصویر ایک طائر نما گھوڑے کی صورت میں ہے۔ اس کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اس فن میں بھی رسمی نقش و نگار کو دخل دیا۔ سامرہ کے بعد فوراً آئے، رتہ اور سمرقند وغیرہ میں یہ فن نظر آتا ہے جہاں وہ ترقی ہوئی ہے کہ ایک نمایاں پہلو اختیار کر لیا۔ مگر رتی تو بعض حالات میں سامرہ سے بھی سبقت رکھتا ہے موسو مجیبو نے ایک نمونہ دیا ہے جو تیسری صدی ہجری کا ہے اس میں عربی تحریر بھی ہے اور درمیان میں ایک آدمی بھی بیٹھا ہوا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فن ایران میں پہلے ہی اعلیٰ معراج پر تھا۔ اور اس وجہ سے ان کو اسلامی روایات نقش و نگار اختیار کرنا کوئی مشکل نہ تھا۔ خصوصیت سے ان میں سے ایک مرتبان قابل ذکر ہے جس پر حلقوں میں عربی تحریر اور تصاویر انسانی ہیں جو اس وقت کے اعلیٰ معیار فن اسلامی کا پتہ دیتی ہیں۔ اس کی تاریخ ۳۵۵ھ ہے۔ مگر اس پر سامرہ کا اثر ضرور ہے۔ چونکہ یہاں محض ارتقا مصوری کے ضمن میں بیان کرنا مقصود ہے اسلئے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ورنہ ہزاروں نمونے بطور مثال پیش

پیش کئے جاسکتے ہیں۔ علاوہ ظروف کے اینٹیں وغیرہ سامرہ کی بیشمار چمکدار رنگوں سے مزین دیکھی جاسکتی ہیں۔ مگر جو نمونہ متذکرہ ظاہر طور پر ملتا ہے جس پر تاریخ ہے وہ واشنگٹن میں فویر کے مجموعہ میں ۳۳۵ھ کا ہے اور قیروان، بغداد، رتہ وغیرہ سے قدیم نمونے بھی مل سکتے ہیں۔ اور بہت سے نمونے ایسے ملتے ہیں جن پر تصاویر ہیں اور تحریریں بھی ہیں۔ بعض یورپین محققین نے ظروف پر نقاشی کا کام کرنے والوں کے ابتدائی نام جمع کئے ہیں جن کے دستخطوں کو میں نے بھی دیکھا ہے:-

عمل عمر، عمل عبید، عمل ذکری، صنعہ عیسیٰ، عمل الاحمر، عمل ابی خالد، عمل کنیہ بن عبد اللہ، عمل مالک بن العباس، عمل الاستاذ، عمل المہرز بن علمر، عمل الشامی

فن ظروف سازی کے رنگین نقش و نگار کے بعد ایک خاص فن دیواری مصوری کا نظر آتا ہے۔

دیواری نقوش اور ایران میں دیواری نقوش اسلام سے پہلے موجود تھے۔ لیکن جب خلیفہ ہشام اموی (۲۱۳ھ) کے زمانہ میں حر بن یوسف الثقفی والئے موصل نے ایک مدرسہ، سرلئے اور ایک محل تیار کروایا ابن الاثیر کے بیان کے مطابق یہ محل بن ساروں کے بازار میں تھا جو اب ویران ہو چکا ہے اور سفید سنگ جراث سے بنایا گیا تھا۔ دیواروں پر بچی کاری کی گئی تھی۔ اس محل کو اس کی خوبیوں کے سبب سے منقوشہ کہا جاتا تھا۔ بعد میں یہی قطع حر کے نام سے مشہور ہو گیا۔ ان نقوش دیواری کے متعلق متعدد شعرائے عرب کے کلام میں بھی شہادتیں ملتی ہیں۔ مثلاً ابن احمد لیس۔ ابوالصلت۔ بختری۔ مہتبی۔ ضحاک۔ ابو نواس وغیرہ وغیرہ

جب خلیفہ معتمد نے سامرہ کی بنیاد ڈالی تو وہاں اپنی رہائش۔

کے لئے قصر تعمیر کروایا جس کی دیواروں پر نقاشی تھی۔ ۲۲۲ء
 میں خلیفہ کے حکم سے وزیر احمد بن خالد نے اپنی مساعی جمیلہ سے
 اس کام کو سرانجام دیا۔ یہ دیواری نقوش ظاہر کرتے ہیں کہ وہاں
 نہ محض ہیل بوٹے ہی تھے بلکہ جانوروں کی تصاویر بھی تھیں اور
 یہ نقوشی مصوری کا وہ جذبہ اور اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں کہ
 آج بھی اس سے عمدہ موجودہ فن مصوری پیش کرنے سے قاصر
 ہے۔ ڈاکٹر ہرز فیلڈ کی کتاب سامرہ تین جلدوں میں ہے۔
 اس میں چند نمونے مختلف عجائب خانوں سے اکٹھے کر کے دئے
 گئے ہیں۔ خصوصیت سے شیر کی شبیہ آجکل کی شیلڈ کا تصور دیتی
 ہے۔ دیگر نمونہ جات نقاشی بھی خاصی روشنی ڈالتے ہیں اور ان
 سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نقوش بجائے اس کے کہ نمٹ چکی ہوں۔
 بلکہ تخیلی اور سی طور پر بنائے گئے ہیں۔ عربوں نے مصوری میں
 یہ ایک جدید نظریہ پیدا کیا تھا۔ ایک جگہ آپ دیکھیں گے کہ کس طرح
 کتوں سے گورخر کا شکار اور عقاب سے پرندوں کا شکار کیا
 جاتا تھا۔ اور ساتھ ساتھ آرام کی زندگی کا ماحول کیا ہوتا تھا
 اگر ان کا اجٹا کی جگہ دیواری مصوری سے مقابلہ کیا جائے تو
 اس سے بالکل مختلف کام مختلف طریقہ فن مختلف جذبات مختلف
 ماحول نظر آئیگا۔ فریڈرک موزیم برلن میں ایک ٹکڑا استرکاری
 سامرہ پر احمد بن موسیٰ کا ریکر کا نام ملتا ہے۔ اس کتاب سے
 مسلمانوں کے دیگر حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ کس طرح وہ اپنے
 مکانات کو آراستہ کرتے تھے اور اگر ان کا پوری طرح مطالعہ کیا
 جائے تو مسلمانوں کی پوری تہذیب کا نقشہ عیاں ہو جائیگا۔
 ان محلات میں ایک حمام بھی ہے۔ اس کے ایک دروازہ
 پر ابھی تک ایک کتبہ محفوظ ہے:-

”بِسْمِ اللّٰهِ اَمْرٌ بِاَهْلِ الْحَمَامِ اَحْمَدُ بْنُ مُحَمَّدٍ الْمُعْتَمِدِ
 بِاللّٰهِ اَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ اَدَامَ اللّٰهُ التَّائِيْدَ وَالسَّعَادَةَ وَوَعَا
 مِنْ اللّٰهِ وَرَحْمَةً“

ان نقوش میں بعض جگہ کرامت کی بھی تصاویر ملتی ہیں جس سے معلوم
 ہوتا ہے کہ سامرہ اور اس کے گرد و نواح میں مسلمانوں نے بعد میں
 بھی مختلف عمارتیں بنائیں۔ یا قوت نے چند اشعار خوب نقل کئے ہیں:-
 وَمَا زِلْتُ اَسْمَعُ اَنْ الْمَلُوكَ
 يَسْنِي عَلٰى قَدْرِ اَقْدَارِهَا
 وَاعْلَمُ اَنْ عَقُولَ الرِّجَالِ
 تَقْضِيْ عَلَيْهَا بَاثَارَهَا
 یعنی ہر خلیفہ اپنے اپنے اقتدار کے مطابق تعمیرات میں زیادتی کرتا
 رہا۔

اسی گرد و نواح میں ایک قدیم حمام الفار کا ذکر ملتا جس کو بہت
 چھوٹا ہونے کی وجہ سے الفاس (چوہا) کہتے تھے۔ کیونکہ روم
 میں حمام بہت زیادہ وسیع بنائے جاتے تھے۔ ان کے اندر تین طبقات
 ہوتے تھے۔ ایک سے دوسرے میں جانے کے لئے راستہ بھی
 ہوتا تھا۔ یہ حمام الفار اول ان حماموں میں سے ہے جو اسلام
 میں اول تیار ہوا۔ جب اسکو عمرو بن العاص نے تعمیر کرایا تو رومیوں
 نے اپنی عادت کے خلاف دیکھ کر اس کو بنظر حقارت دیکھا اور
 کہا کہ یہ تو چوہوں کے لئے تعمیر ہوا ہے۔ چنانچہ اس کا نام اسی
 دن سے حمام الفار مشہور ہو گیا۔ حمام کے سلسلہ میں اس کی بناوٹ
 پر بھی بحث ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کو بھی خوب
 سمجھتے تھے۔ چنانچہ سب سے بہتر حمام وہ ہوتا ہے جو قدیم ہو
 چکا ہو۔ اس لئے کہ جو حمام جدید تعمیر ہوگا اس میں یہ خرابی ہے
 کہ اس کی دیواریں ابھی تک تر ہوں گی۔ اس لئے اس میں غسل
 کرنے سے نقصان ہوگا۔ اور بخارات پیدا ہوں گے۔ حمام نو تعمیر
 شدہ کس لئے۔ بعض شارح فرماتے ہیں کہ اس قسم کے حمام سے
 یہ نقصان ہے کہ اس کی دیواروں میں جو تیزی اور نمی ہوگی وہ
 چونہ گچ اور تار کول کے ساتھ تحلیل ہو جائیگی۔ اب حرارت حمام
 کی وجہ سے اس میں سے بخارات اٹھیں گے۔ جس کا انسان کے بدن

کے اندر جاناروح اور نفس کے لئے بہت مضر ہے اس لئے کہ ان کا اثر قلب پر بھی پڑیگا۔ حام لئے قدیم جو مصر میں باقی رہ گئے ہیں وہ سب خراب ہو گئے ہیں۔ صرف ان کے کچھ نشانات باقی ہیں۔

مصر مفریزی کے مصر کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں تصویر کشی اعلیٰ معیار پر تھی کیونکہ عرب مصورین اصول مناظر اور قرب و بعد کے اثر سے بخوبی واقف تھے۔ وہ بعض صنایعوں کے اسرار بھی نقل کرتا ہے۔ مثلاً ابو بکر بن حسن متوفی ۳۶۵ھ۔ استاد احمد بن یوسف محمد بن محمد۔ مستنصر کے زمانہ کا مشہور واقعہ ہے کہ اس کے وزیر

الحسن بن علی البازدري نے ابن عزیز مصور کو عراق سے اور قاہرہ خفائے کو بصرہ سے بلوا کر ان کی نقاشی کا مقابلہ کروایا۔ دونوں مصوروں کو ایک رقاصہ کی تصویر محل کے جھوکے پر بنانے کے لئے کہا گیا جو خود بازدري کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ قاہرہ نے رقاصہ کو سفید لباس میں سیاہ پردے پر اس طرح ظاہر کیا گویا وہ حاضرین سے رخصت ہو رہی ہے اور ادھر ابن عزیز نے اس کو زرد پردے پر سرخ نقاب میں اس طرح مصور کیا گویا وہ نقاب سے باہر آ رہی ہے۔

بنی طولون

بنی طولون ہے جس نے دنیا میں اپنی مذہبی تحریکات سے بلچل پیدا کر دی تھی اور فنون کے سلسلہ میں مصر کی سرزمین کو مالا مال کر دیا۔ اور خاص کر محکمہ تعمیر کو بہت فروغ ہوا۔ متعدد مساجد، مدارس و محلات تعمیر کئے گئے۔ بلکہ تاریخ فن تعمیر اسلامی میں طرز بنی طولون کا خاص ذکر ہے۔ محلات الفخیمہ جن کے ارد گرد مدائن الفنا تعمیر کئے۔ اس نے پہاڑ پر بہت ہی خوبصورت مسجد ۳۶۱ھ میں تعمیر کرائی جس کا نام جامع ابن طولون رکھا گیا جس کے آثار آج تک اس کی شان و شوکت کا پتہ دیتے ہیں اس کے قرب میں غازیہ بن احمد ۸۲-۳۶۲ھ نے اپنے محل میں ایک بڑا صحن قائم کیا جسے شہری نقش و نگار سے مزین کیا گیا۔ جس میں اس کا اس کی بیوی اور اس کے درباری شعرا کے مجسمے قائم کئے گئے

لہ الحکومت المصریہ ص ۱۹ علی بخت ۳ سفرنامہ ۱۵۵ مطبوعہ بیروت

جن کا آج نشان نہیں ملتا۔ ابن طولون کی قبر کے تعویذ پر وہ نقوش کندہ ہیں جو اس کی مسجد وغیرہ کے دروازہ پر ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صنایعوں نے اسے مناسب سمجھا کہ بجائے اس کے اس کی تعمیرات کے ذکر کو کتبہ میں اس کی قبر کے تعویذ پر ثبت کریں انھوں نے اس پر ان تمام عمارات کو نقوش میں کندہ کر دیا جو اس نے تعمیر کی تھیں۔ اس سے عیان ہوتا ہے کہ نقش و نگار کو مصر میں تخریب کے طور پر ابھی تک استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ جو اصل غایت فن ہے۔

خلفائے فاطمیین مصر فنون لطیفہ اسلامی کے صحن میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی ابتدا ۳۵۸ھ سے ہوتی ہے۔ جن کی حکومت میں شیعہ مذہب کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اور ان کی وجہ سے قبطیوں کو پھر موقع ملا کہ وہ اپنے قدیم جذبہ فنون جمیلہ کو عوام میں آزادی سے پیش کر سکیں اور اپنی مردہ روایات کو پھر زندہ کریں۔ چنانچہ بہت آزادی سے فنون کی طرف توجہ کی گئی۔ مستنصر باللہ ۴۹۷ھ کے خزانہ کے حالات کے سامنے الف لیلة کے قصے بھی ماند پڑ جاتے ہیں۔

ناصر خسرو علوی اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے۔ کہ جب میں مصر میں ۴۹۰ھ میں گیا تو سلطان کے ہاں دعوت میں بلایا گیا اور وہ خصوصیت سے سلطان کے تخت کے ذکر میں گویا ہے کہ چار گز بلند تھا اس کے تینوں طرف شکار گاہ و میدان وغیرہ کی تصاویر تھیں اور نہایت پاکیزہ خط میں کتبے لکھے ہوئے تھے پھر لکھتا ہے قصر فاطمیین میں خلیفہ مستنصر کا ایک آفتابہ تھا جو خالص سونے چاندی کا تھا۔ اس پرندوں اور شکاریوں کی نہایت عمدہ تصاویر منقوش تھیں۔ اور نیز دیگر تصاویر کا ذکر کرتا ہے جو لکڑی پر کندہ تھیں۔ فاطمی خلیفہ ابراہیم حکام اللہ نے اپنے قصر میں تمام شعرا کی تصاویر دیواروں پر بنوائیں اور ہر شاعر کا ایک شعر اس منظر کی تعریف میں لکھوا کر درج کر دیا۔ اور ہر تصویر کے پاس

زمانہ کی بعض عمارات کے منقش ٹکڑے ملتے ہیں جو یورپ کے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں اور سامان حرب کے تو ہمیشہ انہوں نے نظر آتے ہیں۔ حجر ازرق کا ایک منقوش ٹکڑا ملا، جو بقلم نسخی ۵۹ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں قندیل وغیرہ کی شکلیں ہیں اور نقاش کا نام عبدالرحمن وابن اجیہ لکھا ہوا ہے۔

محمود غزنوی کے زمانے سے یہ ہرگز مترشح نہیں ہوتا کہ اس میں کبھی ان فنون کی طرف توجہ کی گئی ہو۔ کیونکہ ہمیں لے دے کے یہی یاد ہے کہ اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے۔ لیکن اس کی سپاہیانہ زندگی کے علاوہ علوم کی سرپرستی کی طرف دیکھا جائے تو جس شہزادے فارس کے قیام کا سہرا اس کے ہی سر نظر آئیگا۔ اس کے عہد میں فرخی، عنصری، فردوسی جیسے شعرا ہوئے۔ فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ شاہنامہ کے عنوان کے تحت میں یہاں اتنا لکھنا کافی ہوگا کہ اس کے بعض بیانات محض قدیم نقش و نگار دیوار ہائے فارس کا پتہ نہیں دیتے بلکہ آئندہ آنے والی تخیلی مصوری کا راستہ کھولتے ہیں۔ مصوری نے شاہنامہ کے اشعار کو اپنے ادراک کے مطابق مصور کیا۔ انہوں نے تمثیلی (REALISTIC) حدود سے نکل کر رسمی اور تخیلی (CONVENTIONAL AND IDEALISTIC) مصوری کی طرف رجوع کیا جو دراصل مسلمانوں میں مصوری و نقاشی کا نصب العین رہا ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے ایک باغ بڑے ساز و سامان سے تیار کرایا تھا۔ گلہائے رنگا، رنگ کے تختے تاجا جدا جدا دو طرفہ سرو و شمشاد ایک طرف مصنوعی خوشنما جھیل اس میں رنگ رنگ کی مچھلیاں کاؤں میں موتی کے آویزے پہنے ہوئے پھرتی تھیں۔ تصاویر میں محمود کو کہیں برچھائے ٹکار میں مصروف کہیں ہڑم عیش میں میٹھا دکھایا ہے۔ فرخی نے اس باغ کا نقشہ چند اشعار میں پیش کیا ہے۔

مورخ بہتقی نے اپنی تاریخ میں سلطان مسعود غزنوی کے محلات

طاق میں ایک ایک تخیلی ایک سو پچاس اشرفیوں کی سر بھر رکھوا دی۔ ہر شاعر آتا تھا اور اپنے حصہ کی تخیلی طاق سے اٹھا کر لیجاتا جب اشرف الخلیل حلقہ الجبل پر قابض ہوا تو اس نے اس کو بلند کرایا پسیدہ رنگوایا۔ دیواروں پر تمام امرا کے دولت کی نقادیر بنوائیں اور تہ کو نہایت نفیس نقش و نگار سے آراستہ کیا۔ مصر کے عجائب خانہ میں فاطمی خلفا کے ہزاروں آثار موجود ہیں جن میں ایک ٹکڑا امر کا ہے جس پر ایک کتبہ خط کوفی میں ہے دراصل مشہد سے متعلق ہے اس پر لکھا ہے "بسم اللہ الخ بعملہ عبد اللہ ولیہ ابی المہمون عبد اللہ الخ" ۶۷ھ میں خلفائے فاطمین کے بعد مصر میں ایوبیوں کا دور دورہ ہوا جن کا زمانہ زیادہ تر جنگی مہمات میں گذرا اور فاطمی عہد کے صنایع مصر کو چھوڑ کر شام، ایشیائے کوچک، عراق، عرب، ایران، صقلیہ اور اندلس میں پھیل گئے اور ان مقامات میں اپنے فن کو فروغ دیا۔ جو اس وقت کی تاریخ میں نمایاں ملتا ہے۔ دور ایوبیہ میں مسلمانوں کو بہت بڑی فتوحات حاصل ہوئیں ان میں۔ خاص طور پر قابل ذکر فتح بیت المقدس ہے۔ جسے مسلمانوں نے عرصہ تک حاصل کرنے کی کوشش کر چکے تھے۔ گو اس دور میں فنون کی طرف توجہ کم ہوئی تھی لیکن جو کچھ بھی ہوا اپنی نوعیت میں آئندہ نسلوں کے لئے راہ عمل نمازادہ تر جنگی عمارات و سامان حرب کی طرف توجہ مبذول رہی۔ فاطمین کے قصر کو حلقہ الجبل کے نام سے بدل دیا اس میں وہ بات رکھی کہ اس میں مدخل و مخرج کا خوب انتظام کیا اور ایک خندق اس کے گرد محصورین کے بچاؤ کے لئے بنائی اور اس میں خاص قسم کے جنگی گنبد قائم کئے جن سے باہر کا اچھی طرح سے مشاہدہ کیا جاسکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی کو قدرت نے اس صنعت کے رائج کرنے کا خاص ملکہ عطا کیا تھا جو بعد میں جا کر دنیا کے لئے ایک جنگی قلعہ جات کا خاص فن بن گیا۔ اس

ایوبی

کو بھی بہت فروغ ہوا جن میں کوئی جاندار نقش نظر نہیں آتا۔^{۱۱۲} میں غرناطہ میں احمر کی بنیاد رکھی گئی اور اس قصر کی عمارت کے مختلف حصے مختلف مطالب کے لئے مخصوص کئے گئے۔ خاص کر ان میں بیت الشریعت کی چھت جس میں مختلف قسم کی تصاویر بنی ہوئی ہیں خصوصیت سے امراء عرب کی مجلس شوریٰ جو مدیرین سلطنت کی شبیہات پر مشتمل ہے اس کے علاوہ اور بھی نقوش ہیں۔ ان سے اندلسی مسلمانوں کی وضع قطع پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ یہاں کے صنایعوں نے شبکہ کاری میں ایک خاص تفرع پیدا کیا تھا جو دنیا میں آج اولین ماحذوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہاں کی ایک ایک اینٹ کے فنی خصوصیات بیان کرنے کے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے مگر پھر بھی وہ اصل بات احاطہ تحریر میں نہیں آسکتی جو کیفیت ان آثار کو دیکھ کر طاری ہوتی ہے۔

سہ ۱۱۲ھ کا ایسا زمانہ تھا کہ خلفائے مصر، سلاطین سلجوق اور خلفائے بغداد میں جنگ شروع تھی۔ خلیفہ القائم بامر اللہ بغداد کو متواتر ایک مہینہ کے لئے غازی میں قید کر دیا گیا تھا۔ اسی اشناس طغرل بیگ نے اپنے بھائی پر فتح پائی تو والی غازی کو کھڑے خلیفہ کو رہا کر دیا اور بعزت تمام دار الخلافہ میں پہنچا دیا گیا۔ خلیفہ کا قصر جو لوٹا جا چکا تھا اور جو کچھ کسی نے لوٹا تھا واپس نہیں کیا۔ ان میں ہزار ہا ٹکڑے شجر کے تھے جن پر خلفائے عرب اور ان کے جنگجو ارکان سلطنت کی تصاویر تھیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سا ایسا سامان تھا جو حیوانی اور انسانی تصاویر سے مزین تھا۔

سلاجقہ کے متعلق عرض ہے کہ انھوں نے زیادہ تر فن تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ لیکن شہزادہ طغرل بن ارسلان شاہ ۱۱۹۵ء تا ۱۲۰۷ء نے اپنے ہاں ایک مصور جمال اصفہانی کو ملازم رکھا تھا تاکہ ان تمام شجر کی تصاویر بنوائے جنہیں زین الدین الراوندی نے اپنے مجموعہ کلام میں بیان کیا ہے۔ اس نے کتاب کو اپنے ہاتھ سے نقل کیا تھا اور ہر ایک تصویر کے نیچے ان شجر کے اشعار بھی

کی جو تفصیل دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوار و سقف نقش و نگار سے مزین تھیں۔ اور خاص کر الفیہ و ثلثیہ کے الفاظ سے بیان کیا ہے جو خاص کر ان سلاطین کی فالغ البالی کا پتہ دیتی ہیں بعض متعصب واقعہ نگاروں نے بیان کیا ہے کہ محمود غزنوی نے ہند کے مندروں وغیرہ کو برباد کر کے بہت سا سامان یہاں سے لجا کر اپنے محلات و مساجد بنائے۔ مسٹر فرگسن تاریخ فن تعمیر ہند میں لکھتا ہے کہ غزنوی کی عمارات کو دیکھ کر اس امر کا شبہ بھی نہیں ہوتا کہ ان میں کسی طرح بھی ہندی سامان سے مدد لی گئی ہو۔ مسجد کے صندلی ستونوں کے منقطع کہا جاتا ہے کہ یہ سومنات کے مندر سے لائے گئے ہیں۔ لیکن غزنی کی مقامی لکڑی ایسی ہی ہوتی ہے۔ انہیں سومنات سے کوئی مشابہت نہیں۔ غزنی کا طرز تعمیر زیادہ تر بنی طولوں کی عمارات سے مشابہ ہے۔ اور اس دور کے شجرانے بیشتر تصاویر سلاطین غزنی کی طرح میں لکھے ہیں۔ جن میں ان کے محلات و ساکن کی پوری پوری تفصیلات اور اس وقت کی مصویر کا پتہ ملتا ہے۔

اندلس جو اسلامی تہذیب و تمدن کا ابتدائی گوارہ چکا ہے اس کی یادگاریں اب تک دنیا کے لئے عبرت کا سبق ہیں۔ وہاں جن اسلامی علوم و فنون کی ترویج اور ترقی ہوئی وہ انظر من الشمس ہیں۔ اگر تحقیق کی جائے تو بیشمار اسلامی اثرات جو یہاں کی پیداوار ہیں یورپ پر ثابت ہو گئے۔ قدیم یادگاروں میں مسجد قرطبہ جس کی بنیاد ۱۱۵۲ء میں رکھی گئی نہایت بے نظیر ہے۔ اس عمارت میں علاوہ کمال فن تعمیر کے نقاشی کو بھی خاص حد تک دخل ہے جس کے دیکھنے سے عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ باوجود حوادث زمانہ کے اپنی اصلی حالت میں نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد اندلس میں مسکروں دیگر عمارات تعمیر ہوئیں جن میں یہی کمال فن نہاں ہے خصوصیت سے علم ہندسہ کو جسے مسلمانوں کی نقاشی میں خصوصیت عظیمہ حاصل ہے یہاں مطالعہ کرنے کا بہت بڑا موقع ملتا ہے۔ دیگر دیواری نقش و نگار

قلبہند کئے تھے۔ یہ اسی طرح سے ہے جس طرح متذکرہ بالا خلیفہ الامر
بحکام اللہ نے اپنے درباری شاعر کی تصاویر بنوائی تھیں۔

معموری
فلسفہ

علامہ الدین بن عبد اللہ البہائی الغزالی الدمشقی متوفی ۷۵۵ھ نے اپنی کتاب
مطالعۃ البدور فی منازل السرور میں حمام نافع کے تحت میں ان دیواری نقوش
کے فلسفیانہ پہلو پر مفصل لکھا ہے جو اس ضمن میں مشرق و مغرب میں پہلی تحریر
معلوم ہوتی ہے۔

اس حمام کے اندر نہایت پر صنعت و حرمت اور نازک تصاویر مثلاً
عاشق و معشوق، باغ و گل، غنچہ، صفوف اسپ و دیگر وحوش کی ہوتی
تھیں اور علت اس کی یہ تھی کہ اس قسم کی تصاویر سے بدن کے ہر سہ قوی
جوانیہ، بدنہ، نفسانیہ کو بہت زیادہ تقویت حاصل ہوتی ہے۔ حکیم
بدر الدین بن مظفر قاضی علیک اپنی کتاب مفرح النفس میں رقمطراز ہیں کہ تمام
اطباء، حکماء و فضلاء عرصہ کا اتفاق ہے کہ خوبصورت اور نازک صورت
کے دیکھنے سے نفس کو ایک گونہ فرحت و مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ان
کی وجہ سے امراض سوداویہ اور پریشان کن افکار دور ہو جاتے ہیں۔
ان افکار کے ازالہ کی وجہ سے قلب کو بہت زیادہ قوت حاصل
ہوتی ہے حکما کا قول ہے کہ اگر خوبصورت صورتیں کسی وجہ سے زیر
نظارہ نہ آسکیں تو انسان کو چاہئے کہ پھر وہ ایسی صورت ہیاکل دیکھے
جو بصورت فریم بڑے بڑے محلات میں آدیزاں ہوتی ہیں۔

یہ رائے حکیم محمد بن زکریا رازی نے لکھی اور ذکر کی ہے حتیٰ کہ وہ
اس شخص کے لئے جس کا قلب یہودہ خیالات اور پریشان کن وساوس
کا آماجگاہ بنا ہوا ہو اس لئے یہ عمل یعنی نظارگی صورت جمیلہ کو فرض و
لازم قرار دیتے ہیں۔ وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر اشکال میں تناسب
مقدار کو ملحوظ رکھ کر دیدہ زیب رنگ مثلاً سرخ، سبز، زرد اور سفید
کے ساتھ کسی تصویر کو کھینچا جائے تو بالیقین اخلاط سوداویہ کے ازالہ
میں نافع ہوگی اور وہ تمام ہوم و غوم جو ہر وقت اس پر طاری رہتے
ہیں زائل کر دیگی۔ روح سے تمام کدورتوں کو نکال کر انبساط و خوشی
کا سامان پیدا کریگی۔ اسی لئے کہ جب نفس اس قسم کے صورت حسینہ

کو دیکھ کر بہرہ اندوز ہوتا ہے۔ اس کی تمام کدورت برفع ہو جاتی ہے
اس کے بعد کہتے ہیں کہ جب حکمائے متقدمین نے حمام کو ترویج دی
تو انہوں نے اپنی صائب عقل سے یہ معلوم کر لیا کہ انسان جب حمام
میں داخل ہوتا ہے تو اس کی قوت میں بہت کچھ کمی پیدا ہو جاتی ہے
لہذا انہوں نے اپنی عقل و حکمت سے استمداد کر کے اختراع کیا کہ
حماموں کے اندر بہترین صور حسین و شیرین و دیدہ زیب رنگوں
میں نقش کی جائیں تاکہ وہ قوت جو زائل ہوئی ہے انہیں دیکھ کر عود
کر آئے۔ ان تصاویر کی انہوں نے تین قسمیں کی ہیں۔ اس لئے کہ
ارواح بدن میں قسم کی ہیں۔ حیوانیہ، نفسانیہ، طبیعیہ۔ لہذا انہوں
نے ہر قسم کی جدا تصویر کو ایک الگ قوت کی تقویت کا سبب بتایا
ہے۔ مثلاً قوت حیوانیہ کو زیادہ کرنے کے لئے جنگ قتال و شکار
وحوش اور گھوڑوں کی دوڑ کے نقشے بنائے۔ نفسانیہ کی زیادتی
کے لئے وہ مجسمے بنائے جن سے عشق و تفکر کی معیت مستنبط ہوتی ہو
یا مثلاً عاشق و معشوق کے وصال یا فراق کی تصویر کھینچی ہو اور
قوت طبیعیہ کی زیادتی کے لئے باغ و گل، غنچہ، عمدہ عمدہ خوش منظر
اشجار اور دیدہ زیب ایوان کی تصاویر بنائیں۔ یہ تمام اقسام تصاویر
ایک عمدہ حمام کے لوازمات و اجزا میں قرار دئے گئے۔

بعض نے اس خلوت خانہ میں یہ عجیب بات دیکھی کہ اس کی
چہار دیواری اس طرح صیقل شدہ اور چمکتی تھی کہ اس میں اور آئینے
نسوانی میں کوئی فرق باقی نہ رہا۔ انسان جس طرح کی دیوار میں چاہے
اپنے تمام بدن کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ نیز میں نے دیکھا کہ اس کا فرش
مذہب تھا۔ اس میں سرخ، زرد، سبز رنگ کے ٹنگے جو تمام بلور کے
بنے ہوئے تھے جڑے تھے۔ ان کے متعلق مشہور ہے۔ کہ یہ ایک
قسم کا پتھر تھا جو روم سے آتا تھا۔ مذہب کی یہ صورت ہوتی تھی
کہ وہ ایک قسم کا شیشہ ہوتا تھا جس پر آب زر سے نہایت عمدہ
دلکش تصاویر کھینچی جاتی تھیں۔ اس کے بعد رافعی کا قول نقل کر کے
استنباط کیا ہے کہ اگر تصویر وغیرہ گدڑ یا حمام میں ہوں تو کوئی

لے۔ ملاحظہ راحت الصدور مرتبہ پروفیسر اقبال۔ لے۔ وائٹا کتب خانہ نسخہ ۱۱۵۴ آئینہ نسوانی عربوں کے نزدیک بطور ضرب المثل کے مشہور ہے۔ کیونکہ عورتیں اپنی ٹیپ
ٹاپ کو ٹیک رکھنے کے لئے ہر وقت پاس رکھتیں جس کی وجہ سے یہ عام مشہور ہو گیا یا ممکن ہے کچھ اور مطلب ہو۔

مضانقہ نہیں اور اگر مجلس میں ہوں جہاں وہ عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں تو وہاں داخل ہونا حرام یا مکروہ ہے۔

تجارتی اشیا

مسعودی بیان کرتا ہے کہ جزیرۃ العرب میں بہت سے مقام پر چینی تاجر مقیم تھے جن سے عرب رؤسا بہت سی چینی اشیا منقش و مصور لے کر اپنی شادیوں کے موقع پر بطور تحفہ تحائف دیا کرتے تھے اور یہ چینی ان کے نزدیک اعلیٰ صنائع شمار ہوتے تھے۔ جو دنیا بھر کے دیگر صنائعوں پر بھی سبقت رکھتے تھے۔ اس نے ایک عجیب قصہ بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چینی تاجر کس قسم کی اشیا عام بازاروں میں فروخت کرتے تھے۔ ایک چینی مصور نے ایک پرندہ کی تصویر ایک ٹینکے پر بیٹھے ہوئے بنائی۔ وہ بازار میں پڑی ہوئی تھی جسے بہت سے لوگ عجیب و غریب سمجھے آخر ایک شخص نے اس پر علانیہ نکتہ چینی کی۔ وہ تاجر اسے سلطان کے پاس لے گیا وہاں تصویر کا نقص دریافت کیا تو بیان ہوا کہ پرندہ ٹینکے پر اس طرح بیٹھ نہیں سکتا۔ معترض کا اعتراض مصور کو برا معلوم ہوا۔ قدیم شعر لے فارس کے کلام میں چینی صنعت کی بہت تعریف ملتی ہے۔ مگر اس کے برعکس تیسری صدی ہجری کے آخر میں ایک عرب ابن و ہالبصری نے بادشاہ چین کے دربار میں ایک موقع تصاویر انبیا پیش کیا تھا جن میں آنحضرت صلیع کی بھی تصویر تھی۔ سرآمد لکھا کا خیال ہے کہ اسلامی مصوری نے دور دراز تک سفر کیا۔ اگرچہ مذہبی تصورات کے برعکس تھی۔

پارچہ پر

مصور

اور کسی حد تک میان ہو چکا ہے کہ عربوں کے ہاں کپڑوں کے خاص نام ان کے خاص نقوش کی وجہ سے مقرر تھے جو عام طور پر وہ لوگ استعمال کرتے تھے۔ مثلاً ھیں صقلیہ (Sicily) جہاں مسلمانوں کی حکومت زیادہ الدولۃ اغلب کی فتح سے شروع ہوتی ہے۔ وہاں ابھی تک بہت سے اسلامی آثار حقیقہ علاوہ عمارات کے مل جاتے ہیں۔ وہاں ایک عجائب خانہ ہے جس میں خالص اسلامی اشیا زیادہ تر قالین و ریشمی کپڑوں وغیرہ کی قسم

۱۔ اسلامک ۲۔ ۱۔ میگزین آف آرٹ ۱۹۵۶ء

رکھی ہوئی ہیں۔ جن پر جانوروں کے نقوش اور تصاویر ملتی ہیں۔ جن سے اس وقت کی عربی شان و شوکت مترشح ہوتی ہے۔ ان پر اساتذہ فن نے نہایت جانفشانی اور کمال دکھایا ہے اور بعض ان کے اسما بھی ثبت ہیں۔ چنانچہ بعض پر اسناد و عبد العزیز کا نام ملتا ہے جن کے کارخانے میں یہ اشیا تیار ہوئی تھیں اور بعض پر عربی عبارتیں "العن والنصر والاقبال" کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ اسی طرح کی سینکڑوں قدیم چیزیں یورپ کے تمام عجائب خانوں میں نظر آئیں گی۔ خصوصیت سے وین کے عجائب خانہ مشرقی اور وٹیکن میں یہ آثار کثرت سے ملتے ہیں ان میں بعض مسلمان سپاہیوں کے لباس وغیرہ ہیں۔ ان کی آستینوں اور سینوں پر ابھی تک خون کے نشان موجود ہیں بعض پر یہ آیات ملتی ہیں۔ "نصرتی من اللہ وفتح قریب ولبشر المومنین" صلاح الدین ایوبی کے زمانے کے جھنڈے ملتے ہیں۔ خطیب بغدادی نے اپنی کتاب تاریخ بغداد میں خلیفہ المنتصر باللہ ۶۷۸ھ کے تحت میں بدائع من التصویر ایک باب قائم کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ خلیفہ المنتصر مجلس میں بیٹھا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ دیباچ کا قرش بچھا دیا جائے۔ بعض میں بہت بڑے بڑے دائرے تھے۔ ان میں گھوڑوں کی تصاویر تھیں اور ان پر سوار تھے جن کے سروں پر تاج تھے دائرہ کے گرد کچھ فارسی میں لکھا تھا جب منتصر اور اس کے ندیا بیٹھے تھے تو غلاموں اور بڑے بڑے لوگوں کے چہرے آپ کی طرف متوجہ تھے تو اس نے اس دائرہ کی طرف دیکھا جس کے گرد کچھ لکھا ہوا تھا۔ تو اس نے وزیر سے دریافت کیا کہ کیا لکھا ہے۔ اس نے عذر کیا کہ میں نہیں جانتا۔ پھر اس نے حاضرین سے سوال کیا مگر کسی نے پڑھنے سے دفا نہیں کی پھر اس نے وصیف کی طرف التفات کیا۔ اس کو کہا کہ کوئی آدمی لاؤ۔ جو اسے پڑھے۔ ایک شخص پیش کیا گیا وہ اس تحریر

کو پڑھ کر پریشان ہوا۔ منقر نے کہا یہ کیا ہے۔ اس نے کہا۔ اے امیر المومنین یہ کوئی ایرانی یوقوت ہے پھر اصرار کیا کہ مجھے مطلع کرو۔ پھر اس نے کہا کہ اے امیر المومنین اس کے کچھ معنی نہیں ہیں۔ اس پر وہ بہت ہنسنے لگا اور غصہ نہ کیا۔ اس نے کہا یہ لکھا ہے کہ میں شیردیز بن کسرک بن ہرمز ہوں۔ میں نے اپنے باپ کو قتل کر دیا ہے پھر کہتا ہے کہ میں نے محض چھ مہینہ سلطنت کی۔ منقر کا کاہرہ سن کر متغیر ہو گیا۔ مجلس سے اٹھ کر حرم میں چلا گیا محض چھ مہینے سلطنت کی اور اس کا انتقال ہفتہ کے روز ہر شہر ربيع الاول ۳۷۷ھ میں ہوا۔ وہ لوگ نصاب کو بالکل واقعات پر منطبق کر کے بناتے تھے اور پھر اس پر تحریر یا ثبت کرتے تھے۔ اس واقعہ سے ہم یہ بھی استنباط کر سکتے ہیں کہ ایرانی فن اس وقت عرب میں شیر و شکر ہو چکا تھا۔ مسعودی نے بھی اس قائلین کا ذکر کیا ہے اس نے لکھا ہے اس میں یزید بن الولید بن عبد الملک نابیک کی بھی تصویریں ہیں اور مسعودی نے ایک اور ایسے قائلین کی تفصیل ہم پہنچائی ہے جو ام المومنین کی ملک میں تھا جس میں ایسی مصع صورتیں دکھائی گئی تھیں جس سے مسلمانوں کی زندگی کے واقعات و عادات کا پتہ ملتا۔

مجھے برٹش موزیم میں ایک ہندوستانی مسٹر گورڈن جو ۲۰ سال سے مانوی برٹش میں مقیم ہے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ کاغذ کی تاریخ لکھ رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ عرب میں قبل بعثت آنحضرت صلم کاغذ موجود تھا جب میں نے اس کے سامنے قرآن کریم کی آیت پیش کی جس میں لفظ قرطاس آتا ہے اور پھر احادیث بھی بتائیں تو اس نے ان کو سن کر مجھے بعض نمونے دکھائے۔ علاوہ ازیں یہ امر تاریخ میں آچکا ہے کہ اولاً کاغذ کی ابتدا چین میں ہوئی اور وہیں سے گرد و نواح کے شہروں میں لایا گیا اور یہ بھی علم ہے کہ قبل اسلام کے وقت سمرقند میں بنتا تھا۔ جب عربی امیر زیاد بن صالح نے سمرقند کو ۳۸۵ھ میں فتح کیا تو اس لڑائی میں بہت سے چینی قیدی بھی ہاتھ آئے ان میں سے بعض کاغذ بنانا جانتے تھے۔ یوسف بن عمرو عرب نے ان سے کاغذ بنانے کا طریقہ سیکھا اور کہ معطلہ میں آکر اور لوگوں کو بھی سکھایا تو کاغذ مکہ میں آکر قرطاس کہلایا۔ ۳۸۵ھ میں مکہ میں پہلی مرتبہ کاغذ تیار ہوا۔ غرض کہ یہ امر یقینی ہے کہ چینیوں کے بعد مسلمانوں نے ہی کاغذ تیار کیا

کتابی مصوری
(کاغذ)

اپنے مسودات ان پر لکھے جو آج تک محفوظ ہیں۔

ابن ندیم نے جہاں ابتدائی اسماں کتاب المصاحف شریف بیان کئے ہیں وہاں اسماں المذہبین للمصاحف شریف بھی کئے ہیں۔ جن کا کام محض قرآن کے اوراق کی مطلقاً کاری کرنا تھا۔ تذبذب نگاری و زرافشانی مسلمانوں کے خاص فن شمار ہوئے ہیں مثلاً البیہقی، ابراہیم الصغیر، ابوموسیٰ بن عمار، السقطی، محمد بن محمد ابو عبد اللہ الخراسانی اور اس کا لڑکا۔ یہ وہ اسماں ہیں جو ابن ندیم متوفی ۳۷۷ھ تک مشاہیر میں سے تھے۔ ان کے بعض نمونے اب تک مصر، قسطنطنیہ، وائنا اور یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ جو مسلمانوں کے خاص کے خاص ملکہ نقاشی کا پتہ دیتے ہیں۔ مسلمان صنایع اس کام سے روزی کماتے تھے۔ وہ حافظ قرآن ہوتے تھے اور اسی کو لکھنا مطلقاً کرنا توشہ آخرت تصور کرتے تھے۔ اور اپنے دل و دماغ سے اس کی تزئین میں حصہ لیتے تھے۔ یہ فن مسلمانوں میں اخیر تک ہر اسلامی سلطنت میں نہایت شان و شوکت پر رہا ہے۔

ایران کی جد و جہد کو مد نظر رکھ کر اور ایرانی کتبی تصاویر کی طرف توجہ کریں تو پہلے مانی کے مذہب پر ضرور روشنی ڈالنی چاہئے جس نے ایران کی ذہنیات پر ایک عرصہ تک تسلط رکھا تھا۔ آرنلڈ کی سامی جمیلہ سے ایک قدیم مخطوطہ ۹۰۰-۱۰۰۰ متعلقہ مذہب مانی کے چند اوراق کا ایڈن براؤنیورٹی سے پتہ لگا ہے۔ اور ان سے کاغذ پر تصاویر کا قدیم ترین ہونا معلوم ہوتا ہے۔ لی قوق کا خیال ہے کہ قریب قریب تمام اسلامی کتبی مصوری کی بنا مانوی مذہب کی کتبی تصاویر پر ہے اور آگے چل کر کہتا ہے اگر کوئی مقابلہ ممکن ہو سکتا ہے تو مجھے کتبی مصوری اور دیواری مصوری بدھ مت اور ایرانی مانوی متاں وسط ایشیا کی طرف توجہ دلانی چاہئے جو بلاشبہ اس کتاب سے بالکل مختلف ہے جو ان کی تھی۔ ان فنون کو غالباً مصر میں لایا گیا۔ یہ نظریہ قائم نہیں ہو سکتا۔

اس ضمن میں پروفیسر گروہ مان ایک تجویز پیش کرتا ہے کہ مانوی

دہستان مصوری کا زبردست اثر یقینی طور پر قدیم مسلم نمودجات مصوری سے واضح ہے اگرچہ وہ زوال پذیر ہے۔ میں اس قدر دور نہیں جاتا جس قدر کہ لی فاق گیا ہے کہ ماویٰ دہستان مصوری اسلامی کتابی مصوری کی بنیاد ہے کیونکہ اوائل زمانہ کے مسلم مصور یا نقاش زیادہ تر فلسطین اور عراق کے مابین نظر آتے ہیں۔ کسی حد تک ان کے طریق فن سے ماویٰ طرز ضرور مترشح ہے جس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ماویٰ دہستان مصوری سے مسلمان مصورین باخبر ضرور تھے۔ مگر میرا خیال ہے کہ اگر ہر ملک کے طریق فن کو بغور دیکھیں تو ان میں ضرور بعض بعض ایسے نکات نظر آئیں گے جو دوسرے میں بھی پائے جائیں گے۔ اس سے کسی فن کا دوسرے فن پر اثر وغیرہ ثابت کرنا عقل پر ولات نہیں کرتا کیونکہ ہر ملک کا فن یا طریق فن اپنے خاص طرز اور ماحول پر مبنی ہے۔

مذہبی تصویر

سر آرٹلڈ کا خیال ہے کہ مسلمانوں نے دراصل کوئی مذہبی فن پیدا نہیں کیا جو ان کا اپنا مذہبی فن کہا جاسکے۔ اس کا خیال ہے کہ ابتدا میں اس صنف میں بہت کچھ غیر مسلم صناعتوں سے لیا گیا ہے۔ ہمیں اس نظریہ کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے کیونکہ بہت جلد ہی مسلمان اس قابل ہو گئے تھے کہ وہ سب کام خود اپنے خاص طرز پر کر سکیں جس کو دوسرے لوگ بغیر ہدایت کے ہرگز نہیں کر سکے۔ جیسا کہ مثلاً اوپر عرض کر چکا ہوں۔ کیونکہ آرٹلڈ نے فلورنس کی لارسیٹن کے کتبخانہ کا نسخہ کتاب مقدس (انجیل) عربی کو پیش کیا ہے جو ۱۶۹۹ء کا مکتوبہ ہے اور عراق کے شمال مغرب میں تیار ہوا۔ اس میں چھوٹی چھوٹی سیاح میں تصاویر ہیں جو کسی عہدگی فن کو پیش نہیں کرتیں مگر اس کے برعکس موسیو بلوشے رقمطراز ہیں کہ آٹھویں صدی عیسوی تک لاطینی خطوط میں جاندار یا انسانی نقوش نظر نہیں آتے تھے بلکہ کوئی ایسی تصویر بھی نہیں جو کسی قسم کے متذکرہ ماحول کو ظاہر کرتی ہو ان قدیم زمانوں کے صناعت نے مطلقاً کار و مذہب کرنے والوں کی طرح دسویں صدی عیسوی کے آخر تک اپنے آپ کو زیائش کی ترقی تک مطمئن رکھا جس کی تکمیل علم ہندسہ کے خطوط میں کی جو جاندار مناظر کے اظہار سے

بہت ہی آسان تھی۔ اس میں ان کو نتیجہ تک پہنچنے کے لئے کم محنت درکار ہوتی تھی اور یہ اس نتیجہ سے بہت ہی ارفع تھا جو رومی اور بازنطینی مصوری کے مکمل کام کی نقل کر کے پیدا کیا جاتا جس کو انہوں نے شروع کیا تھا اس روایت کو جیسا کہ ہم انجیل چارلس ثانی میں زیائش کو دیکھ سکتے ہیں اور ابھی تک موجود تھی اور دیر تک محفوظ رہی مسلمانوں نے اس وقت تک جاندار کا اظہار نقوش میں کرنے سے اعراض کیا تھا یعنی متذکرہ بالا قرآن کریم کے مذہب و مطلقاً کار مسلمان ہی تھے جنہوں نے ابتدا میں خواہ کسی سے کام کو سیکھ کر ہی ان کاموں کو سنبھالا۔ جیسا کہ موسیو بلوشے کے بیان سے واضح ہے کہ عرب مطلقاً کار ضرور تھے۔ مگر سر آرٹلڈ نے جس زمانے کا انجیل کا عربی مخطوطہ فلورنس پیش کیا ہے اس سے قبل زمانہ کے خالص مسلمان صناعت کے کام کے مخطوطے برآمد ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء کی نمائش ایرانی فن میں اوراق منافی کی کتاب الحیوان از مجموعہ مورگن کتبخانہ اور اوراق شاہنامہ مسرطیٹی، مسرگوش کلکتہ وغیرہ وغیرہ سے کافی روشنی پڑی ہے کہ مسلمانوں کی ابھی تک یہ اشیا محفوظ ہیں اگرچہ ان کو روح مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

بعضوں نے آرٹلڈ کے اس نظریہ کی تردید کی ہے اور بہت سی اشد اس کے برعکس اپنی تائید میں پیش کی ہیں اور بعضوں نے اس مذہبی مصوری سے یہ تصور کیا ہے کہ محض مذہبی مضامین کو دخل دیا ہو۔ ان کی تسلی کے لئے عرض ہے کہ یہ ضرور نظر آئیگا کہ بعض نے ایسی تصاویر بنائیں جو خالص ظاہری صورت میں مذہبی کہی جاسکتی ہیں مگر غایت فن کے اعتبار سے ان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں جس طرح دیگر مذاہب مثلاً بدھ مت اور عیسائیت نے تصاویر سے کیا ہے مسلمانوں کے ہاں بھی ان کے گھروں یا مساجد میں کوئی ایسی تصویر نظر نہیں آئیگی جو ان کے کسی مسئلہ مذہب یا کسی ایسے اصول مذہب پر روشنی ڈالے جس طرح اس کے برعکس دیگر مذاہب میں ملیگا اور پھر وہ نقوش خواہ رنگ میں خواہ حجر میں باعث عبادت بھی ہوئے مسلمانوں نے مصوری کو محض ایرانی روایات کے ماتحت رومانیت

۱۔ اسلامک آرٹ ۱۱۲-۱۱۳ء۔ مسلمان پیٹنگ از بلوشے ۱۱۲ء حال ہی میں مسٹر انڈن نے ایک کتاب (HINDU VIEW OF ART) لکھی ہے اس میں یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ بدھ مت کی تعلیم میں مصوری ممنوع ہے۔

مشہور کیمیا گر کی تصنیفات ملتی ہیں جن میں رازی کو اس کے معمل میں تجربوں میں مصروف دکھایا گیا ہے۔ قاہرہ کے دارالآثار میں ایک برتن ہے جس پر پرندوں وغیرہ کے نقوش اور اس کے بنانے والے کا نام محمد بن فضل اللہ ہے۔

علم القراءۃ میں کئی کتابیں مصورتیا رہیں جن میں حروف کے خالیج کو ظاہر کرنے کے لئے حلق منہ اور زبان کی تصویریں بنائی گئی ہیں اور بعض میں پورا چہرہ بھی دکھایا گیا ہے جو آج یورپ میں علم الصوت کے نام سے رائج ہے۔ اور اہم تصویر کیا گیا ہے۔

امام ابو الحسن نیشاپوری کی کتاب "علم الاصلطراب" کا حصہ اول مکتوب ۵۲۲ھ تیار کردہ احمد البیہقی جن میں ایک سو تین شکلیں ہیں اس نے اسے دیکھا ہے اور یہ ایرانی نمائش لندن ۱۹۳۱ء میں آئی تھی۔ اس سے ایک امر پر ضرور روشنی پڑتی ہے کہ احمد البیہقی علاوہ واقف حساب اسطرلاب کی شکلوں کو صحیح کھینچنے کی بھی مہارت رکھتا تھا جو بہت ہی صاف اور عمدگی سے تیار ہوئی ہیں۔ یہ نسخہ چسٹر بیٹی کے مجموعہ میں ہے۔

اسی طرح عطار و بن محمد الحاسب کا رسالہ منافع الاحجار جو ۱۱۷۷ھ کا تیار شدہ ہے یہ بھی لندن کی نمائش میں ۱۹۳۱ء میں آیا۔ اور یہ گذر ہوئی نے ارسال کیا تھا۔ ابن ندیم نے اپنی فرست میں عطار دکی دیگر تصانیف کو لکھا ہے مگر اسے درج نہیں کیا یعنی بالکل نئی چیز تھی اس میں بہت سی شکلیں بنائی ہوئی ہیں۔ عطار د بہت بڑا ریاضی دان تھا۔

جغرافیہ میں سب سے پہلی کتاب الاقالیم از ابو اسحاق الفارسی اصطخری کی ہے جس میں نقشہ جات ممالک بھی دئے گئے جو اس کی دور کی جلد سے عیاں ہیں۔ ادیبی نے بھی اپنے جغرافیہ کو دنیا کے نقشہ سے مزین کیا۔ مقدسی کی احسن التقاسیم اسی طرح تیار ہوئی تھی کہ ہر ملک کے شہر اور قصبات مع ان کے حدود کے علاوہ علاقہ دکھائے گئے تھے راستے سرخ خطوط سے، ریگستان زرد رنگ، سمندر سبز رنگ سے

اور شمریت کو مد نظر رکھ کر اختیار کیا جس کو مذہبیات سے کوئی تعلق نہیں بلکہ مذہب کے رسوم دور اور خالصاً جالیاتی صورت ہے اور اسی سے انہوں نے مصوری کو نمائشی قید سے آزاد کر کے تخلیقی صورت دی اور معنوی طور پر بعض حالات کے تحت تصاویر بھی بنائیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بعض مذاہب کی تمام تعلیم ہی نقوش اور بت تراشی کے نمونوں میں ہی پنہاں ہے اگر آج وہ مرٹ جائیں تو ان کے مذہب کی تمام روایا کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو مذہب اسلام کے بالکل برعکس ہے کیونکہ ہماری تمام تعلیم ہماری کتب مقدسہ میں محفوظ ہے جو اس قسم کے تصویریں اظہار سے بلند و ارفع ہے۔ اس کے متعلق مزید وضاحت سے ہزاروں کے زمانہ کے تحت میں آگے چل کر بیان کیا جائیگا۔

خلفاء بنو عباس نے جب تدوین علوم کی طرف توجہ کی تو دور دور سے فضلاء، علما، حکما و ماہرین فن کو دربار میں جگہ دی گئی جنہوں نے علاوہ تصانیف کے اپنی کتب کو مناسب و ضروری نقوش سے آراستہ کیا جو زیادہ تر جغرافیہ، طب، ادب، علم البیوت، ہندسہ، علم القراءۃ اور موسیقی میں تھیں۔

علوم طبیعیات میں دیکھا جائے تو سب سے پہلے حنین بن اسحاق متوفی ۲۹۸ھ کی کتاب العین کا پتہ ملتا ہے جس نے آنکھ کی پتلی کی تصویر اپنی کتاب میں ایسی بھرتی سے کھینچی کہ آنکھ کے ڈاکٹر بھی اپنی کتاب میں ایسا صحیح اور واضح نقشہ کھینچنے سے قاصر ہیں۔ حیون الانبیا میں رشید الدین ابن الصوری کی نادر تصنیف کا ذکر ملتا ہے۔ اس کی تیاری میں مؤلف خود ان مقامات پر گیا ہے جہاں پودے اگتے تھے اور ساتھ ایک مصور ہوتا تھا۔ پودے کے رنگ، پھول، پتیوں کی تعداد جغرافیہ شاخوں کی حالت کو دیکھ کر کاغذ پر کھینچا جاتا تھا۔ اور مختلف اوقات پر مختلف حالتوں کی تصویریں جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ پودے کا نشوونما ہو جاتا تھا۔ میونخ (جرمنی) کی اسلامی نمائش سنہ ۱۹۱۴ء میں ایک ورق از کتاب طب آیا جس کے مصنف کا نام یا کتاب کا نام معلوم نہیں لیکن مصور کا نام عبداللہ بن الفضل مورخ ۶۱۹ھ لکھا ہے۔ ابو بکر رازی

طب

دیا نیلگوں اور پہاڑ سیاہ رنگ سے نمایاں کئے گئے تھے۔ بعد میں
معجم البلدان از یاقوت حموی و آثار البلاد از قزوینی جیسی کتب بھی جزائیہ
عالم میں لکھی گئیں۔ اور ان کو نقشہ جات دنیا سے مزین کیا گیا۔
نجوم محمد بن موسیٰ المعروف بہ خوارزمی جو مامون کا درباری مخم تھا اس
کی کتب میں نجوم کی تصاویر تھیں۔ ایک رسالہ علم نجوم میں ملتا ہے جسے
نصیر الدین محمد نے تیار کر کے سلطان غیاث الدین کیخسرو (۶۶۶-۶۸۲ھ)
کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

نجوم

جرتقیل

علم جرتقیل میں بعض مصنفین نے محسوس کیا کہ اپنی تصنیفات کو
مصور کیا جائے۔ کیونکہ انہوں نے ان نقشہ جات کو مفہوم مطالب کے
لئے تفہیم کا ذریعہ سمجھ لیا تھا۔ جس سے انہوں نے مدد لی۔ جزری کی
کتاب فی معرفۃ احوال الهند سے جو سنٹ صوفیہ قسطنطنیہ کے کتب خانہ میں ہے
اس کے چند اوراق پر نشان بد قسمتی سے بوسطن (امریکہ) کے موزیم
میں بھی چلے گئے ہیں۔ جو غالباً ۱۸۰۶ء میں سلطان محمود کے لئے لکھی
گئی تھی جس میں ان اوراق سے کسی خاص تاریخ وغیرہ کا پتہ نہیں چلتا
سوا اس کے کہ ان پر الملک الصالح الاطی الدین والیدین لکھا ہوا ملتا
ہے جس سے سلطان محمود کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور نسخہ
مرقومہ ۱۹۲۲ء کا منقول ملتا ہے۔ اگر قسطنطنیہ کا مصور نسخہ جسے
مصنف نے سلطان کے لئے تیار کیا تھا اس میں خاص قابلیت
کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ظاہر کرتا ہے کہ جزری کی کتاب جو پانچ حصوں
پر مشتمل ہے اس کے اول حصہ میں دس گھڑیوں کا ذکر ہے جس میں
اول کا نقشہ یہاں دیا گیا ہے۔ جو ایک آبی گھڑی کہلاتی ہے اور
یہ اپنے سلسلہ میں اول ہے جس کی جرتقیل کے متعلق بیان کرنا
ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ایک محل محراب دار دکھایا گیا
ہے جس میں بارہ برجوں کے نشان دئے گئے ہیں ان کے اندر
ان کے علاوہ اور ہم مرکز دوائر ہیں جن میں آفتاب و قمر کے حلقے
دئے گئے ہیں۔ اس کے نیچے دو قطاریں بارہ بارہ دروازوں
کی ہیں اوپر کی قطار میں دروازے بند ہیں اور نیچے کی کھلی ہیں۔ ایک

سوئی بائیں طرف سے دائیں طرف کو سفر کرتی ہے جو نیچے کے
دروازوں سے لگا دی گئی ہے اس کے نیچے دائیں و بائیں دو
عقاب کی تصاویر ہیں اور ان کے نیچے دو برتن ہیں جن پر نقارے
ہیں۔ محراب میں پھر بارہ شیشوں کے دائرے دکھائے ہیں اور اس
کے نیچے محراب میں دو شخص ڈھول سپٹ بٹے ہیں اور دو نفیریاں
بجا رہے ہیں اور درمیان میں ایک نقارچی نقارہ بجا رہا ہے اس
گھڑی میں وقت اس طرح سے دیکھا جاسکتا ہے کہ جب ایک
گھنٹہ گزر جاتا ہے تو سوئی بائیں طرف سے دائیں طرف کو سفر
کرتی ہے تو ایک دروازہ سے گزر کر دوسرے میں گھڑی ہو جاتی
ہے۔ تب پہلا دروازہ اوپر کی قطار میں کھلتا ہے اور کسی شخص کی
تصویر نمودار ہوتی ہے تو نیچے کی قطار کے دروازے میں مختلف
رنگ ظاہر ہو جاتا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ بارہ میں سے ایک
گھنٹہ گزر گیا ہے۔ دوؤں عقاب ان نقاروں پر جھپک کر ان کو
پیشہ ہیں تو ہر ایک گھنٹہ کے بعد اس طرح اس میں آواز پیدا
ہوتی ہے۔ ہر ایک تین، چھ، نو، بارہ گھنٹوں کے بعد ڈھول
پیشہ والے اور نفیریاں بجانے والے اپنا عمل کرتے ہیں۔ اور
نقارچی اپنا نقارہ بجاتا ہے۔ رات کے وقت محراب میں جو بارہ
مختلف شیشے لگے ہوئے ہیں۔ اور اسے رنگ سے دیکھنے والے
کو اپنی حرکت کا پتہ دیتے رہتے ہیں جب گھنٹہ شروع ہوتا ہے۔
تو روشنی مدہم ہو جاتی ہے۔ جب ختم ہو جاتا ہے تو سنوٹخ ہو جاتی ہے
آفتاب و قمر کے دوائر روزانہ ان کی اصلی حالت کو ظاہر کرتے
رہتے ہیں۔ اگر مصنف اپنی کتاب میں یہ نقشہ ضبط نہ کرتا تو اس
کی تفہیم قارئین کے لئے ناممکن تھی جس کی ضرورت کو محسوس کر
کے اس نے نقشہ کشی سے کام لیا۔ جزری کی اس کتاب کے
اوراق میں بعض ایسی اشیاء بھی دکھائی گئی ہیں جن میں ایک ایسی
مشین دکھائی ہے جس سے مالکات کا وزن نہایت خوبی سے
ٹھیک ٹھیک ہو سکتا ہے۔

کتاب الحيوان کے نام سے بہت سے عرب مصنفین نے تصنیفات کی ہیں جن میں سے حاضہ 'دمیری' اور منانی کی کتب کا پتہ ملتا ہے اور ان میں منانی کی کتاب فارسی میں ہے۔ جسے ابن جتھو نے مصور کیا تھا۔ برٹش موزیم میں اب تک موجود ہے۔ جو اس بات پر بھی روشنی ڈالتی ہے کہ عربوں میں علوم کس پایہ تک پہنچ چکے تھے۔ اور شاؤ و نادر ہی کوئی ایسا علم رہ گیا تھا جس میں تصنیف نہیں ہوئی تھی۔ اس میں بعض خاص خاص حیوان کی تصاویر بھی بنائی گئی تھیں۔ ان میں ایک آبی بھینسہ بھی ہے۔ کتاب کا خط نسخی ہے۔ اور حروف کوئی خط میں ہیں۔ نیویارک مورگن کے کتب خانہ میں ایک اور نسخہ متذکرہ بالا بھی ہے جو اسی منانی کی کتاب الحيوان کے اوراق پارینہ معلوم ہوتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ چھٹی صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے۔ جس سے اس قدر واضح تصاویر دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ محض ظاہری انسانی یا دیگر نقوش کا خاکہ کھینچنے میں کامیاب ہی نہ تھے بلکہ حیوان وغیرہ کے نقوش ان کے عادات و خاصیات کے مطابق تیار کرتے تھے۔

خلفائے نبی عباس کا زمانہ جس کو خاص کر اجبار علوم و فنون کا زمانہ کہنا سجا ہو گا۔ ہمارے قریباً تمام فنون کو فروغ ہوا اور تمام دیگر ممالک پر بھی فنون اسلامی کا یہیں سے اثر ہوا۔ حدیث زمانہ کی وجہ سے یہ چیز اب بالکل کالعدم ہو چکی ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید کا زمانہ الف لیلة کے پڑھنے والوں میں ہمیشہ کے لئے اپنی یاد تازہ رکھے گا جو زیادہ تر آپ کے عہد کے واقعات پر مشتمل ہے اور جس کے بہت سے نسخے بھی تیار کئے گئے۔ میونخ جرمنی کی نمائش ۱۹۱۲ء میں چند اوراق الف لیلة آئے جن میں سے ایک پر اس مشین کا نقشہ تھا جسے ہارون الرشید نے چارلس پنجم کو تحفہ دیا تھا۔ اس بادشاہ چارلس نے عربوں سے سپین میں جنگ کی تھی اور بعض اوراق میں مصر کے بازاروں کے مناظر تھے اور بعض باہرین موسیقی

کی تصاویر بھی تھیں جو اپنے اپنے ماز پر طبع آزمائی کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ دیواروں پر شاہی اسلحہ سنہری عقاب سرخ سطح پر اور ایک سنہری پیالہ نیلی سطح پر دکھائے گئے تھے بعض محققین کی رائے ہے کہ یہ اوراق ساتویں صدی ہجری کے تیار شدہ تھے۔ لیکن یہ اس سے بھی مدیم معلوم ہوتے ہیں۔

کلیدہ دمنہ کا ماخذ ہتھوپدیش بتائی جاتی ہے اور اس کا ترجمہ عبداللہ بن متغنی نے مامون کے حکم سے کیا تھا جس کے بے شمار نسخے ملتے ہیں۔ اس کا ایک مصور نسخہ پیرس میں قدیم ایرانی تصاویر کی نمائش منعقدہ ۱۹۱۲ء میں آیا جو ۳۳۳ء کا لکھا ہوا تھا۔ جس میں تصاویر بھی تھیں ایک اور نامکمل نسخہ کے بھی چند اوراق تھے جو بہت ہی اعلیٰ تصاویر رکھتا تھا۔ پیرس کے کتب خانہ ملی نسخہ ۳۳۳ء کا لکھا ہوا ہے اور یہ خاص کر غزنوی کے کتب خانہ قدیم سے تعلق رکھتا ہے جو دراصل فرانس کے موسیو ڈاکسن پیرن کا ہے اس میں جانوروں کی بھی تصاویر ہیں جو اور کتب کی تصاویر سے بالکل مختلف ہیں۔ غرضیکہ ان کا طریقہ ہی الگ ہے اور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی چینی مصور نے ان کو سلطان غزنوی کے لئے تیار کیا تھا۔

مجھے باڈیس لائبریری آکسفورڈ میں دو بہت اہم قدیم مصور نسخے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک تو کتاب الجحامع بین العلم والعمل المتافع فی صناعتہ اخیل علامہ بدیع الزمان ابی العزاسمعیل کا ۵۴۴ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں عمارات و دیگر شہری تصاویر ہیں جن سے پورا تفہیم مطالب کا کام لیا ہے۔ دوسرا نسخہ کلیدہ دمنہ کا ہے جو ۵۵۴ء کا لکھا ہوا محمد بن احمد صفی بن قاسم بن عبدالرحمن کا لکھا ہوا اور مصور شدہ ہے اس میں بہت سی تصاویر ہیں۔

محققین کی رائے ہے کہ سب سے قدیم ادبی کتاب کا مصو

نسخہ قسطنطنیہ کے کتب خانہ میں ہے جس میں سلطان نور الدین محمد متوفی ۱۱۸۷ء کا نام لکھا ہے۔ ایک اور ورق پر صلاح الدین کا نام لکھا ہوا ہے۔ چونکہ یہ ایسا زمانہ تھا جبکہ مدارس اسلامیہ میں باقاعدہ عربی تعلیم دی جاتی تھی اور ادب میں مقامات تحریری مقامات بیچ الزمان ہدائی کی جگہ لے چکی تھی جو تمام مدارس میں پڑھائی جاتی تھی اور یہ کتاب اپنی طرز بیان میں کسی قدر سربلغ الفہم تھی کیونکہ واقعات مندرجہ ذیل آنکھوں کے سامنے علی صورت میں آجاتے تھے اور اس امر کے متعقبات تھے کہ ان کو ضرور مصور کیا جائے۔ چنانچہ بے شمار نسخے مصور کئے گئے۔ اس کے ہم نسخے اس وقت بھی فرانس و اٹالیا لندن میں ہیں۔ پیرس کے کتب خانہ ملی کے نسخہ میں ایک سو تصاویر ہیں جن کا مصور یحییٰ بن محمود بن یحییٰ بن ابی الحسن بن الواسطی ہے جس نے اس کو ماہ رمضان ۳۳۳ھ میں مصور کیا ہے۔ میں نے اسے اصل دیکھا ہے۔ برٹش موزیم لندن کا نسخہ ۳۳۳ھ کا لکھا ہوا ہے اور ابو الفضل بن ابی اسحق مصور نے اس کی تصاویر بنائی ہیں۔ یہ تینوں نسخے قدیم ترین تصویر شدہ اسلامی مصوری میں شمار ہوتے ہیں۔ خالصاً عراقی کام ہے ان پر کسی قسم کا ایرانی یا چینی اثر نہیں ہے۔ ان سے مصور کتب کا اندازہ اس سے مستعمل ادیبان کے طریقہ تعلیم پر روشنی پڑتی ہے۔ بعض ایسے ہی نسخے ابھی تک بلان، وینس، فلورنس، روم وغیرہ کے عجائب خانوں میں مسلمانوں کے موجود ہیں۔ جو ابھی تک عوام کے دیکھنے میں نہیں آئے۔ ایک نسخہ مجمع التواریخ رشید الدین ایدہ نبرا یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے اور یہ ۳۵۷ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں کافی تصاویر ہیں۔ خصوصیت سے اس میں محمود غزنوی اور علاء الدین خلجی کے حملوں کو مصور کیا گیا اور محمود غزنوی کی فوج کو لڑتے دکھایا ہے۔ ان سے خصوصیت سے اس وقت کے تمدن پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ جھنڈوں، تیرکوں اور دیگر سامان حرب اچھی طرح دکھائے ہیں۔ ایک اور ایسا ہی قریب

۳۱۴

اسی زمانہ کا نسخہ مجمع التواریخ لندن میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں ہے۔ یہ دونوں نسخے دراصل ایک ہی نسخے کے حصے ہیں۔ لندن میں مجھے میرے کرم دوست مسٹر سیسیٹینی نے بتایا کہ کتب خانہ خدیو مصر میں ایک قدیم نسخہ کتاب الاغانی ابو الفرج اصفہانی متوفی ۳۵۶ھ کا ہے جس میں بیشمار تصاویر ہیں اور قدیم لکھا ہوا ہے اس کے متعلق مفصل معلومات سر آرملڈ نے حاصل کی تھیں۔ یہ دی اول ترین علمی کارنامہ عربی علم موسیقی و شاعری کا ہے جو نجو عباس کے عہد میں تمام محالوج اصول علم موسیقی، آلات موسیقی پر اس زمانہ کے مشاہیر عربی شعرا اور ان کے پڑھنے والوں کے متعلق مفصل بیس ضخیم جلدوں پر تنقید و تبصرہ ہے یعنی دراصل بقول حضرت عمرؓ الشعر من دیوان العرب عربوں کی ثقافت کے حصہ اکثر کا آئینہ ہے۔

ان تمام مصور نسخوں کے ذکر کرنے کے بعد یہ امر قابل وضاحت معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی تک لوگ اپنے اپنے ماحول میں اپنی قدیم روایات پر کام کرنے لگے تھے۔ جو نسخے عراق میں تیار ہوئے ان میں وہی ماحول ہے جو وسط ایشیا میں چینی اثر سے اثر پذیر ہوا تھا۔

شبکہ کشی کے ضمن میں اوپر بیشمار مثالیں گزر چکی ہیں کہ ابتداء ہی میں سکون، تمنوں، محلات کی دیواروں پر بعض خلفاء و سلاطین کی شبہات بنائی گئیں مگر یہ وہ زمانہ تھا جبکہ شبکہ کشی بت پرستی کی قیود سے آزاد ہو چکی تھی اور اس سے دیگر اغراض وابستہ تھیں۔ بعض اوقات سکے جاری کر کے خلیفہ یا سلطان کی حیات کا ثبوت اور سلطنت کے طول و عرض میں تشبیہ صورت خلیفہ یا سلطان ہوتی تھی یا اس سکے کو موثق بنانے کا ذریعہ ذہن میں ہوتا تھا۔ اکثر خلفاء و سلاطین نے اعلیٰ کارناموں کے صلے میں تمنوں کو رواج دیا جن پر خود کی تصاویر ہوتی تھیں۔ تاریخ کی ورق گردانی عجیب و غریب واقعات شبکہ کشی سے متعلق پیش کریگی۔ مسعودی کا بیان ہے کہ اس نے اسطرح میں ۳۳۳ھ میں ایک مخطوطہ دیکھا جس میں ستائیس ساسانی بادشاہوں کی تصاویر

شبکہ کشی

تھیں جو کاغذ یا کپڑے پر تھیں اس کا ذکر حمزہ اصفہانی متوفی قریب ۱۰۰۰ھ نے اپنی کتاب سین ملوک الارض میں ساسانی بادشاہوں کے تحت میں بیان کیا ہے اور اس کی مفصل کیفیت بھی وہی ہے۔ لیکن اس شہر کی کئی کے ذریعہ بعض اوقات تاریخ اسلامی میں جھگڑے کا بھی کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ محمود غزنوی (۳۷۱-۴۵۱ھ) کے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ مصوری بالخصوص شبیہ کشی اعلیٰ معیار پر تھی۔ مشہور فلسفی اور حکیم ابو عیسیٰ محمود غزنوی کی ملازمت کو منظور نہیں کرتا تھا بلکہ گورکان بھاگ گیا تھا۔ سلطان نے اس کے مکان و محل کا پتہ لگانے کی غرض سے مصور ابو نصر ابن عرفان ریاضی دان اور سنجم کو ابن سینا کی شبیہ بنانے کی غرض سے مقرر کیا۔ کہ اس کی تصاویر کو کاغذ پر بنا کر گردہ نواح میں منتشر کیا جائے جو اس کو اس کے مطابق دیکھ پائے مطلع کئے اسی طرح سے بیشمار مثالیں تلاش سے مل سکتی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر مارٹن نے اپنی کتاب میں صلاح الدین ایوبی کی ایک تصویر دی ہے جو غالباً معاصرانہ حیثیت رکھتی ہے۔ مصور نے سلطان کو سنہری تخت پر دکھایا ہے لباس سرخ سر پر عمامہ سیاہی مائل ہے۔ چار زانو ہو کر بیٹھا ہے۔ آئینوں پر عایشہ ہے جسے طراز کہا جاتا ہے۔ سلطان کے سر کے گرد ایک سنہری ہالہ بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم متقدمین سے چلی آتی ہے کہ بادشاہوں کو یہ خصوصیت دی جاتی تھی دوسرے الفاظ میں "السلطان ظل اللہ" کا خطوط میں اظہار ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کی تجلیات و انوار نازل ہوتی تھیں۔ اگرچہ قدیم تصاویر حضرت مسیح میں بھی یہ ہالہ ملتا ہے مگر یہ تصویر اپنی نوعیت میں اول ہے جس میں کسی مسلمان مصور نے یہ ہالہ دکھایا ہے۔ حالانکہ چینی مصورین یا قدیم ایرانی مصورین سے نہ جانے ہالہ کے شعلہ نما بادل کے ٹکڑے سے دکھائے ہیں اور بعد میں سب نے اس ہالہ کی تقلید کی ہے۔ اس سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ واقعی صلاح الدین کی اصل تصویر ہے۔ مسٹر مارٹن نے اس تصویر کے ساتھ مراقش کے ایک حال ہی کے بزرگ ملاحظہ کی

تصویر بھی محض مقابلہ کی غرض سے دی ہے جس سے یہ ثابت کیا ہے کہ باوجود ان دونوں تصاویر میں آٹھ سو سال کا فاصلہ ہونے کے بھی اور مراقش و عرب کے مابین بکیرہ روم حامل ہونے کے بھی اپنے ظاہری لباس و اطوار میں ایسی معلوم ہوتی ہیں کہ دونوں کو مصور نے ایک ہی وقت میں بنایا ہے لیکن میرے نقطہ نگاہ سے یہ ہے کہ ابھی تک ہماری پودہ باش انہیں روایات پر قائم ہے سلطان صلاح الدین ایوبی کی اور تصاویر بھی ملتی ہیں لیکن وہ اصلی نہیں ہیں۔ اس تصویر سے سلاطین کا سریر سلطنت پر بیٹھنے کا طریق بھی معلوم ہوتا ہے۔ بعض دفعہ بعض ساسانی سلاطین بھی بعض نقوش میں اسی طرح نظر آتے ہیں مگر یہ امر مسلمہ ہے کہ عربی صنایع پر ایرانی اور بازنطینی اثر ہوا۔ اور عربوں نے جو کچھ پیدا کیا وہ خالصاً جدت لئے ہوئے ان سے متاثر شدہ تھا۔ ان کی قوت مدد کہ کو بالکل مفقود ہی نہیں سمجھنا چاہئے۔ جتنے وہ جنگجو تھے اتنے ہی فنون میں بھی ماہر تھے۔ جیسا کہ انہوں نے اپنی بہادری سے دنیا پر تسلط حاصل کیا تھا۔ اسی طرح انہوں نے فنون میں بھی سہولت پائی تھی۔ اس کے لئے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ شواہد تلاش کئے جائیں اسے محض نقادان فن ہی اندازہ کر سکتے ہیں۔ خاص کر صلاح الدین کی اس تصویر میں کس قدر اعلیٰ معیار شبیہ نگاری ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ مشرقی مصور آج کل کے یورپین مصورین کی طرح نہیں کرتے تھے کہ گھنٹوں روزانہ اپنے پیش نظر ایک شخص کو بٹھا کر تصویر بنائی جائے وہ اپنی یادداشت کی بنا پر اس کا خاکہ خطوں میں اتارتے تھے۔ جن میں وہ جذبات و کیفیات و عادات مصور شدہ شخص کے پنہاں کر دیتے تھے کیونکہ وہ اسے اسی نگاہ سے خطا کاتے وقت دیکھتے تھے جس طرح وہ ان سے اپنی روزانہ زندگی میں پیش آتا تھا۔ اور یہی بڑی خصوصیت مشرقی فن کی ہے جسے اب تک یورپ پیدا نہیں کر سکا۔ اگر کسی سلطان کی تصویر بنائی گئی تو اسے

یہی کرنا چاہئے کہ اس کے خدو خال کو قلمبند کر کے اس کے اہلی جذبات و حیات کو ظاہر کیا جائے جو اس پر ہر وقت اپنا اثر رکھتے ہیں۔ اور اس کے چہرے سے مترشح ہوتے ہیں جس سے اس کی اصلی حقیقت کا پتہ چل سکے اور یہی ایک مصوری کا مفقود و حید ہے جس سے بعض ماہرین تصاویر یا علم النفس شبیہ کو دیکھ کر لوگوں کی عادات و مزاج کا پتہ لگا لیتے ہیں جو اکثر اوقات ٹھیک ہوتا ہے اس لئے مصور نہایت ہی کامیاب ہے۔ کہ اس نے سلطان صلاح الدین ایوبی کی تصویر کو ایسی حالت میں بنایا ہے اور یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ مشرقی تصاویر بہ نسبت مغربی تصاویر کے زیادہ جامع اور مانع ہوتی ہیں۔ تاہم یہ تصویر اپنے آپ میں ایک وسیع تخیل رکھتی ہے حالانکہ مصور نے چند لمحات میں نہایت

استغراق کی حالت میں بنائی ہے۔ لیکن مسلمان قریب زوال دولت عباسیہ اپنے ہاں خالص اسلامی طرز فنون پیدا کر چکے تھے جن کو اسلامی کہا جاسکتا ہے۔ اور ان میں کسی قسم کا یار لظیفی یا چینی اثر وغیرہ نہیں رہا۔ یہ بات نہایت وضاحت سے ۱۹۳۱ء کی نمائش فنون ایران لندن نے قائم کر دی ہے۔ بلکہ بہت سے متذکرہ بالا ایشیائی فنون کے دیکھنے سے بھی یہ بات واضح نظر آتی ہے۔ بلاذری نے بیان کیا ہے کہ محمد بن قاسم کے سپاہیوں میں سے بنی کلاب کے کسی فرد نے داہر راہہ سلطان کو قتل کیا تو ان دونوں کو بروص میں اس کی تلک میں مصور کیا گیا اور بدیل بن ہنفہ کو قندیس میں مصور کیا۔ جب محمد بن قاسم کا انتقال ہوا تو اہل ہند روئے اور کیرج میں آپ کا مجسمہ بنایا۔

محمد عبداللہ چغتائی

ST

WV



مجید ملک

گورکھ دھندا (ایک ایکٹ کا ڈراما)

افراد

مسرخان - ایک خوبصورت عورت جو اس نام سے مشہور ہے۔
مسرخیدر - ایک نوجوان آدمی جس سے مسرخان محبت کرتی ہے۔
مسرخیر ہاشمی - مسرخیدر کی بیوی کا بڑا بھائی
مسرخ احمد - مسرخان کا ایک ملاقاتی
ملازم -

منظر — ڈرائنگ روم - مغربی انداز میں مزین - فرنیچر میں "کیوبزم" کی جھلک ہے۔ دروازوں کے سامنے دبیز پردے بل کھا کھا کے لٹکے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر سیزانی کی "نہانے والے" - پکاسو کی "بے جان زندگی" اور لیوناردو ڈوونچی کی "مونا لیزا" - مسند لیاں - گلدان جن میں پنیزی - ورینا اور مارشل نیل کے پھول ہیں - سگار کبس - ہاتھی دانت اور پتھر کے مجسمے اور مرا جیلاں - فوٹو البم - پیانو - سگریٹ کے ڈبے - راکھ گرانے کی طشتیاں - لیکن اس مغربی وضع کے کمرے میں مشرقی طرز زندگی کی ضروریات بھی موجود ہیں - مثلاً ایک طرف ایک تخت رکھا ہے جس پر اطلس کی مسند اور اطلس کا گھٹاؤ تکیہ ہے اور باجی چاندی کے اگالداں لٹکے ہیں - شمالی دروازے کا دبیز اور بل کھایا ہوا پردہ ہلتا ہے اور ایک لمبے کے بعد ایک عورت داخل ہوتی ہے - چھریا بدن - سفید رنگت — لیکن رنگت کی سفیدی میں اضافہ کرنے کے لئے پوڈر استعمال کیا گیا ہے — کشیدہ قد اور عمر کوئی ستائیس اٹھائیس سال - کچھ گا رہی ہے - لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آتے - آتش دان پر جو چیزیں رکھی ہیں ان کی ترتیب بدلتی ہے - پھر گلدانوں کے پھولوں سے چھڑچھاڑ کرتی ہے -

نوکر (خدمتگارانوں کی رسمی سفید وردی میں) داخل ہوتا ہے اور طشتی میں ایک ملاقاتی کا رڈ پیش کرتا ہے - مسرخان (خوبصورت - کشیدہ قامت عورت اسی نام سے پکاری جاتی ہے) - کارڈ کو دیکھ کر طشتی میں پھینک دیتی ہے -

مسخر خان — احمد صاحب سے کہ دو کہ میں اس وقت مشغول ہوں۔ پھر کسی وقت تشریف لائیں۔
 نوکر چلا جاتا ہے۔ مسخر خان پھر بچوں کو آرام کرنے میں مشغول ہو جاتی ہے۔ لیکن خدا جانے کیوں اب اس کی طبیعت اداس سی ہو گئی
 ہے۔ وہ بھی آواز میں کچھ گارہی ہے۔ در وناک سی طرز ہے۔ غالباً ہماگ میں ہے۔ جس گلدان میں پھول سجا رہی ہے۔ اس کے پاس
 ہی پیانو رکھا ہے۔ جسے کھول کے بجانا شروع کر دیتی ہے۔ پہلے یونہی آہستہ آہستہ۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد بلند آوازیں گانا شروع کر دیتی ہے۔
 کبھی وہ دن بھی تھے ہندم کہ میں بیاب ہو چکا
 خدا کی بارگہ میں التجا کرتا تھا رو رو کر
 کہ اے عرش بریں پہ بنے والے اپنی رحمت سے
 مجھے حوروں کی عفت دے ستارہ کی بلند سے
 اگر میں اپنے دل کا حال کہتا تھا دعاؤں میں
 تو معصومیتیں پرواز کرتی تھیں فضلوں میں
 ازل کے دن ملی تھی پاکبازی اس قدر مجھ کو
 مگر اس وقت میں ہوں اور دنیا کی بری باتیں
 خوشامد بھوٹ۔ چالاک۔ لگاوٹ۔ دور کی گھائیں
 دروغ مصالحت آمیز ظاہر کی رواداری
 تملق۔ بزدلانہ دور اندیشی۔ ریاکاری
 قبح آٹامیاں عفت فروشوں سے ملاقاتیں
 غرض حرص ہواؤں کے دن عیش کی راتیں
 مری قسمت نے رسوا کر دیا ہے کس قدر مجھ کو

نظم ختم ہو چکی ہے لیکن پیانو بھی بج رہا ہے۔ نوکر پھر داخل ہوتا ہے اور طشتی میں ایک کارڈ پیش کرتا ہے۔
 مسخر خان — (کارڈ دیکھ کر تعجب سے) مسٹر صغیر ہاشمی! یہ کیسے آئے؟ کو تو تشریف لے آئیں۔
 مسخر خان پیانو کے سامنے سے اٹھ کر پھر بچوں کو آرام کرنے لگتی ہے۔ مناسب وقفے کے بعد ایک آدمی کمرے میں داخل ہوتا ہے،
 مغربی لباس میں۔ خوش وضع۔ خوش شکل اور عنوان شباب میں۔

صغیر ہاشمی — آداب عرض۔ معاف کیجئے آپ مجھ سے واقف نہیں۔ میں —
 مسخر خان — آپ تشریف رکھئے۔ میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ بہت اچھی طرح۔ آپ کو کون نہیں جانتا۔ جاگیر دار سبیل مجرٹ
 بحلیٹیو اسمبلی کے ممبر۔ غالباً ٹائمز میں بھی آپ کی وہ تصویر —
 صغیر ہاشمی — یوں تو آپ میرا نام وغیرہ جانتی ہوگی۔ لیکن شاید آپ کو یہ علم نہیں کہ —
 مسخر خان — مجھے آپ کے متعلق سب کچھ معلوم ہے۔ مثلاً مجھے معلوم ہے کہ آپ مسز حیدر کے بھائی ہیں۔
 صغیر ہاشمی — جی ہاں۔ میں مسز حیدر کا بھائی ہوں۔ غمزدہ۔ آفت رسیدہ ثریا کا۔
 مسخر خان — کیوں کیوں خیریت تو ہے۔
 صغیر ہاشمی — میں اسی کے متعلق آپ سے گفتگو کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں بات کس طرح
 شروع کروں۔ میرا کام بہت مشکل ہے۔ آپ میری مدد کیجئے۔
 مسخر خان — کیئے۔ کیئے۔ میں غور سے سن رہی ہوں۔

صغیر ہاشمی۔ آپ وعدہ کیجئے کہ آپ مجھے معاف کر دیں گی۔ ممکن ہے مجھے چند ایسی باتیں کہنی پڑیں جن سے آپ کو تکلیف ہو۔ چھپنے والی۔ دل دکھانے والی باتیں۔ لیکن خدا کے لئے آپ مجھے معاف کر دیجئے گا میں سچ کہتا ہوں میرا مقصد یہ نہیں کہ آپ کو اذیت پہنچے لیکن جس موضوع پر میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے۔ میں ادب کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن مجبور ہوں۔ میں قطعاً مجبور ہوں۔

مسٹر خان — (چہرے پر گہرا ہٹ کے آثار ہیں لیکن مسکرنے کی کوشش کر رہی ہے) آپ مطمئن رہیں میں آپ کی بے ادبیوں کو آپ کی کم عمری پر محمول کر دوں گی۔

صغیر ہاشمی — مسٹر خان آپ اس قسم کی فقرہ بازی سے موضوع گفتگو کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی تعلیم کو اور عقلی حلا کو اور ان تکلفات کو جو عقل فزادوں کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں۔ تا اختتام گفتگو علیحدہ رکھ دیں۔ بھول جائیں۔ میرا یہاں آنا بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ میں نے تکلفات کا لباس اتار دیا ہے۔ جس طرح سانپ اپنی کینچلی اتار دیتا ہے۔ میری کینچلی باہر سڑک پر ہے۔ میں اس کمرے سے نکلوں گا تو پھر اُسے پن لوں گا۔ لیکن اس کمرے میں نہیں۔ اگر آپ نے تکلفات کی کینچلی نہ اتاری تو میری اور آپ کی گفتگو دو قدم بھی نہیں چل سکتی۔

مسٹر خان — فرمائیے۔ میں سب کچھ سننے کے لئے تیار ہوں۔ میں نے (ایک کھوکھلی ہنسی کے ساتھ) اپنی کینچلی اتار دی ہے۔ صغیر ہاشمی — مسٹر خان۔ میں آپ سے رحم مانگنے کے لئے آیا ہوں۔ آپ میری بہن پر رحم کیجئے۔ میری ننھی سی بہن پر جو راتوں کو سو نہیں سکتی۔ جو دن رو رو کر گزرتی ہے۔ جس کی زندگی سے آرام اور اطمینان مفقود ہو گیا ہے۔ جس کے دماغ پر حزن ویاس مسلط ہو گئے ہیں۔ جو گویا زندہ درگور ہے۔ آپ اس پر رحم کیجئے۔

مسٹر خان — کس طرح؟

صغیر ہاشمی — آپ جانتی ہیں کس طرح۔

مسٹر خان — مسٹر ہاشمی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کینچلی نہیں اتاری

صغیر ہاشمی — کیوں؟

مسٹر خان — اگر واقعی آپ کینچلی اتار چکے ہیں تو صاف صاف الفاظ میں کہئے نا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔

صغیر ہاشمی — بہت اچھا۔ مسٹر خان۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مسٹر حیدر سے اپنے تعلقات منقطع کر لیں۔ اور میری بہن کو اس کا جائز حق دے دیں۔

مسٹر خان — بس آپ کہ چکے؟

صغیر ہاشمی — جی ہاں۔

مسٹر خان — آپ کچھ اور تو نہیں کہنا چاہتے؟

صغیر ہاشمی — نہیں۔

مسٹر خان — تو میرا جواب سن لیجئے۔ میں مسٹر حیدر سے ”تعلقات منقطع کرنے“ سے انکار کرتی ہوں۔

صغیر ہاشمی — یہ نہ کہئے مسر خان۔ کیا آپ کے دل میں ایک دکھیا۔ ستم زدہ ننھی سی بچی کے لئے کوئی رحم نہیں۔ ثریا جس نے اتنی عمر میں کوئی غم۔ کوئی رنج۔ کوئی کلفت نہ دیکھی تھی۔ جو مصائب و آلام کی زندگی سے قطعی ناواقف تھی۔ آج وہ تڑپ رہی ہے۔ اس کی رنگت زرد ہے۔ مضمحل ہوئی جاتی ہے۔ اور مجھے خوف ہے کہ مر نہ جائے۔ آپ اس پر رحم کیجئے۔

مسر خان — مسر ہاشمی میرے لئے کس قدر آسان تھا کہ میں مسر حیدر کے اور اپنے تعلقات سے منکر ہو جاؤں۔ لیکن میں نے انکار نہیں کیا۔ مجھے انکار کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی۔ آپ کی بہن سے مجھے ہمدردی ضرور ہے۔ لیکن مجھے اپنی ذات کے ساتھ نسبتاً زیادہ ہمدردی ہے۔ یہ تھوڑی سی خود عرضی تو آپ کے نزدیک بھی جائز ہوگی۔ آخر میں آپ کی بہن کی خاطر قربانی کیوں کروں۔ اپنے آپ کو تکلیف میں کیوں ڈالوں۔ اور سینے۔ آپ اپنی بہن کی صحت کے متعلق متفکر نہ ہوں۔ آپ مرد لوگ ہم لوگوں کی سخت جانی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

صغیر ہاشمی — آپ اس کی تکلیف کا اندازہ نہیں لگا سکتیں + مسر خان — آپ کی برادرانہ محبت قابل ستائش ہے۔ لیکن یاد رکھئے۔ میرا بھی ایک بھائی ہے۔ مجھ سے بہت دور ہے۔ میرے اور اس کے درمیان ایک دنیا حامل ہے۔ لیکن اگر مجھے کوئی تکلیف پہنچے تو اسے اسی قدر تکلیف ہوتی ہے جتنی آپ کو اب ہو رہی ہے۔ اگر میرا بھائی آپ کی بہن کے پاس جا کر وہی کچھ کہے جو آپ نے مجھ سے کہا ہے۔ تو؟ اگر وہ کہے کہ میری بہن کی آسائش اور اس کے آرام کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ کی بہن اپنے شوہر سے علیحدہ ہو جائیں تو؟ مجھے ان دونوں باتوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ مسر حیدر پر آپ لوگوں نے دنیا کی محبت سچا اور کی ہے۔ مجھ پر بھی باپ اور ماں اور بھائی نے محبت سچا اور کی تھی۔ میں بھی ناز و نعم میں پلی تھی۔ میں بھی جذبات رکھتی ہوں۔ مجھے بھی کسی کی یاد ستا سکتی ہے۔ مجھے بھی جدائی سے تکلیف ہوتی ہے۔ میرے سینے میں بھی دل ہے۔ غم کھانے والا۔ رشک کرنے والا۔ رنج و اندوہ سے زخمی ہو جانے والا دل۔

صغیر ہاشمی — دیکھئے آپ نے کیونگی پھر بہن لی۔ یا شاید آپ اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہیں۔ میرا مقصد اذیت پہنچانا نہیں۔ لیکن واقعات کیا ہیں۔ میری بہن مسر حیدر کی منکوحہ بیوی ہے۔ اور اپنے دل کی ان اتھاہ گہرائیوں سے اپنے شوہر کے ساتھ محبت کرتی ہے جن سے فقط ایک نیک بی بی ہی کر سکتی ہے۔ میری بہن کی امیدوں کا مرکز۔ اس کے تخیلات کا منتہی۔ اس کے جذبات کا طغوان و اداوی اس کا شوہر ہے۔ آپ کو بھی مسر حیدر کے ساتھ ایک خاص قسم کی۔ ایک خاص حد تک محبت ہوگی۔ لیکن گستاخی معاف۔ خدا شاہد ہے میرا مقصد اذیت پہنچانا نہیں۔ آخر آپ کے تعلقات کی بنیاد تجارتی قسم کی ہے۔

مسر خان کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آخری جملے سے اسے سخت تکلیف پہنچی ہے۔ لیکن وہ ضبط کئے ہوئے

ہے۔

مسر خان — کیا مطلب؟

صغیر ہاشمی — میرا مطلب یہ ہے کہ آخر — میری جبارت کو ضرور معاف کر دیجئے — آپ اپنی محبت کو پہنچتی ہیں۔ اس کی قیمت وصول کرتی ہیں۔ مسر حیدر بھی ان دو یا تین یا چار یا پانچ آدمیوں میں سے ہیں جو — (معاذ اللہ! ایک طریقے سے)

اور میں اسی وقت دس ہزار روپے اس بات کے معاوضے میں دینے کے لئے تیار ہوں کہ آپ مسٹر حیدر کو چھوڑ دیں۔

مسرخان کا رنگ سرخ اور نیلا اور آخرزرد ہو گیا ہے۔ لیکن پھر اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا ہے۔

مسرخان — یہ بات قطعی طور پر غلط ہے۔ میرے اور مسٹر حیدر کے تعلقات میں کسی قسم کا تجارتی پن نہیں۔ میں نے اپنی محبت کو کم از کم مسٹر حیدر کے پاس کبھی نہیں بیچا۔ یہ گناہ فقط آپ کی بہن کرتی ہیں۔
صغیر ہاشمی — کیا مطلب؟

مسرخان — آپ کی بہن مسٹر حیدر کی منکوحہ بیوی ہیں۔ منکوحہ بیوی کسے کہتے ہیں؟ جو چند آدمیوں کے سامنے اپنی محبت اور اپنے جسم کو چند سو یا چند ہزار روپے کے عوض میں بیچ دے۔ آپ کی بہن کی پوزیشن یہی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے پاس چند ہزار روپے میں اور چند ہزار روپے کے زیور کپڑے میں بک چکی ہیں۔ آپ لوگوں نے انہیں بیچا۔ انہوں نے بکنا قبول کیا۔ ان کا مہر کیا تھا۔ پچیس ہزار؟ تیس ہزار؟ تو آپ ہی بتائیے کیا آپ کی بہن نے تیس ہزار روپے کے عوض اپنی محبت اور اپنے جسم کو مسٹر حیدر کے پاس نہیں بیچا۔ تجارتی پن آپ کی بہن اور مسٹر حیدر کے تعلقات میں ہے۔ میرے اور مسٹر حیدر کے تعلقات میں نہیں۔ میں مسٹر حیدر سے محبت کرتی ہوں۔ میں ان کے پاس نہیں رہتی۔ وہ میرے اخراجات کے کفیل نہیں۔ مجھے کوئی ماہانہ رقم ان سے نہیں ملتی۔ میرے کپڑوں کے بل وہ ادا نہیں کرتے۔ میرے نوکروں کو وہ تنخواہیں نہیں دیتے۔ میں خود اپنی مالک ہوں۔ میں اپنی محبت بیچتی نہیں۔ مفت ان کے قدموں میں پھینکتی ہوں۔ اندریں حالات تجارتی پن کن کے تعلقات میں ہے۔ میرے تعلقات میں یا آپ کی بہن کے تعلقات میں؟ کیا آپ کی بہن نے مسٹر حیدر کو دیکھ کر۔ ان کے لئے اپنے دل میں محبت محسوس کر کے۔ ان سے شادی کی تھی۔ یا بغیر دیکھے؟ محض اس لئے کہ بزرگوں کا فیصلہ یہی تھا۔ اور بزرگ؟ ظاہر ہے کہ بزرگوں کا فیصلہ محض۔ اسی بات پر مبنی تھا کہ ان کے نزدیک مسٹر حیدر مس ہاشمی کی اچھی قیمت ڈال سکتے تھے۔ میرے دل میں مسٹر حیدر کی محبت ہے۔ میں نے انہیں دیکھ کے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ کے۔ اچھی طرح دیکھ کے۔ ان سے محبت کی ہے۔ میرے تعلقات تجارتی نہیں۔ تجارتی تعلقات آپ کی بہن کے

ہیں۔
صغیر ہاشمی — میں اس قسم کی گفتگو نہیں سن سکتا۔

مسرخان — آپ کو سننی ہوگی۔ میں آپ کو سناؤنگی۔ آپ کو یہ حق کہاں سے حاصل ہو گیا۔ کہ جو کچھ آپ کے جی میں آئے آپ کہ دیں لیکن جو کچھ آپ کو سنا چاہئے وہ نہ سنیں۔ آپ کی بہن کی قیمت ہے۔ اس کی قیمت تیس ہزار روپے ہے۔ اور میں اسی وقت تیس ہزار روپے دینے کے لئے تیار ہوں۔ (ایک میز کے پاس جاکر دراز میں سے چک بک نکالتی ہے) آپ مسرخان سے کہئے کہ وہ مسٹر حیدر کو رہا کر دیں۔ مہر لے لیں۔ اپنی قیمت وصول کر لیں۔
صغیر ہاشمی — خاموش گسٹخ عورت۔

معلوم ہوتا ہے کہ صغیر ہاشمی یکدم آپے سے باہر ہو گیا ہے۔ وہ ہلک کر مسر خان کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں پوالہ ہے۔ مسر خان ابھی تک میز کے پاس کھڑی ہے۔ اس کے چہرے پر تعجب اور سر اسیمگی اور خوف ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس حرکت کے لئے تیار نہ تھی۔

صغیر ہاشمی — میں جان دینے سے نہیں ڈرتا اور جو جان دینے سے نہیں ڈرتا وہ جان لینے سے کیونکر ڈر سکتا ہے۔ میں اپنی ننھی بہن کی خاطر تمہاری جان لے کر اپنی جان قربان کر دوں گا۔ میں نے تمہیں ہر طرح سمجھایا ہے۔ تمہارے جذبہ شرافت کو اکسانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ چیز تمہارے پاس کہاں۔ میں نے تمہیں وہ شے بھی دینے پر آمادگی ظاہر کی ہے جس کو تم اور تمہاری قماش کے لوگ سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن میرے پاس اپنی خواہش پورا کرنے کا ایک ایسا طریقہ بھی ہے جو مجھے تم سے بے نیاز کرتا ہے۔ یاد رکھو اگر تم نے مسٹر جیدر کا پیچھا نہ چھوڑا تو —

مسر خان — تو —
صغیر ہاشمی — تو میں ابھی تمہیں ڈھیر کر دوں گا۔

مسر خان — یہ قطعی بات ہے؟

صغیر ہاشمی — قطعی

مسر خان — (کامل اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ) تو مسٹر ہاشمی آپ گولی چلائیے۔

مسر خان نے اطمینان سے میز پر ہاتھ ٹیک لئے ہیں اور ایک عجیب بے پرواہی کے انداز سے سینہ سپر کر دیا ہے۔
صغیر ہاشمی کا رنگ فق ہو گیا ہے۔ وہ بالکل گھبر گیا ہے۔ حیرت سے مسر خان کا منہ تک رہا ہے۔

مسر خان — مسٹر ہاشمی آپ فائر کیجئے میں تیار ہوں۔ (آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد) آپ فائر کیوں نہیں کرتے۔ کیا دیر ہے؟

صغیر ہاشمی — میں۔ میں —

مسر خان — ہاں آپ کیا۔ فائر کیجئے نا۔ کیوں نہیں کرتے؟ آپ کی بہن اور اس کے شوہر کے درمیان میں دیوار کی طرح حائل ہوں۔ آپ اس دیوار کو ہٹانے میں تاخیر نہ کیجئے۔ کیا آپ کو اپنی بہن سے محبت نہیں؟ فائر کیجئے مسٹر ہاشمی۔
صغیر ہاشمی — میں فائر نہیں کر دوں گا۔

مسر خان — (آنکھیں کھول دیتی ہے۔ اطمینان کا ایک لمبا سانس لیتی ہے۔ اب وہ مسکرا رہی ہے) مسٹر ہاشمی مجھے معلوم تھا آپ فائر نہیں کریں گے قطعی اور یقینی طور پر معلوم تھا۔ قاتلوں کی صورت آپ کی سی نہیں ہوتی۔ آپ جان دے سکتے ہیں۔ لیکن آپ جان لے نہیں سکتے۔ اس کے متعلق مجھے اسی وقت یقین ہو گیا تھا جب آپ مجھے لمبی لمبی دھکیاں دے رہے تھے — ورنہ غالباً

میں اتنی دلیری کے ساتھ آپ کے سامنے سینہ تان کے کھڑی نہ ہو سکتی۔

مسٹر ہاشمی — میں معافی مانگتا ہوں۔

مسرخان — میں معافی دیتی ہوں لیکن معافی مانگنا اور اس لئے معافی دینا غیر ضروری ہے۔ مسٹر ہاشمی! میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں۔ اگر میرا بھائی آپ کی بہن کے پاس جاتا۔ ریوالور لے کر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا تو کیا آپ کی بہن بھی اپنی محبت کی خاطر اسی قدر دلیری سے مرنے کے لئے تیار ہو جاتی؟ میں مانتی ہوں مجھے قریب قریب یقین تھا کہ آپ میں انسانی جان لینے کی اہلیت نہیں۔ لیکن اس کے باوجود — آخر آپ ریوالور لئے میرے سامنے کھڑے تھے۔ کیا آپ کی بہن انہی حالات میں اسی قدر ثابت قدم رہتی جس قدر میں رہی۔ اس سوال کا جواب مجھے نہ دیجئے۔ ایمانداری سے اپنے آپ کو دیجئے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ مسٹر حیدر کی محبت کا حقدار کون ہے۔

خدا جانے یہ گفتگو کیا کیا پہلو اختیار کرتی لیکن معاشرتی دروازے کے باہر آدمیوں کے بونے کی آوازیں آتی ہیں۔ پھر آہستہ سے کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ دبیز اور بل کھایا ہوا پردہ ہلتا ہے اور مسٹر حیدر داخل ہوتا ہے۔

مسٹر حیدر — اوہو۔ ہاشمی بھیا۔ آپ دنیا کے اس حصے میں کیونکر تشریف لے آئے؟

ظاہر ہے کہ مسٹر حیدر اس وقت اتفاقہ طور پر آگیا ہے۔ اور اسے یہاں کے بحث مباحثے کی کچھ خبر نہیں۔ وہ مسٹر ہاشمی کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر مسرخان کی طرف۔ دونوں کے چہرے سے عیاں ہے کہ کوئی غیر معمولی بات درپیش ہے۔ اس کی مسکراہٹ زیر لب ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اور وہ گھبراہٹ سے مسرخان کی طرف بڑھتا ہے۔ مسٹر ہاشمی مسرخان کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں رحم کی درخواست کر رہی ہیں۔ مسرخان اس درخواست کو دیکھتی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسے جو کچھ فیصلہ کرنا تھا کر چکی ہے۔

مسٹر حیدر — مسرخان خیریت تو ہے؟

مسرخان — نہیں۔

مسٹر حیدر — (انتہائی گھبراہٹ سے) کیوں۔ کیوں کیا ہوا؟

مسرخان — ان سے پوچھئے۔

مسٹر ہاشمی — اگر میری ذلت کی داستان بہر حال سنائی جائیگی تو آپ ہی سنائیے نا۔ میں تو شاید اپنی رعایت کر دوں۔

مسرخان — مسٹر ہاشمی چاہتے ہیں کہ میں ان کی بہن کی خاطر آپ سے ملنا چھوڑ دوں۔ ان کی بہن کا دل نازک سا ہے اس لئے وہ آپ کی جدائی برداشت نہیں کر سکتیں۔ اور میرا دل پتھر کا ہے اس لئے میں ٹکر سکتی ہوں۔

مسٹر حیدر تعجب اور کبیدگی سے مسٹر ہاشمی کی طرف دیکھتا ہے گویا فقط نگاہوں سے اس کی جسارت بلکہ حماقت پر تبصرہ کر رہا ہے۔ مسر خان خاموش ہے۔ شاید وہ چاہتی ہے کہ مسٹر حیدر ایک جملے سے کما حقہ متاثر ہوئے۔ پھر آگے چلے۔

مسر خان — مسٹر ہاشمی کا خیال ہے کہ میں آپ کے پاس اپنی محبت پہنچتی ہوں۔ یہ کہتے ہیں کہ آپ ان دو یا تین یا چار یا پانچ آدمیوں میں سے ایک ہیں جو میرے اخراجات کے کفیل ہیں۔ انہوں نے اپنا جملہ مکمل نہیں کیا تھا۔ لیکن ان کا مطلب یہی تھا۔ ٹھیک ہے نا مسٹر ہاشمی؟ دو یا تین یا چار یا پانچ آدمیوں میں سے ایک جو — جو کیا۔ جو میرے اخراجات کے کفیل ہیں۔ یہی مطلب تھا؟ یقیناً یہی مطلب تھا ورنہ آخر آپ مجھے دس ہزار روپے ”اسی وقت“ اس امر کے معاوضے میں دینے کے لئے کیوں تیار ہو جاتے کہ میں مسٹر حیدر کو چھوڑ دوں۔

مسٹر حیدر صغیر ہاشمی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ اور کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن صغیر ہاشمی۔ رنگ زرد۔ پیشانی پسینے میں تڑپ رہی۔ سر نیچا کئے۔ نگاہیں زمین پر گاڑے بے حس و حرکت کھڑا ہے۔ مسر خان جملہ ختم کرنے کے بعد پھر خاموش ہے۔ اور غالباً اندازہ لگا رہی ہے کہ اس گفتگو سے مسٹر حیدر کس حد تک متاثر ہوا ہے۔

مسر خان — اور جب میں نے انکار کر دیا۔ اور یہ مایوس ہو گئے۔ اور چونکہ یہ جان دینے سے نہیں ڈرتے اور ان کے نزدیک جو جان دینے سے نہیں ڈرتا وہ جان لینے سے بھی نہیں ڈرتا۔ اس لئے یہ ریوا اور نکال کر میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتی تو اس وقت وہ ریوا اور ان کے کوٹ کی دائیں جیب میں ہے۔ دائیں میں ہے مسٹر ہاشمی کہ بائیں میں؟ غالباً دائیں میں ہے۔ تو یہ ریوا اور نکال کر میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اور انہوں نے فرمایا کہ اگر تم میری بہن کے رستے میں حائل ہونے سے باز نہ آئیں تو — ”تو میں ابھی تمہیں ڈھیر کر دوں گا۔“ لیکن انہوں نے مجھے ڈھیر نہ کیا۔ حالانکہ میں بار بار ان سے کہتی رہی کہ آپ گولی چلائیں — یہ بیچس و حرکت کھڑے رہے۔ اس وقت سے اس وقت تک کھڑے ہیں۔ اوہو۔ میں کس قدر بدتمیز ہوں۔ مسٹر ہاشمی آپ تشریف رکھئے نا۔

صغیر ہاشمی بالکل کھویا ہوا۔ مہوت کھڑا ہے جیسے کوئی سکتے کے عالم میں ہو۔ اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا جاتا ہے وہ بیٹھ جاتا ہے۔ اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ہر سکوت بھی توڑتا ہے۔ لیکن اس کی نگاہیں زمین سے نہیں اٹھتیں۔

صغیر ہاشمی — مجھے معاف کر دیجئے۔ میں کیا سمجھ رہا تھا اور کیا ہو گیا۔
مسٹر حیدر — مجھے آپ سے یہ توقع نہ تھی۔
مسٹر ہاشمی — آپ ٹھیک کہتے ہیں۔

مسٹر جیدر — خیر جو آپ نے مناسب سمجھا آپ نے کر لیا۔ اب جو میں مناسب سمجھوں گا میں کروں گا۔

مسٹر ہاشمی — آپ کیا کریں گے؟

مسٹر جیدر — جو میرے جی میں آئے گا۔

مسٹر ہاشمی — (مضطرب ہو کر) آپ میرے گناہ کی سزا ثریا کو تو نہیں دیں گے؟

مسٹر جیدر — میں کسی کے گناہ کی سزا کسی کو نہیں دینا چاہتا۔

صغیر ہاشمی — پھر آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ خدا کے لئے مجھے بتا دیجئے۔ مجھ پر رحم کیجئے۔

مسٹر جیدر — کچھ بھی نہیں۔ میں وہی کروں گا۔ جس کا میں آج سے بہت پہلے فیصلہ کر چکا ہوں۔ میں ثریا سے ہمیشہ کے لئے جدا

ہو جاؤں گا۔

صغیر ہاشمی — (انتہائی کرب سے) نہیں۔ نہیں آخر اس کا قصور کیا ہے؟

مسٹر جیدر — (سزخان کی طرف اشارہ کر کے) اور ان کا کیا قصور تھا؟

صغیر ہاشمی — مجھے معاف کر دیجئے۔ قصور صرف میرا ہے۔ مجرم صرف میں ہوں۔

مسٹر جیدر — اس گفتگو کو جاری رکھنے سے کچھ حاصل نہیں۔

صغیر ہاشمی — بہت اچھا میں جاتا ہوں۔ (یکدم جوش سے) لیکن یاد رکھئے میں نے جو کچھ کیا محبت کی وجہ سے کیا اور محبت ایک

ایسا جرم ہے جو مرتے دم تک مجھ سے سرزد ہو گا۔ میں نے جو کچھ کیا اس لئے کیا کہ مجھے اپنی بہن سے محبت ہے۔ لیکن صرف یہی نہیں۔

میں نے اس لئے کیا کہ مجھے آپ سے محبت ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ اپنی جوانی اور اپنی عزت ایک ابر و باختہ اور خود غرض عورت کی خاطر

تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ سزخان خود غرض نہیں۔ باقی رہی ابر و بختی وہ چیز جو میرے نزدیک نہایت کا جو ہر اصلی ہے

تو آپ کے نزدیک غالباً اس چیز کی کوئی قدر نہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ آج گفتگو اور تجربے کے بعد میرے خیالات کی دنیا میں بھی پھل سیڑج

گئی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا سمجھوں۔ ایک طرف وہ ایڈیٹل ہیں جو انسانی زندگی کا نچوڑ سمجھے جاتے ہیں اور جن کو صدیوں کے

تجربے نے صحیح ثابت کیا ہے۔ دوسری طرف وہ منطق ہے جو آج میرے سامنے سزخان نے پیش کی ہے۔ اور جس کا جواب ممکن نہیں۔ شاید

زندگی اسی شے کا نام ہے۔ یقیناً زندگی اسی بھیا نک گورکھ دھندے کا نام ہے ورنہ آخر مجھے کیوں یہ خیال آیا۔ میں کیوں اس خیال سے بیتاب

ہو گیا کہ میں یہاں آؤں اور منت سماجت سے یا روپے دے کر سزخان کو آپ سے علیحدہ کر دوں۔ بعد میں جو کچھ ہوگا کیوں ہوا۔

ریو اور کیوں نکلے۔ سزخان مرنے کے لئے کیوں آمادہ ہو گئیں۔ میں انہیں مار کیوں نہ سکا۔ آپ عین وقت پر کیوں آ گئے۔ اور پھر قیامت

یہ ہے کہ یہ بھیا نک۔ گناؤں کا کھیل یہاں کھیل گیا۔ اس کی سزا اس کھیل کے شروع کرنے والے کو ملنی چاہئے تھی۔ لیکن اس کی سزا ایک

نفی سی سچی کو ملے گی جسے خبر بھی نہیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔

مسٹر جیدر — (متاثر ہو کر) میں سزا نہیں دینا چاہتا۔

صغیر ہاشمی — میں مان لیتا ہوں کہ آپ کا مقصد سزا دینا نہیں۔ لیکن نتیجہ بہر حال وہی ہے۔ سزا بہر حال ثریا کو ملے گی۔

جو یہاں موجود نہیں۔ جسے اتنا بھی معلوم نہیں کہ اس کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا ہے۔ خدا جانے اس وقت وہ کیا سوچ رہی ہے۔ ممکن ہے

اس وقت وہ ایک پرمسرت زندگی کے خواب دیکھ رہی ہو۔ ممکن ہے۔ اس وقت۔ عین اس وقت وہ اپنے تصور میں آپ کو مسر خان سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہوتے دیکھ رہی ہو۔ بھائی جان۔ خدا جانے ثریا آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ خدا جانے وہ کوئی ایسی بات کہنے جس سے آپ اپنا فیصلہ بدل دینے پر مجبور ہو جائیں۔ جب میں یہاں آیا تھا میں اور آدمی تھا۔ اب میں اور آدمی ہوں۔ جن باتوں کو میں مسلمات میں شمار کرتا تھا۔ وہ اب غیر مسلمہ ہیں۔ وہ اب غیر مسلمہ ہی نہیں بلکہ ان کے برعکس باتیں مسلمات معلوم ہوتی ہیں۔ آپ ایک مرتبہ ثریا سے مل تو لیجئے۔ اس سے کہ تو دیجئے کہ آپ کیا کرنے والے ہیں۔ اس کے دل میں یہ حسرت تو نہ رہ جائے کہ —

مسٹر حیدر — میں ان سے ملنا نہیں چاہتا۔ مجھے ان سے مل کے تکلیف ہوگی۔

مسٹر ہاشمی — وہ اس نفرت کی مستحق تو نہیں۔

مسٹر حیدر — نہ ملنے کی وجہ نفرت نہیں (ذرا چمک کر) مجھے ثریا سے نفرت نہیں۔

مسٹر ہاشمی — پھر آپ اس کے پاس جانے سے کیوں انکار کرتے ہیں؟

مسٹر حیدر — اس لئے کہ مجھے اس سے مل کے تکلیف ہوگی۔

صغیر ہاشمی — (اُسے تائیدی میں پہلی مرتبہ کچھ روشنی سی نظر آتی ہے) تو مسٹر حیدر میں ثریا کو یہاں لاؤنگا۔ میں ابھی اسے یہاں لاتا ہوں۔ آپ خود اس سے کہ دیجئے۔ اپنی زبان سے کہ دیجئے کہ آپ ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو رہے ہیں۔ (مشرقی دروازے سے باہر چلا جاتا ہے)

مسٹر حیدر — یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ (مسر خان سے) میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ میں ثریا کے ساتھ آنکھیں نہیں ملا سکتا میں اپنے منہ سے نہیں کہہ سکتا کہ —

مسر خان — آپ جانے کی تکلیف نہ کیجئے۔ مسر حیدر یہاں نہیں آئینگے۔

مسٹر حیدر — کیوں؟

مسر خان — بس نہیں آئینگے۔

مسٹر حیدر — یقین ہے آپ کو؟

مسر خان — پکا یقین۔

مسٹر حیدر — لیکن کیوں۔ خودی مانع ہوگی؟

مسر خان — نہیں غرور اور خودی کی بات نہیں۔

مسٹر حیدر — کیونکہ اگر خودی کی بات ہے۔ تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ چیز نہ ثریا میں ہے۔ نہ صغیر میں۔ بلکہ ان کے خاندان کے کسی رکن میں بھی نہیں۔ غرور اور خودی کی غیر موجودگی ایک خوبی ہے۔ لیکن ان لوگوں میں یہ خوبی عیب کی حد تک پہنچ گئی ہے بعض اوقات تو مجھے شبہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں احساس خودداری کی بھی کمی ہے۔

مسر خان — نہیں محبت کی فراوانی ہے۔ کم سے کم مسٹر صغیر ہاشمی تو سر سے لے کر پاؤں تک محبت ہیں۔

مسٹر حیدر — جو سر سے پاؤں تک محبت ہو وہ کسی پر ریوا لور نہیں اٹھا سکتا۔
 مسر خان — اٹھا سکتا ہے لیکن چلا نہیں سکتا۔ اور مسٹر صغیر ہاشمی نہیں چلا سکے۔
 مسٹر حیدر — اگر وہ فائر کر دیتا !
 مسر خان — ناممکن تھا۔ آپ کو شش کر کے اپنے دل پر خوف وارد نہ کیجے۔

ظاہر ہے کہ مسر خان اراداً اپنے خطرے کو کم کر کے دکھا رہی ہے۔ دونوں خاموش ہو جاتے ہیں اور کافی دیر تک
 خاموش رہتے ہیں.....

مسٹر حیدر — آپ کیا سوچ رہی ہیں ؟
 مسر خان — اور آپ کیا سوچ رہے ہیں ؟
 مسٹر حیدر — کچھ نہیں۔
 مسر خان — آخر ؟
 مسٹر حیدر — میں سوچ رہا ہوں کہ اگر ثریا آگئی تو میں کیا کرونگا۔
 مسر خان — میں سوچ رہی ہوں کہ اگر وہ نہ آئیں۔ اور وہ یقیناً نہیں آئیں گی تو آپ کیا کریں گے۔
 مسٹر حیدر — کیا مطلب ؟
 مسر خان — مطلب کچھ ایسا پیچیدہ نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ مسر حیدر بیاں نہیں آئیں گی۔
 مسٹر حیدر — لیکن کیوں ؟
 مسر خان — یہ آپ کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ ایسی باتیں فقط ہم لوگ سمجھ سکتے ہیں۔
 مسٹر حیدر — ”ہم لوگ“ کون ؟
 مسر خان — عورت لوگ۔ اگر آپ عورت ہوتے تو آپ بھی سمجھ لیتے۔
 مسٹر حیدر — (ہنس کر) اس قسم کے علم النفس کا میں قائل نہیں۔
 مسر خان — آپ کیونکر ہو سکتے ہیں۔

..... خاموشی

مسز خان — (معاً) آپ گاتے کیوں نہیں ؟
 مسز حیدر — (تعجب سے) کیا مطلب ؟
 مسز خان — کچھ گائیے نا۔
 مسز حیدر — کیا خوب وقت نکالا ہے آپ نے گانے کا۔
 مسز خان — اس سے بہتر وقت کیا ہوگا۔
 مسز حیدر — کیا خوبی ہے اس وقت میں ؟
 مسز خان — اور برائی کیا ہے ؟
 مسز حیدر — معاف کیجئے میں تو اس وقت گان نہیں سکتا۔

..... خاموشی

مسز خان — آپ کیا سوچ رہے ہیں ؟
 مسز حیدر — میں الفاظ سوچ رہا ہوں۔ اس تحریر کے جو میں آج ٹریا کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں۔

کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ مسز صغیر ہاشمی داخل ہوتا ہے۔ اکیلا ہے۔

مسز خان — مسز حیدر نہیں آئیں ؟
 صغیر ہاشمی — نہیں وہ نہیں آئیں۔ (مسز حیدر سے) یہ خط دیا ہے۔

مسز حیدر خط پڑھ رہا ہے۔ اور اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو رہا ہے۔ وہ بالکل زرد ہو گیا ہے۔ خط ختم کر کے وہ ہاتھوں پہ ماتھائیٹک کے بیٹھ جاتا ہے۔

مسز خان — مسز حیدر میں چاہتی ہوں کہ آپ یہ خط بلند آواز سے پڑھیں۔
 مسز حیدر — کیوں ؟

مسز خان — مسز حیدر آپ کو یہ خط بلند آواز سے پڑھنا ہوگا۔ میں یہ خط سننا چاہتی ہوں۔
 مسز حیدر — (مسز حیدر بلند آواز سے خط پڑھتا ہے) میرے مالک مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ آج میری قیمت کا

فیصلہ کرنے والے ہیں۔ یا شاید کر چکے ہیں۔ آپ جو کچھ کرنے والے ہیں یا جو کچھ کر چکے ہیں۔ میرے نزدیک وہی صحیح ہے جس دن سے میں آپ کے ساتھ وابستہ ہوں۔ اس دن سے لے کر آج تک میں نے اپنی زندگی کا مقصد یہی سمجھا ہے کہ میں آپ کے لئے موجب راحت بنوں۔ لیکن یہ سعادت میری قسمت میں نہ تھی۔ اب میرا فرض یہی ہے کہ میں آپ کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ میں مٹ جانے کے لئے بالکل تیار ہوں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں کبھی آپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش بھی نہیں کروں گی۔ آپ میرا نام بھی نہیں سنیں گے۔ مرنا بہت آسان ہے لیکن میں مرنا نہیں چاہتی۔ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ میں اسی دنیا میں رہنا چاہتی ہوں جس دنیا میں آپ ہیں۔ میں اس دنیا میں آپ کی کامیابیاں اور مسرتیں دیکھنے کے لئے رہنا چاہتی ہوں۔ میں آپ کی مسرتوں میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔ میں آپ کی کامیابیاں دور سے دیکھوں گی۔ بہت دور سے۔ لیکن آپ کی کامیابیاں میری کامیابیاں ہوں گی۔

میری حسرت تھی کہ بہر حال میں آپ کے دامن کے ساتھ وابستہ رہوں۔ لیکن میرے مالک یہ بھی نہ سہی۔ اگر آپ کی خواہش یہی ہے کہ آپ مجھے اپنے نام سے بھی محروم کر دیں تو میری بھی یہی خواہش ہے۔ اور اس سے فرق بھی کیا پڑیگا۔ میں بہر حال آپ کی ہوں اور آپ بہر حال میرے نہیں۔ میں اب بھی آپ کی ہوں اور اُس حالت میں بھی آپ ہی کی رہوں گی۔ آپ اُس حالت میں بھی میرے نہیں ہونگے لیکن اب بھی میرے نہیں۔ خدا آپ کو اور مسر خان کو شاد و با مراد رکھے۔ خدا زندگیاں دراز کرے۔ خدا آپ کو کامیابیاں دے۔ مسرتیں دے۔ خدا آپ پر اپنی رحمتیں بکھار کرے۔

مستر حیدر خط پڑھ رہا تھا تو اس کی آواز میں لرزش سی تھی۔ مسٹر ہاشمی نے غالباً آنسو چھپانے کے لئے منہ دوسری سمت پھیر لیا ہے۔ مسر خان کسی گری سوچ میں ہے۔ کچھ دیر تک سب خاموش رہتے ہیں۔ آخر مسر خان کرسی چھوڑ کے اس انداز سے کھڑی ہو جاتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہ کوئی قطعی فیصلہ کر چکی ہے۔

مسر خان — (مستر حیدر کی جانب ہاتھ بڑھا کر) خدا حافظ !

مستر حیدر اس خدا حافظ کا مطلب نہیں سمجھا۔ وہ متفہم نہ ہوا۔ مسر خان کی طرف دیکھتا ہے۔ لیکن مسر خان کا بڑھا ہوا ہاتھ دیکھ کر وہ بھی عادت کے مطابق ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔

مسر خان — (ہاتھ ملا کر) خدا حافظ۔ آپ مسر حیدر کے پاس جایئے۔ آپ ان کے ہیں۔ آپ میرے نہیں۔

مستر حیدر کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن مسر خان سلسلہ گفتگو جاری رکھتی ہے۔

مسر خان — آپ میرے لئے نہیں۔ میں آپ کے لئے نہیں۔ آپ — ننھی ثریا کے پاس جایئے۔

..... (آہستہ آہستہ رک رک کر) میں آپ سے محبت کرتی ہوں اور شاید آپ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں لیکن مسز حیدر کے

دل میں جو محبت ہے —————
مسز حیدر ————— آپ جانتی ہیں مجھے محبت کس سے ہے۔ لیکن آپ درست کہتی ہیں۔

مسز خان ————— خدا حافظ !
مسز حیدر ————— خدا حافظ ! (چلا جاتا ہے)

مسز خان ————— مسز ہاشمی۔ میں دو چار روز میں ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلی جاؤں گی۔ آپ لوگ کبھی میری صورت نہیں دیکھیں گے۔ لیکن جانے سے پیشتر میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ دنیا کی حقیر ہستیوں کو۔ میرا مطلب ہے ان ہستیوں کو جنہیں دنیا حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ آپ حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھا کیجے۔ اگر آپ سے لوگ بھی افتادگانِ دہر کو حقیر سمجھیں تو خدا کی اس مخلوق کا سینہ شق ہو جاتا ہے۔ زندگی ایک بھیانک گورکھ دھندا ہے۔ یہ آپ کے لفظ ہیں۔ ایک بھیانک گورکھ دھندا۔ لیکن یہ گورکھ دھندا کس قدر بھیانک ہے۔ اس کا اندازہ آپ کبھی نہیں لگا سکتے۔ یہ میں جانتی ہوں۔ یہ میں ہی جانتی ہوں جو اس گورکھ دھند کے بچوں میں پھنسی ہوئی ہوں۔

صغیر ہاشمی ————— مجھے معاف کر دیجئے۔
مسز خان ————— (ہنس کر) اس کی ضرورت نہیں۔ خدا حافظ
صغیر ہاشمی ————— خدا حافظ (جاتا ہے)

کیا مسز خان رو رہی ہے ؟ وہ ایک بڑی کرسی پر اوندھے منہ پڑی ہے۔ لیکن نہیں وہ رو نہیں رہی۔ اب وہ اٹھی ہے اور پیانو کے سلمے جا بیٹھی ہے۔

مسز خان ————— (گاتی ہے)

اے خدا اے جہاں کے خالق	اے زمین۔ آسمان کے خالق
یہ ترا شاہکار کچھ بھی نہیں	دہرنا پائدار کچھ بھی نہیں
اس میں جو ہے اداس رہتا ہے	ہمہ تن رنج و یاس رہتا ہے
دل کے غنچے کبھی نہیں کھلتے	گل و بلبل کبھی نہیں ملتے
آرزو نامرام رہتی ہے	جس جو تشنہ کام رہتی ہے
دل کی دنیا عجیب دنیا ہے	تیرے فردوس سے بھی اعلیٰ ہے
اس میں ہر دم بہار رہتی ہے	شانِ صد لالہ زار رہتی ہے

نخل ملتے ہیں پھول کھلتے ہیں گل ڈبل پٹ کے ملتے ہیں
 آرزو مدعا سے ملتی ہے جستجو منتہی سے ملتی ہے
 وقت نعموں کا اک تسلسل ہے جو صدا ہے صدائے بلبل ہے
 مبتذل ساز باز سے بالا ہوس و حرص و آرزو سے بالا
 دل کی دنیا عجیب دنیا ہے
 تیرے فردوس سے بھی اعلیٰ ہے

نوکر داخل ہوتا ہے۔ اور طشتی میں ایک کارڈ پیش کرتا ہے۔

مسز خان — احمد صاحب ہیں۔ فوراً بلا لاؤ۔۔۔ (احمد داخل ہوتا ہے تو مسز خان گارہی ہے۔ " دل کی دنیا عجیب دنیا ہے تیرے فردوس سے بھی اعلیٰ ہے ")

احمد — کس کے فردوس سے ؟
 مسز خان — (ہنس کر) تیرے فردوس سے ۔
 احمد — میرا فردوس تو یہی مکان ہے ۔
 مسز خان — ظاہر ہے اس سے تو بہت اعلیٰ ہے ۔
 احمد — کیا ؟
 مسز خان — دل کی دنیا جس میں کینچی پہننے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔
 احمد — کیا مطلب ؟
 مسز خان — سانپ کی ایک کینچی ہوتی ہے نا ۔ جسے وہ کبھی اتار دیتا ہے ۔ کبھی پہن لیتا ہے ۔
 احمد — پہنتا دہنتا نہیں ۔
 مسز خان — نہیں پہنتا ! تو پھر یہ صرف ہمارا کمال ہے کہ ہم کینچی پہن بھی لیتے ہیں اور اتار بھی دیتے ہیں ۔
 احمد — کیا باتیں کر رہی ہیں آپ آج ۔
 مسز خان — (کھلکھلا کر ہنستی ہے) آج میں بہت خوش ہوں بہت ہی خوش ہوں ۔

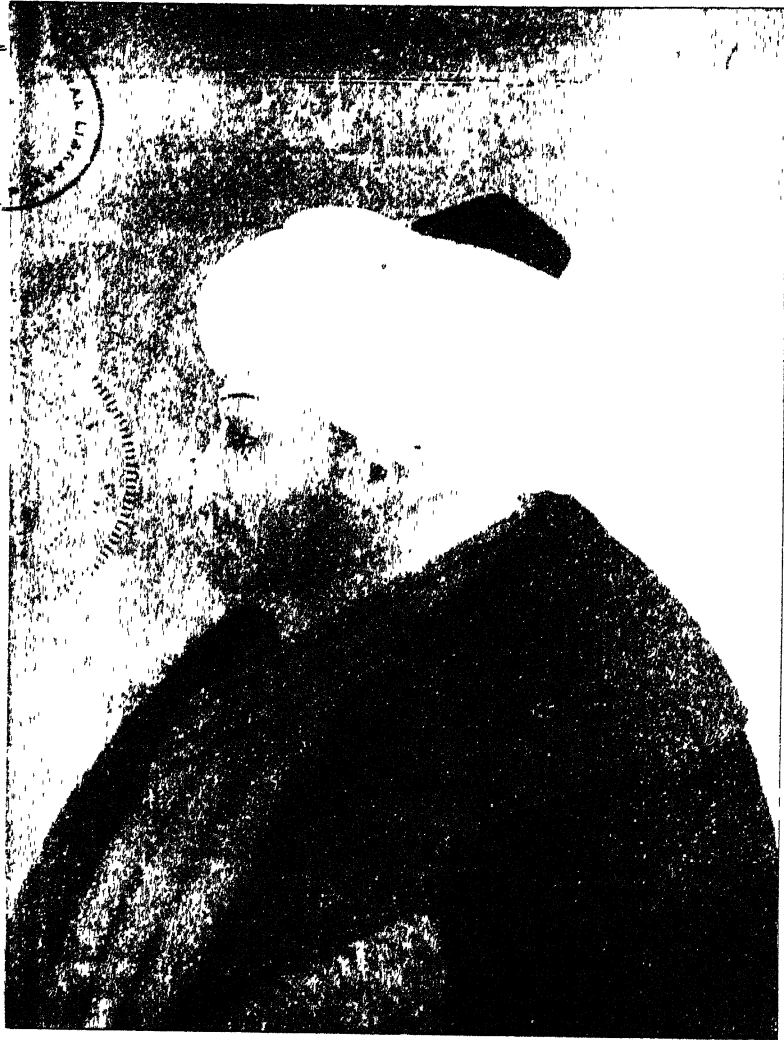
مجید ملک

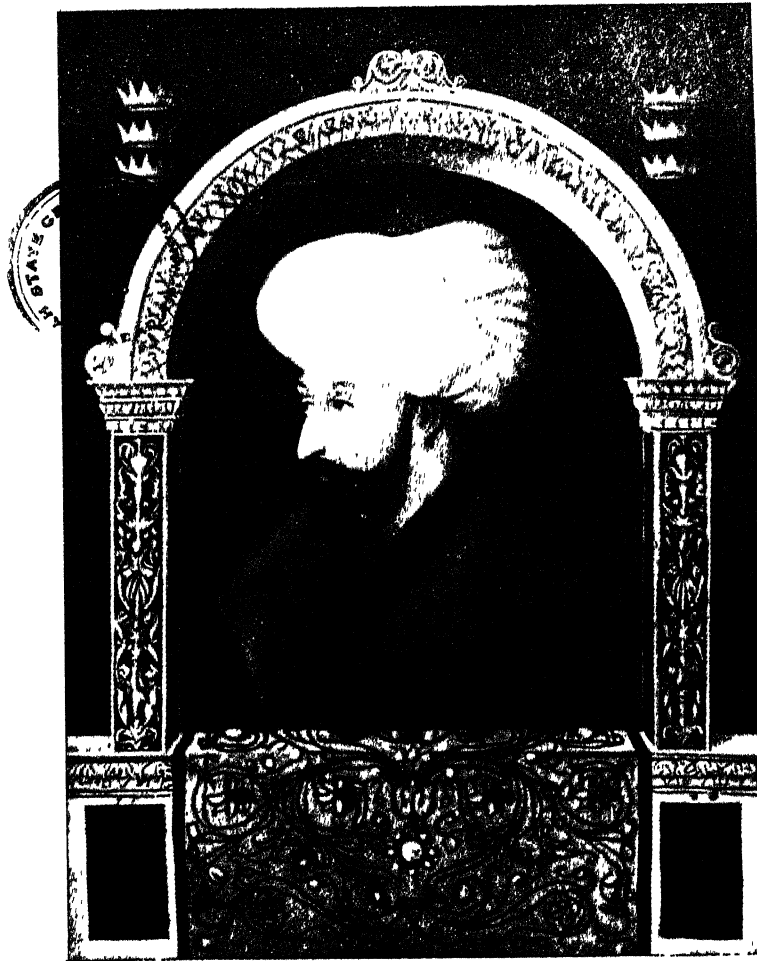
ڈراپ

تاثیر تاثرات

میری فائیں یاد کرو گے روؤ گے فریاد کرو گے
مجھ کو تو برباد کیا ہے اور کسے برباد کرو گے
ہم بھی ہسینگے تم پر اک ن تم بھی کبھی فریاد کرو گے
محفل کی محفل ہے غمگیں کس کس کا دل شاد کرو گے
دشمن تک کو بھول گئے ہو مجھ کو تم کیوں یاد کرو گے
ختم ہوئی دشنام طرازی یا کچھ اور ارشاد کرو گے
جا کر بھی ناشاد کیا تھا آ کر بھی ناشاد کرو گے
چھوڑ دو بھی تاثیر کی باتیں کب تک اس کو یاد کرو گے

محمدین تاثیر







محمد عبداللہ جغتائی جسٹاٹل بلینی

یہ دونوں بھائی ونیس میں گریٹ کونسل کے ہال میں ایسی تصاویر بنانے کے لئے منتخب ہوئے۔ جو خصوصیت سے ونیس شہر کی شان و شوکت عیاں کریں۔ مثلاً کارناہما نے جنگ اور ونیس کے بہادروں کا ایشارہ وغیرہ۔ چنانچہ انہوں نے ایسی تصاویر بنائیں جن کی طرف نگاہیں بھی اور دل و دماغ بھی متوجہ ہوتے تھے۔ اس کام کو انہوں نے ۱۷۸۷ء میں شروع کیا۔ جب ۱۷۹۷ء میں چھوٹے بھائی جسٹاٹل بلینی کو قسطنطنیہ جانے کا اتفاق ہوا۔ تو گیوانی اس کام کو ہدایت کرتا رہا۔ افسوس ہے۔ کہ یہ تصاویر ۱۷۹۷ء میں ضائع ہو گئیں۔ ان دونوں بھائیوں نے ان کے علاوہ بہت سی شبیہات ونیس کے حکام کی بنائی تھیں۔ گیوانی کے کام کے بعض نمونے بواسطہ سفیر ونیس قسطنطنیہ پہنچے۔ اور سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کی نظر سے گزرے۔ جو ان کو دیکھ کر بہت متاثر و متعجب ہوا۔ سلطان محمد ثانی (فاتح قسطنطنیہ) نے ۲۳ سال کی عمر میں قسطنطنیہ کو فتح کیا۔ وہ اعلیٰ پایہ کا شاعر تھا۔ اور دیگر فنون لطیفہ سے خاصی دلچسپی رکھتا تھا۔ اگرچہ یورپین مورخین نے دل کھول کر ترکوں کے خلاف زہر اگلا ہے۔ مگر جسٹاٹل بلینی کے ضمن میں مشہور اطالوی مصور معمار و مصنف دیزاری (۱۵۶۹-۱۵۱۱ء) نے جو الفاظ اپنے تذکرے میں لکھے ہیں۔ وہ قابل غور ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔ کہ باوجودیکہ مصوری ترکوں کے ہاں ممنوع تھی۔ تاہم سلطان نے تحفہ تصاویر کو بطیب خاطر قبول کیا۔ اور مصور کی بے حد تعریف کی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ مصور کو قسطنطنیہ میں آنے کی دعوت دی۔ ونیس کی سینٹ نے فیصلہ کیا۔

جس شخص نے کبھی ونیس کی تنگ و تاریک گلیوں میں گنڈولہ میں بیٹھ کر سیر کی ہے۔ اس کو ان گلی کوچوں پر ”سٹراڈا ڈی گیوانی“ یا ”وایا ڈی بلینی“ یا ”سٹراڈا جسٹاٹل بلینی“ لکھے نظر آئیں گے۔ یہ گلی کوپے قدیم بزرگوں کے اسماء پر ہیں۔ آفریں ہے ان پرچہموں نے اپنے بزرگوں کے کارناموں کو ابھی تک محض تاریخ کے اوراق پر یا تصاویر ہی میں زندہ نہیں رکھا۔ بلکہ جہاں جہاں وہ سکونت پذیر تھے۔ ان جگہوں کو بھی ان کے ناموں پر آباد رکھا ہے جیسٹاٹل بلینی بھی ونیس کا باشندہ تھا۔ جو ۱۷۲۷ء میں پیدا ہوا۔ اس کا والد جاکوپو (یعقوب) اور اس کے اباؤ اجداد وہیں رہتے تھے۔ اس کا بڑا بھائی گیوانی بلینی بھی ونیس ہی میں ۱۷۱۸ء میں پیدا ہوا۔ اگرچہ ان کا آبائی پیشہ مصوری تھا۔ مگر کچھ زیادہ اچھی حالت میں رہتے۔ اور بہت غیر معروف تھے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے مصوری میں کمال پیدا کیا۔ اور ونیس کے سینٹ کی توجہ ان کی طرف منعطف ہوئی۔ انہوں نے ونیس کی تاریخ کو چار چاند لگا دئے۔ اگر آج ان کے ذکر کو اطالوی مصوری کی تاریخ اور سیاسی تاریخ سے حذف کر دیا جائے۔ تو ایک بہت بڑی کمی پیدا ہو جائے۔

یہ دونوں بھائی الگ الگ محاکموں میں رہتے تھے۔ لیکن آپس میں بیحد محبت تھی۔ اور ایک دوسرے کی عزت و تکریم کرتے تھے۔ باپ کے متواضع تھے۔ ایشارہ کے مالک تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی۔ کہ ایک دوسرے سے اپنے آپ کو کم تصور کرتے تھے۔ ان کی یہ خوبی سب کے دلوں میں گھر کئے ہوئے تھی۔ اور یہی آخر میں ان کے لئے اعلیٰ مرتبے کے حصول کا باعث ہوئی۔

کیا۔ بعد ازاں وہ ”ڈوج“ (حاکم ونیس) اور سینٹ کے سامنے سلام کے لئے حاضر ہوا۔ اس سے عزت و تکریم کا سلوک کیا گیا۔ اس نے سلطان کا وہ مکتوب بھی ان کے سامنے پیش کیا جس سے متاثر ہو کر سینٹ نے دوسو کراؤن سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ جو اس کو تاحیات ملتا رہا۔ وہ ۱۶۸۱ء کے ابتدا میں واپس آگیا تھا۔ اور اس کا انتقال ۱۶۸۶ء میں ہوا۔ مگر اس نے اس عرصے میں بہت کم تصاویر بنائیں۔ اور اسی سال کی عمر میں اس دار فانی سے رخصت ہوا۔ اور اپنے بھائی گیونی کے ہاتھوں سنٹ گیونی پاؤلو میں دفن ہوا۔ اور ۱۶۸۶ء میں مٹی کے مینے میں سلطان محمد کا وصال ہوا۔ جب وہ اٹلی کی فتح کی تیاریاں کر رہا تھا اطالوی مصوری میں یہ وہ زمانہ تھا۔ جسے مورخین دور احیاء

(RENAISSANCE) کہتے ہیں۔ ان مصورین

نے خصوصیت سے اشاعت عیسائیت میں مدد کی۔ جو صدیوں میں نہیں ہوئی تھی۔ جنٹائل کے کام پر قیام قسطنطنیہ سے مشرقیت کا بہت اثر ہوا۔ جو اس کی بعد کی تصاویر سے واضح ہے۔ مثلاً ”سینٹ مار کو پریچنگ ایٹ الیگنڈریا“ جو اس وقت میلڈن کی گیلری میں ہے۔ اور ”ایڈ بیریشن آف دی میگی“ جو لندن کی نیشنل گیلری میں ہے ان تصاویر میں ترکی امر کی تصاویر بھی نظر آتی ہیں۔ جو اپنے لمبے لمبے چغول اور گنبد نما عمارتوں سے عیاں ہیں۔ جنٹائل کا یہ اثر اس کے بعد کی اطالوی مصوری پر بھی ہوا۔ جو پاؤلو ویرونیز وغیرہ کے کام سے واضح ہے۔ مثلاً اس کی ”ایک دعوت کی تصویر ہے۔ اور یورپی تصاویر بھی ہیں۔ جن میں مشرقی اثر نظر آئے گا۔

ویراڈی کے بیان سے واضح ہو چکا ہے۔ کہ جنٹائل نے سلطان کی تصویر بنائی۔ جس سے وہ خوش ہوا۔ ”پاولو گیا ولو“ جو تاریخ ترکی سے دلچسپی رکھتا تھا۔ بیان کرتا ہے۔ کہ دو تصاویر عجائب خانہ کو (com) میں تھیں۔ جو اطالیہ میں جھیل لمبارڈی کے کنارے واقع تھا۔ ان تصاویر کے متعلق وہ بیان کرتا ہے۔ کہ ان میں سے ایک ضرور جنٹائل کی بنائی ہوئی ہے جس کو اس نے سلطان کے سامنے پیش کرنا یا تھا

کہ جنٹائل کا بھائی گیونی عمر رسیدہ ہے۔ صحت پر داشت نہیں کر سکتا۔ علاوہ انہیں اس وقت وہ گریٹ کونسل کے ہال میں تصاویر بنانے میں مصروف تھا۔ اس لئے چھوٹے بھائی جنٹائل بلینی کو بھیجا جائے چنانچہ اس کو قسطنطنیہ پہنچایا گیا۔ اور وہ سفیر کی وساطت سے سلطان کے روبرو پیش ہوا۔ سلطان بہت عزت و تکریم سے پیش آیا۔ جنٹائل نے اپنے کام کا ایک نمونہ سلطان کے سامنے پیش کیا۔ جسے اس نے بہت پسند کیا۔ اپنے مختصر عرصہ قیام میں بلینی نے سلطان کی شبیہ تیار کی۔ جو اس نیک نما و ترک کے لئے گویا ایک معجزہ تھی۔ سلطان اس قدر محفوظ ہوا۔ کہ ایک روز اس نے جنٹائل سے بطور آزمائش پوچھا۔ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ تم خود اپنی تصویر بنا سکو۔ جنٹائل نے جواب دیا۔ بہت اچھا۔ اور چند ہی روز میں ایک نہایت عجیب و غریب بالکل صحیح تصویر آئینہ کی مدد سے تیار کر کے سلطان کو دکھائی۔ وہ بہت متحیر و مسحور ہوا۔ جس سے اس کو مٹا خیال ہوا۔ کہ مصور کو ضرور خدائی قوت حاصل ہے۔ اور کہا۔ کہ اگر میرے مذہب میں تصویر کشی جائز ہو۔ تو میں جنٹائل کو کبھی واپس ونیس نہ جانے دوں۔

ایک روز سلطان نے جنٹائل کو اپنے محل میں طلب کیا۔ اس کے کام کی بہت تحریف کی۔ اور بیحد مسرت کی حالت میں جنٹائل سے خواہش کی۔ کہ میں تمہاری ہر خواہش کو پورا کروں گا۔ خواہ کچھ ہو۔ جنٹائل چونکہ نیک فطرت تھا۔ اس نے کہا۔ آپ سینٹ ونیس کے نام اپنے اطمینان کے اظہار کے طور پر ایک مکتوب لکھ دیں۔ چنانچہ سلطان نے نہایت عمدہ الفاظ میں لکھ دیا۔ اور گراں بہا تحائف دئے۔ ترکوں کے رواج کے مطابق اس کو ”بے“ کا خطاب بھی عطا کیا۔ علاوہ انہیں اس کے گلے میں ایک سونے کا دو سو پچاس کراؤن کا چنڈن ہار ڈالا۔ اور اسے رخصت کیا۔ یہ ہار بھی تک ونیس میں موجود ہے جنٹائل نے قسطنطنیہ کو خیر باد کہنے کے بعد نہایت خوشی سے سفر پورا کیا۔ اس کی آمد کی خبر سن کر اس کے شہر ونیس کے روسا اور اس کے بھائی گیونی نے سنٹ مار کو کے پاس نہایت شاندار استقبال

اور وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ اس کا ایک میڈل (تمغہ) بھی ہے جس پر اوپس کانٹنٹی "مصور کے دستخط ہیں۔ مگر سلطان کی اصل تصویر جسے جنٹائل نے بنایا لنڈن نیشنل گیلری والی سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس تصویر سے وہ ۵۲ سال کی عمر سے زیادہ نظر آتا ہے۔ جو عمر اس کی وفات کے وقت تھی۔ اس وقت ہمارے سامنے وہ تصویر بھی ہے۔ جو سرائے کتب خانہ استنبول سے حاصل کر کے یہاں شائع کی جاتی ہے۔ اور عرصہ سے یورپین محققین میں مشہور تھی۔ اس کے متعلق سر چارلس ہولمز سابق ایڈیٹر سٹوڈیونس ڈاکٹر مارٹن کی وساطت سے ایک اطلاع ٹائمز لندن ۱۲ جولائی ۱۹۲۶ء میں شائع کی تھی کہ اب وثوق سے کہا جاسکتا ہے۔ کہ سلطان محمد کی یہ اصل تصویر ہے۔ عبدالعزیز بے ہتم عجائب خانہ آثار عتیقہ استنبول کی اجازت سے یہ تصاویر بواسطہ مٹراسل گرے (برٹش موزیم) کارواں میں شائع کی جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ تصاویر کسی یورپین مصور کا کام معلوم نہیں ہوتیں۔ تاہم جنٹائل کی تصویر سے تاثر معلوم ہوتی ہیں۔ اور ان تصاویر اور نیشنل گیلری لنڈن والی تصویر میں محض پگڑی اور سر میں مشابہت نظر آتی ہے۔ سلطان محمد کا جو "میڈل" یہاں شائع کیا جاتا ہے۔ دراصل اعلیٰ فن کا نمونہ ہے۔ یہ کانٹنٹیٹس کا بنایا ہوا ہے۔ اس میں سلطان کی مکمل شبیہ ہے۔ سرائے کتب خانہ والا خاکہ بالکل اصل ہے۔ اور اسی کانٹنٹیٹس کا کام ہے۔ جسے "فرڈینینڈ" نے نیپلز سے قسطنطنیہ بھیجا تھا۔ اسی نے "میڈل" کا یہ خاکہ تیار کیا۔ اور اسی نے "میڈل" بنایا۔ "میڈل" سلطان نے اپنے غازیوں کو فتح قسطنطنیہ کے ضمن میں تقسیم کیا تھا۔

یہ مشہور ہے کہ جب جنٹائل یعنی قسطنطنیہ گیا۔ تو اس کے ہمراہ اس کے ایک دو تلامذہ بھی اس کی مدد کے لئے گئے تھے۔ وہاں بھی بعض ترکی مصوّر اس کے تلامذہ ہوئے مثلاً شبلی زادہ احمد جو ہر دسہ کا تھا۔ اور جس کا ذکر ترکی مصنف عالی (قریب ۱۵۵۷ء) نے کیا ہے۔ جنٹائل کا نام اس کے قول کے مطابق "سنان بے" تھا۔ وہ کہتا ہے۔ "یہ فرنگی مصوّر سلطان محمد کے زمانہ میں یہاں آیا۔ اور یہ ماسٹر و پاؤلی کا

شاگرد تھا۔ اور وہ داسیان کا تلمیذ تھا؟ ڈاکٹر مارٹن نے بھی جنٹائل اور "سنان بے" ایک ہی شخص قرار دیا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جنٹائل کو "بے" کا خطاب سلطان سے ملا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے مورخین نے "سنان بے" لکھا ہے۔

ایک امراقیل ذکر ہے۔ جنٹائل کے ترکی جاننے سے وہاں اس فن میں بیداری ہوئی۔ اور مسلمانوں میں شبیہ کشی کا چرچا ہوا۔ بہت سے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے بعد میں شبیہات ترکی رؤسا وغیرہ کی بنائیں مسلمان مصوری میں جو شبیہ کشی کے عمدہ نمونے نظر آتے ہیں۔ وہ زیادہ تر اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ مسلمان مصوّرین شبیہ بنا ہی نہیں سکتے تھے۔ بلکہ یہ ہے کہ جنٹائل کے وہاں جاننے سے ان کے لئے جرأت کا ایک نیا باب مصوری میں کھل گیا۔ اس سے پیشتر ان کی مصوری زیادہ حد تک کتابی مصوری تک محدود رہی۔ یہاں دو نمونے برٹش موزیم سے لے کر دئے جلتے ہیں۔ جو اغلب ہے کہ جنٹائل کے موقلم سے ہیں۔ اگرچہ نامکمل ہیں کیونکہ ان پر یورپی زبان میں بعض الفاظ ملتے ہیں۔ جو غالباً لباس کے رنگوں کے اسماء ہیں جنہیں مصور نے بطور احتیاط درج کر لیا ہے۔ یہ نمونے محض خاکہ ہیں۔ جو ترکی لباس سر کا بالخصوص عجیب و غریب نمونہ ہیں۔ غالباً اسی وجہ کی بنا پر ان کو کھینچا گیا ہے۔ ان کے علاوہ ایک ترکی مصوّر کی شبیہ ملتی ہے۔ جس پر "صورہ العبد ہزاد" لکھا ہے۔ اگرچہ یہ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا۔ کہ یہ فی الحقیقت ہزاد کا کام ہے۔ مگر یہ یقینی ہے کہ ہزاد نے بھی اسی زمانہ میں شبیہات بنائیں اور اس پر مولانا جعفر کی ایک ہبر بھی ہے۔

محمد عبداللہ چٹائی

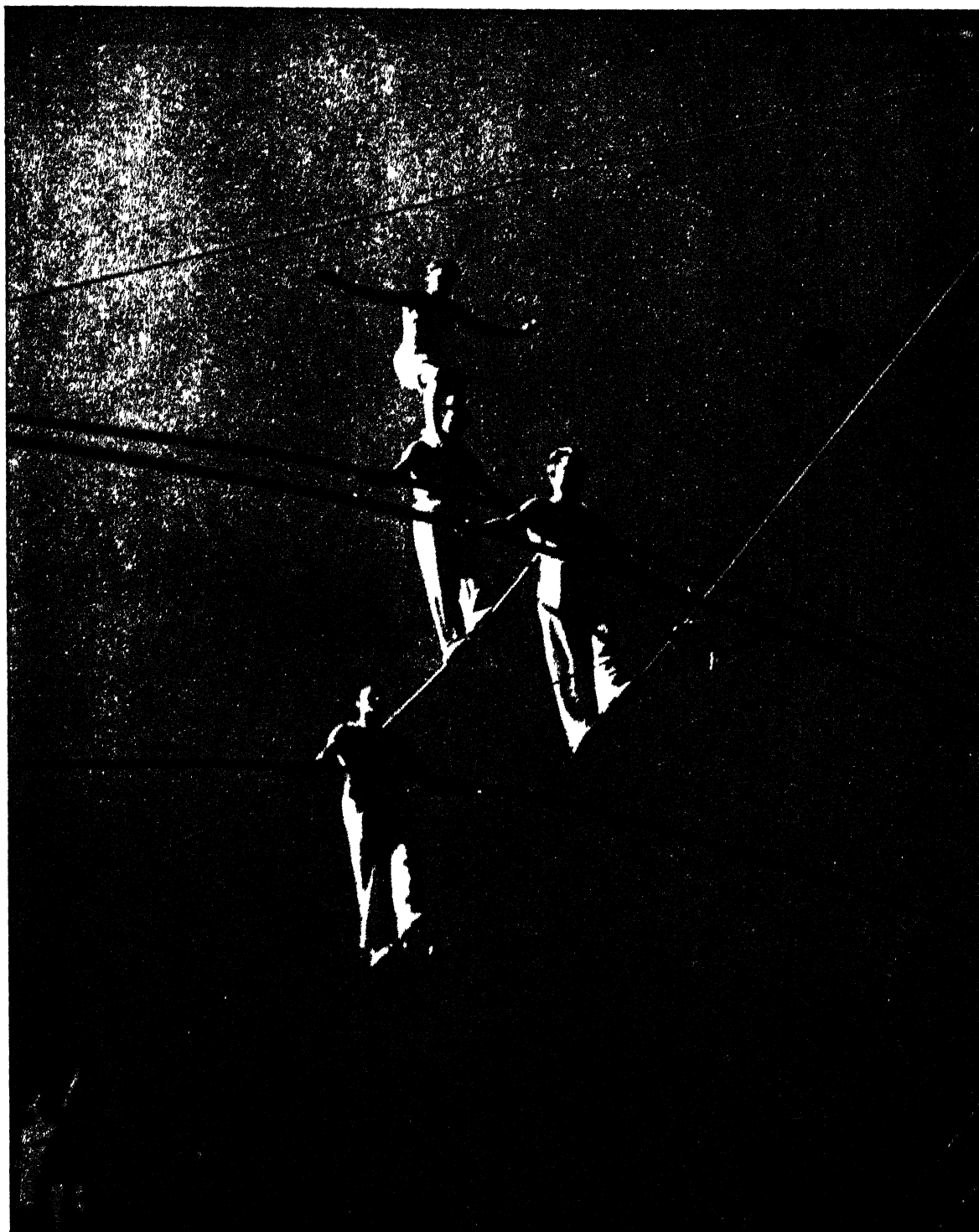
گناہ کیست؟

نظیر	دیدن چنین جسم نہ کردن گناہ کیست	گرد سر تو گشتن و مردن گناہ من
عرف	بُردن بزر تیغ و نکشتن گناہ کیست	لائق بقید و بند بودن گناہ من
صا	امشب وفائے وعدہ نکردن گناہ کیست	راضی شدن بوعصیٰ فردا گناہ من
فائ	درخانہ خدا زدن آتش گناہ کیست	دل باتو خانہ سوز سپردن گناہ من
قد	دل بردن و نگاہ نہ کردن گناہ کیست	درد دل حریں بتو گفتن گناہ من
لا	پنجیر نیم کشته نکشتن گناہ کیست	خود را نشان تیر تو کردن گناہ من
وشت	ہرگز بمن نگاہ نہ کردن گناہ کیست	قطع نظر ز غیر تو کردن گناہ من
است	لُخ و ز نقاب جلوہ نمودن گناہ کیست	عاشق شدن نریدہ جالت گناہ من
علا	آما بریں گناہ نکشتن گناہ کیست	دروصل تو ز شوق نمودن گناہ من
لا	از یک نگاہ زندہ نہ کردن گناہ کیست	بے رحم زیر پائے تو مردن گناہ من
صبا	ساغر ز دست غمیر گرفتن گناہ کیست	زنجیدن فدیہم تو رفتن گناہ من
دعالم	دستہ دشمنہ تیر نہ کردن گناہ کیست	بیخود بوقت فسخ طعیدن گناہ من









مطبوعاتِ جدیدہ

انارکلی

یہ وہ زمانہ تھا۔ جب میرے دوست شیخ نور الہی رحال اسسٹنٹ ڈائریکٹر تعلیمات پنجاب کالج میں اردو ڈرامہ کو فروغ دینے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اس کوشش میں سید امتیاز علی ان کے مستعد اور خوشدل مددگار تھے۔ غرضیکہ سید صاحب کو اوائل عمر سے ادبی ذوق اور ڈرامہ کا شوق رہا۔ اور ان کے اس ذوق و شوق کا ایک مستقل اور قابل قدر نتیجہ "انارکلی" کی شکل میں فی الحال ہمارے پیش نظر ہے اپنے کسی معاصر کی تصنیف پر تنقید کرنا۔ اور خصوصاً ایسے معاصر کی تصنیف پر جو اپنے زمرہ احباب میں شامل ہو۔ نہایت ہی نازک اور دشوار عمل ہے۔ اگر بقدر شوق تنقید کی جائے۔ تو خوشامد کا احتمال ہوتا ہے۔ اور اگر نکتہ چیں کا شیوہ اختیار کیا جائے۔ تو تکدر مزاج کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ لیکن لوگ کہتے ہیں۔ کہ سخن حق سے احتراز بھی ایک قسم کی معصیت ہے۔ اس لئے سید امتیاز علی کی تصنیف کے مطالعہ سے جو تاثرات میرے دل میں پیدا ہوئے ہیں۔ ان کو الفاظ میں ترجمہ کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

مجھے یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں۔ کہ "انارکلی" اردو زبان کا بہترین ڈرامہ ہے جو اس وقت تک میرے مطالعہ میں آیا۔ اور خود ستانی کی نیت سے نہیں۔ بلکہ امر واقعہ کے طور پر اس بات کے کہنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ کہ اردو ادب کے اس شعبہ میں میرا مطالعہ خاصہ وسیع ہے۔ اس ڈرامہ میں ادبی لطافت کے باوجود اسٹیج کے لوازمات کی پوری پابندی کی گئی ہے۔ اور اس التزام کی وجہ سے اردو ادب میں

اردو ادبیات میں اچھے ڈراموں کی اس قدر کمی ہے۔ کہ انارکلی کی اشاعت ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ حشر احسن اور طائب بنارس کے ڈرامے ہندوستانی ناک کے آسمان کے درخشان ستارے ہیں۔ لیکن ان بزرگوں کی تصنیف کا مال کار اردو ادب میں اضافہ نہ تھا۔ بلکہ ہمارے سٹیج کی رونق۔ چند ڈرامے انگریزی اور دیگر زبانوں سے ترجمہ ہوئے ہیں۔ جو کم و بیش ادبی خوبی رکھتے ہیں۔ لیکن نقش اول اور نقش ثانی کا تفاوت بدیہی اور لازمی ہے۔ ان کے علاوہ گنتی کے ڈرامے ہیں جو طبع مزاج کے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے دو ایک شیخ احمد علی شوق قدوائی اور مرزا محمد ہادی لکھنوی جیسے کہنہ مشفق ادیبوں کے فکر کا نتیجہ ہیں۔ لیکن ان ڈراموں کی شاعرانہ حیثیت خواہ کتنی بھی بلند پایہ خیال کی جائے۔ مگر فن ڈرامہ کے اعتبار سے ان میں کوئی خصوصیت نظر نہیں آتی۔ مختصر یہ کہ جدید اردو ادب کے جملہ اصناف میں ڈرامہ سب سے پست ہے۔ لہذا سید امتیاز علی کی یہ سعی جو انہوں نے اردو ڈرامہ کو ادب اور فن کے اعتبار سے ایک خاص رفعت پر لانے کے لئے کی ہے۔ ہر طرح قابلِ داد و ستائش ہے۔

سید امتیاز علی کو میں ان کی شیر خوارگی کے زمانہ سے جانتا ہوں۔ اس کے بعد جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ تو علاوہ استاد ی شاگردی کے تعلق کے (جو ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں بسا اوقات بالکل بے معنی نہیں۔ تو ہمارے نام ضرور ہوتا ہے) دوستانہ روابط بھی قائم ہو گئے۔

اور بغاوت کے اسناد کا ایک طریقہ ہے جس کی تائید کرنے والے سر زمانہ میں بہت مل جاتے ہیں۔ اکبر۔ سلیم۔ انارنگی تینوں اپنی اپنی جگہ حق بجانب تھے۔ اور ان کے مستفاد حقوق کا ہولناک تصادم ٹریچڈی کی جان ہے۔ ورنہ ایک شہزادہ کا بے پناہ عشق یا ایک کنیز کا ناروا قتل لاشیائی تاریخ کے نہایت معمولی واقعات ہیں جن کی بنا پر ایک بلند پایہ ٹریچڈی کی تعمیر چنناں پائیدار ثابت نہ ہوتی۔

فن تعمیر میں جو خشت و سنگ کا مفاد ہے۔ وہی مفاد ڈرامہ کی ترکیب میں مختلف مناظر کا ہے۔ اور جس طرح ایک محتاط معمار خشت و سنگ کے انتخاب و ترتیب کا خاص خیال رکھتا ہے۔ اسی طرح ایک ماہر ڈرامہ نویس اپنے مناظر کے انتخاب و ترتیب پر اپنی پوری توجہ صرف کرتا ہے۔

انارنگی کے مصنف نے اپنے مناظر کو اپنے موضوع کا ہم پایہ بنانے کی انتہائی کوشش کی ہے۔ اور ہر ایک منظر میں اشخاص فسانہ کی حرکات و سکنات۔ بات چیت۔ تراش خراش اس منظر کی عمومی کیفیت کے عین مطابق ہے۔ الفاظ میں شاعری ہے۔ مگر تک بندی نہیں۔ حرکات میں زندگی ہے۔ مگر خفت نہیں۔ غرض جو لفظ ہے۔ وہ دلنشیں۔ اور جو حرکت ہے۔ وہ دلکش ہے۔

بلائے جاں ہے غالب اسکی ہر بات

جبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

ہر ایک منظر کے شروع میں دور حاضرہ کے مذاق کے مطابق رجوع ایک حد تک سنیما کا متبع ہے، اس منظر کی ظاہری ہیئت نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ اور یہ بیان بجلتے خود خوبی تحریر کا نمونہ ہونے کے علاوہ ڈرامہ میں ایک گونہ ناول کی کیفیت پیدا کرتا ہے جس سے کتاب دہرا مغلیہ کی بو قلموں زندگی کا ایک رنگین مرقع بن گئی ہے اگر اس پر بھی رنگ کی کوئی کمی تھی۔ تو اس کو جناب چغتائی کی قلمکاری نے پورا کر دیا ہے۔ جن کا کمال میری مدح سرائی کا محتاج نہیں۔ ہاں مجھ جیسے کمزور تخیل والے ناظرین کے لئے ان کی تصاویر کا شاہد

یہ ڈرامہ آپ ہی اپنی نظیر ہے۔ علاوہ ہر ایک ایسے ڈرامہ کے مصنف کو جس کے بعض اشخاص تاریخی حیثیت رکھتے ہوں۔ ایک خاص وقت پیش آتی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ ان اشخاص سے صرف وہی اقوال و افعال منسوب کر سکتا ہے۔ جو ان کی تاریخی شخصیت سے بہت متفاوت یا کم از کم بالکل مخالف نہ تصور کئے جاسکیں۔ شہنشاہ اکبر اور شہزادہ سلیم تاریخ ہند کی معروف ترین ہستیاں ہیں۔ اس لئے یہ وقت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور مصنف کا کام دشوار سے دشوار تر ہو جاتا ہے۔ ایک طرف تو یہ اندیشہ لگا رہتا ہے۔ کہ کوئی ایسی بات ان سے منسوب نہ ہونے پائے۔ جو ان کی روایتی شہرت اور حقیقی شان کے شایاں نہ ہو۔ دوسری طرف یہ ادبی ضرورت لاحق رہتی ہے۔ کہ ان کی شخصیت کے انسانی عناصر اس حد تک نمایاں کئے جائیں۔ کہ وہ ہستیاں حیات ثانی کا ایک عارضی قالب اختیار کر لیں۔ اور تاریخ کے خاموش اور مردہ ادراک سے منتقل ہو کر ڈرامہ کے زندہ اور فصیح مناظر میں ایک فطری لفظ و حرکت سے آراستہ چلتی پھرتی ہنستی، بولتیں نظر آنے لگیں۔ اس دو گونہ وقت کو سید امتیاز علی نے نہایت خوبصورتی سے ملحوظ رکھا ہے۔ اور ان کے ڈرامہ کے اشخاص کی کردار و گفتار میں کوئی ایسی چیز نہیں۔ جو ذوق سلیم کو گراں گذرے۔ یا ان اشخاص کی جانب ہماری توجہ اور ہمدردی کو کم کر سکے۔

مصاحت شعاری سے دیا چہ میں یہ تصریح بھی کر دی گئی ہے۔ کہ جو روایت ڈرامہ کا مآخذ ہے۔ وہ مصنف کی تحقیق کے مطابق پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ لیکن اگر اس روایت کا ڈرامہ کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ مصنف کے تمام تصرفات اکبر اور سلیم کی نیک نامی کے محافظ و ضامن ہیں۔ روایت کی رو سے سلیم اور انارنگی کا عشق ایک مجرمانہ اور بدناما تعلق تھا۔ جس کا اکبر کے رقیبانہ انتقام نے خاتمہ کر دیا۔ ڈرامہ کی تمہید و ترکیب میں سلیم اور انارنگی کا تعلق عنوان شباب کا وہ اولین اور پاک جذبہ ہے۔ جس سے زیادہ خوش آئند شے شاید دنیا میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ اور اکبر کا انتقام رشک و رقابت کا نتیجہ نہیں بلکہ سلطنت کے استحکام

کتاب کے معنوی تصورات کو پیش نظر رکھنے میں یقیناً معاون ہوگا۔
مندرجہ بالا محاسن کے علاوہ چھپائی اور کاغذ کی صفائی، سروق
کی نفاست، جلد کی نزاکت، کتاب کے حسن کے لئے سونے پر بہاگ
ہے۔ اپنے ملک میں کتابوں کے نشر و اشاعت کے موجودہ کوائف

کو ملحوظ رکھ کر اس بات کی بہت کم امید معلوم ہوتی ہے۔ کہ عرصہ
دراز تک "انارکلی" سے کثیت مجموعی کوئی بہت بہتر کتاب اردو
زبان میں میسر آ سکے معلوم نہیں۔ کہ اس آخری قیاس کو دل
خوش کن سمجھوں یا افسوسناک۔

مرزا محمد سعید ایم۔ اے
ریٹائرڈ آئی۔ ای۔ ایس

مجموعہ لغز

بیسویں صدی کی علمی زندگی کا یہ طغرائے امتیاز ہے۔ کہ اس میں
علماء و سلف کے وہ ادبی کارنامے جو اب تک پردہ غیب میں مخفی تھے۔
زیور طبع سے آراستہ کر کے منہد، شہود پر لائے جا رہے ہیں۔ اگرچہ
افسوس ہے۔ کہ ہندوستان اس علمی کارگزاری کی تگ و دو میں یورپ
تو کجا۔ مصر اور ایران سے بھی پیچھے ہے۔ تاہم مقام شکر ہے۔ کہ آج ہمارے
ملک میں ایسے فضلاء کی مثالیں مفقود نہیں ہیں۔ جن کی تحقیقات کے
نتائج علم و ادب کے بین الاقوامی کارناموں میں شمار ہو سکتے ہیں۔

ہندوستان میں اس سال کی قابل ذکر بلکہ قابل فخر اشاعت میں
سے حکیم میر قدرت اللہ قاسم کی تصنیف مجموعہ لغز ہے۔ جو کہ فارسی زبان
میں شعرائے اردو کا ایک ضخیم تذکرہ ہے۔ چھ سو ترانوے ریختہ نگاروں
کے حالات اور آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی تالیف کی تاریخ
اختتام ۱۲۲۱ھ ہے۔ حال میں اس کو پنجاب یونیورسٹی نے اپنے
سلسلہ نشریات مشرقیہ میں چھپوا کر شائع کیا ہے۔

اگرچہ ظاہری صفات میں یعنی کتابت، طباعت، کاغذ اور جلد کی
دیدہ نہی کے لحاظ سے مجموعہ لغز ہماری سائنس کی حقدار ہے لیکن
جس چیز نے اس کو لغز تر بنا دیا ہے۔ وہ اس کے فاضل مرتب حافظ
عمود خاں صاحب شیرانی کی دقت تحقیق ہے۔ حافظ صاحب کا
لے۔ دو جلد۔ تعداد صفحات ۵۰۰ + ۴۰۰ + ۵۱، تقطیع ۳۰×۲۰

مقام اشاعت لاہور۔ ۱۹۳۳ء

نام محتاج تعارف نہیں۔ انکے علمی مضامین ارباب ذوق سے ان کو چھپی
طرح روشناس کرا چکے ہیں۔ اردو اور فارسی ادب کے وہ مشہور محقق ہیں
اور انکی تحقیقات کا معیار نہایت بلند تسلیم کیا جا چکا ہے مجموعہ لغز کی ترتیب
و تصحیح میں انہوں نے اسی جانفشانی اور دقت نظر سے کام لیا ہے۔ جس
کیلئے وہ مشہور ہیں۔ قلمی نسخہ جس سے انہوں نے متن کو مرتب کیا ہے پنجاب
یونیورسٹی لائبریری میں ہے مقدمہ میں انہوں نے ثابت کیا ہے۔ کہ وہ مصنف
کا اصل مسودہ ہے۔ لیکن ایسا کہ اس کو تصنیف کا ابتدائی خاکہ کتنا چاہئے ایسا
معلوم ہوتا ہے۔ کہ مصنف کا ارادہ اس کو اصلاح و ترمیم کے بعد دوبارہ
صاف کر کے لکھنے کا تھا۔ کیونکہ یہ مسودہ

”جگہ جگہ سے تلمذہ ہے۔ جملے اور فقرے مختلف مقامات سے
کاٹے گئے ہیں۔ اور ان کی بجائے نئے جملے اصلاح شدہ شکل
میں لکھے گئے ہیں۔ مصنف نے نظر ثانی کرتے وقت بشمار
موقعوں پر حاشیہ میں نئے اضافے داخل کئے ہیں۔ الفاظ میں
حک و ترمیم سینکڑوں موقعوں پر نظر آتی ہے۔ کئی مقام پر
عین متن میں جگہ خالی چھوٹی ہوتی ہے۔ ایک صفحہ ختم ہو چکا
ہے۔ اور بجائے دوسرے صفحے پر لکھنے کے پہلے صفحہ کے
حاشیہ پر سلسلہ کتابت جاری رکھا گیا ہے۔ وغیرہ

ایسی حالت میں ظاہر ہے۔ کہ مصنف نے بکثرت وقت و تھریک
لے۔ مقدمہ صفحہ بیچ

مصفاۃ اور وضاحت کا مطلق خیال نہیں کیا۔ خط شکستہ اور نقطہ بہت کم دئے گئے ہیں۔ ایسی تحریر کو پڑھنے کے لئے خاص مشق دیکر رہے۔ پھر یہی نہیں۔ بلکہ نسخے کے تمام اوراق کرم خوردہ اور کٹے پھٹے ہیں۔ جس کی وجہ سے عبارت جگہ جگہ سے تلف ہو گئی ہے۔ نظر بدیں حالات متن کی تصحیح و ترمیم کچھ آسان کام نہ تھا۔ لیکن فاضل اڈیٹر ہمارے شکریئے اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کہ انہوں نے اس دشوار کم کو کامیابی کے ساتھ سر کیا۔

مقدمے میں انہوں نے مصنف (حکیم میر قدرت اللہ قاسم) کے حالات بالتفصیل لکھے ہیں۔ اور بتلایا ہے کہ

”حکیم صاحب دشت سخن کے پرانے سیاح ہیں۔ ان کی تمام عمر شعر اور شاعروں کی صحبتوں میں گزری ہے۔ اس لئے ان کی رائیں شعرا کے کلام اور مقام کے متعلق قابل احترام ہیں۔ باوجودیکہ اس تذکرہ میں سینکڑوں شعرا کا ذکر ہے۔ ان میں ایسے بھی ہوں گے جن کے ساتھ بمقتضائے بشریت معاشرانہ چشمک اختلاف و عداوت بھی ہوگی۔ لیکن ہر ایک کے ذکر میں واقعہ نگاری کے فرائض کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ اور حق گوئی اور انصاف پسندی سے تجاوز نہیں کیا ہے۔ تقریباً ہر شخص کو نیکی کے ساتھ یاد کیا ہے۔ یہ امر ان کی نیک دلی اور سلیم الطبعی کی روشن دلیل ہے۔“

ظاہر ہے کہ ایسے انصاف پسند نقاد کے تصنیف کردہ تذکرے

کو ہمارے خاص احترام کا حقدار ہونا چاہئے۔ علاوہ اس کے انہوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے۔ کہ مجموعہ نغز مولانا آزاد مرحوم کی مشہور تالیف آبجیات کا ایک اہم ماخذ ہے۔ آبجیات کو جو مقبولیت حاصل ہے اسکو مد نظر رکھتے ہوئے ہم اس کے ماخذ کو ایک فوق العادۃ اہمیت دے بغیر نہیں رہ سکتے۔

الغرض مجموعہ نغز کی اشاعت سے اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ آخر میں فاضل مرتب نے جو ”فہرست اسماء اشخاص“ بر ترتیب ابجد دے دی ہے۔ اس نے کتاب کو اور بھی مفید بنا دیا ہے اردو میں جتنی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ان میں یہ فہرست (انڈکس) نہیں لگائی جاتی جس سے کتاب کے حقیقی مفاد میں ایک قابل انوس غامی رہ جاتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی مجموعہ نغز ایک عمدہ مثال ہے پنجاب یونیورسٹی ہماری مبارکباد کی مستحق ہے۔ کہ اس نے ایسی مفید تالیف کو شائع کر کے دنیا کے ادب پر احسان کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے ملک میں علمی انجمنیں ایسے فائدہ مند کاموں کی طرف متوجہ ہوں۔ (ڈاکٹر محمد اقبال۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ایم۔ اے)

لے مقدمہ صفحہ ۴

طے قلمی نسخہ جواب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔

پہلے مولانا آزاد کے ذاتی کتب خانے سے تعلق

رکھتا تھا۔ ۱۲



PERSIAN. MINIATURE PAINTING)

ایرانی کتابی مصوری
اس نمائش کے سلسلہ میں ایرانی کتابی مصوری سے متعلق شائع کی ہے۔ اس کتاب کو نہایت سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں دو سو بیس تصاویر ہیں جن میں سے سولہ رنگین ہیں۔ اس کتاب کو پرنس موزیم کی مایہ ناز ہستینوں یعنی ڈاکٹر لارنس بنین۔ مسٹر گونس اور مسٹر باسل گرے نے ترتیب دیا ہے قیمت ۱۲۶ شلنگ ہے۔ ڈاکٹر بنین نے مقدمہ میں بعض اہم مصور کتب کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی وجہ سے ایرانی مصوری کے متعلق علم میں بہت

بڑا اضافہ ہوا ہے مثلاً رشید الدین کی جامع التواریخ جس کے حصص اڈنبر
یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہیں۔ اور شاہنامہ ازڈیموٹ جولڈن مشرقی مجلس
کے کتب خانہ میں ہے۔ چودھویں صدی عیسوی کے بعض مصوخطوطات جو
بیزانٹائن کے آئے اور جن سے واضح ہوتا ہے کہ تیموری مصوری کس وقت جلوہ
پیرا ہوئی بعض نمونے ایسے بھی تھے جو شاہ رخ اور بلسنغر کے کتب خانوں
سے تعلق رکھتے تھے جن میں ایک ظفر نامہ ۱۳۳۳ء کا ہے جس پر سرائیڈ
ایک الگ کتاب تالیف کر چکے ہیں۔ کلید و منہ جو حکایات کا مجموعہ ہے شاہنامہ
ازرائل مشرقی مجلس لندن اور اسی کا ایک اور مخطوطہ ازبودین اور ایک گلستان
ازمجموعہ پیٹریٹ جی مولانا جعفر نے بلسنغر کے لئے لکھا تھا۔ اور اسی مولانا
جعفر کا ایک شاہنامہ ۱۳۳۳ء کا یہ تمام چیزیں بے حد دلچسپ تھیں مگر ہمارے
نزدیک جو قدیم ترین مصوخطوط اس نمائش میں آیا۔ وہ اوراق شاہنامہ میں
ازمجموعات مطر جیت گوش کلکتہ و مطر پیٹریٹ لندن۔ اگرچہ سنانی کی
کتاب الجیوان کے بھی قدیم مصوراوراق امریکہ سے آئے تھے۔ مگر ان کا یہ
درجہ نہیں۔ غرناڈا کے ٹرنین نے نہایت کامیابی سے بیان کر کے کی کوشش
کی ہے۔ کہ ایرانی مصوری دراصل ہے کیا؟ اور اس کا ہماری ثقافت میں
کیا درجہ ہے۔ اور کہاں تک ہماری روزانہ زندگی کی یہ آئینہ دار ہے۔ سب سے
بڑھ کر یہ کہ اسلام کا رجحان مصوری کے متعلق کیا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں
انہوں نے سرائیڈ کے نظریات پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ کتاب ایک
بہت بڑا ذریعہ ہے کہ فن مصوری میں ایرانی تخیل کا مغربی تخیل اور چینی تخیل
سے مقابلہ کرنے میں مدد دے۔ دور وسطیٰ کی مغربی مصوری میں ہم جذبات انسانی
جسم میں دیکھنے میں یعنی نئی نوع انسان کی خواہشات غموم۔ کامیابی اور مایوسی
کی علامات کیا ہیں؟ یہ امر تصاویر واضح کرتی ہیں چینی مصوری میں مصور کو
تمام عالم ایک کیفیت میں مشاعرہ نظر آتا ہے۔ جس میں انسان بھی شامل ہوتا
ہے۔ دراصل ایرانی تخیل ان دونوں کے درمیان ہے۔ اور اس میں
ضروری تیسری جہت نہیں ہوتی۔ اور یہی بات مشرقی مصوری کے تخیل
ہونے کی دلیل ہے۔

کتاب کی تقسیم یوں قائم کی ہو۔ ۱۔ قبل غلبہ چنگیزی۔ اس میں عراقی دبستان

کو بیان کیا ہے۔ جس کے متعلق مٹر گرے کتاب ہے۔ کہ ابتدائی اسلامی مصوری
پیشرفت کا عنصر غالب تھا۔ اور یہ عراقی طرز و راصل یونانی مصوری کا نسخہ
شدہ نظر ہے۔ اگر اسے بازنطینی کہا جائے۔ تو بہتر ہے۔ مجھے بعض عربی شعرا
نے بھی بیان کیا ہے۔ اور اسے دیگر یورپین مصنفین موسیو بلوشے اور سرائیڈ
وغیرہ نے بھی بیان کیا ہے۔ مگر یہ خصوصیت محض اسی دور میں ہے۔ بعد
میں مسلمان مناہوں نے اپنا طرز اختیار کر لیا تھا۔

۲۔ ابتدائی ایرانی طرز اور چودھویں صدی عیسوی کی تبدیلیاں۔ یہ
دور دراصل ایسا ہے۔ جبکہ صحیح معنوں میں ایرانی مصوری کی ابتدا چینی یعنی
وسط ایشیائی تاثرات میں ہوئی۔ اور یہی تیموری دبستان کا پیش خیمہ ہے۔

۳۔ تیموری دور۔ جو صحیح اور دراصل ایرانی مصوری ہے۔

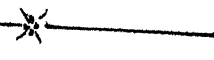
۴۔ اخیر پندرھویں صدی عیسوی میں ہنزاد اور اس کے معاصرین۔ اس
دور میں پوری شان و شوکت ایرانی مصوری کی نظر آتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے
جبکہ ہرات مصوری کا مرکز تھا۔ اس کے گرد و نواح میں تہرہ۔ شیراز۔ طہران
وغیرہ تھے جہاں پھر بھی کام کرنے والے موجود تھے۔ ابو الغازی سلطان
حسین بن منصور بن بایقرا (۱۰۶۶-۱۱۰۱ء) کی شخصیت کی بدولت بہت سے
ماہرین فن شہرت تک پہنچے۔ وہ خود بھی شاعر تھا۔ اور اس کے دیوان کو ہنزاد
نے مصور بھی کیا ہے۔ اسی سلطان کے دوستوں میں میر علی شیر نوائی تھا جس
نے سلطان علی مشہدی جیسے خطاط اور ہنزاد جیسے مصور کو کہیں جانے نہیں دیا
غرضیکہ ہرات ہی مصوری کا بڑا مرکز تھا۔ ان کی تصاویر کا انداز اور لباس مخصوص
قسم کا ہے۔ جس کی وجہ سے ہرات دبستان ایرانی مصوری میں مشہور ہے۔

تیموریوں کے بعد فوراً صفویوں کا زمانہ آیا۔ ان سلاطین نے خود بھی مصوری
سیکھی اور اسے کماحقہ فروغ بھی دیا۔ یہ وہ زمانہ ہے۔ جبکہ ہنزاد نے دنیا
میں شہرت حاصل کی (ہنزاد کے متعلق ملاحظہ ہو کاررواں کا گذشتہ نمبر جس
میں اس کی حیات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے) اگر اس کے صحیح کام سے متعلق ہمیں
مصر کے مخطوطہ بوستان کا ذکر کرنا چاہئے۔ جس میں ہنزاد نے اپنی کمال ہنر اور
کا ثبوت دیا ہے۔ اور جو اس کی ہستی کے متعلق شکوک ہیں ان نمونوں کو دیکھ کر
حکایت ہو جاتے ہیں۔

اس کتاب میں خصوصیت سے خواجہ عبدالصمد اور سید میر علی تبریزی کے جو نمونے دئے ہیں۔ وہ قابل ذکر ہیں۔ اور یہی دو مصور ہیں جن کی وجہ سے مغل مصوری کو فروغ ہوا۔ آجکل جو مغل اور ہندو مصوری نظر آتی ہے وہ دراصل انہیں کی منت پذیر ہے۔ یہ بھی وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ مجسمہ پیسٹر ٹیپی نے نمائش کو چار چاند لگا دئے۔ اس کی عدم موجودگی میں نمائش بالکل بھیکہ رہتی۔ اور بہت سے نئے نظریوں پر کبھی روشنی نہ پڑتی۔ اور یہی طرح وہ نمونے جو سرائے کتب خانہ قسطنطنیہ سے آئے۔ ان کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ کتاب کے اخیر میں ایک دو صفحے بھی ہیں۔ اول سر آرنلڈ کارٹر جرمز ایجرز کی تاریخ کے اس حصہ کا جو مصورین کے حالات پر مشتمل ہے۔ اور دوسرا صفحہ دوست محمد کے خطوط مصورین اور نقاشین کا ایک طرح سے ترجمہ ہے۔ جو پہلی مرتبہ ملالہ الدین آیا۔ اور اس کے لئے خصوصیت سے مٹر وکنس سختی مبارک باد ہیں۔ کہ ان کی مساعی جمیلہ کو دستیاب ہوا۔ اور اس تحریر سے ہندو کی زندگی کے ایسے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ جو پہلے معلوم نہ تھے۔ مثلاً یہی کہ ہندو کا انتقال ۱۹۲۳ء میں ہوا ڈاکٹر لارنس نہیں نے مفہوم لکھا ہے۔ مٹر گرے نے ابتدائی حصہ جو مشکل ترین تھا۔ اپنے اجتہاد کی بنا پر نہایت کامیابی سے سرانجام دیا ہے اور خاتمہ کی تمام ذمہ داری مٹر وکنس پر ہے۔ ان تینوں حضرات نے کمال کوشش اس امر کی کی ہے۔ کہ کتاب میں تمام نیامواد آجائے۔ اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ کتاب کی جو قیمت رکھی گئی ہے اس کی تمام خوبیوں کے مقابلہ میں بے حد کم ہے یعنی چھ گنی۔

﴿غبد اللہ چغتائی﴾
 ANCIENT MONUMENTS OF KASHMIR (از رام چندرا کاک۔ مطبوعہ انڈیا سولہ ٹی لنڈن قیمت ۲۵ شلنگ یہ امر محتاج بیان نہیں ہے۔ کہ انڈیا سولہ ٹی لنڈن نے بیش قیمت علمی خدمات ہندوستان سے متعلق سرانجام دی ہیں۔ جو تالیفات مقتدر فضلا کی اب تک شائع کی ہیں۔ ان میں انجنا پڑ ایک جامع کتاب مغل مصوری۔ جنوبی ہند کے قدیم آثار۔ شاہنامہ وغیرہ وغیرہ

سب قابل ذکر ہیں کشمیر کے آثار قدیمہ انہیں روایات پر حال میں ہی طبع ہوئی ہے کشمیر خطہ نے نظیر ہونے کی وجہ سے قدیم زمانے سے ہی آباد گاہ سیامان عالم رہا ہے بشمار کتب و بیانات اس کے متعلق موجود ہیں۔ اور مختلف ادوار میں سلاطین نے بھی اپنے اپنے مذاق کے مطابق آثار بنوائے جو وہاں محلات، مناوے، باغات، مساجد وغیرہ کی صورت میں ابھی تک موجود ہیں لیکن عام طور پر جو کچھ کشمیر پر لکھا گیا ہے۔ رومانی اور جمالیاتی اعتبار سے ہے۔ اور علمی تحقیقی رو سے کم لکھا گیا۔ یہ کتاب اس فن میں شاید اول ہے۔ اگرچہ اس کا بیشتر حصہ غیر مسلم آثار عتیقہ کے متعلق ہے۔ (حالانکہ شاہ میر کے زمانہ ۱۳۳۳ء سے اسلام وہاں آیا۔ اور موجودہ راجہ کے اباؤ اجداد کے زمانہ تک رہا) مگر تاہم غنیمت ہے۔ بڑی خوشی اس بات کی ہے۔ کہ مٹر کاک کشمیر ہی کے باشندے ہیں۔ اور وہیں محکمہ آثار قدیمہ کے ناظم بھی تھے۔ اس لئے ان کے بیانات زیادہ تر ان کے مشاہدات اور ذاتی علم کا نتیجہ ہیں۔ آپ نے رواداری کا ثبوت بھی دیا ہے۔ آثار قدیمہ پر علمی کام کرنے والوں کے لئے یہ مفید کتاب ہے۔ اس پر سرفروشیں یگ ہسپتڈ کا تعارف نامہ ہے۔ اور دیباچہ پروفیسر فرٹے کلے ہے۔ دونوں حضرات ہندوستانی تہذیب و تاریخ کے ماہرین میں سے ہیں۔ اور دونوں نے ایک عرصہ ہندوستان میں گزارا ہے اس لئے ان کے بیانات اپنے اپنے رنگ میں بہت مفید ہیں۔ کل، پلٹ آرٹ پیپر پر عمارات وغیرہ کے فوٹو گراف کے ہیں۔ کتاب کی ترتیب یوں قائم کی ہے۔ دیباچہ وغیرہ کے بعد سیاسی تاریخ۔ طرز فن تعمیر۔ آثار سری نگر و گردنواح۔ آثار بالائے سری نگر۔ آثار تخت سری نگر کشمیر کی تاریخ کا مطالعہ اس امر پر روشنی ڈالے گا کہ کشمیر کے اصل باشندے ہمیشہ سے رعیت سلاطین غیر ملکی رہے۔ اور یہ لوگ کشمیر کے طبعی گرد و نواح سے بہت متاثر ہیں۔ یہ بات ان کی روزانہ زندگی سے بھی عیاں ہے۔ کتاب میں ایک مفید باب الکتشافات سراوان سے متعلق ہے۔ جن کے آثار رافعاتان اور گندھارا سے مماثل ہیں۔ اور جن سے ساسانی اثرات عیاں ہیں۔ اسلامی فن تعمیر کے بارے میں مصنف نے اختصار سے کام لیا ہے۔



کی دیگر کتب کی طرح اچھی کتابت اور طباعت سے آراستہ ہو کر شائع ہوئی ہے۔ ہمارے نزدیک حالات صحابہ کے ضمن میں بھی ایک حصہ مشکل اور مختلف فیہ تھا۔ بہر حال شاہ معین الدین صاحب نے نہایت جانفشانی سے ہر پہلو پر بحث کی ہے۔ اور مصنف کے لباس میں مصنف کا کام کامیابی سے کیا ہے۔

✽

مثنوی تعلق نامہ خسرو دہلوی { تہذیب و تحشیہ سید ہاشمی فرید آبادی - ملنے کا پتہ - دفتر

مخطوطات فارسیہ لال ٹیکری حیدر آباد دکن قیمت مجلد للہ بردہ پہلے - حیدر آباد دکن میں ایک مجلس مخطوطات فارسیہ ۱۳۱۳ھ سے قائم ہے۔ جس کی غرض و غایت سالانہ رپورٹ سے واضح ہے۔ فارسی زبان کی علمی اور نادر کتابوں کی حفاظت و اشاعت کا کوئی مناسب انتظام کیا جائے۔ چنانچہ تعلق نامہ اس سلسلہ کا اول علمی کارنامہ ہے۔ اور واقعی بہت بڑا کارنامہ ہے۔ تعلق نامہ بالکل ناپید تھا۔ اس کا ایک ہی نسخہ دستیاب ہو سکا دیا ہے میں سید ہاشمی صاحب نے علامہ فیضی کا ایک رقعہ دیا ہے۔ جو راجہ علی خاں فاروقی والئے خاندیش کو تحریر کیا تھا جس میں اس تعلق نامہ کا ذکر ہے۔ اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ نہ تو اس کا اول ہے نہ آخر۔ حیاتی کاشی نے جہانگیر کے حکم سے اس کے ابتدائی ۵۰ اشعار کی کمی کو پورا کیا۔ اور اس کامیابی کے صلہ میں حیاتی کو زر سرخ و سفید سے تلو اکرا اس کے ہم وزن روپیہ انعام دیا گیا۔ مگر یہ وہی نسخہ ہو جس کا ذکر ملا فیضی نے اپنے رقعہ میں کیا ہے۔ بہر حال یہ ایک نسخہ خوش قسمتی سے زمانہ کے دست برد سے محفوظ رہا۔ اور اس کی طباعت پر مجلس مخطوطات حیدر آباد دکن نے داد و تحسین کی مستحق ہے۔ یہ نسخہ دراصل نواب حبیب الرحمن خان شیلانی صاحب کے کتب خانہ کی ملکیت دراصل اس نسخہ کی ترتیب مولوی رشید احمد مرحوم نے شروع کی تھی لیکن حالات نے مساعدت نہ کی۔ اور وہ قبل از وقت ہی دلخ مفارقت دے گئے۔ مطبوعہ کتاب میں ان کا ایک نام تمام مقدمہ بھی ہے۔ سید ہاشمی صاحب نے بہت کاوش سے ایک بات یہ پیدا کی ہے۔ کہ اپنے ذاتی مطالعات تاریخ

تاریخ صقلیہ جلد اول { از سید ریاست علی ندوی - مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ - عرصہ سے لوگوں کو علم تھا۔ کہ دار المصنفین نے تاریخ صقلیہ کی تدوین کا بیڑا اٹھایا ہے۔ صقلیہ میں مسلمانوں کی حکومت قریب ۸۵۰ء سے قریب ۱۰۰۰ء تک نہایت شان و شوکت سے رہی۔ اس کتاب میں صقلیہ کے طبعی حالات صقلیہ - اٹلی و جزائر صقلیہ پر اسلامی حملہ کی ابتدا - اسلامی حکومت کا قیام - اسلامی حکومت کا عہد بعد عروج اور پھر اسلامی حکومت کا خاتمہ اور مسلمانوں کے مصائب اور جلا وطنی کا تفصیلی مرقعہ دکھایا گیا ہے۔ تین رنگین نقشے بھی ہیں۔ اور کتاب کو نہایت کامیابی سے ضروری محاسن طباعت سے ۵۱۶ صفحات میں مکمل کیا گیا ہے۔

لامور میں ادارہ معارف اسلامیہ کے اجلاس کے موقع پر سید ریاست علی صاحب نے ایک بسیط مقالہ صقلیہ کے متعلق پڑھا تھا۔ جس کے بعد بعض محققین نے ان سے درخواست کی تھی۔ کہ وہ صقلیہ پر مسلمانوں کے ثقافتی اثر کے متعلق پھر کچھ ارقام فرمائیں۔ چنانچہ سید صاحب جلد دوم میں ثقافتی پہلو پر توجہ دیں گے۔

سید ریاست علی صاحب ایک عرصہ سے اس کام پر لگے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں اس علمی کاوش و تحقیق پر مبارک دیتے ہیں۔ اور انشاء اللہ دونوں جلدوں کی موجودگی میں پھر مفصل تبصرہ پیش کریں گے۔ دار المصنفین کا یہ علمی کارنامہ دراصل عالم اسلامی پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔

✽

سیر الصحابہ جلد ششم { مولوی شاہ معین الدین احمد ندوی رفیق دار المصنفین - دار المصنفین نے ایک سلسلہ سیر الصحابہ کا شروع کر رکھا ہے۔ جو مقبول عام ہو چکا ہے۔ اسی سلسلہ کی چھٹی کڑی یہ کتاب ہے۔ اور یہ مفید سلسلہ اس کے بعد ایک اور جلد "صغار صحابہ" کے بعد ختم ہو جائے گا۔ یہ جلد (ششم) خصوصیت سے حضرت حسن - حضرت امیر معاویہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم پر مشتمل ہے۔ دار المصنفین

سے اور اس کے متن کو خوب پڑھ کر اس کا ایک خلاصہ دیگر کتب تاریخ عہد سے مقابلہ کر کے تیار کیا ہے۔ جو بذات خود ایک مستقل تصنیف کا کام دیتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ امیر خسرو کی یہ تصنیف تاریخی حیثیت سے بہت اہم تھی۔ کس طرح خسرو خاں نے آل علماء الدین پر ظلم ڈھالے اور پھر آخر کار کس طرح انہی مظالم کا خود شکار ہوا۔ اور کس طرح آل تغلق وارش سلطنت ہوئی۔

یہ کتاب اورنگ آباد دکن کے مطبع اردو میں ٹائپ میں طبع ہوئی ہے نہایت دیدہ زیب ہے۔ ہمیں قوی امید ہے کہ اس طرح دیگر مخطوطات کی اشاعت کا انتظام بھی کیا جائے گا۔



مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر کا اثر لکھنے والی صاحبہ انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد۔ دکن ۱۹۳۳ء۔ اس مقالہ کو اول مولانا عبدالحق صاحب نے ۱۹۲۷ء میں رسالہ اردو میں شائع کیا تھا۔ مگر اس وقت ٹائپ کی عدم موجودگی کی وجہ سے اس میں اکثر اغلاط رہ گئی تھیں۔ اب اس کو الگ ایک کتاب کی صورت میں انجمن کی کتب کے عام سائز پر ٹائپ میں طبع کیا گیا ہے۔ اور یہ ص ۱۳۳ پر مشتمل ہے۔

آغاز کتاب میں مولانا نے دکن میں مسلمانوں کی آمد کو علماء الدین کے زمانہ سے بیان کیا ہے۔ جس کے بعد جب محمد تغلق کا دکن پر تسلط ہو کر ختم ہو گیا تو حکومت بمقام قائم ہوئی۔ جس کے انتزاع کے بعد دکن میں مختلف اسلامی سلطنتیں بچا پور۔ احمد نگر۔ برار۔ بیدر۔ گوکنڈہ کے نام سے قائم ہو گئیں اور اس وقت سے آج تک برابر اسلامی حکومت یہاں کسی نہ کسی رنگ میں قائم رہی۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جبکہ مسلم و غیر مسلم ایک دوسرے سے برابر کا برتاؤ کرتے تھے۔ اسی وجہ سے فارسی زبان کا اثر جو فاتحوں کی زبان تھی۔ یہاں کی دیسی زبانوں پر بہت زیادہ ہوا۔ جب سیوا جی نے ۱۹۰۶ء میں خالص مرہٹی زبان کی لغت تیار کرنے کا حکم دیا۔ تو کامیابی نہ ہو سکی۔ بلکہ اس کے بعد اس قسم کی کوشش کو بے سود تصور کیا گیا۔ حکومت پناہ۔ غم شیر بہادر۔ نیسا خاص خیل

”راجہ بہادر“ وغیرہ وغیرہ بے شمار ایسے الفاظ مولانا نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کئے ہیں۔ جو مرہٹی زبان کا جزو اعظم بن چکے ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہ فارسی کے حروف جار۔ ربط۔ عطف۔ نجاتہ وغیرہ بلا تکلف استعمال ہوتے ہیں۔ مولانا نے فارسی الفاظ کی مثالیں ۱۳۳ سے لے کر آج تک مرہٹی مصنفین کے کلام و بیانات سے دی ہیں۔ جن میں الفاظ ہجری۔ السلام علیکم عرضداشت۔ ”زیادہ چہ نویں“ وغیرہ وغیرہ عام آئے ہیں۔ ایک مبسوط نہایت ضرب الامثال کی دی ہے۔ ایک عنوان مٹوری اور طریقہ تحریر قائم کیا ہے۔ جس میں کاغذ کے استعمال و قدیم طرز پر بحث ہے۔ ان سب میں اسلامی اثر کو بالوضاحت دکھایا ہے۔ سب سے بڑا کارنامہ اس کتاب میں یہ ہے کہ مرہٹی شاعری پر ایک نہایت محققانہ تنقید ہے جس سے مولانا کے وسیع مطالعہ کا پتہ ملتا ہے۔ اس میں بعض جگہ سیوا جی کے حالات زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور مرہٹوں کے متعلق کہا ہے کہ ”مرہٹے بحیثیت قوم کبھی صاحب علم و فضل نہیں ہوئے“۔ کتاب کے آخر میں ایک خاتمہ بھی ہے۔

ہمارے نزدیک مولانا کا یہ شہ کار دراصل محض ”لسانی“ طور پر تنقید نہیں بلکہ مرہٹی ثقافت پر روشنی ڈالتا ہے۔ کہ یہ قوم کس قدر معلم ثقافت سے متاثر ہوئی اور کس طرح مسلمانوں سے متاثر ہو کر سلطنت قائم کرنے کی کوشش کی کس طرح مسلمانوں کے ہی اصول سلطنت آخر تک قائم رہے۔ اس بنا پر اگر کتاب کے عنوان کے ساتھ ”مرہٹی تمدن“ کا اضافہ ہو جاتا۔ تو نہایت موزون ہوتا۔



ہندوستانی لسانیات ”از ڈاکٹر سید محی الدین قادری۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر زبان اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ نئے کا پتر ۱۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن قیمت ۵ روپے دیباچہ از ڈاکٹر عبد السلام صدیقی صدر شعبہ عربی، فارسی الہ آباد یونیورسٹی جس کے ابتدا میں آپ نے عنوان کتاب کی یوں تعریف فرمائی ہے۔ ”سان زبان کو کہتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ ”لسانیات“ اس علم کو کہتے ہیں جس کا موضوع زبان کے مسائل ہیں۔۔۔ الخ“ ڈاکٹر قادری نے اپنی تمہید میں بیان کیا

ہے کہ ہمارے ہاں ایسی تالیفات مفقود ہیں۔ مگر ہمارے ہاں کی دو تصانیف کا ذکر یوں کیا ہے۔ ”تتہم یہاں ہندوستان کے دو مایہ ناز نامہرین لسانیات پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی اور پروفیسر سستی کار چٹرجی کی لسانی تحقیقات کا تذکرہ ضروری ہے۔ مولانا شیرانی کی پنجاب میں اردو پہلی اردو کی کتاب ہو جس میں ہماری زبان سے متعلق جدید ترین طرز کا لسانی مواد پیش کیا گیا ہے ڈاکٹر چٹرجی کا مقدمہ آغاز و ارتقاء کے نگار اور ان کا حال کا لکھا ہوا رسالہ ”گلگتہ کی اردو“ دونوں کتابیں ہندوستانی السذ اور ساتھ ہماری زبان کو متعلق نہایت مستند اور عصری معلومات پیش کرتی ہیں۔“

کتاب کو دو حصوں پر تقسیم کیا ہے۔ اول میں لسانیات۔ زبان فطرتقا۔ ارادی تشکیلات۔ دنیا کی زبانیں۔ ہند آریائی ارتقا۔ جدید ہند آریائی زبانیں۔ ہند کی غیر آریائی زبانیں۔ دوم میں ہندوستانی کا آغاز۔ ہندوستانی کا ارتقا۔ ادبی بولیاں۔ ہندوستانی کی ہمہ گیری۔ عدد حاضر۔ اس کے علاوہ اس میں مفید نقشے تقسیم زبان کے بھی لگائے ہیں مغرضیکہ لسانیات کے تحت میں اردو میں یہ ایک کامیاب کوشش ہے۔

✽

”مؤلف حکیم سید شمس اللہ قادری سٹے کا پتہ :- دفتر رسالہ مورخین ہند“ تاریخچہ حیدر آباد دکن قیمت عا۔ حکیم صاحب اپنی تاریخی تالیفات کی وجہ سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ یہ کتاب سلم سلاطین ہندوستان کی معتبر و مستند کتب تواریخ کی فہرست ہے۔ اور ان کے مصنفین کے تذکروں پر ایک تبصرہ ہے جو ص ۱۳۲ پر مشتمل ہے۔ اس پر ایک مقدمہ نواب سر امین جنگ بہادر کا ہے کتاب تاریخ آئینہ گزشتہ و دریں حال است و فال مستقبل نواب صاحب کے الفاظ کے مطابق مفید ہے۔ اس میں ہند کی عام تاریخیں۔ جغرافیائی تاریخیں۔ سلاطین دہلی کی تاریخیں۔ لودھی اور سوری خاندان۔ تیموریہ۔ سندھ کشمیر۔ گجرات۔ بہمنیہ۔ علول شاہیہ قطب شاہیہ۔ آصفیہ۔ مرہٹہ۔ اودھ۔ افغانہ۔ بنگالہ۔ کرناٹک۔ میسور کی کتب تاریخ کا تذکرہ درج ہے۔

”مثنویات میر“ مرتبہ سید محمد ایم۔ اے لکچرار ٹی کالج حیدر آباد دکن مٹھوٹے لکھنے کا پتہ :- حیدر آباد۔ مکتبہ ابراہیمیہ۔ قیمت عا۔ چھوٹی تقطیع قریب دو سو ساٹھ صفحات۔ میر تقی میر۔ سودا۔ غالب وغیرہ سب اردو شاعری کے پیش رو ہونے کی حیثیت سے زبان زد خلایق ہیں مگر میر ان سب میں سبقت رکھتے ہیں آپ کا زاد ۱۱۳۶ھ سے لیکر ۱۲۲۵ھ تاریخی اعتبار سے پر آشوب ہے۔ بہت سے حالات کا میر صاحب پر بھی اثر ہوا۔ مگر ان کی شاعری میں یہ سب انقلابات ان کے لئے فیضان کا باعث ہوئے۔ جو کچھ انہوں نے لکھا۔ وہ بہت حد تک ان کے اپنے ذاتی واقعات و تجربات کا آئینہ تھا۔ ویسے بھی اردو شعرا میں وہ اول ہیں۔ جنہوں نے اپنی آپ بیتی ”ذکر میر“ کے عنوان سے فارسی میں لکھی ہے۔ اور جسے مولوی عبدالحق صاحب نے ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔ سید محمد صاحب نے ایک مستقل کتاب کی صورت میں ایک دیباچہ کے ساتھ ان کی مثنویات کو مرتب کیا ہے۔ اور اسی مہسوط مقدمہ میں ان کے طرز کلام اور حیات پر بحث کی ہے۔ جو اعلیٰ درجوں کے طلبہ کے لئے نہایت مفید ہے مثنویات میر تعداد میں ۳۳ ہیں۔ ان سے کم سے کم ان کے رفقا اور ماحول کا ضرور پتہ ملتا ہے۔ پیشمر ہے۔ کہ کسی مصنف کے حالات کا صحیح مطالعہ کرنا چاہو۔ تو اس کی تصنیفات کا مطالعہ کرو۔ چنانچہ مثنویات ان کی حیات کا ایک باب ہیں مثلاً سرگزشت سفر۔ حیدر نامہ۔ کتخانی آصف الدولہ۔ مرغ بازاراں۔ ہونما اہل دغا۔ میر وغیرہ وغیرہ

✽

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کی مطبوعات :-

ملک بھر میں انجمن ترقی اردو ہی ایک انجمن ہے۔ جو اردو زبان کی خدمت خاص نبھ اور اصول پر کر رہی ہے۔ اس کا بڑا مقصد یہ ہے۔ کہ اردو زبان کو جو پچھلے پانسو سال میں اہل ہند کی متحدہ کوششوں سے بنی ہے۔ اور جو قومی زبان کہلانے کی مستحق ہے۔ ادنیٰ اور علمی زبان بنایا جائے۔ اس خیال کو مدنظر رکھ کر انجمن علم و ادب کے ہر شعبے پر کتابیں لکھو اکرا شائع کر رہی ہے۔ چونکہ یہ مطبوعات ایسے وقت میں موصول ہوتی ہیں۔ جب ان پر کما حقہ تبصرہ

نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مختصر اُن کے محاسن کو قارئین کا روانہ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

واستان رانی کیشکی اور کنوراو دے بھان [انشا اللہ خاں

”انشا“ کی جدت طبع کا نتیجہ ہے مصنف نے یہ التزام کیا ہے۔ کہ فارسی عربی کا ایک لفظ بھی نہ آنے پائے۔ لیکن لطف یہ ہے۔ کہ آجکل کی ایسی ہندی نہیں ہے۔ کہ نہ لکھنے والا سمجھے نہ پڑھنے والا پڑھے۔ اس کتاب کی زبان کو اردو دان سمجھتا ہے۔ اور ہندی دان بھی۔ یہ کتاب شکل سے دستیاب ہوتی تھی۔ اب انجمن نے شائع کر کے اردو دان طبقہ پر احسان عظیم کیا ہے شروع میں مولوی عبدالحق کا ایک مختصر دیباچہ ہے۔ حجم ۵۶ صفحہ قیمت غیر مجلد چار آنے۔ ۴۴

سب رس یعنی قصہ حسن دل [اردو نشر کی یہ نیا پ اور سب

وجہ توجہ کے بعد خاص اہتمام سے انجمن ترقی اردو نے شائع کی ہے۔ اس کے مصنف مولانا ”وجہی“ سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ کے وبار کے نامور شاعر اور ادیب تھے۔ اس کتاب کا سنہ تصنیف ۱۳۸۵ھ ہے۔ اور اس میں پوری ادبی شان پائی جاتی ہے۔ قصہ بھی عجیب ہے۔ اور طرز بیان بھی عجیب۔ اردو کے دلدادہ اور زبان کے محقق کے لئے یہ کتاب مغنمات میں سے ہے۔ کتاب کو شروع میں مولانا عبدالحق صاحب کا ناقدانہ اور عالمانہ مقدمہ ۵۲ صفحات کا ہے جس میں قصے کی تاریخ کتاب کی حقیقت اور خصوصیات پر بحث کی گئی ہے حجم ۸۰ صفحات قیمت مجلد چار روپے۔

جنگ نامہ عالم علی خاں [سیدوں اور نواب نظام الملک

دکنی شاعر نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ عالم علی خاں دکن کا صوبہ دار اور سید عبداللہ قطب الملک کا بھتیجا ہے۔ جب نظام الملک دکن کی طرف بڑھتے ہیں۔ تو یہ نوجوان صوبہ دار ان کے مقابلہ کے لئے فوج لے کر آتا ہے۔ یہ نظم تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اسی زمانے کی زبان کا پتہ دیتی ہے۔

باغ و بہار یا قصہ چہار وریش [میرامن دہلوی کی یادگار زمانہ

سلامت میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ اور دکن کی سوا سو برس پہلے کی بول چال اور محاورے کا اعلیٰ نمونہ ہے کتاب کے شروع میں مولوی عبدالحق صاحب کا محققانہ مقدمہ اور اخیر میں الفاظ و محاورات کی فہرست ہے قیمت غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے۔

ترکوں کی اسلامی خدا و ان کی زبان ادبیا [ڈاکٹر جو لیس

بڑا پیسٹ یونیورسٹی کے تین لکچروں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں دئے تھے۔ مولوی سید و صاحب الدین صاحب نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب میں ترکوں کی ترقی و زوال کے اسباب دکھا کر پروفیسر مذکور نے ترکی ادبیات کی تدریجی ترقی کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ دکھایا ہے۔ کہ فرانس کے انقلابی خیالات اور یورپین باشندوں کی بیداری نے ترکوں کے تخیلات میں بھی حرکت پیدا کی۔ لیکن انہوں نے اندھی تقلید کی بجائے اجتہاد و فکر سے کام لیا۔ ۱۳۵ صفحہ قیمت ایک روپیہ (دس)

تاریخ ادبیات ایران [پروفیسر براؤن کی بے مثل اور مشہور عالم

حصے کا ترجمہ ہے۔ فارسی ادب کی تاریخ پر اب تک ایسی کتاب نہیں لکھی گئی اس حصہ کے شروع میں فارسی زبان کی اور اس کی ابتدا اور ترقی کا نہایت محققانہ بیان ہے قیمت مجلد چار روپے۔

ریاست [افلاطون کسی تعریف یا تعارف کا محتاج نہیں۔ آج تقریباً

کا اتر تمام عالم پر ہے۔ ہر زبان میں اس کی تصنیفات کے تراجم موجود ہیں اور بڑے احترام سے پڑھے جاتے ہیں۔ غالباً اس کی سب سے بڑی اور قابل قدر تصنیف ”ریاست“ ہے۔ جس کا ترجمہ انجمن نے اردو زبان میں پیش کیا ہے۔ اور جسے نہایت خوبی سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ جامعہ ملیہ دہلی نے سرانجام دیا ہے۔ قیمت مجلد پانچ روپے۔ (دس)

مولوی عبدالحق کی نگہانی میں تکمیل تک پہنچ کر عنقریب شائع ہوگی۔



ابتدائی اسلامی فن تعمیر (۱) از کیپٹن کریسویل راجہ اول متعلقہ

پریس قیمت دس گنی کیپٹن کریسویل کی شخصیت اسلامی دنیا میں فن تعمیر اسلامی کے ضمن میں محتاج تعارف نہیں ممکن ہے۔ کہ ہندوستان کے مسلمان ابھی تک آپ کی شخصیت سے نا آشنا ہیں۔ کیونکہ آپ کی جدوجہد اور توجہات زیادہ تر مشرق قریب تک ہی محدود رہی ہیں آپ کا یہ فنی و علمی شاہکار ہر اعتبار سے پہلی کوششوں سے خواہ وہ کسی زبان میں کی گئی ہوں سبقت لے گیا ہے۔ یہ کتاب بہت بڑی تقطیع میں کئی سو صفحات پر مرقوم نوگراف اور نقشوں کے مشتمل ہے۔ تمام کتاب کیپٹن کریسویل کے ذاتی کمال فن کا نتیجہ ہے۔ اس سے پیشتر بعض یورپین مصنفین نے بھی اس موضوع پر لکھا ہے۔ جو زیادہ تر تعصب پر مبنی ہو ان میں خاص طور پر سینوریار یورپ کی کتاب اسلامی فن تعمیر تعصبات کا مجموعہ ہے لیکن کیپٹن کریسویل نے ہر اعتبار سے نہایت اچھی طرح سے اسلامیات کا مطالعہ کر کے اس کتاب کو ترتیب دیا ہے مصنف کی اعلیٰ قابلیت کا ثبوت اور جو کچھ عبور انہیں اس فن پر حاصل ہے۔ ان کی کتاب سے عیاں ہے۔ کتاب میں مسجد نبویؐ کی ابتدائی تاریخ یعنی ارتفاع تعمیر مسجد پر پوری بحث کی گئی ہے مسجد بیت المقدس مسجد عمر وغیرہ پر بھی نہایت محققانہ بحث کی ہے۔ اور مسلمانوں کے فن تعمیر کا نہایت درخشاں پہلو دکھایا ہے۔ یہ کتاب شاہ فواد کے نام پر معنون ہے غرضیکہ کیپٹن کریسویل نے نہایت جامعیت اور غیر تعصبانہ جذبات کے ساتھ ابتدائی اسلامی فن تعمیر کا سنگ بنیاد رکھا ہے۔ جس کی کسی غیر مذہب کے مصنف سے توقع رکھنا بعید از قیاس ہے۔

محمد عبداللہ حقانی

(1) EARLY MUSLIM ARCHITECTURE

فائوسٹ گوسٹے کو جرمنی کا امامی شاعر کہا جاتا ہے۔ اور اس کا ڈیڑا صدی سے تمام عالم میں مشہور ہے۔ اور جس کا دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو میں پہلی مرتبہ صحیح و مکمل ترجمہ ایک مبسوط محققانہ مقدمہ کے ساتھ ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے کیا ہے۔ قیمت مجلد چار روپیہ۔

رہنمایان ہند مترجمہ بابو نرائن پرشاد دورا "ہر" یہ مضمون متھ و کی مشہور کتاب "پرافٹس آف انڈیا" کا ترجمہ ہے تمہید کتاب میں ہندو مذہب کی اعلیٰ تعلیم و حدایت اور پسندیدہ عقاید کا بیان عالمگیر اور دلکش پیرائے میں لکھا ہے۔ سری کرشن جی کی سوانحی اور ان کی ولولہ انگیز جھگوت گیتا۔ سری کرشن جی کا فلسفہ نجات اور اس کی تین منازل اور گوتم بدھ کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے آخری حصہ میں "شکر چاریہ" "زانچ" اور راناند کے حالات درج ہیں۔ حجم ۲۱۵ صفحہ قیمت دو روپے

انجمن ترقی اردو کی یہ مطبوعات ان کے اپنے مروجہ ٹاپ ہیں اور نہایت سلیقہ اور نفاست کے ساتھ طبع کی گئی ہیں۔ انجمن ہذا کی بعض اہم مطبوعات زیر طبع ہیں۔ ان میں سے چند لغت کی کتابیں ہیں جن کی ضرورت اہل علم کو ہمیشہ سے تھی۔ اور ان کے طبع ہونے سے بہت سی کمی پوری ہو جائے گی۔ چنانچہ ان میں سے:-

(۱) انگریزی اردو لغات کئی سال کے بعد تیار ہوئی ہے۔ اور عنقریب شائع ہوگی۔ یہ مبسوط ڈکشنری مستند حضرات کی مشترک محنت اور مولوی عبدالحق صاحب کی سرکردگی کا نتیجہ ہے۔

(۲) علمی اصطلاحات کی لغات جو شائع ہو چکی ہے۔ اور اب ترمیم شدہ حالت میں از سر نو طبع ہوگی۔ اس میں بیش بہا اضافے کئے گئے ہیں (۳) اصطلاحات پیشہ وراں۔ اس میں قریب ایک سو پیشوں کی اصطلاحات ہیں۔ بہت محنت سے جمع کی گئی ہیں۔

اس طرح سے (۴) لغات اردو کے قدیم اور (۵) اردو کی طبع لغات بھی بہت اعلیٰ ایمان نے پرتیار ہو رہی ہیں۔ مہر خاں ذکر کتاب مولانا

طرحی غزلیات

بہل

ساتھی کی چشمِ مست نے دیوانہ کر دیا
ہوش و خرد سے عشق نے بیگانہ کر دیا
اے شمعِ حسنِ دل تو بہت سخت چیز تھا
رگِ رگ سے دل نے کھینچ کے سر ملے جیا
انجام کارِ مشقِ تصور نے دل مرا
اچھا کیا یہ طالبِ دیدار کا علاج
بہل جما کے دل میں توں کے خیال کو
دورِ نفس کو گردِ ششِ پیمانہ کر دیا
دیوانہ کر دیا مجھے دیوانہ کر دیا
تیرا کرم کہ صورتِ پروانہ کر دیا
نذرِ اداسے تر گس مستانہ کر دیا
آئینہ دارِ جلوہ جانا نہ کر دیا
صورت دکھا کے آپ نے دیوانہ کر دیا
بیکار تم نے کعبہ کو بت خانہ کر دیا

نواب سجاد علی خاں قسبل نواب آف کرناٹ

احسن مارہروی

یوں ہم نے پیشِ حسن کا نذرانہ کر دیا
کیا سحر تو نے تر گس مستانہ کر دیا
رندوں نے مل کے مہکدے میں اور کیا کیا
ہم کو تری نگاہ کے اعجاز و سحر نے
چھلکا کے اپنے جامِ تری چشمِ مست نے
تم اپنے مرنے والے سے جب کو نہ سن سکے
اتنا بہا جیس سے پسینا دمِ اخیر
دل کو نثارِ جلوہ جانا نہ کر دیا
دنیا کو اک نگاہ میں دیوانہ کر دیا
برہمِ نظامِ شیشہ و پیمانہ کر دیا
ہشیا ر کر دیا کبھی دیوانہ کر دیا
دنیا میں عامِ مشربِ رندانہ کر دیا
دو ہچکیوں نے ختم وہ افسانہ کر دیا
لبریز جس نے عمر کا پیمانہ کر دیا

احسن کے پاس خرقہ و عمامہ اب کہاں
سب اس نے نذرِ مرشدِ میخانہ کر دیا

احسن مارہروی

وحشت

جس کو خراب نرگس مستانہ کر دیا ساقی نے اسکے دل کو طرب خانہ کر دیا
اہل خرد نے دیکھ کے دنیا کا رنگ ڈھنگ فرصت کو وقف ساغر و پیمانہ کر دیا
معصوم حسن تھا اُسے رسوا کیا عجب کس نے بیانِ عشق کو افسانہ کر دیا
اچھا کیا کہ میرے دل سے پرست کو ساقی نے اک نگاہ میں میخانہ کر دیا
لوٹے مرنے کرشمہ و انداز و ناز کے دل کو نیازِ جملوہ جانا نہ کر دیا
مقصد جو دیکھا ایک ہی ایمان و کفر کا دل کو کبھی حرم کبھی تجخانہ کر دیا
وحشت یہ اک مرقع رنگینِ حسن ہے
اوراق کا رواں کو پریشانہ کر دیا

خان بہادر رضا علی وحشت

تنش

نرنگ کیا یہ نرگس مستانہ کر دیا کعبہ کو دیر کو میخانہ کر دیا
ساقی نے میرے ظرف کی کیا خوب ادوی پھوٹے ہوئے نصیب کو پیمانہ کر دیا
کھلتے ہی ان کی آنکھ زمانہ تباہ تھا پہنچی ہل نظرو ہیں ویرانہ کر دیا
شوق ستم ظریفی اجاب دیکھنا رودادِ عشق کو مری افسانہ کر دیا
انجام کارِ نالہ خاموش شمع نے اعلانِ نامراد ہی پروانہ کر دیا
پروے میں روگیا تری بے پروگی کمال پروازِ ہوش نے مجھے دیوانہ کر دیا
اللہ سے نمائش انداز و لفریب بیگانہ ہو گئے کبھی بیگانہ کر دیا
دیکھی جو بے نیازیِ سنگِ حرم تنش
سر کو رہیں سجدہِ بختانہ کر دیا

شیخ عبداللطیف تنش



گزارش احوال و فہمی

وہ کسی رسالے کے لئے بار بار کیوں لکھیں؟ ہم بار بار اصرار بھی نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے اصرار سے مجبور ہو کر اگر وہ لکھ بھی دینگے۔ تو غالباً وہ ان کے اور کارواں کے معیار پر پورا نہ اترے گا۔

گذشتہ سال کارواں دو ہزار پانچ سو کی تعداد میں شائع کیا گیا تھا۔ اور اس سال تین ہزار پانچ سو۔ گذشتہ سال جو کامیابی ہوئی تھی اسے مد نظر رکھ کر اس سال بھی امید کی جاتی ہے۔ کہ ہمیں خاطر خواہ کامیابی میسر ہوگی چند معروضات ان مضامین کے متعلق ضروری ہیں۔ جو اس سال کارواں میں شائع نہیں ہوئے۔ یہ مضامین دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کی اشاعت مضمون نگار سے اختلاف رائے رکھنے کی وجہ سے قرین مصلحت نہیں سمجھی گئی۔ اور دوسرے وہ جو وقت پر نہ ملے۔ اور اس لئے شامل نہ کئے جاسکے۔ مولانا محمد سید محمد اور جناب عبداللطیف پش کے مضامین ہیں۔ اول الذکر مضامین میں سے تین مضامین قابل ذکر ہیں ایک مضمون "ملسم زندگی" پر تنقید کے رنگ میں تھا۔ ہم مضمون نگار کی قابلیت کے معترف ہیں۔ لیکن ان کی تنقید اور اس کے نتائج کو دور نہیں سمجھتے۔ دوسرا مضمون "حشر کی شخصیت" پر تھا۔ جناب حشر کا شمیری پر تنقید لکھنا بہت آسان ہے۔ اور ان کی خامیاں "مسلم ہیں۔ لیکن اردو ڈرامہ کی جو خدمت جناب حشر نے انجام دی۔ اسے نظر انداز کر دینا انتہا درجے کی بے انصافی ہے۔ تیسرا مضمون مغل اور اردو پر تھا۔ فاضل مضمون نگار نے کتاب کی ان خامیوں کی طرف توجہ دلائی تھی۔ جو "فن تحقیق کی رد سے کتاب میں موجود ہیں۔" لیکن کیا کتاب میں خوبیاں نہیں؟

اردو میں ایک سالنامہ شائع کرنے کی تجویز جناب چغتائی اور جناب تاثیر کے درمیان کوئی آٹھ سات سال سے زیر بحث تھی۔ لیکن وقت اور حالات نے مساعیت نہ کی۔ اس لئے یہ تجویز گذشتہ سال تک عملی صورت اختیار نہ کر سکی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کارواں سال میں ایک مرتبہ کیوں شائع کیا جاتا ہے؟ ایک وجہ یہ ہے کہ جو معیار کارواں کے پیش نظر ہے۔ وہ ماہوار سہ ماہی بلکہ ششماہی رسالے میں بھی ممکن نہیں لیکن سب سے پہلے ہمیں ایک اعتراف کرنا ہے۔ وہ یہ کہ کارواں پر ہم لوگ اپنے وقت اور آمدنی کا ایک محدود حصہ صرف کر سکتے ہیں۔ کارواں ہمارے لئے کسب معاش کا ذریعہ نہیں۔ اور نہ ہمارے لئے ذریعہ شہرت ہی ہے جس ادبی حلقے کو کارواں کے ساتھ وابستگی کا فخر حاصل ہے۔ خدا کے فضل سے وہ حلقہ دنیائے علم میں برسوں سے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دنیوی جاہ کے لحاظ سے بھی یہ طبقہ خدا کی مہربانیوں سے پوری طرح متمتع ہے۔ اندریں حالات کارواں کی اشاعت کا محرک محض خدمت اردو کا جذبہ ہے۔ اور ہر چند کہ ہم دست بدعا ہیں۔ کہ خدا ہمیں اس خدمت کے لئے زیادہ سے زیادہ ایثار کی ہمت عطا کرے۔ تاہم موجودہ صورت میں اس سے زیادہ شکل ہے۔

ہندوستان میں مضمون نگار حلقہ اس قدر محدود ہے۔ کہ سال میں دو مرتبہ بھی اعلیٰ پائے کا سالہ لکنا قریب قریب ناممکن ہے۔ وجہ ہر حال جن کی قابلیت مسلم ہے۔ محدود ہے چند ہیں۔ ان میں سے بیشتر کی مالی حالت خدا کے فضل و کرم سے ایسی ہے کہ مضمون نگاری ان کا ذریعہ معاش تو کیا ان کی آمدنی کا کوئی جزو بھی مہیا نہیں کر سکتی۔ اندریں حالات

تبادلہ اور کارواں } جو رسائل اور اخبارات ہمیں سال بھر اپنا
 پرچہ بھیجتے رہیں گے۔ یا جو بھیجتے رہے ہیں
 ان کی خدمت میں کارواں شائع ہوتے ہی روانہ کیا جائے گا۔ بعض رسائل
 اور اخبارات یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ ایک پرچہ بھیج کر کارواں کے حق وازین
 گئے ہیں۔ انہیں خیال رکھنا چاہئے۔ کہ کارواں ایک سالنا مسہ ہے۔ جو
 سال بھر میں ایک ہی بار شائع ہوتا ہے۔ اور سال میں ایک ہی بار بھیجا
 جاسکتا ہے۔

کارواں میں ریویو } کارواں میں ریویو دو قسم کی کتابوں پر کئے جائیں گے
 ایک تو ان بہترین کتابوں پر جو دنیا کے کسی
 حصہ میں سال کے دوران میں شائع ہوں خصوصیت سے ان پر جو مشرقی
 تہذیب و تمدن اور ادب و تاریخ سے کوئی تعلق رکھتی ہوں۔ اور دوسرے
 ان علمی کتب پر جو ہندوستان میں شائع ہوں۔ اور مفید معلومات سے پر ہو
 مرقع چغتائی کا تیسرا ایڈیشن } ہندوستان کے اردو شاعروں
 میں جو درجہ قبولیت غالب کو
 نصیب ہوا ہے۔ وہ کسی بیان کا محتاج نہیں۔ اگرچہ مرزا غالب کا دیوان
 دہرادر شعر سے زیادہ نہیں۔ لیکن ان اشعار کے تذکرے ہزاروں کتابوں
 پر ہیں۔ مرزا غالب کی شعریت۔ سادگی۔ معنوں۔ افزینی اور موسیقیت کتنے
 دلوں کو تسخیر کئے ہوئے ہے۔ اس کا ثبوت وہ لاتعداد ایڈیشن ہیں۔ جو
 آئے دن ملک کے ہر گوشہ سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

دیوان غالب کے ان تمام ایڈیشنوں میں جو آج تک شائع ہوئے
 مرقع چغتائی ایک خاص شرف رکھتا ہے۔ مرقع چغتائی دیوان غالب
 کا وہ مصور ایڈیشن ہے۔ جو جناب چغتائی نے اصراف کثیر اور سالوں کی
 محنت کے بعد شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا سب سے پہلا ایڈیشن ۲۱۰
 کاپیوں کی تعداد میں ایک سو دس روپیہ فی جلد کے حساب سے شائع کیا
 گیا تھا۔ یہ پہلا ایڈیشن تین ماہ کی مدت میں تمام کا تمام فروخت ہو گیا۔ اس
 کے بعد ملک۔ فن اور ادب کی خدمت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کا
 دوسرا ایڈیشن نہایت تھوڑے تغیر و تبدل کے ساتھ تین ہزار کی تعداد

میں نہایت ارزاں قیمت پر یعنی فی جلد سترہ روپے کے حساب سے شائع
 کیا گیا۔ چنانچہ قدروان علم و فن کی قدردانی اور توجہ سے یہ دوسرا ایڈیشن
 بھی نہایت قلیل مدت میں فروخت ہو گیا۔ اردو علم و ادب سے تعلق
 رکھنے والے اصحاب کے لئے یہ جریقینا مسرت کا باعث ہوگی۔ کہ مرقع
 چغتائی کا تیسرا ایڈیشن دوسرے ایڈیشن سے ارزاں قیمت پر شائع کیا
 گیا ہے۔ یہ تیسرا ایڈیشن (قیمت بارہ روپیہ فی جلد) اب اہل نظر کے
 سامنے ہے۔ تیسرے ایڈیشن میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو دوسرے
 ایڈیشن میں تھیں۔ تمام کتاب اسی کاغذ پر اسی جلد میں۔ انہیں تصاویر
 کے ساتھ شائع ہوتی ہے۔

تمام مصور دیوان تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کی
 مجموعی خوبیوں کے مقابلے میں (قیمت بارہ روپے) کچھ بھی حقیقت
 نہیں رکھتی۔ اس تیسرے ایڈیشن کے تمام تاجرانہ حقوق شیخ مبارک علی
 تاجر کتب اندروں لوہاری دروازہ لاہور کو تفویض کئے گئے ہیں۔ شیخ
 صاحب ایک صاحب ذوق تاجر کتب میں۔ اردو علم و ادب پر بہترین
 کتابیں شائع کرتے ہیں۔ جو صاحب مرقع چغتائی کا تیسرا ایڈیشن خریدنا
 چاہیں۔ وہ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندروں لوہاری دروازہ لاہور سے
 خرید سکتے ہیں۔

کارواں کی تمام تصاویر } کی طباعت گزشتہ سال کی طرح
 ہم مسٹر محمد حسین مالک زینتہ پریس بل روڈ میں ہوئی ہے
 گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی اپنے ضروری کاموں کو روک کر
 شہداء و زینت و جانفشانی سے کارواں کی تصاویر اور سرورق کو نہایت
 خوشنمائی اور زینت سے طبع کیا۔ ہمارا دعویٰ ہے۔ کہ اس سے بہتر طباعت
 لاہور کا کوئی اور پریس انجام نہیں دے سکتا۔ اس کے علاوہ ہم
 بابو مولاداد منیر مسلم پرنٹنگ پریس کے بھی شکر گزار ہیں۔ کہ انہوں نے
 کارواں کی لیتھو کی طباعت میں گزشتہ سال کی مانند نہایت سرگرمی کا
 اظہار کیا۔ مسلم پرنٹنگ پریس میں لیتھو کا کام بہت اچھا اور عمدہ ہوتا ہے۔

عجائب خانہ آثار عتیقہ تنبول کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔
کہ انہوں نے کارواں کیلئے بعض تصاویر کی اشاعت کی اجازت مرحمت
فرمائی۔

کارواں کا آئندہ نمبر { اس سے بھی زیادہ شان و شوکت
میں شائع کیا جائے گا۔ مضمون نگار اصحاب سے استدعا ہے کہ اپنے
مضامین نشر و نظم منی ۱۹۳۳ء تک ارسال فرما کر مضمون فرمائیں تاکہ
تمام مضامین نشر و نظم مناسب اور موزوں جن و خوبی کے ساتھ ترتیب
دئے جاسکیں۔

کارواں کی کتابت { منشی سمیع اللہ صاحب نے انجام دی ہے
فنی خوبیاں موجود ہیں۔ سمیع اللہ صاحب کتابت کی فنی خوبیوں کے علاوہ
انگریزی، عربی، فارسی اور اردو میں بھی کافی سے زیادہ استعداد رکھتے ہیں۔ ہم
آپ کے بے حد شکر گزار ہیں۔ کہ آپ نے اس سال کارواں کی کتابت کو
وقت مقررہ پر انجام دیا۔ آپ منشی اسد اللہ صاحب مشہور کاتب کے
فرزند رشید ہیں۔ مریع چغتائی (دیوان غالب) کی کتابت جو فنی اعتبار
سے اپنا جواب نہیں رکھتی منشی اسد اللہ صاحب کی کی ہوئی ہے۔
ہم برٹش موزیم - بوڈلین لائبریری آکسفورڈ

کارواں کے جملہ مضامین نشر و نظم اور تصاویر کے حقوق محفوظ ہیں۔



منیجر

مسلم پرنٹنگ پریس بیرون اکبری دروازہ لاہور میں باہتمام مولاد ادریشی چھاپا اور محمد عبداللہ پبلشر رسالہ کارواں نے دفتر رسالہ کارواں سے شائع کیا ہے۔

ملکہ
خلد اللہ

ماجدان

جس کا کوثر قبول ہمایونی بخشیں

۱۵
سر محمد اقبال
مدظلہ العالی

عارف نامہ لکھنا منظور فرمائیں

وہ کتاب یقیناً بے نظیر اور قابل دید کتاب ہو گیا۔ دوسرا ایڈیشن قیمت ستر روپے ہاتھوں سے پشتر کوئی ایسی شاندار کتاب شائع نہیں ہوئی ہے جس پر نصیب اردو کی یہ پہلی اور آخری کتاب ہے۔ الفاظ اس کی خوبیوں کا

کتاب کا پہلا ایڈیشن ایک سو دس روپے فی جلد تین ماہ کی قلیل مدت میں فروخت ہوا۔ اب تیسرے ایڈیشن کی قیمت بارہ روپے فی جلد مقرر کی گئی ہے۔ ہندوستان میں بے عیب شاعری۔ جو جدا آموز مصوری۔ دیدہ زیب کتابت اور باصرہ نواز سنہری جلد سے زائد روپیہ پانی کی طرح بہا کر ماہرین فن طباعت کے زیر اہتمام شائع کی گئی ہے۔ ہمارے قاصر ہیں یہ چیز صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

مربع چغتائی

دیوان غالب ص ۱۰

کاغذ بیاض مذاق کی ذیل اور اس کا اس لکھنا صحیح اور دل کو بہانے۔ مجموعہ میں سو صفحات کے زائد بڑی تطبیح جنتیں رنگین تصاویر جن کے ہر ایک یورپ کے شہر کا نام لکھا ہے۔ اس کتاب کی قیمت فی جلد بارہ روپے ہے۔

شاہنامہ اسلام آباد دوم صفحہ ۱۵۰۰ کاغذ صحیفہ ۱۵۰۰ لکھنا صحیح اور دل کو بہانے۔ مجموعہ میں سو صفحات کے زائد بڑی تطبیح جنتیں رنگین تصاویر جن کے ہر ایک یورپ کے شہر کا نام لکھا ہے۔ اس کتاب کی قیمت فی جلد بارہ روپے ہے۔

شیخ مبارک علی تاجت سلاروں کو باری مددگار

حفیظ کا دوسرا مجموعہ کلام سوز و ساز

اے

جس میں ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۲ء تک کے تمام ہمارے

یعنی

نغمہ زار کے بعد کی ساری نظمیں شائع کر دی گئی ہیں
نوٹی کشتی کا ملاح - سلام - رقاصہ تین نغمے (ٹیگور حفیظ، اقبال)
دورہ خیبر شام رنگیں - پریت کا گیت کرشن بنسری - دل ہے
پرائے بس میں وغیرہ زندہ جاوید نظمیں گیت اور غزلیں اسی

مجموعہ میں شامل ہیں

صفحہ ۱۰۰ قیمت عام علاوہ محصول

مستقیم

دفتر شاہنامہ کمال ٹاؤن
لاہور

یہ مجھے رزمیہ کاناموں کی اولین مشق

شاہنامہ اسلام

جلد دوم

مصنفہ

فروغی شام ابوالاثر حفیظ جالت صحری

جس میں درج کے صحابہ کرام کے اخلاق حسنا اور مجاہدین
موشہدا - اس کے سروروشانہ کارنامے عام فہم اور دلورالیک
ان میں نظم کئے گئے ہیں

پہلی جلد حضرت ابراہیم حضرت اسماعیل اور حضرت
اسحاق کے کمال شہادت کے بعد حضرت یحییٰ کی ولادت
قیمت تین روپے حضرت یحییٰ بنوت و ہجرت کے حالات پیش ہے
دوسری جلد جنگ سوین جنگ امد کی مکمل تصویر اور
ریدۃ النساء حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا حضرت علی
قیمت تین روپے اکرم اللہ وجہہ کی سادہ شادی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

سادہ تیرہ سو سال میں

یہ پہلی نظم ہے جو کہ واقعات ایسے شاندار انداز میں پیش کئے گئے ہیں
جن سے مرد دل زندہ ہو سکتے ہیں۔

ہر جلد کا خاص ڈیزائن ہاؤس فی جلد علاوہ محصول
مستقیم دفتر شاہنامہ کمال ٹاؤن لاہور

